اثر نگارش

اہلِ قلم کی ایک جماعت

زیرِ نظر

استاد محقق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیر نمونہ

جلد 21

ترجمہ

حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی رحمۃ اللہ علیہ

زیرِ سرپرستی

حضرت آیت اللہ العظمیٰ الحاج سید علی رضا سیستانی مدظلہ

مصباح القرآن ٹرسٹ

تفسیر نمونہ جلد ۲۱

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ
سورۂ زخرف	۲۳
سورۂ زخرف کے مضامین	۲۵
اس سورت کی تلاوت کی فضیلت	۲۶
آیت ۱ تا ۸	۲۷
گناہ رحمت کو نہیں روک سکتے	۲۸
آیت ۹ تا ۱۴	۳۳
توحید کے کچھ دلائل	۳۴
نعمتوں کے موقع پر خدا کی یاد	۳۹
آیت ۱۵ تا ۱۹	۴۲
فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کیوں سمجھتے ہو ؟	۴۳
آیت ۲۰ تا ۲۲	۴۷
تقلیدِ آباء کی دلیل	۴۷
آیت ۲۳ تا ۲۵	۵۲
ان اندھے اور بہرے مقلدین کا انجام	۵۳
آیت ۲۶ تا ۳۰	۵۶
توحید ۔ انبیاء کا دائمی پیغام	۵۷
آیت ۳۱، ۳۲	۶۲
قرآن کسی دولت مند پر نازل کیوں نہیں ہوا ؟	۶۲

عنوان	صفحہ
دو اہم سوالوں کا جواب	۶۴
آیت ۳۳ تا ۳۵	۶۷
چاندی کے محل ۔ جھوٹی قدریں	۶۸
چند اہم نکات	۶۹
اسلام غلط اقدار کی نفی کرتا ہے	۶۹
ایک سوال کا جواب	۷۱
آیت ۳۶ تا ۴۰	۷۳
شیاطین کا ساتھی	۷۴
آیت ۴۱ تا ۴۵	۷۹
دامنِ وحی مضبوطی سے پکڑے رہیں	۸۰
پیغمبر کی قوم کون لوگ ہیں	۸۳
آیت ۴۶ تا ۵۰	۸۵
مغرور اور عہد شکن فرعونی	۸۶
آیت ۵۱ تا ۵۶	۹۰
موسیٰؑ کے پاس سونے کے کنگن کیوں نہیں ؟	۹۱
آیت ۵۷ تا ۶۲	۹۷
شانِ نزول	۹۸

عنوان	صفحہ
کون سے معبود جہنمی ہیں ؟	۹۹
آیت ۶۳ تا ۶۵	۱۰۵
جن لوگوں نے عیسیٰؑ کے بارے میں غلو کیا	۱۰۶
آیت ۶۶ تا ۶۹	۱۱۰
کس انتظار میں ہو	۱۱۱
آیت ۷۰ تا ۷۳	۱۱۴
جو جی چاہے اور جس سے آنکھ لذت اٹھائے۔	۱۱۵
ایک سوال کا جواب	۱۱۷
آیت ۷۴ تا ۸۰	۱۱۹
مرنے اور عذاب سے جان چھڑانے کی آرزو۔	۱۲۰
آیت ۸۱ تا ۸۵	۱۲۴
انھیں باطل میں غوطے کھانے دو	۱۲۵
چند اہم نکات	۱۲۸
آیت ۸۶ تا ۸۹	۱۳۰
شفاعت کون کر سکتا ہے	۱۳۱
سورۂ دخان	۱۳۵
سورۂ دخان کے مضامین	۱۳۷
سورۂ دخان کی تلاوت کا ثواب	۱۳۸
آیت ۱ تا ۸	۱۳۹
مبارک رات میں قرآن کا نزول	۱۴۰
قرآن دفعتاً نازل ہوا ہے یا تدریجی طور پر؟	۱۴۱
قرآن مجید کا شب قدر سے رابطہ	۱۴۷
آیت ۹ تا ۱۶	۱۴۹
جب ہولناک دھواں آسمان پر چھا جائے گا	۱۵۰

عنوان	صفحہ
دخان مبین سے کیا مراد ہے ؟	۱۵۲
آیت ۱۷ تا ۲۱	۱۵۶
خود ایمان نہیں لاتے تو دوسروں کو تو نہ روکو۔	۵۷ ۱۵۷
آیت ۲۲ تا ۲۹	۱۶۱
محلات، باغات اور خزانوں کو چھوڑ کر چلے گئے	۱۶۲
آیت ۳۰ تا ۳۳	۱۶۹
بنی اسرائیل کی آزمائش	۱۶۹
آیت ۳۴ تا ۳۶	۱۷۳
یہی موت ہے بس	۱۷۳
معاد کے بارے میں مشرکین کا عقیدہ	۱۷۵
آیت ۳۷ تا ۳۹	۱۷۷
آیا وہ بہتر ہیں یا قوم "تبع"	۱۷۷
قوم تبع، کون تھی	۱۷۹
آیت ۴۰ تا ۴۲	۱۸۳
جدائی کا دن یا یوم الفصل	۱۸۳
آیت ۴۳ تا ۵۰	۱۸۶
تھوہر کا درخت	۱۸۷
جسمانی اور روحانی سزائیں	۱۹۰
آیت ۵۱ تا ۵۷	۱۹۲
پرہیزگار لوگ اور بہشت کی گوناگوں نعمتیں۔	۱۹۳
پہلی موت کیا ہے	۱۹۶
آیت ۵۸ - ۵۹	۱۹۹
آپ بھی منتظر رہیں اور وہ بھی منتظر ہیں	۱۹۹

عنوان	صفحہ
چند نکات	۲۰۰
سورۂ جاثیہ	۲۰۳
سورۂ جاثیہ کے مضامین	۲۰۵
سورۂ جاثیہ کی تلاوت کا ثواب	۲۰۵
آیت ۱ تا ۶	۲۰۷
ہر جگہ اس کی نشانیاں موجود ہیں	۲۰۸
آیت ۷ تا ۱۰	۲۱۴
گناہگار جھوٹے پر پھٹکار	۲۱۵
آیت ۱۱ تا ۱۵	۲۱۹
سب تیرے سرگردان اور تیرے زیرِ فرمان ہیں۔	۲۲۰
آیت ۱۶ تا ۲۰	۲۲۶
بنی اسرائیل کی ناشکری	۲۲۷
آیت ۲۱ تا ۲۳	۲۳۳
ان لوگوں کا مرنا جینا ایک سا نہیں	۲۳۴
چند اہم نکات	۲۳۹
(۱) خواہشاتِ نفسانی سب سے زیادہ خطرناک بُت ہیں۔	۲۳۹
(۲) شیطان کے لیے موثر ترین راستہ	۲۴۰
(۳) نفس پرستی ہدایت سے محرومی کا سبب	۲۴۰
(۴) خدا کے قائل	۲۴۰
(۵) ہوس پرستی کا انجام	۲۴۰
آیت ۲۴-۲۵	۲۴۳
دھریوں کے عقائد	۲۴۴
آیت ۲۶ تا ۳۱	۲۴۹
سب گھٹنے ٹیک دیں گے	۲۵۰
آیت ۳۲ تا ۳۷	۲۵۷
جس دن انسان کے بُرے اعمال ظاہر ہوجائیں گے	۲۵۸
سورۂ احقاف	۲۶۵
سورۂ احقاف کے مضامین	۲۶۷
اس سورہ کے فضائل	۲۶۷
آیت ۱ تا ۳	۲۶۹
اس کائنات کی تخلیق حق کی بنا پر ہے	۲۶۹
آیت ۴ تا ۶	۲۷۲
گمراہ ترین لوگ	۲۷۳
آیت ۷ تا ۱۰	۲۷۷
کہہ دیجئے میں کوئی نیا رسول نہیں ہوں	۲۷۸
آیت ۱۱ تا ۱۴	۲۸۵
شانِ نزول	۲۸۶
کامیابی کی دو شرطیں	۲۹۲
آیت ۱۵ تا ۱۶	۲۹۲
اے انسان اپنے والدین سے نیکی کر	۲۹۹
چند اہم نکات	۲۹۹
(۱) بہشتی انسانوں کی صفات	۲۹۹
(۲) وصینا الانسان	۲۹۹
(۳) احسان کی تعبیر	۲۹۹
(۴) اولاد کی پرورش میں ماں کی تکالیف	۲۹۹
(۵) قرآنی آیات میں خاندانی رشتے	۳۰۰
آیت ۱۷ تا ۱۹	۳۰۲
والدین کے حقوق پامال کرنے والے	۳۰۳

عنوان	صفحہ
یہ آیت بنی امیہ کی طرف کیسے تحریف کی گئی ؟	۳۰۶
آیت ۲۰	۳۰۸
زہد اور آخرت کا ذخیرہ	۳۰۸
چند اہم نکات	۳۰۹
(۱) کفار کا جہنم کو پیش کیا جانا	۳۰۹
(۲) اذھبتم طیباتکم کا مفہوم	۳۱۰
(۳) طیبات کا وسیع مفہوم	۳۱۱
(۴) عذاب الہون	۳۱۱
(۵) اہل جہنم کے دو گناہوں کا تذکرہ	۳۱۱
(۶) غیر الحق	۳۱۱
آیت ۲۱ تا ۲۵	۳۱۳
قوم عاد اور تباہ کن آندھی	۳۱۵
آیت ۲۶ تا ۲۸	۳۲۰
تم قوم عاد سے زیادہ طاقت ور نہیں ہو	۳۲۱
آیت ۲۹ تا ۳۲	۳۲۵
شانِ نزول	۳۲۶
جنات ایمان لاتے ہیں	۳۲۸
چند نکات	۳۳۱
(۱) موثر تبلیغ	۳۳۱
(۲) عظمتِ قرآن کی بہترین دلیل	۳۳۱
آیت ۳۳ تا ۳۵	۳۳۳
اولوالعزم پیغمبروں کی طرح صبر کریں	۳۳۴
اولوالعزم پیغمبر کون تھے ؟	۳۳۶
آنحضرت صبر و استقامت کا مجسم نمونہ تھے۔	۳۳۹

عنوان	صفحہ
سورۂ محمدؐ	۳۴۳
سورۂ محمدؐ کے مضامین	۳۴۵
سورۂ محمدؐ کی تلاوت کی فضیلت	۳۴۶
آیت ۱ تا ۳	۳۴۸
مومن حق کی اور کافر باطل کی اتباع کرتے ہیں۔	۳۴۹
آیت ۴ تا ۶	۳۵۲
میدان جنگ میں ارادے کی پختگی ضروری ہے۔	۳۵۴
چند نکات	۳۵۹
(۱) شہدا کا بلند مقام	۳۵۹
(۲) اسلام میں جنگ کے مقاصد	۳۶۲
(۳) ماضی میں غلاموں کا دردناک انجام	۳۶۴
(۱) اسلام غلامی کا موجد ہرگز نہیں	۳۶۵
(۴) اسلام اور غلامی	۳۶۶
(۵) غلاموں کی آزادی کے لیے اسلام کا مفہوم۔	۳۶۸
آیت ۷ تا ۱۱	۳۷۵
تم خدا کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا۔	۳۷۶
آیت ۱۲ تا ۱۴	۳۸۱
مومنین اور کفار کا انجام	۳۸۲
آیت ۱۵	۳۸۷
بہشت کی ایک اور صفت	۳۸۸
چند نکات	۳۹۰
(۱) بہشت کی چار نہریں	۳۹۰

عنوان	صفحہ
(۲) شراب طہور	۳۹۰
(۳) خراب نہ ہونے والے مشروبات	۳۹۰
(۴) پھل کیوں ؟	۳۹۱
(۵) سقوا	۳۹۱
آیت ۱۷ تا ۱۹	۳۹۲
قیامت کی نشانیاں ظاہر ہو چکی ہیں	۳۹۳
کیا پیغمبر اسلام کی بعثت قیامت کے قریب ہونے کی علامت ہے ؟	۳۹۶
اشراط الساعۃ کیا ہیں ؟	۳۹۹
آیت ۲۰ تا ۲۴	۴۰۳
وہ جہاد کے نام سے بھی ڈرتے ہیں	۴۰۴
چند نکات	
(۱) قرآن فکر و عمل کی کتاب ہے	۴۰۹
(۲) امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث	۴۱۱
آیت ۲۵ تا ۲۸	۴۱۲
وہ قرآن میں غور کیوں نہیں کرتے ؟	۴۱۳

عنوان	صفحہ
آیت ۲۹ تا ۳۱	۴۱۷
منافقین انداز گفتگو سے پہچانے جاتے ہیں۔	۴۱۸
آیت ۳۲ تا ۳۴	۴۲۲
کفر کی حالت میں مرنے والے نہیں بخشے جائیں گے۔	۴۲۳
ثواب ضائع ہونے کے اسباب	۴۲۴
(۱) احسان جتانا اور تکلیف پہنچانا	۴۲۴
(۲) عجب اور خود پسندی	۴۲۵
(۳) حسد	۴۲۵
مرنے دم تک ایمان پر قائم رہنا بقائے عمل کی اہم ترین شرط ہے۔	۴۲۵
آیت ۳۵	۴۲۷
بے جا اور رسوا کن صلح	۴۲۷
آیت ۳۶ تا ۳۸	۴۳۰
اگر تم روگردانی کرو گے تو دوسرے لوگ آجائیں گے	۴۳۱

جلد ۲۱

تفسیر نمونہ

سورۂ زخرف، دخان، جاثیہ (پارہ ۲۵)
سورۂ احقاف، محمّد (پارہ ۲۶)

جلد ۲۱ کا آغاز
۷، جمادی الاوّل ۱۴۰۵
۱۳۶۳/۱۱/۹

سُورۂ زُخرف

یہ سُورۃ مکہ میں نازل ہوئی

اور

اس کی ۸۹ آیات ہیں

تاریخ آغاز

۷ رجمادی الاول ۱۴۰۵ھ

سُورت زخرف کے مضامین :

سورت زخرف مکی سورتوں میں سے ہے۔ اس کی صرف آیت ۴۵ کے بارے میں بعض مفسرین نے کچھ اختلاف کیا ہے اور اسے مدنی سورت سمجھا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ اس کے بیشتر مطالب کا تعلق اہل کتاب سے ہے، یا پھر معراج کے واقعے کو بیان کر رہی ہے، چونکہ ان دونوں واقعات کا مدینہ سے ربط ہے لہٰذا انہوں نے اسے مدنی شمار کیا ہے۔ ہم انشاء اللہ اسی آیت کی تفسیر کے موقع پر اس کی بھی وضاحت کریں گے۔

بہرحال مکی سورتیں اکثر و بیشتر اسلام کے بنیادی عقائد کے محور کے گرد گھومتی ہیں اور مبداء و معاد، نبوت و قرآن اور انذار و تبشیر کے متعلق گفتگو کرتی ہیں اور یہی مزاج اس سورت کا ہے۔

اس سورت کے مضامین کو خلاصے کے طور پر سات حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

پہلا حصہ :

یہ سورت کا سرآغاز ہے اس میں قرآن مجید، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی اہمیت اور اس آسمانی کتاب یعنی قرآن پاک کے ساتھ جہلا کی ناپسندیدہ روش کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

دوسرا حصہ :

" آفاق " میں توحید کے کچھ دلائل اور انسان پر خدا کی گوناگوں نعمتوں کے تذکرہ پر مشتمل ہے۔

تیسرا حصہ :

اسی حقیقت کی تکمیل کرتا ہے۔ یعنی اس حصے میں شرک کے خلاف جدوجہد، خدا کی ذات کی طرف ناروا نسبتوں کی نفی، اندھی تقلید اور لڑکیوں سے نفرت اور فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھنے جیسی خرافات کے خلاف بات کی گئی ہے۔

چوتھا حصہ :

حقائق کو مجسم کرنے کے لیے کچھ سابق انبیاء اور ان کی اقوام کی سرگزشت بیان کی گئی ہے اور خصوصی طور پر حضرت ابراہیم حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کی داستانوں پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔

پانچواں حصہ :

اس میں معاد کے مسئلے کے ضمن میں مؤمنین کی جزا اور کفار کے دردناک انجام کو بیان کیا گیا ہے۔ اور مجرمین کو زوردار الفاظ میں تنبیہ کی گئی ہے۔

چھٹا حصہ :

یہ اس سورت کا اہم ترین حصہ ہے اور اس میں ان جھوٹی اقدار کا ذکر ہے جو بے ایمان لوگوں کے افکار پر حکم فرما چلی آ رہی ہیں۔ اور انہی جھوٹی اور بے بنیاد اقدار کی وجہ سے وہ زندگی کے اہم مسائل کو بھی سمجھنے میں گوناگوں غلطیوں کے مرتکب ہوتے

چلے آرہے ہیں حتی کہ وہ اس بات کی توقع رکھتے ہیں کہ قرآن مجید کو بھی ایک متمول اور ثروتمند شخص پر نازل ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ وہ انسانی شخصیت اور عظمت کو دولت ہی میں منحصر سمجھتے تھے۔ قرآن مجید نے اس سورت کی متعدد آیات میں اس احمقانہ سوچ کی خوب سرکوبی کرتے ہوئے صحیح اسلامی اور انسانی اقدار کو اجاگر کیا ہے۔

ساتواں حصہ :

دوسری سورتوں کی طرح اس میں بھی موثر اور مفید پند و نصیحت پائی جاتی ہے۔ یوں یہ حصہ دوسرے حصوں کی تکمیل کرتا ہے تاکہ سورت کی مجموعی آیات کو معجون شفا کی صورت عطا کرے اور سننے والے کے دل پر گہرا اثر ڈالے۔

اس سورت کا نام اس کی ۳۵ ویں آیت کے لفظ سے لیا گیا ہے جس میں مادی اقدار اور "زخرف" (سونا اور اس جیسی چیزوں) کے بارے میں بات چیت کی گئی ہے۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت :

تفسیر اور حدیث کی مختلف کتابوں میں اس سورت کی بہت فضیلت بیان کی گئی ہے، اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث بھی ہے :

من قرأ سورۃ الزخرف، کان ممن یقال لہ یوم القیامۃ یاعباد لاخوف علیکم الیوم ولا انتم تحزنون ادخلوا الجنۃ بغیر حساب

جو شخص سورہ زخرف کی تلاوت کرے گا وہ ان لوگوں میں قرار پائے گا جنہیں روز قیامت اس طرح مخاطب کیا جائے گا: اے میرے بندو! آج نہ تو تم پر کسی قسم کا خوف ہے اور نہ ہی غم، تم بہشت میں حساب و کتاب کے بغیر چلے جاؤ۔[1]

البتہ یاعباد لاخوف علیکم الیوم و لا انتم تحزنون - کا خطاب اسی سورت کی ۶۸ ویں آیت میں موجود ہے۔ ادخلوا الجنۃ کا جملہ اس کی ۷۰ ویں آیت سے لیا گیا ہے اور "بغیر حساب" کا جملہ کلام کے لوازمات میں سے اور قرآن مجید کی دوسری آیات سے لیا گیا ہے۔

صورت حال خواہ کچھ ہو، یہ عظیم بشارت اور بے حد و حساب فضیلت، غور و فکر اور ایمان و عمل کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ تلاوت تو سمجھنے کے لیے مقدمہ کی حیثیت رکھتی ہے اور ایمان و عمل اس کے ثمر ہوتے ہیں۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان سورہ زخرف کا آغاز۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱۔ حٰمٓ ۚ﴿۱﴾
۲۔ وَالۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ ۙ﴿۲﴾
۳۔ اِنَّا جَعَلۡنٰہُ قُرۡاٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ۚ﴿۳﴾
۴۔ وَاِنَّہٗ فِیۡۤ اُمِّ الۡکِتٰبِ لَدَیۡنَا لَعَلِیٌّ حَکِیۡمٌ ؕ﴿۴﴾
۵۔ اَفَنَضۡرِبُ عَنۡکُمُ الذِّکۡرَ صَفۡحًا اَنۡ کُنۡتُمۡ قَوۡمًا مُّسۡرِفِیۡنَ ﴿۵﴾
۶۔ وَکَمۡ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ نَّبِیٍّ فِی الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۶﴾
۷۔ وَمَا یَاۡتِیۡہِمۡ مِّنۡ نَّبِیٍّ اِلَّا کَانُوۡا بِہٖ یَسۡتَہۡزِءُوۡنَ ﴿۷﴾
۸۔ فَاَہۡلَکۡنَاۤ اَشَدَّ مِنۡہُمۡ بَطۡشًا وَّمَضٰی مَثَلُ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۸﴾

ترجمہ

خداوند رحمان اور رحیم کے نام سے۔

۱۔ حٰم۔
۲۔ اس کتاب کی قسم جس کے حقائق آشکار ہیں۔
۳۔ کہ ہم نے اسے فصیح اور عربی قرآن بنایا ہے تاکہ تم اسے سمجھ سکو۔
۴۔ اور وہ اصلی کتاب (لوح محفوظ) میں ہمارے پاس ہے جو کہ بڑی عظمت والا اور حکمت آموز ہے۔

۵۔ آیا اس ذکر (قرآن مجید) کو ہم اس لیے تم سے واپس لے لیں کہ تم اسراف کرنے والی قوم ہو؟

۶۔ اور گزشتہ قوموں میں ہم نے (ہدایت کے لیے) کس قدر انبیاء بھیجے ہیں!

۷۔ لیکن ان کے پاس کوئی بھی پیغمبر نہیں جاتا تھا مگر یہ کہ وہ اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔

۸۔ ہم نے تو ان لوگوں کو بھی ہلاک کر ڈالا، جو طاقت کے لحاظ سے ان سے بہت زیادہ تھے اور پہلے لوگوں کا ذکر گزر چکا ہے۔

تفسیر

گناہ رحمت کو نہیں روک سکتے

سورت کے آغاز میں ہم ایک بار پھر حروف مقطعات (حٰمٓ) کو پاتے ہیں۔ یہ چوتھی سورت ہے، جس کا آغاز "حٰمٓ" سے ہو رہا ہے۔ تین اور سورتوں کا آغاز بھی انہی دو حروف سے ہوا ہے۔ مجموعی طور پر یہ ساتوں سورتیں "حٰمٓ کا خاندان" تشکیل دیتی ہیں۔ سورتیں بالترتیب یہ ہیں۔ ۱۔ مؤمن ۔۲۔ حٰمٓ سجدہ ۔۳۔ شوریٰ ۔۴۔ زخرف ۔۵۔ دخان ۔۶۔ جاثیہ ۔۷۔ احقاف۔

حروف مقطعات کے بارے میں ہم پہلے ہی تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے ہیں (ملاحظہ ہو تفسیر نمونہ کی جلد اوّل سورۂ بقرہ کا آغاز، جلد دوم سورہ آل عمران کی ابتداء، جلد ششم سورہ اعراف کا آغاز اور جلد ۲۰ سورہ حٰمٓ سجدہ کی ابتداء)۔

اسی سلسلے کی دوسری آیت میں قرآن مجید کی قسم کھاتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے: قسم ہے اس آشکار کتاب کی (والکتاب المبین)۔

اس کتاب کی قسم جس کے حقائق آشکار، مفہوم واضح، اس کی سچائی کے دلائل نمایاں اور اس کی ہدایت کی راہیں واضح اور روشن ہیں۔

ہم نے اسے ایک عربی قرآن قرار دیا ہے تاکہ تم اسے سمجھ سکو۔ (انا جعلناہ قرآنا عربیا لعلکم

تعقلون)۔[1]

قرآن کا عربی ہونا یا تو اس لحاظ سے ہے کہ وہ عربی زبان میں نازل ہوا ہے جو حقائق بیان کرنے کے لیے دُنیا کی وسیع اور جامع ترین زبانوں میں سے ہے اور باریک سے باریک مطالب نہایت ہی ظرافت اور لطافت کے ساتھ بیان کرتی ہے۔

یا "عربی" بمعنی "فصاحت" کے ہے (کیونکہ لفظ "عربی" کا ایک معنی "فصیح" بھی ہے)۔ اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہم نے اس قرآن کو نہایت ہی فصاحت کے انداز میں نازل کیا ہے تاکہ جملات اور کلمات کے ذریعے اچھے سے اچھے حقائق کو ظاہر کرے اور سب لوگ اسے بخوبی سمجھ سکیں۔

یہاں پر ایک دلچسپ بات اور بھی ہے اور وہ یہ کہ قسم اور جواب قسم دونوں ایک چیز ہیں، قرآن کی قسم اُٹھائی جارہی ہے کہ یہ کتاب عربی قرار دی جاچکی ہے، تاکہ سب لوگ اس کے مطالب سمجھ سکیں، اور یہ بات شاید اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن سے بڑھ کر اور کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی قسم اٹھائی جاسکے۔ اگر قرآن سے بڑھ کر کوئی اور چیز ہوسکتی ہے تو وہ صرف قرآن پاک ہی ہے۔ کیونکہ یہ خدا کا کلام ہے اور یہ کلام الٰہی اسی کی ذات اقدس کا مظہر ہے۔

"لعل" (شاید، ہوسکتا ہے وغیرہ) کی تعبیر اس لیے نہیں ہے کہ خداوندِ عالم کو قرآن مجید کی تاثیر میں کسی قسم کا شک ہے، یا امید و آزادی کی آرزو کی کوئی صورت ہے کہ جس تک پہنچنے کے لیے کسی قسم کی مشکل کا سامنا ہوتا ہے۔ ایسی بات نہیں ہے، بلکہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آیاتِ قرآنی سُننے والوں کی فکری اور اخلاقی سطح مختلف ہوتی ہے۔ لہٰذا قرآن کی تاثیر بھی ان کی اسی سطح کے مطابق ہوتی ہے کہ جس طرف "لعل" کے ساتھ اجمالی اشارہ کیا گیا ہے (اس بات کی مزید تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ جلد سوم سورۂ آلِ عمران کی آیت نمبر ۲۰۰ کی تفسیر کی طرف رجوع فرمائیں)۔

پھر اس آسمانی کتاب کی تین اور صفات کو بیان فرماتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اور وہ اصل کتاب لوحِ محفوظ میں ہمارے پاس ہے جو بلند مرتبہ اور حکمت آموز ہے (وانہ فی ام الکتاب لدینا لعلی حکیم)۔

پہلی صفت میں تو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن مجید "ام الکتاب" میں پروردگارِ عالم کے پاس ثبت اور محفوظ ہے، جیسا کہ سورۂ "بروج" کی آیات ۲۱، ۲۲ میں بھی ہے۔

"بل ھو قرآن مجید فی لوح محفوظ"۔

"وہ قرآن مجید ہے جو لوحِ محفوظ میں ہے"

اب دیکھنا یہ ہے کہ "اُم الکتاب" یا "لوحِ محفوظ" سے کیا مراد ہے؟

لغت عرب میں "اُمّ" کا لفظ ہر چیز کی اصل، بنیاد اور اساس کے معنی میں آتا ہے۔ اگر اہل عرب ماں کو "اُم" کہتے ہیں تو اس لیے کہ وہ خاندان کی بُنیاد اور اولاد کے لیے جائے پناہ ہوتی ہے۔ اسی لیے "اُمّ الکتاب" کا معنی ایسی کتاب ہے جو تمام آسمانی کتابوں کی اصل و اساس ہے اور وہ وہی لوح ہے جو خدا کے نزدیک ہر قسم کے

---

[1] "والکتاب المبین" میں "واؤ" قسم کے لیے ہے اور "انا جعلناہ قرآنا عربیا" کا جملہ جواب قسم ہے۔

تغیر، تبدل اور تحریف سے محفوظ ہے اور ایسی کتاب "پروردگار عالم کا علم" ہے، جو خود اُسی کے پاس ہے اور تمام کائنات کے حقائق کائنات میں ماضی اور حال و مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والے حالات اور تمام آسمانی کتابیں اس میں درج ہیں اور اس حد تک خدا کے علاوہ کسی کو رسائی حاصل نہیں ہے مگر جنہیں خدا خود آگاہ کرے۔

یہ قرآن مجید کی بہت بڑی عظمت ہے جس کا سرچشمہ حق تعالیٰ کا بے پایاں علم ہے، جس کی اصل و اساس خود خدا کے پاس ہے۔

اسی دلیل کی بنا پر قرآن مجید کی دوسری صفت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ بلند مرتبہ کتاب ہے۔ (العلی)۔

تیسری صفت کے بارے میں فرمایا گیا ہے: حکمت آموز، مستحکم، پختہ اور حساب شدہ ہے (حکیم)۔

اور جس چیز کا براہ راست تعلق خدا کے لامتناہی علم سے ہو، اسے ایسی اوصاف کا حامل ہونا ہی چاہیے۔

بعض مفسرین قرآن مجید کو اس بنا پر بلند مرتبہ کتاب سمجھتے ہیں کہ وہ دوسری تمام آسمانی کتابوں پر فوقیت رکھتی ہے اور ان پر سبقت حاصل کر گئی ہے اور ان سب کو منسوخ کر کے اعجاز کے بلند ترین مقام پر فائز ہو چکی ہے۔

کچھ اور مفسرین کے نزدیک یہ ہے کہ یہ اس لیے بلند مقام کی حامل کتاب ہے کہ اس کے مندرجات ایسے حقائق پر مشتمل ہیں جو انسانی افکار کی رسائی سے بالا ہیں (ان حقائق کے علاوہ جن کا ظاہری مفہوم ہر شخص سمجھ لیتا ہے)

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ لفظ "حکیم" عام طور پر انسان کی یا شخص کی صفت کے لیے استعمال ہوتا ہے، کتاب کے لیے نہیں، لیکن چونکہ یہ آسمانی کتاب بذات خود ایک عظیم معلم اور حکمت آموز کی حیثیت رکھتی ہے لہٰذا اس کے لیے یہ تعبیر نہایت ہی موزوں اور بجا ہے۔

البتہ "حکیم" کا معنی "مستحکم" اور ہر قسم کے خلل سے محفوظ بھی ذکر ہوا ہے اور یہ تمام مفہوم اور مطالب مذکورہ لفظ میں موجود ہیں اور قرآن پر صحیح معنوں میں صادق آتے ہیں، کیونکہ قرآن ان معانی کے لحاظ سے حکیم ہے۔

بعد کی آیت میں قرآن سے منہ موڑنے اور اس کا انکار کرنے والوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: آیا ہم قرآن کو جو کہ تمہاری بیداری اور توجہ کا سبب ہے تم سے اس لیے واپس لے لیں کہ تم اسراف اور تجاوز کرنے والے لوگ ہو (افنضرب عنکم الذکر صفحًا ان کنتم قومًا مسرفین)۔

یہ ٹھیک ہے کہ تم نے حق کی مخالفت اور دشمنی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور مخالفت کو افراط و اسراف کی حد تک پہنچا چکے ہو، لیکن خدا کا لطف و کرم اور رحمت و مہربانی بھی اس قدر وسیع ہے کہ وہ تمہاری ایسی باتوں کو اپنی رحمت کے آگے سدراہ نہیں سمجھتا اور اس بیدار کرنے والی آسمانی کتاب کو مسلسل تمہارے لیے بھیجتا رہتا ہے تاکہ جن دلوں میں تھوڑی سی آمادگی پائی جاتی ہے ان میں حرکت پیدا ہو اور وہ سیدھی راہ پر آجائیں اور پروردگار عالم کی عمومی رحمت اور رحمانیت کا یہی معنی ہے جو دوست اور دشمن دونوں کے لیے ہے۔

"افنضرب عنکم" کا معنی "افنصرف عنکم" (آیا ہم تم سے منصرف کر دیں یا پھیر دیں) کیا گیا ہے۔ کیونکہ جب کوئی سوار اپنی سواری کو ایک راستے سے دوسرے راستے کی طرف پھیرنا چاہتا ہے تو اسے چابک مارتا ہے، لہٰذا اس جیسے مقام پر "ضرب" کا لفظ "صرف" (پھیرنے) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔[1]

---

[1] تفسیر مجمع البیان انہی آیات کے ذیل میں۔

"صفح" دراصل "جانب" اور کسی طرف (SIDE) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور "عرض" یعنی چوڑائی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن اس آیت میں پہلے پہلے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی کیا ہم اس قرآن کو جو تذکر کا موجب ہے، تمہاری طرف سے دوسری جانب پھیر دیں؟

"مسرف" "اسراف" کے مادہ سے ہے، جس کا معنی حد سے بڑھ جانا ہے اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مشرکین اور رسول اللہ کے دشمن اپنی عداوت اور مخالفت میں اس حد تک بڑھ گئے ہیں کہ وہ مخالفت اور عناد کی کسی حد کو نہیں پہچانتے۔

پھر مذکورہ فرمان کے لیے شاہد کے طور پر بھی اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تسلی اور تشفی کے لیے بھی اور ساتھ ہی ہٹ دھرم منکرین کو تنبیہ اور تہدید کے طور پر بھی مختصر لیکن محکم انداز میں فرمایا گیا ہے:

ہم نے گزشتہ قوموں میں ہدایت کی خاطر بہت سارے انبیاء کو بھیجا ہے (وکم ارسلنا من نبی فی الاولین)۔

لیکن ان کے پاس کوئی پیغمبر نہیں آتا تھا مگر یہ کہ اس کا مذاق اڑاتے تھے (وما یأتیھم من نبی الا کانوا بہ یستھزؤون)۔

اس قسم کے مخالفین، مذاق اور تمسخر لطفِ الٰہی سے ہرگز مانع نہ ہوئے یہ وہ فیض الٰہی ہے جو ازل سے ابد تک جاری و ساری ہے اور ایسی سخاوت ہے جو تمام بندگانِ خدا کے لیے یکساں ہے، بلکہ اصولی طور پر خدا نے انھیں خلق ہی رحمت کے لیے فرمایا ہے (ولذالک خلقھم) (ہود۔ ۱۱۹)

اسی لیے تمہاری روگردانی اور ہٹ دھرمی کبھی اس کے لطف و کرم کی سدِ راہ نہیں بن سکتی اور رسولِ پاک اور مومنین کو بھی مایوس و پریشان نہیں ہونا چاہیئے، کیونکہ حق سے روگردانی اور خواہشات نفسانی کی پیروی آج کی پیداوار نہیں، بلکہ زمانہ قدیم سے چلی آرہی ہے۔

البتہ یہ بات بھی ان (کفار) کو نہیں بھولنی چاہیئے کہ خداوندِ کریم کا بے حد و حساب لطف و کرم اس کی سزا سے مانع بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ مجرم کو سزا بھی اس کی حکمت کا تقاضا ہوتی ہے۔ اسی لیے بعد کی آیت میں فرمایا گیا: ہم نے تو ان لوگوں کو بھی ہلاک اور نیست و نابود کر دیا ہے جو ان سے زیادہ طاقت ور تھے۔ (فاھلکنا اشد منھم بطشاً)۔

اور گزشتہ لوگوں کی داستان بھی گزر چکی ہے۔ (ومضیٰ مثل الاولین)۔

جو آیات ہم نے اس سے پہلے آپ پر نازل فرمائی ہیں ان میں ایسی ہی سرکش قوموں کی سرکشی اور نافرمانی کے بہت سے نمونے پیش کیے گئے ہیں اور وحی کے ذریعے ان کے تفصیلی حالات آپ تک بے کم و کاست پہنچ چکے ہیں۔ ان اقوام میں کچھ ایسی قومیں بھی تھیں جو مشرکین عرب سے کئی گنا زیادہ طاقتور تھیں۔ ان کے پاس ذرائع اور وسائل کی فراوانی تھی۔ افرادی قوت کی کوئی کمی نہیں تھی فوج کے لحاظ سے بھی وہ بہت قوی تھیں، استعداد بھی ان کی زیادہ تھی۔ جیسے فرعون اور اس کی قوم اور طاقت کے لحاظ سے عاد و ثمود کی قومیں، لیکن اب تم جاؤ اور ان کے شہروں کو کھنڈرات کی صورت میں جا کر دیکھو، ان کی سرگزشت تاریخ کی کتابوں میں پڑھو اور ان سب سے واضح کیفیت قرآن میں موجود ہے اس کا مطالعہ کرو اور اس میں غور و خوض سے کام لو۔ پھر تمہیں معلوم ہوگا کہ ہٹ دھرم اور سرکش افراد اللہ کے دردناک عذاب سے ہرگز نہیں بچ سکتے۔

"بطش" (بروزن "فرش") کا معنی جیسا کہ راغب نے "مفردات" میں تحریر کیا ہے "کسی چیز کو طاقت کے ساتھ پکڑنا ہے"

اور یہاں پر "اشد" کا کلمہ بھی ساتھ استعمال ہوا ہے، جس سے طاقت میں شدت بتانا مقصود ہے۔

"منھم" میں موجود ضمیر مشرکین عرب کی طرف لوٹ رہی ہے، جو اس سے پہلی آیات میں مخاطب تھے۔ لیکن یہاں پر ضمیر کو غائب اس لیے لایا گیا ہے کہ وہ خدا کے مسلسل خطاب کے اہل نہیں ہیں۔

بعض بزرگ مفسرین "مضیٰ مثل الاولین" (گذشتہ اقوام کا انجام پہلے گزر چکا ہے) کے جملے کو اس سے پہلی سورت شوریٰ کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو اس سے پہلے گزر چکی ہے اور اس میں اس قسم کے لوگوں کا کچھ ذکر موجود ہے، لیکن اس قسم کی محدودیت پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ خاص کر جب کہ سورہ شوریٰ میں گزشتہ اقوام کی سرگزشت کی جانب بہت ہی کم اشارہ ہوا ہے۔ اور دوسری قرآنی سورتوں میں ان کے تفصیلی حالات درج ہیں۔

بہرحال یہ آیت سورۂ قصص کی ۷۸ ویں آیت سے ملتی جلتی ہے، جس میں فرمایا گیا ہے:

"اولم یعلم ان اللہ قد اھلک من قبلہ من القرون من ھو اشد منہ قوۃ واکثر جمعا"

"آیا قارون نہیں جانتا تھا کہ خدا نے اس سے پہلے کی کئی قوموں کو نیست و نابود کر دیا، جو اس سے طاقت میں بھی زیادہ تھیں اور مال و دولت میں بھی؟"

یا پھر سورۂ مومن کی آیت ۲۱ سے ملتی جلتی ہے، جس میں مشرکین عرب کو خبردار کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

"اولم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبۃ الذین کانوا من قبلھم کانوا ھم اشد منھم قوۃ واثارا فی الارض فاخذھم اللہ بذنوبھم وما کان لھم من اللہ من واق"

"آیا انہوں نے زمین کی سیر نہیں کی تاکہ وہ دیکھتے کہ ان سے پہلے لوگوں کا انجام کیا ہوا ہے؟ وہ ان سے طاقت میں بھی زیادہ تھے اور زمین پر اپنے آثار میں بھی۔ لیکن خدا نے انہیں ان کے گناہوں کی وجہ سے اپنی گرفت میں لے لیا اور انہیں عذاب الٰہی سے بچانے والا کوئی نہ تھا۔"

۹- وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ۙ

۱۰- الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّجَعَلَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۙ

۱۱- وَالَّذِىْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ ۚ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ۚ كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ۝

۱۲- وَالَّذِىْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ ۙ

۱۳- لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِىْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ۙ

۱۴- وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ۝

ترجمہ

۹- اور اگر آپ ان سے سوال کریں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے، تو وہ یقیناً یہی کہیں کہ خداوند قادر و علیم ہی نے انہیں پیدا کیا ہے۔

۱۰۔ وہی جس نے زمین کو گہوارہ اور تمھارے سکون کی جگہ بنایا ہے اور تمھارے لیے زمین میں رستے مقرر کیے ہیں تاکہ تم ہدایت پا جاؤ (اور مقصد تک پہنچ جاؤ)۔

۱۱۔ وہی خدا جس نے آسمان سے مقرر مقدار میں پانی نازل کیا اور اس کے ذریعے ہم نے مُردہ زمینوں کو زندگی عطا کی اور اسی طرح تم قیامت میں زندہ ہو گے۔

۱۲۔ وہی خدا تو ہے، جس نے ہر چیز کو جوڑے کی صُورت میں پیدا کیا ہے اور تمھارے لیے کشتیوں اور جانوروں میں سے سواریاں بنائی ہیں، جن پر تم سوار ہوتے ہو۔

۱۳۔ تاکہ تم ان کی پشت پر بخوبی بیٹھ سکو، پھر جب تم ان پر سوار ہو جاؤ تو اپنے رب کی نعمت کو یاد کرو اور کہو کہ پاک و منزّہ ہے وہ ذات جس نے اسے ہمارے لیے مسخر کر دیا، ورنہ ہم میں تو اس کی طاقت نہیں تھی۔

۱۴۔ اور ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ جائیں گے۔

تفسیر

توحید کے کچھ دلائل

یہاں سے توحید اور شرک کی گفتگو شروع ہوتی ہے اور سب سے پہلے انسانی فطرت اور سرشت کو پیشِ نظر رکھ کر توحید پر اثبات کیا جاتا ہے اور کائنات پر حکم فرما نظام کے دلائل کو ذکر کرنے اور پروردگار عالم کی پانچ نعمتوں کو بیان کرنے کے بعد انسانوں کی شُکر گزاری کی حس کو بیدار کیا گیا ہے اور پھر بُت پرستی اور دوسرے مُشرکانہ عقائد اور خرافاتی نظریات کو باطل کیا گیا ہے۔

آیت کے پہلے حصّے میں فرمایا گیا ہے: اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو یقیناً وہ جواب میں یہی کہیں گے کہ انھیں عزیز و حکیم خدا نے پیدا کیا ہے۔ (ولئن سألتهم من خلق السماوات والارض ليقولن خلقهن العزيز العليم)۔

اس قسم کی تعبیر کہ جو قرآن مجید کی چار آیات میں مختصر سے فرق کے ساتھ بیان ہوئی ہے (سورۂ عنکبوت آیت ۶۱، سورۂ لقمان آیت ۲۵، سورہ زمر آیت ۳۸ اور سورۂ زخرف کی اسی آیت میں)[1] جہاں خدا شناسی کی فطری دلیل اور انسانی فطرت میں نورِ الٰہی کی تجلّی کی غماز ہے، وہاں پر اس بات کی دلیل بھی ہے کہ مشرکین اس بات کے معترف بھی تھے کہ آسمانوں اور زمین کا خالق خدا ہے اور سوائے شاذ و نادر مواقع کے اپنے معبودوں کے لیے خالقیت کے قائل نہیں تھے۔

تیسری طرف ان کا یہ اعتراف بتوں کی عبودیت کے باطل ہونے کی بنیاد ہے، کیونکہ عبادت کے لائق وہی ہے جو کائنات کا خالق اور مدبر ہے، نہ کہ وہ چیزیں جن کا اس سلسلے میں کوئی حصّہ ہی نہیں، بنا بریں ان کا اللہ تعالیٰ کی خالقیت کا اعتراف خود اُن کے فاسد اور غلط مذہب کے خلاف دندان شکن دلیل ہے۔

"عزیز و حکیم" کی تعبیر جو کہ پروردگارِ عالم کی مطلق قدرت، علم اور حکمت کو ظاہر کرتی ہے، اگرچہ ایک قرآنی تعبیر ہے، لیکن یہ کوئی ایسا مطلب نہیں ہے کہ مشرکین جس کا انکار کر سکتے ہوں۔ کیونکہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق کی خدا کی طرف نسبت کے اعتراف کا لازمہ ہی اس کے عزیز و حکیم ہونے کا اعتراف کرنا ہے۔ وہ تو بتوں کے علم و قدرت کے قائل تھے، چہ جائیکہ خدا کے کہ جس تک رسائی کے لیے بتوں کو اپنا وسیلہ سمجھتے تھے۔

پھر خدا کی ان پانچ عظیم نعمتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن میں سے ہر ایک نظامِ آفرینش کا ایک نمونہ اور خدائی آیات میں سے ایک آیت ہے۔

سب سے پہلے زمین کا ذکر ہے فرمایا گیا ہے: وہی خدا تو ہے، جس نے تمہارے لیے زمین کو گہوارہ اور سکون کا مقام بنایا ہے (الذی جعل لکم الارض مھدًا)۔

"مھد" اور "مہاد" دو ایسے کلمے ہیں جو اس جگہ کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں جو بیٹھنے، سونے اور آرام کرنے کے لیے بنائی جائے۔ اصل میں ایسی جگہ کو کہا جاتا ہے جہاں پر بچے کو سلایا جاتا ہے خواہ گہوارہ ہو یا کوئی اور چیز۔

یقیناً خداوندِ عالم نے زمین کو انسان کے لیے گہوارہ قرار دیا ہے حالانکہ اس کی کئی قسم کی حرکتیں ہیں۔ کشش ثقل کے قانون اور ہوا کے ہر طرف دباؤ اور دوسرے کئی مختلف عوامل کے باوجود اس قدر ساکن و ساکت ہے کہ اس پر رہنے والے ذرہ بھر بھی اضطراب کا احساس نہیں کرتے اور واضح سی بات ہے کہ آرام و سکون اور امن و امان ہی دوسری نعمتوں سے سے استفادہ کی اصل بنیاد ہے۔ یہ بات بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ اگر یہ مختلف عوامل ایک دوسرے کے ساتھ نہ ملتے تو یہ سکون بھی کبھی وجود میں نہ آتا۔

دوسری نعمت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس نے زمین میں تمہارے لیے راہیں مقرر کی ہیں تاکہ تم ہدایت

---

[1] قرآن مجید کے دو اور مقامات پر بھی ان کا "خدا کی خالقیت" کا اعتراف نقل ہوا ہے۔ البتہ ایک مقام پر آسمان سے بارش کے نزول کے بارے میں۔ (عنکبوت/۶۳) اور دوسرے مقام پر ان کی اپنی ذات کے بارے میں خدا کی خالقیت کے بارے میں۔ (زخرف/۸۷)

پاجاؤ اور منزل مقصود تک پہنچ جاؤ (وجعل لکم فیھا سبلاً لعلکم تھتدون)۔

یہ نعمت کہ جسے قرآن مجید میں بارہا بیان کیا گیا ہے (ملاحظہ ہو سورۂ طٰہٰ ۵۳، انبیاء ۳۱ اور نحل ۱۵) ان نعمتوں میں سے ہے جس سے بہت سے لوگ غافل ہیں۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ تقریباً تمام خشکی کو بہت سے نشیب و فراز نے اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے، اور چھوٹے بڑے پہاڑوں اور مختلف ٹیلوں نے اسے ڈھانپ رکھا ہے، پھر دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ دُنیا کے بڑے بڑے پہاڑی سلسلوں کے درمیان عام طور پر کٹاؤ موجود ہیں جن کے درمیان میں سے انسان اپنی راہیں بنا سکتا ہے اور بہت کم اتفاق ہوگا کہ یہ پہاڑ مکمل طور پر زمین کے مختلف حصوں کے درمیان جدائی کا سبب بنے ہوئے ہوں۔

یہ نظام آفرینش کے اسرار میں سے ایک راز اور بندوں پر خدا کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔

اس کے علاوہ زمین کے بہت سے حصّے دریائی راستوں کے ذریعے ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور یہ بات بھی آیت کے عمومی مفہوم میں شامل ہے۔[1]

اس تمام گفتگو سے یہ نتیجہ نکلا کہ "لعلکم تھتدون" سے مراد منزلِ مقصود تک ہدایت اور زمین کے مختلف علاقوں کو تلاش کرنا ہے۔ ہر چند کہ مفسرین نے اس سے امرِ توحید اور خدا شناسی کے سلسلے میں ہدایت مراد لی ہے۔ (البتہ دونوں معانی کو جمع کرنے میں کوئی مانع موجود نہیں)۔

تیسری نعمت بارش کا نزول ہے کہ جو مُردہ زمینوں کو زندہ کرتی ہے۔ بعد کی آیت میں اس بات کو یوں بیان کیا جارہا ہے وہی خدا تو ہے جس نے مقررہ مقدار میں آسمان سے پانی نازل کیا ہے (والذی نزل من السماء ماء بقدر)۔

"اور اس کے ذریعے ہم نے مُردہ زمین کو زندگی عطا کی۔ (فانشرنا بہ بلدۃ میتاً)۔

جس طرح مردہ زمینیں بارش کے پانی کی وجہ سے زندہ ہو جاتی ہیں تم بھی مرنے کے بعد اسی طرح زندہ ہو کر قبروں سے باہر آجاؤ گے: (کذالک تخرجون)۔

"قدر" کا لفظ اس خاص نظام کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے جو نزول باران پر حکم فرما ہے۔ بارش اسی حد تک ہوتی ہے جو مفید اور ثمر بخش ہو نہ کہ مضر اور نقصان دہ۔

یہ ٹھیک ہے کہ بعض اوقات سیلاب بھی آتے ہیں اور زمینوں کو ویران کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ استثنائی صورتِ حال ہوتی ہے جو ایک قسم کی سرزنش کی حیثیت رکھتی ہے۔ جہاں تک اکثر و بیشتر بارشوں کا تعلق ہے وہ سُود مند اور مفید ہوا کرتی ہیں۔ اصولی طور پر تمام درختوں، سبزہ زاروں، پھولوں پُر ثمر باغوں کی رونق بارش کے مقدار کے مطابق نازل ہونے کی برکت سے ہی ہے۔ اگر بارش کا کوئی نظم و نظام نہ ہوتا تو یہ تمام برکتیں بھی حاصل نہ ہو پاتیں۔

آیت کے دوسرے حصّے میں لفظ "انشرنا" آیا ہے جو "نشور" کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کا معنی پھیلنا اور وسعت

---

[1] لفظ "سبل" "سبیل" کی جمع ہے، جس کا خشکی کے راستوں پر بھی اطلاق ہوتا ہے اور تری کے راستوں پر بھی۔ جیسا کہ دُعائے جوشن کبیر میں ہے۔

"یامن فی البر والبحر سبیلہ۔"

اختیار کرنا ہے۔ اس سے نباتات کی دُنیا کا روزِ محشر نگاہوں کے سامنے مجسم ہو جاتا ہے، خشک زمینیں نباتات کے بیجوں کو اپنے دِل میں دیے ہی جگہ دیئے ہوئے ہوتی ہے جس طرح مُردوں کو قبروں نے چھپایا ہوتا ہے اور جونہی "نزولِ باران" کا "صور" پھونکا جاتا ہے تو وہ حرکت میں آجاتے ہیں اور مردوں کی طرح نباتات اور سبزہ، زمین کے اندر سے اپنا سر باہر نکالتے ہیں اور شادابی اور تروتازگی کا ایک محشر برپا ہو جاتا ہے، جو بذاتِ خود انسانوں کے محشر کا ایک نمونہ ہے جس کی طرف اسی آیت کے آخر میں اور متعدد دوسری آیات میں اشارہ ہوا ہے۔

بارش کے نازل ہونے اور نباتات کی زندگی کے تذکرے کے بعد چوتھے مرحلے میں مختلف حیوانات کی تخلیق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہی خدا ہے، جس نے سب کو جوڑوں کی صورت میں پیدا کیا ہے (والذی خلق الازواج کلھا)۔

"ازواج" کے معنی "جوڑے" ہیں اور یہ لفظ مختلف قسم کے جانوروں کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ اس سے پہلے کی آیات میں نباتات کا ذکر آچکا ہے۔ اگرچہ بعض مفسرین نے اسے موجودات کی تمام قسموں کی طرف اشارہ سمجھا ہے خواہ وہ جمادات ہوں یا نباتات، حیوانات ہوں یا انسان۔ کیونکہ قانونِ زوجیت ان سب میں حکم فرما ہے اور ہر ایک کی مخالف جنس موجود ہے۔ آسمان اور زمین، رات اور دن، نور اور ظلمت، تلخ اور شیریں، خشک اور تر، سُورج اور چاند، بہشت اور دوزخ، غرض سوائے خدا کی ذات پاک کے کوئی بھی یگانہ اور یکتا نہیں ہے۔ یہ صرف خدا ہی ہے جس میں دوئی نہیں پائی جاتی۔

لیکن جیسا کہ ہم ابھی بتا چکے ہیں، قرینے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں پر "حیوانات کے جوڑے" مراد ہیں اور ہر ایک جانتا ہے کہ زوجیت کا قانون تمام جانداروں میں حکم فرما ہے اور اگر کچھ شاذ و نادر قسم کے افراد اس سے مستثنیٰ ہوں تو یہ بات قانون کے کلی ہونے سے مانع نہیں ہے۔

بعض مفسرین نے "ازواج" سے مراد حیوانات کی مختلف قسمیں مراد لی ہیں، جیسے پرندے، چوپائے، آبی جانور اور حشرات الارض وغیرہ۔

پانچویں مرحلے پر اس سلسلے کی آخری نعمت کا تذکرہ کرتے ہوئے ان سواریوں کے بارے میں گفتگو فرمائی گئی ہے، جنہیں خداوندِ عالم نے بری اور بحری راہیں طے کرنے کے لیے انسان کے اختیار میں دے دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: اس نے تمہارے لیے کشتیوں اور چوپایوں میں سے سواریاں بنائی ہیں کہ جن پر تم سوار ہوتے ہو (وجعل لکم من الفلک و الانعام ما ترکبون)۔

یہ بنی نوع انسان پر خداوندِ عالم کا ایک بہت بڑا احسان اور اس کی کرم نوازی ہے کہ جو کسی دوسری زندہ مخلوق میں دیکھنے میں نہیں آتی، کیونکہ خداوندِ عالم نے بنی نوع انسان کو ایسی سواریاں عطا کی ہیں۔ جو بری اور بحری راستوں کو طے کرنے میں اس کی معاون و مددگار ہیں۔

جیسا کہ سُورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۷۰ میں ارشاد ہو رہا ہے۔

"ولقد کرمنا بنی آدم وحملناھم فی البر والبحر ورزقناھم من

الطیبات وفضلنا هم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلاً"

" ہم نے بنی آدم کو بزرگی عطا کی اور انھیں بر و بحر میں (سواریوں پر) سوار کیا اور انہیں پاک و پاکیزہ رزق عطا کیا اور اپنی دوسری مخلوق پر برتری عطا کی۔"

حقیقت یہ ہے کہ ان سواریوں کی وجہ سے انسانی سرگرمیوں اور اس کی زندگی کی تگ و دو میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ حتی کہ موجودہ دُور کی تیز رفتار سواریاں جو مختلف چیزوں کے خواص سے استفادہ کر کے تیار کی گئی ہیں اور انسان ان سے بہرہ برداری کر رہا ہے، یہ بھی خداوند عالم کی ایک بہت بڑی کرم نوازی ہے۔ یہ ایسے ذرائع آمد و رفت ہیں جنہوں نے زندگی کے چہرے کو مکمل طور پر تبدیل کر کے رکھ دیا ہے اور ہر چیز کو تیز رفتاری عطا کر دی ہے اور بنی نوع انسان کے لیے طرح طرح کی آسائش مہیا کر دی ہے۔

بعد کی آیت میں اس قسم کی سواریوں کے آخری تخلیقی مقصد کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: تاکہ تم ان سواریوں کی پشت پر بخوبی سوار ہو جاؤ، پھر اپنے پروردگار کی نعمت کو یاد کرو اور کہو: پاک و پاکیزہ ہے وہ ذات کہ جس نے ان کو ہمارے لیے مسخر کر دیا ورنہ یہ ہمارے بس میں تو نہ تھیں۔ (لتستووا علی ظهوره ثم تذکروا نعمة ربکم اذا استویتم علیه وتقولوا سبحان الذی سخر لنا هذا وما کنا له مقرنین)۔

"لتستووا علی ظهوره" کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا نے ان سواریوں کو اس طرح سے پیدا کیا ہے کہ تم ان پر سوار ہو کر آرام اور سکون کے ساتھ منزل مقصود تک پہنچ جاؤ۔[1]

اس آیت میں بری اور بحری سواریوں کی تخلیق کے دو بنیادی مقاصد بیان ہوئے ہیں ایک تو سوار ہوتے وقت خدا کی نعمتوں کی یاد آوری اور دوسرے اس خدا کی ستائش جس نے ان کو انسان کے تابع فرمان بنایا ہے۔ کشتیوں اور بحری جہازوں کو اس طرح سے بنایا گیا ہے کہ وہ سمندر کے سینوں کو چیر کر منزل مقصود تک پہنچاتے ہیں اور چوپایوں کو انسان کے تابع فرمان بنا دیا ہے۔

"مقرنین" "اقران" کے مادہ سے ہے، جس کا معنی ہے "کسی چیز پر قابو پانا" اور "قدرت حاصل کرنا"۔ بعض صاحبان لغت نے یہ بھی کہا ہے کہ "اقران" کا معنی کسی چیز کو "ضبط" کرنا اور اس کی حفاظت کرنا ہے جو دراصل کسی چیز کے "قرین" (ساتھی) ہونے کے معنی میں پنہاں ہے، جس کا لازمہ اس چیز کی حفاظت اور اپنے قابو میں رکھنا ہوتا ہے۔[2]

بنا بریں "وما کنا له مقرنین" کا مفہوم یہ ہوگا، کہ اگر خدا کا لطف و کرم نہ ہوتا تو ہم میں ان سواریوں کو قابو

---

[1] "علی ظهوره" میں موجود ضمیر "ما" موصولہ کی طرف لوٹ رہی ہے جو "ما تو کبون" میں ہے اور کشتیوں اور چوپایوں دونوں قسموں کے لیے ہے اور ضمیر ظاہری لفظ کی وجہ سے مفرد ہے۔

[2] کتاب "لسان العرب" میں آیا ہے کہ "اقرن له" اور "اقرن علیه" کا معنی ہے۔ "اطاق وقوی علیه واعتلا" یعنی اس پر قابو پایا اور سوار ہوا۔ قرآن پاک میں ہے "وما کنا له مقرنین" یعنی "مطیقین"۔

میں رکھنے کی طاقت نہیں تھی۔ مخالف ہوائیں ہمیشہ کشتیوں اور بحری جہازوں کو اُلٹ کر رکھ دیتیں اور ہم ہرگز ساحل نجات تک نہ پہنچ سکتے۔ یہ طاقت ور سرکش جانور کہ جن کی طاقت انسان سے کئی گناہ زیادہ ہوتی ہے، اگر ان میں فرمانبرداری کی رُوح حکم فرما نہ ہوتی تو انسان ان کے نزدیک بھی نہ پھٹک سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی کوئی جانور طیش میں آجاتا ہے اور فرمانبرداری کو پس پشت ڈال دیتا ہے تو وہ ایک ایسے خطرناک جانور میں تبدیل ہوجاتا ہے، جس کا مقابلہ کئی انسان مل کر بھی نہیں کرسکتے، جب کہ عام طور پر ممکن ہے، بیسیوں بلکہ سینکڑوں جانوروں کو ایک رسی میں باندھ کر ان کی مُہار اگر ایک بچے کے ہاتھ میں بھی دے دی جائے تو وہ انھیں خاطر خواہ مقامات پر لے جائے۔

گویا خدا تعالیٰ چوپایوں کے ان استثنائی حالات کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے معمول کے حالات کو بھی واضح کرنا چاہتا ہے۔

اسی آیت کے آخری حصے میں سوار ہوتے وقت سچے مؤمنین کی گفتگو کا ذکر ہے، اور اسی پر یہ آیت مکمل ہوجاتی ہے وہ سواری پر سوار ہوتے وقت کہتے ہیں: اور ہم ہر صورت میں اپنے پروردگار کی طرف لوٹ جانے والے ہیں۔ (وانّا الی ربنا لمنقلبون)۔

یہ جملہ گذشتہ آیات میں توحید کے بارے میں گفتگو کے بعد مسئلہ معاد کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ ہمیشہ خالق اور مبدا کی طرف توجہ انسان کو معاد کی طرف متوجہ کرتی ہے۔

نیز اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ مبادا تم ان سواریوں پر سوار ہوتے وقت اور ان پر قابو پانے کے بعد مغرور اور دنیا دی چکا چوند میں مگن ہوجاؤ، بلکہ تمھیں ہر حالت میں آخرت کی فکر کرنی چاہیئے، کیونکہ ایسے مواقع پر خاص طور پر انسان مغرور اور متکبر ہوجاتا ہے اور اپنی سواریوں کو فوقیت اور تکبر کا ذریعہ قرار دینے والے افراد دُنیا میں کم نہیں ہیں۔

پھر تیسری بات یہ ہے کہ سواریوں پر سوار ہوکر ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف منتقلی ہمیں اس دُنیا سے دوسرے جہان کی طرف عظیم انتقال کی جانب متوجہ کرتی ہے اور انجام کار ہمیں خدا کی جانب منتقل ہوکر جانا ہی ہے۔

نعمتوں کے موقع پر خدا کی یاد

قرآنی آیات میں قابل توجہ نکات میں سے ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ مؤمنین کو کچھ دُعائیں بتائی گئی ہیں کہ جب وہ خدا کی نعمتوں سے استفادہ کریں تو ان دُعاؤں کو پڑھا کریں۔ یہ ایسی دُعائیں ہیں جو اپنے تعمیری مطالب کی وجہ سے انسانی قلب کی رُوح کی بالیدگی کا سبب بنتی ہیں اور غرور و غفلت کے آثار مٹا دیتی ہیں۔

جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کو حکم ہوتا ہے۔

"فاذا استویت انت ومن معک علی الفلک فقل الحمد للہ الذی نجانا من القوم الظالمین"۔

" جب تم اور تمھارے ساتھی کشتی پر سوار ہو جاؤ تو کہو کہ اس خدا کی حمد ہے، جس نے ہمیں ظالم لوگوں سے نجات بخشی۔" (مومنون - ۲۸)

نیز حضرت نوح علیہ السلام ہی کو یہ حکم ملتا ہے کہ کسی بابرکت منزل پر اترنے کے لیے یہ کہیں:

" رب انزلنی منزلاً مبارکاً وانت خیر المنزلین "

"پروردگارا! مجھے بابرکت منزل پر اُتار اور تو بہترین اتارنے والا ہے۔ (مومنون - ۲۹)

زیر تفسیر آیات میں سواری پر بیٹھ جانے کے وقت ہم کو پروردگار کی نعمتوں کی طرف توجہ اور اس کی تسبیح کا حکم دیا گیا ہے۔

جب انسان کی یہ عادت ہو جائے کہ کسی بھی نعمت سے بہرہ مندی کے وقت منعم حقیقی اور نعمت کے مبداء کو یاد کرے تو نہ وہ غفلت کی تاریکی میں ڈوبے گا اور نہ ہی غرور کی لغزش سے دوچار ہو گا۔ بلکہ مادی نعمتیں اس کے لیے پروردگار عالم کی طرف پل کی حیثیت اختیار کریں گے۔

حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات میں ہے کہ آپ جب اپنا پاؤں رکاب میں رکھتے تھے تو "بسم اللہ" کہتے تھے اور جب سواری پر اچھی طرح بیٹھ جاتے تو فرماتے:

" الحمد للہ علیٰ کل حال، سبحان الذی سخر لنا ھذا وما کنا لہ مقرنین وانا الیٰ ربنا لمنقلبون۔ [1]

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے سامنے ایک شخص نے سواری پر سوار ہوتے وقت کہا: سبحان الذی سخر لنا ھذا؛ تو امامؑ نے فرمایا: تمھیں ایسا کہنے کا حکم نہیں ملا، بلکہ یوں کہا کرو:

" الحمد للہ الذی ھدانا للاسلام، الحمد للہ الذی من علینا بمحمد والحمد للہ الذی جعلنا من خیر امۃ اخرجت للناس"

پھر کہو: سبحان الذی سخر لنا ھذا ..... " [2]

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہمیں صرف " سبحان الذی سخر لنا ھذا ..... کہنے کا حکم نہیں دیا گیا۔ بلکہ اس سے پہلے خداوند عالم کی عظیم نعمتوں کو یاد کرنے کا حکم ہے، جو اسلام کی طرف ہدایت کی نعمت، رسول اللہ کی رسالت کی نعمت ہیں۔ پھر اس سواری کو قابو میں لانے پر خدا کی تسبیح کا حکم ہے۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص سواری پر بیٹھتے وقت " سبحان الذی سخر لنا ھذا ..... الیٰ ربنا لمنقلبون " کہے تو وہ ہر قسم کی مصیبتوں سے محفوظ رہے گا۔

---

[1] تفسیر فخر الرازی جلد ۲۷، صفحہ ۱۹۹۔

[2] تفسیر فخر الرازی جلد ۲۷، صفحہ ۱۹۹۔

یہ بات اصولِ کافی کی ایک روایت میں آئمہ معصومین علیہم السلام سے بھی منقول ہے۔[1]

اسلامی تعلیمات اور مغرور ہوس پرست لوگوں کے رویے کے درمیان کتنا فرق ہے، جو اپنی سواریوں کو خودنمائی اور فخر و غرور کا ذریعہ سمجھتے ہیں بلکہ کبھی انھیں اپنے مختلف گناہوں کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ جیسا کہ "زمخشری" نے اپنی تفسیر "کشاف" میں ایک بادشاہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اپنی مخصوص سواری پر بیٹھ کر ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف جا رہا تھا۔

شہروں کا درمیانی فاصلہ ایک ماہ کا سفر تھا، اس نے اس سفر میں اس قدر شراب پی کہ اسے سفر کا پتہ ہی نہیں چلا، اور تب ہوش آئی، جب وہ منزل مقصود تک پہنچ چکا تھا۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ صـ ۵۹۳۔

۱۵۔ وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ ط ع
۱۶۔ اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّاَصْفٰىكُمْ بِالْبَنِيْنَ ۝
۱۷۔ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۝
۱۸۔ اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ ۝
۱۹۔ وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ؕ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْـَٔلُوْنَ ۝

ترجمہ

۱۵۔ اور انہوں نے خدا کے لیے اس کے بندوں میں سے ایک جُز قرار دیا ہے (اور ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں کہا ہے) انسان واضح کفر کرنے والا ہے۔
۱۶۔ آیا اس نے اپنی مخلوقات میں سے بیٹیوں کو اپنے لیے چن لیا ہے اور بیٹوں کو تمہارے لیئے؟
۱۷۔ حالانکہ جب ان میں سے جنہوں نے رحمان کے لیے شبیہ قرار دیا ہے، کسی کو بھی اسی چیز (بیٹی کی پیدائش) کی خوشخبری دی جائے تو اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ غصّے سے بھر جاتا ہے۔
۱۸۔ آیا جو زیب و زینت میں پرورش پائے اور جھگڑے کے وقت اپنا مدعا اور

مقصود بھی بیان نہ کر سکے، (اسے خدا کی اولاد سمجھتے ہو)؟

۱۹۔ ان لوگوں نے فرشتوں کو، جو کہ خدا کے بندے ہیں، مؤنث سمجھ رکھا ہے۔ آیا وہ ان کی تخلیق کے وقت شاہد اور موجود تھے؟ ان کی یہ گواہی لکھی جائے گی اور اس بارے میں ان سے پوچھا جائے گا۔

تفسیر

فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کیوں سمجھتے ہو؟

گزشتہ آیات میں کائنات میں خداوندِ عالم کی نشانیوں اور اس کی نعمتوں اور کرم نوازیوں کو شمار کیا گیا ہے اور عقیدۂ توحید کی بنیادوں کو مستحکم کیا گیا ہے۔ اس کے بعد زیر نظر آیات میں اس کے نقطۂ مقابل یعنی شرک اور غیر اللہ کی پرستش کے خلاف نبرد آزمائی کا آغاز فرمایا گیا ہے اور سب سے پہلے شرک کی ایک قسم یعنی فرشتوں کی پوجا پاٹ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: انہوں نے خدا کے لیے اس کے بندوں میں سے ایک جزء قرار دیا ہے (وجعلوا لہ من عبادہ جزءًا)۔

فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں اور اپنا معبود سمجھنا ایک ایسی خرافات تھی جو بہت سے بت پرستوں میں رائج تھی۔

"جزء" کے ذریعہ یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ فرشتوں کو خدا کی اولاد سمجھتے تھے، کیونکہ ہمیشہ اولاد اپنے ماں باپ کے وجود کا جزء ہوا کرتی ہے، جو نطفے کی صورت میں ان سے جدا ہوتی ہے اور آپس میں مرکب ہو جاتی ہے۔ اسی سے اس کے وجود کا آغاز ہوتا ہے۔

ساتھ ہی یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ وہ فرشتوں کی عبادت بھی کیا کرتے تھے کیونکہ وہ ان کو خدا کے مقابل معبودوں میں شمار کیا کرتے تھے۔

یہ تعبیر ضمنی طور پر مشرکین کے خرافاتی عقیدے کے باطل ہونے کی ایک واضح دلیل بھی ہے، کیونکہ اگر فرشتے خدا کی اولاد ہوں تو اس سے یہ بات لازم آئے گی کہ خداوندِ عالم کا بھی جزء ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ خدا کی پاک ذات مرکب ہے۔ جبکہ عقلی اور نقلی دلائل خدا کے بسیط اور احد ہونے پر کثرت سے موجود ہیں، اور جزء تو صرف امکانی موجودات کے ساتھ مخصوص ہے۔

پھر ارشاد فرمایا گیا ہے: انسان واضح طور پر کفر کرنے والا ہے۔ (ان الانسان لکفور مبین)۔

اس قدر خدائی نعمتوں نے اس کے تمام وجود کو اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے کہ جن میں سے پانچ قسمیں گذشتہ آیات میں بھی بیان ہو چکی ہیں، ایسی حالت میں اسے تو یہ چاہیئے تھا کہ اپنی پیشانی اپنے خالق اور ولی نعمت کے آستان پر جھکا دیتا۔ لیکن اس نے کفر و انکار کی راہ اختیار کرتے ہوئے اس کی مخلوق کے دامن کو جا پکڑا۔

بعد کی آیت میں قرآن ان کے اس خرافاتی نظریئے اور بودے فکر کی مذمت کرنے کے لیے خود ان کے ذہنی اور مسلمہ امور سے استدلال فرماتا ہے کیونکہ وہ مرد کی جنس کو عورت کی جنس پر ترجیح دیتے تھے، بلکہ اصولی طور پر وہ لڑکیوں کو اپنے لیے باعث ننگ و عار سمجھتے تھے۔ چنانچہ فرماتا ہے: آیا خدا نے اپنی تمام مخلوقات میں سے بیٹیوں کو اپنے لیے اور بیٹوں کو تمھارے لیے منتخب کیا ہے (ام اتخذ مما یخلق بنات و اصفاکم بالبنین)۔

تمھارے خیال میں بیٹی کا مرتبہ پست ہے، تو پھر کیونکر تم اپنے آپ کو خدا پر ترجیح دیتے ہو؟ اس کے حصے میں بیٹیاں اور اپنے حصے میں بیٹے کس لیے قرار دیتے ہو؟

یہ ٹھیک ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں انسانی اقدار کے لحاظ سے مرد اور عورت یکساں ہیں، لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مخاطب کے ذہنی افکار کے ذریعے استدلال اس کی فکر و نظر میں کافی حد تک موثر ہوتا ہے اور اسے نظر ثانی پر آمادہ کرتا ہے۔

ایک بار پھر اسی موضوع کو دوسرے انداز میں بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جب ان میں سے کسی کو اس چیز کی خوشخبری دی جاتی ہے جس چیز کو انہوں نے خداوند رحمان کے لیے شبیہ قرار دیا ہے تو اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ غصے سے بھر جاتا ہے۔ (واذا بشر احدھم بما ضرب للرحمٰن مثلاً ظل وجھہ مسودًا وھو کظیم)۔

"بما ضرب للرحمٰن مثلاً" سے مراد وہی فرشتے ہیں جنہیں وہ لوگ خدا کی بیٹیاں سمجھتے اور اپنے معبود قرار دیتے تھے، بالکل خدا کی طرح اور خدا جیسے معبود۔

"کظیم" کا لفظ "کظم" (بروزن "نظم") سے لیا گیا ہے، جس کا معنی ہے "گلا"۔ یہ لفظ مشک پانی سے بھر جانے کے بعد اس کے گلے کو تسمے سے بند کرنے کے لیے بھی آیا ہے۔ لہٰذا یہ کلمہ ان لوگوں کے لیے بھی بولا جاتا ہے، جن کا دل غم و غصہ اور رنج سے بھر چکا ہو۔

یہ تعبیر لڑکیوں کی پیدائش کے بارے میں زمانۂ جاہلیت کے احمق مشرکین کے خرافاتی انکار کو بخوبی بیان کر رہی ہے کہ وہ خود اپنے گھر میں بیٹی کی ولادت کی خبر سن کر کس قدر پریشان اور غمگین ہو جاتے تھے لیکن اس کے باوجود فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھتے تھے۔

اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے: "آیا جو بناؤ سنگار میں پرورش پائے اور بحث و مباحثہ، نزاعی گفتگو اور جدل مجادلہ کے موقع پر اپنا مدعا اور مقصود بھی بخوبی بیان نہ کر سکے، اسے خدا کی اولاد سمجھتے ہو اور بیٹوں کو اپنی اولاد سمجھتے ہو؟" (اومن ینشؤا فی الحلیۃ وھو فی الخصام غیر مبین)۔[1]

---

[1] "ینشؤ" مادہ "نشاء" کسی چیز کی ایجاد کے معنی میں ہے، لیکن یہاں پر پرورش پانے کے معنی میں ہے اور "حلیۃ" (بقیہ حاشیہ برصفحہ آئندہ)

یہاں پر قرآن مجید نے عورتوں کی دو ایسی صفات بیان کی ہیں جو اُن میں عام طور پر دیکھنے میں آتی ہیں اور یہ ان کے احساساتی پہلو سے پیدا ہوتی ہیں، ایک تو ان کا زیورات اور بناؤ سنگار کی چیزوں سے قلبی لگاؤ، اور دوسرے شرم و حیا کی وجہ سے لڑائی جھگڑے اور بحث و مباحثہ کے وقت اپنے مقصود کے بیان کرنے پر ناکافی قدرت۔

اس میں شک نہیں کہ کچھ عورتیں ایسی ہیں جنہیں زیب و زینت کی زیادہ خواہش نہیں ہوتی اور اس بات میں بھی کسی کو شک نہیں کہ "اعتدال کی حد تک" زینت سے لگاؤ عورت کے لیے کوئی عیب بھی نہیں ہے، بلکہ اسلام میں عورت کو بناؤ سنگار کرنے کے لیے تاکید بھی کی گئی ہے۔ البتہ یہاں پر مُراد عورتوں کی وہ اکثریت ہے جو عام طور پر انسانی معاشروں میں زیب و زینت کے ساتھ حد سے زیادہ لگاؤ رکھتی ہیں گویا وہ زینت و آرائش کی دُنیا میں قدم رکھ چکی ہوتی ہیں اور اسی بناؤ سنگار میں پرورش پاتی ہیں۔

اس بات میں بھی شک نہیں ہے کہ کچھ ایسی عورتیں بھی ہیں جو گفتگو میں مکمل طور پر ماہر ہیں، لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اکثریت ایسی عورتوں کی ہے جو شرم و حیا کی وجہ سے بحث و مباحثہ اور لڑائی جھگڑوں کے موقع پر مردوں کے مقابلے میں آنے کی قدرت نہیں رکھتیں۔

اصل مقصد اس حقیقت کو بیان کرنا ہے کہ آخر کس بنا پر تم خدا کے لیے تو بیٹیاں اور اپنے لیے بیٹے قرار دیتے ہو؟

اسی سلسلے کی آخری آیت میں بات کو زیادہ صراحت کے ساتھ بیان کرتے ہُوئے فرمایا گیا ہے: انہوں نے فرشتوں کو جو کہ خدا کے بندے ہیں، مؤنث (اور خدا کی بیٹیاں) سمجھ رکھا ہے (وجعلوا الملائکۃ الذین ھم عباد الرحمٰن اناثًا)۔

جی ہاں! وہ خدا کے بندے ہیں، اس کے حکم کے پابند ہیں اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کیے ہُوئے ہیں، جیسا کہ سُورۂ انبیاء کی آیت ۲۶ و ۲۷ میں بھی فرمایا گیا ہے:

"بل عباد مکرمون لا یسبقونہ بالقول وھم بامرہ یعملون"

"بلکہ وہ تو خدا کے معزز بندے ہیں، کسی بھی بات میں اس سے آگے نہیں بڑھتے اور ہمیشہ اس کے فرمان پر عمل کرتے ہیں"۔

یہاں پر لفظ "عباد" ذکر کرنے کی وجہ درحقیقت ان کی ایک غلط سوچ کا جواب ہے، کیونکہ اگر فرشتے مؤنث ہوتے تو اس لفظ کے بجائے "عبادات" کہا جاتا۔ البتہ یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ لفظ "عباد" جہاں جمع مذکر کا صیغہ ہے، وہاں پر ان تمام موجودات کے لیے بھی بولا جاتا ہے جو مذکر یا مؤنث کے دائرہ سے خارج ہوتی ہیں جیسے فرشتے وغیرہ، جیسا کہ خداوند عالم کے بارے میں مفرد مذکر کی ضمیروں سے استفادہ کیا جاتا ہے، جبکہ وہ ایسی تمام چیزوں سے بلند و بالا ہے۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اس جملے میں "عباد" کو "الرحمٰن" کی طرف مضاف کیا گیا ہے، اس کی وجہ شاید یہ ہو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کے معنی زینت ہے اور "خصام" کا معنی کسی چیز پر بحث و مباحثہ اور کش مکش ہے۔

کہ اکثر و بیشتر فرشتے خدا کی رحمت کا اجرا کرتے اور کائنات کے نظام کو چلاتے ہیں کہ جو سراسر رحمت ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ خرافات زمانہ جاہلیت کے عربوں میں کیونکر پیدا ہوئی اور آج تک کئی لوگوں کے اذہان میں اس کے اثرات کیوں موجود ہیں؟ یہاں تک کہ وہ جب بھی کسی فرشتے کی تصویر کشی کریں تو اسے عورت یا لڑکی کے روپ میں پیش کرتے ہیں، بلکہ جب کسی نام نہاد "فرشتۂ آزادی" کا مجسمہ بناتے ہیں تو عورت کے چہرے اور لمبے چوڑے زنانہ بالوں کے ساتھ اسے منصۂ شہود پر لاتے ہیں۔

ممکن ہے کہ یہ فکر اس لیے پیدا ہوئی ہو، کیونکہ فرشتے آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہیں اور عورتیں بھی عام طور پر پردے میں ہوا کرتی ہیں۔ حتی کہ لغت عرب میں بعض مقامات پر مجازی مؤنث کے بارے میں بھی یہی سوچ کارفرما نظر آتی ہے مثلاً وہ "سورج" کو مجازی مؤنث اور چاند کو مذکر سمجھتے ہیں کیونکہ سورج کی تجلیہ عام طور پر اپنے نور کی شعاعوں میں ڈھکی رہتی ہے اور اسے آنکھوں سے آسانی کے ساتھ نہیں دیکھا جا سکتا، جب کہ چاند کی تجلیہ ایسے نہیں ہے۔

یا پھر اس لیے کہ فرشتوں کے وجود کی لطافت اس بات کا باعث بنی ہے کہ انھیں بھی عورتوں کی جنس سے شمار کیا جائے جو مردوں کی نسبت لطیف وجود ہیں۔ تعجب تو اس بات پر ہوتا ہے کہ اسلام نے اس قسم کی خرافات کے خلاف جو اقدام کیا ہے، اس کے باوجود جب کبھی کوئی کسی عورت کی خوبی بیان کرتا ہے تو کہتا ہے کہ "وہ تو ایک فرشتہ ہے"؛ جبکہ مردوں کے بارے میں اس قسم کے الفاظ بہت کم سنے جاتے ہیں۔ اور "فرشتہ" کے لفظ کو عورت کے نام کے لیے منتخب کیا جاتا ہے، مرد کے نام کے لیے نہیں۔

پھر انکاری استفہام کے طور پر ان کے جواب میں فرمایا گیا ہے: آیا وہ فرشتوں کی تخلیق کے وقت موجود تھے اور انہوں نے اپنی موجودگی کی وجہ سے اس قسم کا نتیجہ نکالا ہے (اشھدوا خلقھم)۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: اس بے بنیاد عقیدے کے بارے میں ان کی گواہی ان کے نامۂ اعمال میں لکھی جاتی ہے اور قیامت کے دن ان سے اس بارے میں پوچھا جائے گا (ستکتب شھادتھم ویسئلون)۔

جو کچھ ہم مندرجہ بالا آیات میں پڑھ چکے ہیں اسی چیز کو دوسرے انداز میں سورۂ نحل کی آیت ۵۷ تا ۵۹ میں بھی بیان کیا گیا ہے، ہم نے وہاں پر زمانۂ جاہلیت کے عربوں کے عقیدہ کو مسئلہ "وٴاد" (بچیوں کو زندہ درگور کرنے) کے سلسلے میں تفصیل سے بیان کیا ہے، بلکہ اصولی طور پر صنف نازک کے بارے میں ان کے عقیدے اور اسلامی نقطۂ نظر سے عورت کی شخصیت اور اس کے مقام کو بڑی تشریح اور تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے (ملاحظہ ہو تفسیر نمونہ جلد ۱۱ صفحہ ۲۲۱ تا ۲۲۸)

۲۰۔ وَقَالُوا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ؕ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝

۲۱۔ اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ ۝

۲۲۔ بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝

ترجمہ

۲۰۔ انہوں نے کہا: اگر خدا چاہتا تو ہم ان کی ہرگز عبادت نہ کرتے، لیکن وہ اس بات پر یقین نہیں رکھتے اور جھوٹ کے علاوہ کچھ نہیں کہتے۔

۲۱۔ یا یہ کہ ہم نے اس سے پہلے انھیں کوئی کتاب دی ہے اور وہ اس سے تمسک کیے ہوئے ہیں؟

۲۲۔ بلکہ وہ کہتے ہیں: ہم نے اپنے آباء واجداد کو جس مذہب پر پایا ہے انہی کے نقش قدم پر ہم کو بھی ہدایت کی گئی ہے۔

تفسیر

تقلید آباء کی دلیل

گزشتہ آیات میں بت پرستوں کے اس خرافاتی عقیدے کا منطقی جواب دیا گیا ہے جو وہ فرشتوں کے بارے میں

رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ خدا کی بیٹیاں ہیں اور وہ یہ کہ کسی دعوے کے ثبوت کے لیے سب سے پہلے موقع پر موجود ہونا، کسی چیز کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا اور اس کا مشاہدہ کرنا ضروری ہوتا ہے، جبکہ کوئی بھی بت پرست ہرگز اس بات کا دعویٰ نہیں کرسکتا کہ فرشتوں کی تخلیق کے وقت وہ اس بات کے شاہد اور ناظر تھے۔

زیر تفسیر آیات بھی اسی چیز کو آگے بڑھاتے ہوئے اس بارے میں مزید تحقیقات کا دروازہ کھولتی ہیں اور اس بے ہودہ خرافات کو دوسرے طریقوں سے باطل کرتی ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے ان کے پورے دلائل میں سے ایک دلیل کو خلاصہ کے طور پر بیان کرتے ہوئے اس کا جواب بھی دیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: انہوں نے کہا: "اگر خدا چاہتا تو ہم ان کی ہرگز عبادت نہ کرتے" یہ تو اُس کی مرضی ہے کہ ہم اُن کی عبادت کرتے ہیں (وقالوا لو شاء الرحمٰن ما عبدناھم)۔

ممکن ہے یہ تعبیر اس لیے بھی ہو کہ وہ عقیدۂ جبر کے قائل تھے اور کہتے تھے کہ ہم جو کچھ بھی کرتے ہیں سب خدا کی مرضی اور اس کی منشا سے انجام دیتے ہیں۔

یا پھر اس لیے کہ اگر ہمارے عقائد اور اعمال خدا کی مرضی کے مطابق نہ ہوتے تو خدا فوراً ہمیں ان سے روک دیتا اور چونکہ اس نے ہمیں اس بات سے روکا نہیں ہے لہٰذا اسی میں اس کی خوشنودی ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے غلط اور خرافاتی عقائد کو صحیح ثابت کرنے اور ان کی توجیہ کرنے کے لیے کئی اور خرافات کے مرتکب ہوتے تھے اور اپنے جھوٹے افکار کو سچا ثابت کرنے کے لیے کئی اور جھوٹ بولا کرتے تھے۔ مذکورہ دونوں احتمالات میں سے جو بھی ان کا مقصود اور ان کی مراد ہو غلط اور بے اساس ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ کائنات میں کوئی بھی چیز خدا کے ارادہ کے بغیر واقع پذیر نہیں ہوسکتی لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ کائنات میں جبر حکم فرما ہے کیونکہ یہ بات فراموش کرنے کے قابل نہیں ہے کہ خدا کی مرضی اور منشا اسی بات میں ہے کہ ہم صاحب اختیار، صاحب ارادہ اور صاحب آزادی ہوں تاکہ وہ ہمیں آزمائے اور ہماری پرورش کرے۔

یہ بات درست ہے کہ خدا کو اپنے بندوں کے اعمال پر نظر رکھنا چاہیئے اور اس بات سے بھی انکار ناممکن ہے کہ تمام انبیاء نے شرک اور دوئی پرستی کی نفی کی ہے۔

اس بات سے قطع نظر انسانی عقل سلیم بھی اس بات کا انکار کرتی ہے۔ تو کیا انسان کے باطنی وجود میں "عقل" خدا کا پیغمبر نہیں ہے؟

اسی آیت کے آخر میں بت پرستوں کے اس بے ہودہ عقیدے کا ایک مختصر سے جملے کے ذریعے یوں جواب دیا گیا ہے: وہ اپنے اس دعوے پر یقین نہیں رکھتے اور جھوٹ کے علاوہ کچھ نہیں کہتے (ما لھم بذالک من علم ان ھم الا یخرصون)۔

انھیں تو مسئلہ جبر اور اپنے اعمال پر خدا کی رضامندی کا علم اور یقین بھی نہیں ہے، بلکہ بہت سے دوسرے نفس پرستوں اور مجرمین کے مانند اپنے سر سے گناہ کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے جبر کے موضوع کا سہارا لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تقدیر کے

ہاتھوں نے ہمیں اس راہ پر لا کھڑا کیا ہے۔

حالانکہ وہ خود بھی جانتے ہیں کہ جھوٹ بول رہے ہیں اور یہ ان کا صرف ایک بہانہ ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان کے حقوق پامال کرتا ہے تو وہ ہرگز اس بات کے پیشِ نظر چشم پوشی کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ وہ اپنے اس کام میں مجبور تھا۔

"یخرصون" "خرص" (بروزن "غرس") کے مادہ سے ہے جس کا اصلی معنی اندازہ لگانا ہے۔ پہلے تو اس کا اطلاق پھل میووں کے بارے میں تخمینہ لگانے پر ہوتا تھا پھر ہر قسم کے اندازے کے بارے میں یہ لفظ استعمال ہونے لگا۔ چونکہ بعض اوقات اندازے اور تخمینے غلط ثابت ہوتے ہیں اسی لیے یہ لفظ جھوٹ کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے اور زیرِ نظر آیت میں بھی اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

بہرحال قرآن مجید کی متعدد آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ بت پرست لوگ اپنے خرافاتی اور غلط عقائد کی توجیہ کے لیے کئی بار مشیت الٰہی کے عقیدے کا سہارا لیتے تھے اور اس سے اپنے لیے استدلال کیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ جہاں انھوں نے اپنے لیے کئی چیزوں کو حلال اور کئی چیزوں کو حرام کر دیا تھا تو اس کی نسبت بھی انہوں نے خدا کی طرف دے دی تھی جیسا کہ سورۂ انعام کی آیت نمبر ۱۴۸ میں ہے۔

"سیقول الذین اشرکوا لو شاء اللہ ما اشرکنا ولا اٰباؤنا ولا حرمنا من شیء"

"مشرک لوگ بہت جلد یہ کہیں گے کہ اگر خدا چاہتا تو ہم مشرک ہوتے اور نہ ہی ہمارے آباؤ اجداد اور کسی چیز کو حرام بھی نہ کرتے۔"

سورۂ نحل کی آیت ۳۵ میں بھی اس چیز کو دہرایا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے۔

"وقال الذین اشرکوا لو شاء اللہ ما عبدنا من دونہ من شیء نحن ولا اٰباؤنا ولا حرمنا من دونہ من شیء"

قرآن مجید سورہ انعام کی آیت کے ذیل میں ان کی تکذیب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"کذالک کذب الذین من قبلھم حتّٰی ذاقوا باسنا"

"اس قسم کا جھوٹ اس سے پہلے لوگ بھی بولا کرتے تھے لیکن انھوں نے ہماری سزا کا مزہ چکھ لیا۔"

سورہ نحل کی آیت کے ذیل میں تصریح کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"فھل علی الرسل الا البلاغ"

"تو کیا خدا کے رسولوں پر تبلیغ رسالت کے علاوہ کچھ اور فرض ہے؟"

زیرِ تفسیر آیت کے سلسلے میں بھی جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں قرآن ان کی طرف جھوٹے تخمینوں کی نسبت دے رہا ہے۔

یہ درحقیقت سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

بعد کی آیت میں ایک اور دلیل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ممکن ہے وہ اس کے ذریعے استدلال کریں چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: یا یہ کہ ہم نے اس کتاب سے پہلے انہیں کتاب دی ہے اور وہ اس سے وابستہ ہوتے ہیں۔ (ام اٰتینٰھم کتاباً من قبلہ فھم بہ مستمسکون)۔[1]

یعنی انھیں اپنے دعویٰ کے ثبوت کے لیے یا تو عقلی دلائل سے کام لینا چاہیئے یا پھر نقلی دلائل سے۔ حالانکہ نہ تو ان کے پاس کوئی عقلی دلیل موجود ہے اور نہ ہی نقلی۔ تمام عقلی دلائل توحید کی دعوت دیتے ہیں اور تمام انبیاء اور آسمانی کتابوں نے بھی توحید کی طرف دی ہے۔

اس سلسلے کی آخری آیت میں ان کے اصل بہانے کی طرف اشارہ کیا گیا اور یہ بہانہ بھی محض ایک خرافات اور ایک اور خرافات کی بنیاد ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے: بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے آباء و اجداد کو ایک مذہب پر پایا ہے اور ہم بھی ان کے آثار کی طرف ہدایت کئے گئے ہیں۔ (بل قالوا انا وجدنا اٰبائنا علیٰ امۃ وانا علیٰ اٰثارھم مھتدون)۔

حقیقت یہ ہے کہ ان کے پاس صرف اپنے آباء و اجداد کی اندھی تقلید کے سوا اور کوئی دلیل نہیں تھی اور پھر تعجب اس پر ہوتا ہے کہ اس تقلید کے ذریعے وہ خود کو ہدایت یافتہ بھی سمجھتے تھے۔ حالانکہ اعتقادی مسائل میں آزاد خیال انسان کے افکار و عقائد کی بنیاد تقلید پر نہیں ہوتی اور تقلید بھی "جاہل سے جاہل کی"۔

کیونکہ واضح سی بات ہے کہ ان کے آباء و اجداد کے پاس نہ تو علم تھا اور نہ ہی دانش، بلکہ ان کے دماغ خرافات اور توہمات سے بھرے ہوئے تھے۔ ان کے معاشرے اور افکار پر بھی جہالت ہی حکم فرما تھی جیسا کہ قرآن مجید کی سورہ بقرہ کی آیت ۱۷۰ میں ہے:

"اولو کان اٰباؤھم لا یعقلون شیئاً ولا یھتدون"۔

"کیا ایسا نہیں ہے کہ ان کے آباء اجداد نہ تو کچھ سمجھتے تھے اور نہ ہی ہدایت یافتہ تھے"۔

تقلید تو صرف فروعی اور غیر اعتقادی مسائل میں ہوتی ہے اور وہ بھی صحیح بنیادوں پر اور پھر یہ کہ عالم کی تقلید کی جاتی ہے۔ یعنی جاہل کو عالم کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے جیسے بیمار ڈاکٹر کی طرف رجوع کرتا ہے یا غیر ماہر افراد ماہرین کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اسی لیے مشرکین کی یہ اندھی تقلید دو طرح سے باطل اور قابل مذمت ہے۔

"امۃ" کا لفظ جیسا کہ راغب، مفردات میں کہتے ہیں، اس جماعت پر بولا جاتا ہے، جس کے افراد ایک دوسرے کے

---

[1] یہاں پر "ام" متصلہ ہے اور "اشھدوا خلقھم" پر اس کا عطف ہے اور "من قبلہ" کی ضمیر "قرآن" کی طرف لوٹ رہی ہے۔ بعض مفسرین نے جو یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ "ام" منقطعہ ہے یا ضمیر "رسول" کی طرف لوٹ رہی ہے، قرینے کے لحاظ سے قطعاً مناسب نہیں ہے۔

ساتھ ایک قسم کا رابطہ رکھتے ہیں۔ یا وہ رابطہ دینی بنیادوں پر ہوتا ہے یا مکان کے لحاظ سے یا زمانے کے اعتبار سے، اگرچہ ان کا باہمی اتصال اختیار یا مجبوری کی صورت میں ہو (اسی لیے بسا اوقات اس کو "مذہب" کے معنی میں بھی لیا جاتا ہے۔ جیسا کہ اسی آیت میں ہے۔ لیکن اس کا اصل معنی وہی جماعت اور گروہ ہے اور اس کلمہ کا مذہب پر اطلاق قرینے کا محتاج ہوتا ہے)[1]

---

[1] "انا علیٰ اٰثارھم مھتدون" میں لفظ "مھتدون" "ان" کی خبر ہے اور "علیٰ اٰثارھم" اس سے متعلق ہے۔ بعض مفسرین نے احتمال ذکر کیا ہے کہ "علیٰ اٰثارھم" "ان" کی پہلی خبر اور "مھتدون" اس کی دوسری خبر ہے، لیکن بعید معلوم ہوتا ہے۔

۲۳- وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ○

۲۴- قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ؕ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ○

۲۵- فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ○ ع النصف

ترجمہ

۲۳- اسی طرح ہم نے کسی دیار میں تجھ سے پہلے کوئی ڈرانے والا پیغمبر نہیں بھیجا مگر یہ کہ بدمست ومغرور دولت مندوں نے کہا کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو ایک مذہب پر پایا ہے، اور ہم ان کے آثار کی پیروی کرتے ہیں۔

۲۴- (ان کے پیغمبر نے) کہا اگر میں اس سے بھی زیادہ ہدایت کرنے والا دین تمھارے پاس لا چکا ہوں، جس پر تم اپنے آباء واجداد کو پاتے ہو (تو کیا پھر بھی تم انکار کروگے؟) انھوں نے کہا (ہاں!) ہم اس ہر چیز کا انکار کرتے ہیں جو تم لوگ لا چکے ہو۔

۲۵- لہٰذا ہم نے ان سے انتقام لیا، پس دیکھ کہ جھٹلانے والوں کا کیسا انجام ہوا۔

تفسیر

ان اندھے اور بہرے مقلدین کا انجام

یہ آیات بُت پرستی کے بارے میں مشرکین کے اصلی بہانے کے سلسلے میں جو کہ باپ دادا کی اندھی تقلید پر مبنی ہے گذشتہ آیات کا تتمہ ہیں۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: یہ صرف عرب مشرکوں کا ہی دعویٰ نہیں بلکہ "اسی طرح ہم نے کسی شہر و دیار میں تجھ سے پہلے کوئی ڈرانے والا پیغمبر نہیں بھیجا مگر بدمست اور مغرور دولت مندوں نے کہا کہ ہم نے تو اپنے باپ دادا کو کسی مذہب پر پایا ہے اور ہم ان کے آثار کی اقتدا کرتے ہیں۔ (وکذالک ما ارسلنا من قبلک فی قریۃ من نذیر الّا قال مترفوھا انّا وجدنا اٰبائنا علیٰ امۃ وانّا علیٰ اٰثارھم مقتدون)۔

اس آیت سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کے ساتھ محاذ آرائی کے سرغنے اور باپ دادا کی تقلید کا مسئلہ پیش کرنے والے اور اس مسئلے پر ڈٹے رہنے والے لوگ "مترفین" ہی تھے، بدمست، مغرور اور خوشحال گھرانوں کے افراد، کیونکہ "مترف" "ترفہ" (بروزن لقمہ) کے مادہ سے ہے، جس کا معنیٰ ہے نعمت کی فراوانی اور چونکہ بہت سے خوشحال گھرانوں کے لوگ اور ثروت مند افراد شہوات حیوانی اور خواہشات نفسانی میں مگن ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا "مترف" کا لفظ ان لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جو نعمتوں میں بدمست اور مغرور ہو کر سرکشی پر اتر آتے ہیں۔ [1] اس کا مصداق اکثر بادشاہ، ظالم و جابر حکمران، متکبر، دولت مند اور خود پرست لوگ ہوتے ہیں۔

جی ہاں! انبیاء کے قیام کی وجہ سے ایسے ہی لوگوں کی خود سری اور من مانی کارروائیوں کا خاتمہ ہوتا تھا اور ان کے ناجائز مفادات کو خطرہ درپیش ہوتا تھا اور محروم و مستضعف افراد ان کے چنگل سے نجات پاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مختلف حیلوں بہانوں سے لوگوں کے ذہن کو مسموم کرتے تھے اور انہیں احمق بنایا کرتے تھے۔ آج کے دور میں بھی دُنیا بھر میں رونما ہونے والی برائیاں اور فسادات انہی "مترفین" کے مرہون منت ہیں۔ جہاں بھی ظلم و گناہ اور تجاوز و تعدی ہے وہاں انہی لوگوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ ہم نے پہلی آیت میں ان کا یہ قول پڑھا ہے کہ "انّا علیٰ اٰثارھم مھتدون" یعنی ہم ان کے آثار پر ہدایت کیے گئے۔ اور یہاں پر ان کا یہ قول پڑھتے ہیں کہ "انّا علیٰ اٰثارھم مقتدون" یعنی

---

[1] لسان العرب میں ہے: "اترفتہ النعمۃ ای اطغتہ"

ہم ان کے آثار کی اقتدار اور پیروی کرتے ہیں۔ اگرچہ دونوں تعبیریں ایک ہی معنیٰ کی طرف لوٹ رہی ہیں لیکن پہلی تعبیر ان کے بزرگوں کے مذاہب کی حقانیت کے دعوٰی کی طرف اشارہ ہے اور دوسری ان لوگوں کے اس مذہب پر ڈٹے رہنے اور باپ دادا کی پیروی کرنے کی طرف اشارہ ہے۔

بہرحال صورت خواہ کچھ بھی ہو، یہ آیت پیغمبر اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم اور مومنین کے لیے ایک قسم کی تسلی اور تسکین ہے کہ انھیں معلوم ہو جائے کہ مشرکین کے حیلے بہانے کوئی نئی چیز نہیں ہیں، بلکہ یہ ان کا وہی راستہ ہے، جس پر تاریخی طور پر تمام گمراہ لوگ گامزن چلے آرہے ہیں۔

بعد کی آیت اس جواب کو بیان کر رہی ہے جو انبیائے ماسلف انھیں دوٹوک الفاظ میں دیا کرتے تھے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: ان کے پیغمبروں نے انھیں کہا: آیا اگر میں کوئی ایسا دین لایا ہوں جو تمھارے آباء و اجداد کے طریقۂ کار سے زیادہ واضح اور زیادہ ہدایت کرنے والا ہو، پھر بھی تم اس کا انکار کرو گے۔ (قال اولو جئتکم باھدٰی مما وجدتم علیہ اٰبائکم)۔ [1]

یہ سب سے زیادہ مؤدب تعبیر ہے جو ہٹ دھرم اور مغرور قوم کے سامنے پیش کی جا سکتی ہے، کہ جس سے ان کے جذبات کو کسی طرح ٹھیس نہ پہنچے۔ پیغمبر یہ نہیں کہتے، کہ جو کچھ تمھارے پاس ہے وہ سب جھوٹ، خرافات اور حماقت ہے بلکہ یہ کہتے ہیں جو کچھ میں لایا ہوں وہ تمھارے باپ دادا کے دین سے زیادہ ہدایت کرنے والا ہے، آؤ، دیکھو اور اس کا مطالعہ کرو۔

اس قسم کی قرآنی تعبیرات، مباحثہ و مناظرہ کے موقع پر خاص کر جاہل اور مغرور افراد کے ساتھ بحث و مباحثہ کے وقت ہمیں گفتگو کرنے کا سلیقہ بتاتی ہیں۔

لیکن اس کے باوجود وہ جہالت، تعصب اور ہٹ دھرمی میں اس قدر غرق ہو چکے تھے کہ یہ جچی تلی اور مؤدبانہ گفتگو بھی مؤثر ثابت نہ ہو سکی، انھوں نے اپنے انبیاء کے جواب میں صرف اتنا کہا کہ ہم ہر اس چیز کا انکار کرتے ہیں جس کو تم لے کر آئے ہو۔ (قالوا انا بما ارسلتم بہ کافرون)۔

انہوں نے اپنی مخالفت کی کوئی دلیل پیش کیے بغیر اور انبیاء الٰہی کی پیشکش کے بارے میں ذرہ بھر غور و خوض کیے بغیر فوراً ہی یہ کہہ دیا۔

ظاہر ہے کہ ایسی سرکش، ہٹ دھرم اور بے منطق قوم کو جینے اور زندہ رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں اور جلد یا بدیر ان پر عذاب الٰہی نازل ہونا ہی چاہیئے تاکہ اس قسم کے گھانس پھونس اور خس و خاشاک کا خاتمہ کر دے اور اسے راستے سے ہٹا دے۔ لہٰذا اسی سلسلے کی آخری آیت میں فرمایا گیا ہے: لہٰذا ہم نے ان سے انتقام لیا اور انھیں سخت سزا دی۔ (فانتقمنا منھم)۔

---

[1] اس جملے کا ایک لفظ محذوف ہے، جس کی تقدیر یوں ہے: "اتتبعون اٰبائکم ولو جئتکم بدین اھدی من دین اٰبائکم" (ملاحظہ ہو تفسیر کشاف، مراغی، قرطبی اور روح المعانی)۔

کسی قوم کو طوفان کے ذریعے، کسی کو تباہ کن زلزلے کے ذریعے، کسی کو تیز و تند جھکڑ اور کسی کو بجلی کی چنگھاڑ کے ذریعے غرض ہم نے ان میں سے ہر ایک کو تباہ کن حکم کے ذریعے نیست و نابود کر دیا اور ہلاک و فنا کر دیا۔

مشرکین مکہ کی عبرت آموزی کے لیے آیت کے آخر میں روئے سخن پیغمبر اکرمؐ کی طرف ہے اور فرمایا گیا ہے: دیکھ تو جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا (فانظر کیف کان عاقبة المکذبین)۔

مکہ کے ہٹ دھرم مشرکین کو بھی ایسے ہی انجام کا انتظار کرنا چاہیئے۔

۲۶- وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖٓ اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ۙ
۲۷- اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ
۲۸- وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ
۲۹- بَلْ مَتَّعْتُ هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى جَآءَهُمُ الْحَقُّ وَرَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ
۳۰- وَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّاِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ

ترجمہ

۲۶۔ اس وقت کو یاد کرو، جب ابراہیم نے اپنے (منہ بولے) باپ (چچا آذر) اور اپنی قوم سے کہا کہ میں اس چیز سے بیزار ہوں، جن کی تم عبادت کرتے ہو۔
۲۷۔ سوائے اس خدا کے جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور وہی میری راہنمائی بھی کرے گا
۲۸۔ اور اس نے کلمۂ توحید کو باقی رہنے والے کلمہ کی صورت میں اپنی اولاد میں قرار دیا تاکہ وہ خدا کی طرف رجوع کریں۔
۲۹۔ لیکن ہم نے ان لوگوں کو اور ان کے آباؤ اجداد کو دنیاوی نعمتوں سے بہرہ مند کیا، یہاں تک کہ ان کے پاس حق اور خدا کا آشکار رسول پہنچ گیا۔
۳۰ لیکن جب ان کے پاس حق آگیا تو انھوں نے کہا: یہ تو جادو ہے اور ہم ہرگز اسے ماننے والے نہیں۔

تفسیر

توحید۔ انبیاء کا دائمی پیغام

ان آیات میں حضرت ابراہیمؑ کی سرگزشت اور بابل کی بت پرست قوم کے واقع کی طرف اشارہ ہے تاکہ اس طرح سے گزشتہ آیات میں مذکور تقلید کی خدمت کو مکمل کیا جا سکے۔ کیونکہ:

ایک تو حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام ملت عرب کے سب سے بڑے بزرگ اور جد امجد تھے۔ سب لوگ ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور انکی تاریخ پر فخر کیا کرتے تھے۔ جب وہ تقلید کے پردوں کو چاک کرتے ہیں تو اگر یہ لوگ اپنے اس دعوے میں سچے ہیں تو انہیں ان کی اقتدار کرنی چاہیئے۔

اگر یہ بات طے ہے کہ آباء واجداد کی تقلید کی جانی چاہیئے تو پھر بت پرستوں ہی کی تقلید کیوں کریں، ابراہیمؑ کی پیروی کیوں نہ کریں؟

دوسرے: جو بت پرست حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقابلے میں آگئے تھے وہ بھی اسی بے مقصد اور کھوکھلی دلیل (باپ دادا کی تقلید) کا سہارا لیتے تھے۔ لیکن جناب ابراہیم علیہ السلام نے ان کی اس دلیل کو یکسر مسترد کر دیا، جیسا کہ سورۂ انبیاء کی ۵۳ ویں اور ۵۴ ویں آیت میں ہے:

« قالُوا وجدنا اٰبائنا لها عابدین قال لقد کنتم انتم و اٰباؤکم فی ضلالٍ مبین »

"بت پرستوں نے کہا: ہم نے اپنے باپ دادا کو دیکھا ہے کہ وہ ان (بتوں) کی پرستش کرتے ہیں تو اس (ابراہیمؑ نے) کہا: یقیناً تم اور تمہارے باپ دادا آشکار اور واضح گمراہی میں ہو۔"

تیسرے یہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ابتدائے اسلام کے مسلمانوں کے لیے ایک قسم کی تسلی اور دل جوئی کی صورت ہے کہ انھیں معلوم ہو کہ اس قسم کی مخالفتیں اور حیلے بہانے ہمیشہ رہے ہیں انھیں دل تنگ اور مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: اس وقت کو یاد کیجیئے، جب ابراہیم نے اپنے (منہ بولے) باپ (آذر) اور اپنی بت پرست قوم سے کہا: میں اس چیز سے بیزار ہوں، جس کی تم عبادت کرتے ہو (واذ قال ابراهیم لابیه وقومه انني براء مما تعبدون)۔ [1]

---

[1] "براء" (بروزن "سوار") مصدر ہے اور "بری" کے معنی میں ہے اور ایسے مقامات پر وصفی معنی میں تاکید اور مبالغہ پایا جاتا ہے، جیسے "زید عدل" اور چونکہ مصدر ہے لہذا اس میں مفرد اور جمع مذکر اور مؤنث یکساں ہیں۔

چونکہ بہت سے بُت پرست خدا کی پرستش بھی کیا کرتے تھے لہٰذا اُنھوں نے فوراً ان کو مُستثنٰی کرتے ہُوئے فرمایا: سوائے اس خدا کے کہ جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور وہی میری راہنمائی کرے گا (الّا الّذی فطرنی فانہ سیھدین)۔

انھوں نے اس مختصر سی عبارت میں ایک توحیدیت کو پروردگار عالم میں منحصر کر دیا کیونکہ معبُود وہی ہو سکتا ہے جو خالق کائنات اور مدبر عالم ہو اور یہ بات سب مانتے تھے کہ خالق، خدا ہے اور ساتھ ہی خدا کی تکوینی اور تشریعی ہدایت کی طرف اشارہ بھی ہے، کیونکہ لُطف کا قاعدہ اسی بات کا متقاضی ہے۔[1]

اس قسم کی باتیں سُورۂ شعراء کی آیات ۷۷ تا ۸۲ میں بھی ذکر ہو چکی ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام فقط اپنی زندگی میں اصول توحید کے طرف دار اور ہر قسم کی بُت پرستی کے دشمن نہیں تھے۔ بلکہ انھوں نے سر توڑ کوشش کی کہ کلمۂ توحید دُنیا میں ہمیشہ کے لیے باقی اور برقرار رہے۔ جیسا کہ بعد کی آیت میں ارشاد ہوتا ہے: انہوں نے کلمۂ توحید کو باقی رہنے والے کلمہ کی صُورت میں اپنی اولاد میں مقرر کر دیا تاکہ وہ خدا کی طرف رجوع کریں (وجعلھا کلمۃ باقیۃ فی عقبہ لعلھم یرجعون)۔[2]

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ آج روئے زمین پر جو دین بھی توحید کا دم بھرتا ہے وہ ابراہیم کی توحید پر مبنی تعلیمات سے ہدایت لیتا ہے اور خدا کے تینوں عظیم پیغمبروں یعنی جناب مُوسیٰؑ، جناب عیسیٰؑ اور حضرت محمد مصطفٰے علیہم السلام انہی کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور اس بارے میں قرآن مجید کی یہ ایک سچی پیش گوئی ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کے انبیاء مثلاً نوح علیہ السلام نے بھی شرک اور بُت پرستی کے خلاف نبرد آزمائی کی اور دُنیا والوں کو توحید کی دعوت دی لیکن جس پیغمبر نے کلمۂ توحید کو استحکام بخشا اور اس کے پرچم کو ہر جگہ بلند کیا وہ ابراہیمؑ بُت شکن ہی تھے۔

انھوں نے نہ صرف اپنے زمانے میں راہِ توحید کو دوام بخشنے کی جد و جہد کی بلکہ اپنی دعاؤں میں بھی پروردگار عالم سے اسی بات کی درخواست کرتے رہے کہ:

"واجنبنی و بنیّ ان نعبد الاصنام"

"مجھے اور میری اولاد کو اس بات سے دور رکھ کہ ہم بتوں کی عبادت کریں"

(ابراھیم۔ ۳۵)

---

[1] اس تفسیر کے مطابق "الّا الّذی فطرنی" میں استثناء متصل ہے کیونکہ بہت سے بُت پرست اللہ کے منکر نہ تھے۔ بلکہ اس کے غیر کو اس کا شریک سمجھتے تھے۔ البتہ یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ یہ استثنائے منقطع ہے اور "الا" "لکن" کے معنی میں ہے کیونکہ "ما تعبدون" کی تعبیر بتوں کی طرف اشارہ ہے اس لیے کہ خدا کے بارے میں عموماً یہ تعبیر نہیں ہوتی (غور کیجیے گا)

[2] "عقب" بنیادی طور پر پاؤں کی ایڑھی کے معنی میں ہے۔ البتہ بعد ازاں اس کے مفہوم میں وسعت پیدا ہوگئی اور یہ لفظ اولاد اور پھر اولاد کی اولاد کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔

یہاں پر ایک اور تفسیر بھی ملتی ہے اور وہ یہ کہ "جعل" میں جو ضمیر ہے وہ خدا کی طرف لوٹ رہی ہے اس لحاظ سے اس جملے کا معنی یوں ہوگا: خدا نے کلمۂ توحید کو ابراہیمؑ کی اولاد میں برقرار رکھا۔

لیکن پہلی تفسیر یعنی ضمیر کا ابراہیم علیہ السلام کی طرف لوٹنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ پہلے جملے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کارناموں کا ایک جزو قرار پائے خصوصاً قرآن مجید کی دوسری بہت سی آیات میں اس بات کو زیادہ زور دے کر بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اس بات پر اصرار رہا ہے کہ ان کی اولاد اور نسلیں خدائی دین پر باقی رہیں۔ جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیات ۱۳۱ اور ۱۳۲ میں ہے۔

"اذ قال له ربّه اسلم قال اسلمت لرب العالمين و وصّى بها ابراهيم بنيه و يعقوب يا بنيّ ان الله اصطفى لكم الدين فلا تموتن الّا و انتم مسلمون"

"اس وقت کو یاد کرو جب ابراہیمؑ کے رب نے ان سے کہا کہ اسلام لے آؤ اور حق کے آگے جھک جاؤ تو انھوں نے کہا کہ میں عالمین کے پروردگار کے سامنے سر تسلیم خم کر چکا ہوں اور ابراہیمؑ نے اپنی اولاد سے بھی اسی توحیدی دین کی وصیت کی اور یعقوب نے بھی اور کہا اے میرے بیٹو! خدا نے اسی دین کو تمھارے لیے منتخب کیا ہے۔ لہٰذا تم ہرگز نہ مرنا مگر مسلمان ہی۔

اگر یہ تصور ہو کہ "جعل" کی تعبیر، تخلیق اور آفرینش کے معنی میں ہے اور خداوند عالم ہی کے ساتھ مخصوص ہے تو یہ تصور غلط ہوگا۔ کیونکہ "جعل" کا اطلاق انسانوں اور غیر انسانوں دونوں پر ہوتا ہے اور قرآن مجید میں اس قسم کے بہت سے نمونے ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر یوسف علیہ السلام کی داستان میں ملتا ہے کہ جب انھیں بھائیوں نے کنویں میں ڈالنے کی ٹھان لی تو قرآن مجید نے وہاں بھی لفظ "جعل" (قرار دینا) استعمال کیا ہے، جیسے:

"فلمّا ذهبوا به واجمعوا ان يجعلوه في غيابت الجبّ۔ (یوسف۔۱۵)

ہماری اس گفتگو سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ "جعلها" میں مفعول کی ضمیر کلمۂ توحید اور "لا الٰه الّا الله" کی گواہی کی طرف لوٹ رہی ہے۔ کیونکہ "انني براء ممّا تعبدون" (میں اس چیز سے بیزار ہوں جس کی تم پرستش کرتے ہو) سے یہ بات سمجھی جاتی ہے اور ابراہیم علیہ السلام کی آئندہ نسلوں میں توحیدی نظریئے کے قائم و دائم رہنے کی مخلصانہ کوششوں کی خبر بھی ملتی ہے۔

متعدد روایات جو ائمہ اہل بیتؑ علیہم السلام سے ہم تک پہنچی ہیں ان میں بھی ضمیر کا مرجع مسئلہ امامت کو بتایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی تعبیر میں فاعل کی ضمیر خدا کی طرف لوٹے گی۔ یعنی خداوند عالم نے مسئلہ امامت کو ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں دائم و برقرار کر دیا۔ جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۲۴ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام سے خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: میں نے تمھیں امام بنا دیا ہے۔

تو انھوں نے عرض کی کہ ان کی اولاد میں بھی امام ہونے چاہئیں، چنانچہ خداوند تعالیٰ نے ان کی دعا کو قبول فرما لیا۔ البتہ ظالم اور ستمگار لوگوں کو اس سے مستثنیٰ قرار دے دیا۔ ملاحظہ ہو:

"قال انی جاعلك للناس اماماً قال ومن ذریتی قال لا ینال عهدی الظالمین"۔

لیکن بادی النظر میں جو مشکل معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ زیرِ تفسیر آیت میں امامت کی بات نہیں ہو رہی، مگر یہ کہ یہ کہا جائے کہ "سیهدین" (خدا مجھے ہدایت کرے گا) کے جملہ کو اس معنی کی طرف ایک اشارہ سمجھیں کیونکہ انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کی ہدایت بھی خدا کی ہدایت مطلقہ کی ایک شعاع ہے اور امامت اور ہدایت کی حقیقت ایک ہے۔

اس سے بھی بہتر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ کہا جائے کہ امامت کا مسئلہ کلمۂ توحید ہی میں مندرج ہے کیونکہ توحید کی کئی فروعات ہیں جن میں سے ایک فرع حاکمیت، ولایت اور راہبری میں توحید و وحدت ہے اور ہم جانتے ہیں کہ حضرات ائمہ علیہم السلام اپنی ولایت اور رہبری خدا کی طرف سے حاصل کرتے ہیں، نہ کہ از خود امام اور رہبر بن جاتے ہیں۔ اسی لیے یہ روایات "جعلها کلمة باقیة" کا ایک مصداق اور اس کے کلی مفہوم کی ایک فرع سمجھی جائیں گی۔ بنا بریں یہ تفسیر پہلی تفسیر سے متضاد نہیں ہوگی جو ہم اوائل میں بیان کر چکے ہیں (غور کیجیے گا)۔ [1]

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ مفسرین نے "فی عقبه" کی تفسیر میں کئی احتمالات کا ذکر کیا ہے۔ بعض نے رہتی دنیا تک ابراہیم علیہ السلام کی تمام ذریت اور نسل سے اس کی تفسیر کی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ صرف ابراہیمؑ کی قوم اور ان کی اُمت سے مخصوص ہے۔ بعض نے آل محمد علیہم السلام سے تفسیر کی ہے۔ لیکن جو بات بظاہر نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کا مفہوم وسیع اور عمومی ہے جو تا قیام قیامت ابراہیمؑ کی اولاد پر محیط ہے اور آل محمد کی تفسیر اس کا ایک واضح اور روشن مصداق ہے۔

بعد کی آیت درحقیقت کئی سوالوں کا ایک جواب ہے اور وہ یہ کہ ان حالات کے باوجود آخر کیا وجہ ہے کہ خداوند عالم مشرکین مکہ کو عذاب میں مبتلا نہیں کرتا؟ کیا ہم ابھی گذشتہ آیات میں نہیں پڑھ چکے کہ خداوند عالم مشرکین مکہ کو عذاب کیوں نہیں دیتا؟ کیا ہم اس سے پہلے کی آیات میں یہ نہیں پڑھ چکے "فانتقمنا منهم" (گزشتہ اقوام میں سے جنہوں نے انبیاء کی تکذیب کی اور اپنے اس کام پر مصر رہے ہم نے ان سے انتقام لے لیا)۔

اس سوال کے جواب میں فرمایا گیا ہے: بلکہ ہم نے (مشرکین مکہ کے) اس گروہ اور ان کے باپ دادا کو دنیاوی نعمتوں سے بہرہ مند کیا حتیٰ کہ حق اور خدا کا واضح رسول ان کے پاس آ گیا۔ (بل متعت هؤلاء وآباءهم حتّٰی جاءهم الحق ورسول مبین)۔

ہم نے شرک و بت پرستی کے باطل ہونے میں صرف عقلی حکم پر اکتفا نہیں کیا اور نہ ہی توحید کے بارے میں صرف ضمیر کے حکم کو کافی سمجھا بلکہ اتمام حجت کے لیے اُنہیں مہلت دی حتیٰ کہ یہ آسمانی کتاب جو سرتاپا حق ہے اور یہ عظیم الشان پیغمبرؐ یعنی حضرت محمد مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کی ہدایت کے لیے آ گئے۔

دوسرے لفظوں میں گزشتہ آیت میں "لعلهم یرجعون" اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی تمام کوششوں کا مقصد یہی تھا کہ انکی تمام نسلیں راہ توحید کی طرف رجوع کریں۔ حالانکہ عرب اس بات کے مدعی تھے کہ وہ

---

[1] صاحب تفسیر نور الثقلین نے ان احادیث کو جلد چہارم ص۵۹۶ و ص۵۹۷ میں ذکر کیا ہے۔ اور یہ تفسیر برہان جلد ۴ ص۱۳۸ و ص۱۳۹ میں بھی مذکور ہیں۔

ابراہیمؑ کی نسل سے ہیں، لیکن اس کے باوجود انھوں نے اس طرف رجوع نہیں کیا۔ مگر پھر بھی خدا نے انھیں مہلت دی، یہاں تک عظیم رسولؐ اور نئی کتاب ان کے پاس پہنچ گئی تاکہ وہ اس گراں خوابی سے بیدار ہوں، چنانچہ بہت سے لوگ بیدار ہو بھی گئے۔

لیکن تعجب کی بات ہے کہ "جب حق (قرآن مجید) ان کے پاس پہنچ گیا، تو بجائے اس کے کہ وہ اپنی اصلاح کرتے اور گزشتہ غلطیوں اور گناہوں کا ازالہ کرتے۔ اُلٹا بہت سے لوگوں نے مخالفت پر کمر باندھ لی اور کہا یہ تو جادُو ہے اور ہم اس کا انکار کرتے ہیں۔" (ولما جائھم الحق قالوا ھٰذا سحر وانّا بہ کافرون)۔

جی ہاں! انھوں نے قرآن کو جادُو کہا اور خدا کے عظیم الشان پیغمبر کو جادُوگر۔ اگر وہ اپنی اس روش سے باز نہ آتے تو عذاب الٰہی ان کے دامن گیر ہو جاتا۔

۳۱- وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ○

۳۲- اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ؕ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ؕ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ○

ترجمہ

۳۱- اور انھوں نے کہا: یہ قرآن ان دو شہروں (مکّہ اور طائف) کے کسی بڑے (مالدار) آدمی پر نازل کیوں نہیں کیا گیا؟

۳۲- کیا یہ لوگ تمھارے پروردگار کی رحمت کو تقسیم کرتے ہیں؟ ہم نے ان کے درمیان ان کی معیشت کو دنیاوی زندگی میں تقسیم کر دیا ہے، اور بعض لوگوں کو بعض دوسرے لوگوں پر فوقیت دی ہے تاکہ وہ ایک دوسرے کی خدمت کریں اور آپس میں تعاون کریں اور جو کچھ یہ لوگ جمع کرتے ہیں، تمھارے پروردگار کی رحمت اس سے کہیں بہتر ہے۔

تفسیر

قرآن کسی دولت مند پر نازل کیوں نہیں ہوا؟

گزشتہ آیات میں انبیاء کی دعوت کے ردّ عمل میں مشرکین کی حیلہ سازیوں اور بہانہ جوئیوں کا تذکرہ تھا۔ کبھی تو وہ اس دعوت کو جادو کہتے اور کبھی اپنے آباؤ اجداد کی تقلید کا بہانہ پیش کرتے ہوئے فرامین الٰہی سے پیٹھ پھیر لیتے۔ لیکن زیر تفسیر

آیات میں خداوندِ عالم ان کے ایک اور بے بنیاد اور کھوکھلے بہانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے : انہوں نے کہا یہ قرآن ان دو شہروں (مکہ اور طائف) کے کسی بڑے (مالدار اور مشہور) آدمی پر نازل کیوں نہیں ہوا (وقالوا لولا نزل ھٰذا القرآن علیٰ رجل من القریتین عظیم)۔

ایک لحاظ سے انھیں حق پہنچتا تھا کہ اس قسم کے حیلوں بہانوں سے کام لیں کیونکہ ان کے نکتۂ نظر سے انسانی اقدار کا معیار مال و دولت، ظاہری آن بان شہرت اور شان و شوکت تھی۔ یہ سرپھرے یہ سمجھتے تھے کہ ان کے دولت مند اور ظالم قبائلی سردار ہی کو خدا کی بارگاہ میں سب لوگوں سے زیادہ تقرب حاصل ہے۔ لہٰذا وہ تعجب کرتے تھے کہ نبوت اور رحمت جیسی یہ عظیم نعمت اس قسم کے لوگوں پر نازل کیوں نہیں ہوئی؟ بلکہ اس کے برعکس ایک یتیم، غریب اور نادار انسان یعنی محمدؐ بن عبداللہ پر نازل ہو گئی! یہ تو باور کرنے کی بات ہی نہیں ہے۔

جی ہاں ایسے غلط اقدار پر مبنی نظام سے ایسا ہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔ عظیم انسانی معاشروں کی سب سے بڑی مصیبت اور ان کے افکار کی کجی کا اصل سبب یہی غلط اقدار پر مبنی نظام ہیں جو بسا اوقات حقائق کو مکمل طور پر الٹ کر رکھ دیتے ہیں۔

جب کہ اس دعوتِ الٰہی کا حامل ایسا شخص ہونا چاہیئے جس کے تمام وجود کو تقویٰ کی رُوح نے معمور کر رکھا ہو، باخبر اور بابصیرت ہو، عزم صمیم کا حامل ہو، شجاع اور عادل ہو اور محروم و مظلوم لوگوں کے درد سے آشنا ہو۔ یہ ہیں وہ شرائط اور اقدار جو اس آسمانی رسالت کے حامل شخص میں پائی جانا ضروری ہیں، نہ کہ خوبصورت لباس، گراں قیمت اور اونچے محلات اور ظاہری آن بان۔ خدا کے انبیاء تو خاص طور پر ایسی چیزوں سے محروم تھے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اصل اقدار جھوٹی قدروں کے ساتھ گڈمڈ ہو جائیں۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مکہ اور طائف کے وہ کون لوگ تھے جو ان بہانہ سازوں کے پیشِ نظر تھے؟ اس بارے میں مفسرین کی مختلف آراء ہیں۔ البتہ اکثر مفسرین طائف سے عروہ بن مسعود ثقفی اور مکہ سے ولید بن مغیرہ مراد لیتے ہیں۔ لیکن بعض مفسرین نے مکہ سے عتبہ بن ربیعہ کا اور طائف سے حبیب بن عمر ثقفی کا نام لیا ہے۔

لیکن بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی گفتگو کسی خاص شخص کے بارے میں نہیں تھی، بلکہ ان کا مقصود کوئی بھی مالدار، مشہور اور قوم و قبیلہ کا سردار شخص تھا۔

قرآن مجید ایسی غلط اور خرافاتی طرزِ فکر کو سرکوب کرنے کے لیے دندان شکن جواب دیتا ہے اور اسلامی و خدائی نکتۂ نظر کو مکمل طور پر مجسم کرتے ہوئے پہلے تو فرماتا ہے: آیا یہ لوگ تمہارے رب کی رحمت کو تقسیم کرتے ہیں۔ (اھم یقسمون رحمت ربک)۔

تاکہ جسے چاہیں نبوت عطا کر دیں، جس پر چاہیں آسمانی کتاب نازل کر دیں اور جس کے متعلق نہ چاہیں اس کے ساتھ ایسا نہ کریں وہ غلط سمجھتے ہیں۔ تمہارے رب کی رحمت کو خود وہی تقسیم کرتا ہے اور سب سے بہتر جانتا ہے کہ کون شخص اس عظیم مرتبے کے لائق ہے؟ جیسا کہ سورۂ انعام کی ۱۲۴ ویں آیت میں بھی ذکر ہوا ہے۔

"اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ"

"خدا بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کہاں قرار دے"۔

اس سے بھی قطع نظر اگر لوگوں کی زندگی میں کوئی فرق اور اختلاف پایا جاتا ہے تو یہ ان کے معنوی اور روحانی مقامات و مراتب میں فرق کی دلیل ہرگز نہیں بن سکتی ۔ بلکہ "ہم نے ان کے درمیان ان کی معیشت کو دنیاوی زندگی میں تقسیم کر دیا ہے اور بعض لوگوں کو دوسرے بعض لوگوں پر فوقیت دی ہے، تاکہ وہ ایک دوسرے کی خدمت کریں اور آپس میں تعاون کریں (نحن قسمنا بینهم معیشتهم فی الحیٰوة الدنیا ورفعنا بعضهم فوق بعض درجات لیتخذ بعضهم بعضًا سخریًا)۔

انھوں نے اس بات کو فراموش کر دیا ہے کہ انسانی زندگی ایک اجتماعی زندگی ہے اور اس کو ایک دوسرے کے ساتھ تعاون اور آپس کی خدمت کے بغیر نہیں چلا جا سکتا۔ اگر تمام لوگ زندگی اور استعداد کے لحاظ سے ایک ہی سطح پر ہوں اور معاشرے میں ان سب کا ایک جیسا مقام ہو تو تعاون اور ایک دوسرے کی خدمت اور ایک دوسرے سے بہرہ مندی کا اصول متزلزل ہو جائے گا۔

اسی لیے انھیں اس قسم کی تفریق دھوکے میں نہ ڈالے اور نہ ہی وہ اسے انسانی اقدار کا معیار سمجھ بیٹھیں بلکہ تمھارے پروردگار کی رحمت اس سے کہیں بہتر ہے جو کچھ یہ لوگ اکٹھا کرتے ہیں خواہ وہ جاہ و مقام ہو یا مال و دولت ۔ (ورحمت ربك خیر مما یجمعون)۔

بلکہ یہ تمام دنیاوی عہدے، منصب، مال اور دولت پروردگار کی رحمت اور اس کے قرب کے مقابلے میں مکھی کے پَر کے برابر بھی قدر و قیمت نہیں رکھتے۔

اس آیت میں "ربك" دو مرتبہ آیا ہے، جو پروردگار عالم کے خاص لطف و کرم کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے جو اس نے اپنے پیغمبر خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر فرمایا ہے کہ ان کی قامت رسا کو نبوت و خاتمیت کی خلعت زیبا سے مزین فرمایا ہے۔

دو اہم سوالوں کا جواب

اس موقع پر کئی سوال مندرجہ بالا آیات کے مطالعہ کرتے وقت پیش آتے ہیں اور دشمنانِ اسلام کی طرف سے بھی انھیں دستاویزی ثبوت کے طور پر اسلام کے آفاقی نظریئے پر حملہ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے ۔

پہلا سوال تو یہ ہے کہ قرآن مجید نے کیونکر انسان کے ذریعے انسان کی خدمت اور تسخیر کو جائز قرار دیا ہے ؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام نے اقتصادی اعتبار سے ایسے طبقاتی نظام کی تائید کی ہے جس میں ایک طبقہ خدمت لینے والا ہو اور دوسرا خدمت کرنے والا ؟

پھر یہ کہ اگر روزی اور معیشت خدا کی طرف سے تقسیم ہو چکی ہے اور یہ اقتصادی اونچ نیچ اسی کی جانب سے ہے تو پھر رزق کی تلاش ہمارے لیے کس حد تک مفید اور ثمر آور ثابت ہو سکتی ہے ؟ آیا اس طرح سے زندگی کے لیے کوشش اور جد و جہد کی نفی نہیں کی گئی ؟

اگر آیت مجیدہ کے متن میں غور کیا جائے تو ان سوالوں کا جواب بخوبی واضح ہو جاتا ہے جو لوگ اس طرح کے

اعتراضات کرتے ہیں ان کا تصور یہ ہوتا ہے کہ آیت کا مفہوم اس طرح ہے کہ انسانوں کا ایک خاص طبقہ دوسرے لوگوں کو مسخر اور تابع فرمان بنالے اور تسخیر بھی انسان سے ظالمانہ استحصال کے معنی میں۔

حالانکہ ایسی بات نہیں ہے بلکہ اس سے مراد لوگوں کی عمومی طور پر ایک دوسرے سے خدمت طلبی ہے۔ یعنی ہر طبقہ کے اپنے مخصوص وسائل اور استعداد ہوتے ہیں جس کے پیش نظر وہ زندگی کے کچھ مسائل میں سرگرمی دکھاتا ہے اور طبعی طور پر ان مسائل کے بارے میں اسی کی خدمات دوسروں کے کام آتی ہیں۔ اسی طرح دوسرے طبقوں کی دوسرے مسائل ہیں۔ تو گویا ان کی خدمت طلبی برابر کی سطح پر ہوتی ہے اور طرفین کے درمیان پائی جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر اصل مقصد اور زندگی میں ایک دوسرے سے تعاون ہوتا ہے نہ کہ کوئی دوسری بات۔

از خود واضح ہے کہ اگر تمام لوگ ہوش و حواس اور روحانی و جسمانی لیاقتوں کے لحاظ سے برابر ہوتے تو اجتماعی لحاظ سے کبھی نظم وجود میں نہ آسکتا۔ جس طرح کہ اگر انسانی بدن کے تمام خلیے ساخت، دفاعی قوت کے لحاظ سے ایک جیسے ہوتے تو انسانی جسم کا نظام بگڑ جاتا پاؤں کی ایڑی کی ہڈی کے مضبوط اور طاقت ور خلیے کہاں اور آنکھ کی جھلی کے لطیف و نازک خلیے کہاں؟ ان دونوں میں سے ہر ایک اپنی طرز ساخت کے مطابق اپنا اپنا کام انجام دینے کے لیے بنائے گئے ہیں۔

اس کے لیے زندہ مثال انسانی جسم کے مختلف اعضا کی ایک دوسرے کی خدمت کے حوالے سے دی جا سکتی ہے جو سانس لینے، خون کی گردش کرنے، غذا کھانے اور دوسری جسمانی فعالیت کی صورت میں موجود ہے اور یہ "لیتخذ بعضهم بعضا سخریا" کا روشن مصداق ہے (البتہ جسم کی اندرونی فعالیت کی حد تک) تو کیا اس قسم کی تسخیر پر کسی قسم کا اعتراض وارد ہو سکتا ہے؟۔

اگر یہ کہا جائے کہ "رفعنا بعضهم فوق بعض درجات" کا جملہ عدالت اجتماعی کے خلاف نظریہ پیش کرتا ہے تو ہم کہیں گے کہ یہ اس صورت میں ہو سکتا ہے جب "عدالت" کا معنی "مساوات" کیا جائے، جبکہ حقیقی عدالت یہ ہے کہ جو چیز جس کام کے لیے ہے وہیں پر قرار پائے۔ تو کیا کسی فوجی ادارے یا ملکی امور کو چلانے کے لیے مراتب یا مناصب کا وجود اس کے ظالم ہونے پر دلالت کرتا ہے؟

ممکن ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہوں، جو نعرہ کی صورت میں "مساوات" کے کلمہ کو اس کے حقیقی مفہوم سے بے توجہ ہو کر اسے ہر جگہ استعمال کریں، لیکن یہ صرف نعرے کی صورت میں ہوگا۔ عملی زندگی میں باہمی فرق کے بغیر نظم وجود میں آسکتا ہی نہیں لیکن یہ باہمی فرق ایک انسان کے ہاتھوں دوسرے انسان کے استحصال کا ذریعہ بھی نہیں بننا چاہیے۔ سب لوگوں کو آزاد ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں، اپنی استعداد کو جلا بخشیں اور اپنی سرگرمیوں کے نتائج سے کما حقہ، فائدہ اٹھائیں اور جہاں ان کی دسترس نہیں ہے، ان لوگوں کو جو طاقت رکھتے ہیں، اُن کا ہاتھ بٹانا چاہیے۔

اب رہا دوسرا سوال کہ یہ بات کیونکر ممکن ہے کہ جب ہر شخص کا رزق مقرر ہو چکا ہے پھر کوشش اور جدوجہد کو جاری کیا جائے؟ لیکن انھیں یہ غلط فہمی اس لیے ہوئی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ خداوند عالم نے انسان کی سعی و کوشش کو اہمیت نہیں دی اور نہ ہی اسے سعی و کوشش کا حکم دیا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ خداوندِ عالم نے مختلف سرگرمیوں کے لیے انسان کے اندر صلاحیتیں بھی مختلف ودیعت فرمائی ہیں اور یہ بات بھی صحیح ہے کہ انسانی زندگی میں اس کے اپنے ارادے سے ہٹ کر کچھ بیرونی عوامل بھی بڑی حد تک اثر انداز ہیں لیکن اس کے باوجود ان عوامل میں سے ایک اہم اور بنیادی عامل سعی و کوشش کو بھی قرار دیا گیا ہے اور " ان لیس للانسان الا ماسعیٰ" (نجم-۳۹) کے اصول کے پیشِ نظر اس نکتے کی بھی وضاحت کردی ہے کہ ہر انسان کی زندگی میں اس کا بڑا حصہ اس کی جدوجہد اور سعی و کوشش کا مرہونِ منت بھی ہے۔

بہرحال ایک نہایت ہی باریک اور دقیق نکتہ یہ بھی ہے کہ بنی نوع انسان ایک طرح کا برتن نہیں ہیں جو ایک کارخانے میں ایک ہی شکل وصورت، ایک ہی قالب اور پیمانے سے اور ایک ہی طرح کا فائدہ پہنچانے کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ اگر یہی کیفیت ہوتی تو وہ ایک دن بھی باہر مل جل کر زندگی بسر نہ کرسکتے۔

اور نہ ہی انسان کسی مشنری کے نٹ بولٹ کی طرح تخلیق کیے گئے ہیں کہ جس کے بنانے والے اور انجنیئر نے اسے کس دیا ہے اور وہ مجبوراً اپنے کام کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ بلکہ اس کے بالکل برعکس تمام بنی نوع انسان ارادی طور پر آزاد بھی ہیں اور ساتھ ہی ذمہ داری اور فرائض کی ادائیگی کے لیے پابند بھی ہیں۔ اس کے باوجود ان کی صلاحیتیں اور لیاقتیں بھی مختلف ہیں اور ایسے خالص مرکب اور مجموعے کا نام انسان ہے۔ چنانچہ اگر اس بارے میں کوئی اعتراض کیا جاتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ اعتراض کرنے والے انسان کی معرفت سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔

قصہ مختصر، خداوندِ عالم نے تمام پہلوؤں کے لحاظ سے کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر فوقیت اور برتری عطا نہیں کی۔ بلکہ جملہ " رفع بعضھم فوق بعض درجات " کے پیشِ نظر تمام لوگوں میں مختلف امتیازات پائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے انہیں ایک دوسرے پر فوقیت حاصل ہے اور ہر طبقے کی دوسرے طبقے سے حصولِ خدمت اور تسخیر بھی انہیں امتیازات کے پیشِ نظر ہوتی ہے اور اسی چیز کا نام عدالت، تدبیر اور حکمت ہے۔ [1]

---

[1] اس سلسلے میں مزید تفصیل تفسیر نمونہ جلد سوم، سورۂ نساء کی ۳۲ ویں آیت اور جلد ششم میں سورۂ انعام کی ۱۶۵ ویں آیت کے ذیل میں بیان ہوچکی ہے۔

٣٣۔ وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ۙ

٣٤۔ وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ ۙ

٣٥۔ وَزُخْرُفًا ؕ وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ۧ

ترجمہ

٣٣۔ اگر کفار کا مادی وسائل سے استفادہ اس بات کا سبب نہ ہوتا کہ گمراہی میں سب لوگ ایک ہی طریقے کے ہو جائیں گے تو ہم ان کے لیے جو خدا کا انکار کرتے ہیں گھروں کی چھتیں چاندی کی بنا دیتے اور وہ سیڑھیاں بھی جن پر وہ چڑھتے ہیں۔

٣٤۔ اور ان کے گھروں کے دروازے اور وہ (خوبصورت نقرئی) تخت جن پر وہ تکیہ لگاتے ہیں۔

٣٥۔ اور زیب و زینت کے دوسرے وسائل بھی، لیکن یہ سب کچھ تو صرف دنیاوی زندگی کے ساز و سامان ہیں اور آخرت تو تیرے پروردگار کے نزدیک صرف پرہیزگاروں کے لیے ہے۔

تفسیر

چاندی کے محل۔ جھوٹی قدریں

یہ آیات بھی اسلامی نظام کی اقدار کا ذکر کر رہی ہیں اور بتا رہی ہیں کہ مال و دولت اور مادی جاہ و منصب کوئی معیار نہیں ہے۔ چنانچہ اس سلسلے کی سب سے پہلی آیت میں ارشاد فرما دیا گیا ہے: اگر کفار کا مادی وسائل سے استفادہ اس بات کا سبب نہ ہوتا کہ تمام لوگ کفر کی طرف مائل ہو کر گمراہی میں ایک ہی طریقہ کے ہو جائیں گے، تو ہم ان لوگوں کے جو خداوند رحمان کا انکار کرتے ہیں۔ گھروں کی چھتیں چاندی کی بنا دیتے (ولولا ان یکون الناس امة واحدة لجعلنا لمن یکفر بالرحمٰن لبیوتهم سقفًا من فضة)۔[1]

اور جن گھروں کی کئی منزلیں ہوتی ہیں ان کی "سیڑھیاں بھی کہ جن پر وہ چڑھتے ہیں۔ (ومعارج علیها یظهرون)۔[2]

بہت سے مفسرین کہتے ہیں کہ یہاں پر مراد چاندی کی سیڑھیاں ہیں اور لفظ "فضہ" (چاندی) کو دوبارہ اس لیے نہیں لایا گیا کیونکہ وہ واضح طور پر موجود ہے اس طرح سے گویا انھوں نے صرف سیڑھیوں کے وجود کو گھروں کی اہمیت کی دلیل نہیں سمجھا، حالانکہ ایسی بات نہیں ہے، کیونکہ بہت سی سیڑھیوں کا وجود ہی مکانات کی عظمت اور کئی منزلہ ہونے کی دلیل ہے۔

"سُقف" (بروزن شُتر) "سَقف" کی جمع ہے۔ البتہ کچھ مفسرین اسے "سقیفہ" (چھپی ہوئی جگہ) کی جمع سمجھتے ہیں۔ لیکن پہلا قول زیادہ مشہور ہے۔

پھر فرمایا گیا ہے کہ اس کے علاوہ ہم "ان کے گھروں کے دروازے اور وہ تخت قرار دیتے جن پر وہ تکیہ لگاتے ہیں: (و لبیوتهم ابوابًا وسررًا علیها یتکئون)۔

ممکن ہے کہ یہ جملہ نقرئی دروازوں اور تختوں کی طرف اشارہ ہو کیونکہ سابقہ آیت میں چھتوں کے نقرئی ہونے کا ذکر ہے اور یہاں پر نقرئی ہونے کو دوبارہ ذکر نہ کیا گیا ہو یہ بھی ممکن ہے کہ کئی دروازوں اور کئی تختوں کی طرف اشارہ ہو ("ابوابًا" اور "سررًا" چونکہ نکرہ ہیں اور یہاں پر اہمیت بیان کرنے کے لیے آئے ہیں) جو بذات خود ان محلات کی عظمت کی ایک دلیل ہے۔ کیونکہ کسی معمولی اور حقیر سے گھر میں متعدد دروازے نہیں ہوا کرتے۔ بلکہ یہ بات بڑے بڑے محلات اور اونچی اونچی عمارتوں ہی سے مخصوص ہوا کرتی ہے۔ اسی طرح تخت بھی ایسی ہی عمارتوں میں پائے جاتے ہیں۔

---

[1] "لبیوتهم" "لمن یکفر بالرحمٰن" کا بدل الاشتمال ہے اور لام کو بھی دوبارہ اسی لیے لایا گیا ہے یا پھر "لبیوتهم" کی لام "علیٰ" کے معنیٰ میں ہے جس کا مفہوم یہ ہوگا "علیٰ بیوتهم" لیکن پہلا احتمال زیادہ صحیح ہے۔

[2] "معارج" معراج کی جمع ہے جس کا معنی ہے۔ ایسا ذریعہ جس کی وجہ سے انسان بالائی منزلوں پر جاتا ہے۔

پھر بھی اسی بات پر اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ آگے چل کر فرمایا گیا ہے کہ اس کے علاوہ زیب و زینت کے دوسرے وسائل بھی: "(وزخرفًا)" [1]

تاکہ ان کی پر تعیش زندگی ہر لحاظ سے مکمل ہو جائے۔ یعنی نقرئی چھتوں کی باشکوہ اور کئی منزلہ محلات اور عمارتیں، متعدد دروازے اور تخت، زیب و زینت کے مختلف وسائل اور ہر قسم کے نقش و نگار جو عام طور پر دُنیا پرستوں کے مطلوب، مقصود اور معبود ہوا کرتے ہیں۔

پھر فرمایا گیا ہے: لیکن یہ سب کچھ دنیاوی مادی زندگی کے وسائل ہیں اور تیرے پروردگار کے نزدیک آخرت تو صرف پرہیزگاروں کے لیے ہے۔ (وان کل ذالك لما متاع الحیوة الدنیا والاخرة عند ربك للمتقین)۔

"زخرف" دراصل ہر اس زینت اور آرائش کو کہتے ہیں جس میں طرح طرح کے نقش و نگار ہوں اور چونکہ زینت کا ایک اہم ترین ذریعہ "سونا" ہے لہٰذا اسے بھی "زخرف" کہتے ہیں اور فضول باتوں کو اس لیے "زخرف" کہا جاتا ہے کیونکہ ان پر ملمع سازی کر کے پیش کیا جاتا ہے۔

المختصر مادی سرمایہ اور دنیاوی زینت کے یہ وسائل اللہ کی بارگاہ میں اس قدر بے قدر و قیمت ہیں کہ صرف کفار و منکرین حق جیسے بے قدر و قیمت افراد ہی کے شایانِ شان ہو سکتے ہیں۔ اگر کم ظرف اور دُنیا کے دل دادہ بے ایمانی اور کفر کی جانب جھکاؤ پیدا نہ کر لیتے تو خدا وندِ عالم اس سرمائے کو صرف اپنی درگاہ سے دھتکارے ہوئے لوگوں کے ہی نصیب کرتا تاکہ سب لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ ایسے امور انسانی قدر و قیمت اور شخصیت کا معیار نہیں ہوا کرتے۔

چند اہم نکات

۱۔ اسلام غلط اقدار کی نفی کرتا ہے: حقیقت یہ ہے کہ جھوٹی اور غلط اقدار کی نفی اور ان پر خطِ تنسیخ کھینچنے کے لیے مندرجہ بالا آیات میں موجود تعبیر سے بڑھ کر کوئی اور تعبیر نہیں ہو سکتی۔ اسے آنحضرتؐ کو ایسے معاشرے کو منقلب کرنے اور اس میں تبدیلی لانے کے لیے بھیجا گیا جس میں افراد کی شخصیت کا معیار اونٹوں کی تعداد، درہم و دینار کی مقدار، غلاموں اور کنیزوں کی تعداد اور زینت و آرائش کے وسائل اور گھر تھے۔ حتیٰ کہ وہ اس بات پر بھی تعجب کرتے تھے کہ محمدؐ بن عبداللہ جو یتیم اور مادی لحاظ سے غریب انسان ہے، اسے نبوت کے لیے منتخب کر لیا گیا ہے۔ سب سے پہلا اور بنیادی کام ایسے معاشرے میں تبدیلی کے لیے یہ ہوتا ہے کہ اس کے ایسے غلط معیاروں کو مسمار کر کے اس پر صحیح انسانی اقدار کی بنیاد رکھی جائے جس میں تقویٰ اور پرہیزگاری

---

[1] بعض مفسرین "زخرفًا" کو "سقفًا" پر عطف اور زینت کے مستقل وسائل کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو اس قسم کے لوگوں کے پاس ہوتے ہیں اور بعض "من فضة" پر عطف جانتے ہیں جو اصل میں "من زخرف" ہے۔ پھر اسے "نزع خافض" کی وجہ سے منصوب کیا گیا ہے۔ تو ایسی صورت میں جملے کا مفہوم یوں ہوگا "ان کے گھروں کی چھتوں، دروازوں اور تختوں میں سے کچھ کو تو ہم نے سونے کے اور کچھ کو چاندی کے بنایا ہے۔ (غور کیجئے گا)۔

علم اور دانش، ایثار و فداکاری اور شجاعت و بہادری جیسی صفات پائی جائیں وگرنہ ہر اصلاح ظاہری، سطحی اور ناپائیدار ہوگی۔

یہ وہی کام ہے جسے اسلام، قرآن اور خود رسول اللہ نے اعلیٰ ترین صورت میں انجام دیا ہے جس کی وجہ سے خرافات پر مبنی ایک پسماندہ ترین انسانی معاشرہ مختصر سے عرصے میں اس قدر ترقی کر گیا کہ اس کا شمار دنیا کے صف اوّل کے معاشروں میں ہونے لگا۔ یہ بات لائق توجہ ہے کہ اسی پروگرام کی تکمیل کے لیے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث ہے:

"لو وزنت الدنیا عند اللہ جناح بعوضة ما سقی الکافر منها شربة ماء"۔

"اگر خدا کے نزدیک دنیا کا وزن مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتا تو اس سے کافر کو پانی کے ایک گھونٹ تک نہ پلاتا۔"[1]

حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے اس بارے میں بات کو نہایت کمال سے بیان فرمایا ہے:

"موسیٰ (علیہ السلام) اپنے بھائی ہارون (علیہ السلام) کو ساتھ لے کر اس حالت میں فرعون کے پاس آئے کہ ان کے جسم پر اُونی کرتے اور ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں اور اس سے قول و قرار کیا کہ اگر وہ اسلام قبول کرے تو اس کا ملک بھی باقی رہے گا اور اس کی عزت بھی برقرار رہے گی۔ تو اس نے (اپنے حاشیہ نشینوں سے) کہا کہ تمھیں اس پر تعجب نہیں ہوتا کہ یہ دونوں مجھ سے یہ معاملہ ٹھہرا رہے ہیں کہ میری عزت بھی برقرار رہے گی اور میرا ملک بھی باقی رہے گا اور جس طرح کے خستہ حال اور ذلیل صورت میں یہ ہیں تم دیکھ ہی رہے ہو (اگر ان میں اتنا دم خم تھا تو پھر) ان کے ہاتھوں میں سونے کے کنگن کیوں نہیں پڑے ہوئے؟ یہ اس لیے کہ وہ سونے کو اور اس کی جمع آوری کو بڑی چیز سمجھتا تھا اور اونی کپڑوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔

"اگر خدا یہ چاہتا کہ جس وقت اس نے نبیوں کو مبعوث کیا ان کے لیے سونے کے خزانوں اور خالص طلا کی کانوں کے منہ کھول دیتا اور ان کے لیے مہیا کر دیتا اور فضا کے پرندوں اور زمین کے صحرائی جانوروں کو ان کے ہمراہ کر دیتا تو کر سکتا تھا اور اگر ایسا کرتا تو پھر آزمائش ختم اور جزا و سزا بے کار ہو جاتی۔

اسی خطبے کے دوسرے حصے میں فرماتے ہیں۔

"تم دیکھتے نہیں کہ اللہ نے آدم سے لے کر اس جہاں کے آخر تک کے اگلوں پچھلوں کو ایسے پتھروں سے آزمایا ہے کہ جو نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ فائدہ، نہ سن سکتے ہیں اور نہ دیکھ سکتے ہیں۔ اس نے ان پتھروں ہی کو اپنا محترم گھر قرار دیا کہ جسے لوگوں کے لیے (امن کے) قیام کا ذریعہ ٹھہرایا ہے۔ پھر یہ کہ اس نے اسے زمین کے رقبوں میں ایک سنگلاخ رقبہ اور دنیا میں بلندی پر واقع ہونے والی آبادیوں میں سے ایک کم مٹی والے مقام اور گھاٹیوں میں سے تنگ اطراف کی گھاٹی میں قرار دیا کنکرے

---

[1] تفسیر کشاف جلد ۴ صفحہ ۲۵۰

اور کھُردرے پہاڑوں، نرم ریتلے میدانوں، کم آب چشموں اور بکھرے ہُوئے دیہاتوں کے درمیان کہ جہاں اونٹ، گھوڑا، گائے بکری نہیں پل سکتے، پھر بھی اُس نے آدم اور ان کی اولاد کو حکم دیا کہ اپنا رُخ اس کی طرف موڑیں۔ چنانچہ وہ ان کے سفر سے فائدہ اُٹھانے کا مرکز اور پالانوں کے اترنے کی منزل بن گیا۔ ....."

اسی خطبے کے ایک اور حصّے میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

" اگر خداوند عالم یہ چاہتا کہ وہ اپنا محترم گھر اور بلند پایہ عبادت گاہیں ایسی جگہ پر بنائے کہ جس کے گرد باغ و چمن کی قطاریں اور بہتی ہوئی نہریں ہوں، زمین نرم و ہموار ہو کہ (جس میں) درختوں اور (ان میں) جُھکے ہُوئے پھلوں کے خوشے ہوں جہاں عمارتوں کا جال بچھا ہُوا اور آبادیوں کا سلسلہ ملا ہو، جہاں سُرخی مائل گیہوں کے پودے، سرسبز مرغزار، چمن در کنار سبزہ زار، پانی میں شرابور میدان، لہلہاتے ہُوئے کھیت اور آباد گزرگاہیں ہوں، تو البتہ وہ جزا و ثواب کو اسی اعتبار سے کم کر دیتا کہ جس قدر ابتلاء و آزمائش میں کمی واقع ہوئی ہے (اور لوگ دلفریب ظاہری اقدار کے ساتھ مانوس ہو جاتے ہیں اور حقیقی اور خدائی اقدار سے غافل ہو جاتے)۔[1]

بہرحال اسلامی انقلاب، اقدار کا انقلاب ہے اور اگر مسلمان آج سخت اور ناخوشگوار حالات سے دوچار ہیں اور بے رحم اور خونخوار دشمن کے پنجوں میں پھنسے ہوئے ہیں تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ انھوں نے اصل اقدار کو چھوڑ کر ایک بار پھر زمانۂ جاہلیت کی قدروں کو اپنا لیا ہے اور یہ قدریں ان میں خوب پروان چڑھ رہی ہیں۔ انسانی شخصیت کا معیار دنیاوی مال و مقام قرار پا چکا ہے، علم، تقوٰے اور فضیلت کو یکسر نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ لوگ مادی چکاچوند میں کھو چکے ہیں۔ اسلام سے یکسر بے گانہ ہو چکے ہیں اور جب تک ان کی یہی حالت رہے گی اس عظیم غلطی کا انھیں خمیازہ بھی بھگتنا پڑے گا۔ جب تک اپنے وجود پر خدائی اقدار کی حکمرانی کا آغاز نہیں کریں گے اس وقت تک خدا کا لطف و کرم ان کے شاملِ حال نہیں ہوگا۔ کیونکہ

"ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتّٰی یغیروا ما بانفسھم"

اللہ اس قوم کی حالت نہیں بدلتا جو اپنے آپ میں تبدیلی نہ لائے۔" (رعد۔۱۱)

۲۔ **ایک سوال کا جواب:** مندرجہ بالا آیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن نے ظاہری ٹھاٹھ باٹھ اور دنیاوی زینت اور شان و شوکت کی نفی کی ہے، جبکہ سورۂ اعراف کی آیت ۳۲ میں فرمایا گیا ہے۔

"قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبات من الرزق قل ھی للذین امنوا فی الحیوۃ الدنیا خالصۃ یوم القیامۃ کذالک نفصل الآیات لقوم یعلمون"

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۱۹۰ (خطبہ قاصعہ) (اردو ترجمہ از مرحوم علامہ مفتی جعفر حسین)

"کہہ دیجئے کہ اللہ نے جو زینت اپنے بندوں کے لیے خلق فرمائی ہے نیز طیبات کو کس نے حرام کیا ہے؟ کہہ دیجئے کہ یہ دُنیا وی زندگی میں ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لے آئے ہیں (اگرچہ دوسرے لوگ بھی اس میں شریک ہیں لیکن) قیامت میں خاص طور پر ان ہی کے لیے ہوگی۔ ہم اپنی آیات کو سمجھدار لوگوں کے لیے اسی طرح تفصیل سے بیان کرتے ہیں"

ایک اور جگہ پر فرمایا گیا ہے:

"یا بنی ادم خذوا زینتکم عند کُلّ مسجد"

"اے اولاد آدم! مسجد جاتے وقت اپنے تئیں مزین کرلیا کرو" (اعراف - ۳۱)

تو یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ دو قسم کی آیات آپس میں کس طرح ہم آہنگ ہوسکتی ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ زیر تفسیر آیات کا اصل مقصد جھوٹی اقدار کی نفی اور ان کا خاتمہ کرنا ہے اور یہ مقصد ملحوظ خاطر ہے کہ مال و دولت اور ظاہری ٹھاٹھ باٹھ کو انسانی شخصیت کا معیار نہ سمجھ لیا جائے، نہ یہ کہ مادی وسائل کوئی بُری چیز ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ مادی وسائل کو صرف وسائل کی حد تک ہی محدود رکھیں اُنھیں منتہائے مقصود نہ سمجھ لیں۔

ساتھ ہی یہ بات بھی ہے کہ ان وسائل کی اس وقت کوئی قدر و قیمت ہے جب وہ کسی معقول اور شائستہ حد تک ہوں اور اسراف و فضول خرچی سے پاک ہوں، نہ کہ سونے چاندی کے محل بنانے اور سیم و زر کو اکٹھا کرنے کے لیے۔

یہاں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ان مادی نعمتوں سے کفار و ظالمین کی بہرہ مندی نہ تو ان کی شخصیت کی دلیل بن سکتی ہے اور نہ ہی مومنین کا ان سے محروم ہونا ان کی شخصیت کے منافی ہے۔ اور نہ ہی معقول حد تک ان اُمور سے استفادہ انسان کے ایمان اور تقویٰ کے لیے نقصان دہ ہوسکتا ہے اور یہی صحیح اسلامی اور قرآنی نظریہ ہے۔

۳۶- وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ○
۳۷- وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ○
۳۸- حَتّٰٓى اِذَا جَآءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ بَيْنِىْ وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ ○
۳۹- وَلَنْ يَّنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ اَنَّكُمْ فِى الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ○
۴۰- اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ اَوْ تَهْدِى الْعُمْىَ وَمَنْ كَانَ فِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○

ترجمہ

۳۶- اور جو شخص یادِ رحمٰن سے روگردانی کرتا ہے تو ہم اس کے لیے ایک شیطان کو مقرر کر دیتے ہیں جو ہر دم اس کے ساتھ رہتا ہے۔
۳۷- اور وہ (شیاطین) ان لوگوں کو خدا کی راہ سے روکتے رہتے ہیں حالانکہ وہ اسی خیال میں ہیں کہ وہی صحیح معنوں میں ہدایت یافتہ ہیں۔
۳۸- یہاں تک کہ جب ہمارے پاس آئے گا تو کہے گا کاش مجھ میں اور تجھ میں مشرق اور مغرب کا فاصلہ ہوتا اور تو کیا ہی بُرا ساتھی ہے۔
۳۹- آج ہرگز اس قسم کی گفتگو تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی کیونکہ تم ظلم کر چکے ہو اور

تم سب عذاب میں شریک ہو۔

۴۰۔ آیا تو بہروں کو سُنا سکتا ہے یا اندھوں کو اور ان لوگوں کو جو صریحی گمراہی میں ہیں ہدایت کر سکتا ہے؟

تفسیر

شیاطین کا ساتھی

گزشتہ آیات میں ان دُنیا پرستوں کی بات ہو رہی تھی جو تمام چیزوں کو مادی پیمانے سے ناپتے ہیں اور زیرِ نظر آیات میں ان کے مہلک آثار میں سے ایک اثر کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے جو دُنیا کے ساتھ قلبی لگاؤ اور خدا سے یکسر اجنبیت ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: اور جو شخص یادِ رحمٰن سے روگردانی کرتا ہے ہم اس کے لیے ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں جو ہر دم اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ (ومن یعش[1] عن ذکر الرحمٰن نقیض[2] لہ شیطانا فھو لہ قرین)۔

جی ہاں! ذکرِ خدا سے غفلت اور دنیاوی لذات میں کھو جانے اور دُنیاوی چکا چوند سے دِل بستگی اس بات کا سبب بن جاتی ہے کہ ایک شیطان انسان پر مسلط ہو جاتا ہے اور وہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا ہے۔ وہ اس کے گلے میں ایک ایسا پٹہ ڈال دیتا ہے جس کے ذریعے اسے ہر جگہ کھینچے پھرتا ہے۔

ظاہر سی بات ہے کہ اس آیت سے جبر کا تصور نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہ ان کے اپنے ہی اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے جو وہ انجام دیتے ہیں۔ ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ انسان کے اپنے اعمال خاص کر دُنیاوی لذتوں میں کھو جانے اور مختلف گناہوں سے آلودہ ہونے کی سب سے پہلی تاثیر یہ ہوتی ہے کہ اس کے دل، آنکھ اور کان پر پردے پڑ جاتے ہیں، جس سے وہ خدا سے بے گانہ ہو جاتا ہے اور اس پر شیاطین مسلط ہو جاتے ہیں اور شیطانی افکار اسے ہر طرف سے گھیر لیتے ہیں اور یہ انسان کے اپنے ہی

---

[1] "یعش" "عشو" (بروزن نشر) کے مادہ سے مشتق ہے، جب "الیٰ" کے ساتھ متعدی ہو جیسے "عشوت الیہ" تو اس کا معنی ہے کمزور آنکھ کے ساتھ کسی چیز کے ذریعے ہدایت پانا اور جب "عن" کے ساتھ متعدی ہو جیسے "عشوعنہ" تو اس کا معنی ہوگا کسی چیز سے روگردانی کرنا۔ زیرِ تفسیر آیت بھی اسی معنی میں ہے (دیکھئے کتاب لسان العرب مادہ "عشو")

[2] "نقیض" "قیض" (بروزن "فیض") کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے انڈے کا چھلکا۔ بعد ازاں اس کا استعمال کسی دوسری چیز پر چھائے رہنے کے لیے ہونے لگا ہے۔

اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کی خدا کی طرف نسبت "مسبب الاسباب" کے اعتبار سے صحیح ہے۔ یہی وہ چیز ہے جسے قرآن مجید کے دوسرے مقامات پر "تزئین شیطان" کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے۔ جیسے سورۂ نحل کی ۶۳ ویں آیت میں ہے۔

"فزین لھم الشیطان اعمالھم"

یا شیطان کی سرپرستی کا نام دیا گیا ہے جیسے سورۂ نحل ہی کی اسی آیت میں ہے "فھو ولیھم الیوم"

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ "نقیض" اپنے لغوی مفہوم کے لحاظ سے ایک تو انسان پر شیطان کے تسلط پر دلالت کرتا ہے اور دوسرے اس کے ساتھی ہونے پر اس کے باوجود "فھو لہ قرین" کا جملہ جو اس کے بعد آیا ہے اس بات کی تاکید کے لیے ہے کہ اس قسم کے لوگوں سے شیطان کبھی جدا نہیں ہو سکتا۔

اور لفظ "رحمان" اس بات کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ وہ اس خدا سے کیوں روگردانی کرتے ہیں اور اس خدا کی یاد سے کیوں غافل رہتے ہیں جس کی رحمت سب پر چھائی ہوئی ہے۔

آیا ایسے لوگوں کا انجام اس کے سوا کچھ اور ہونا چاہیئے کہ وہ شیطان کے ساتھی اور اس کے حکم کے غلام ہوں۔

بعض مفسرین نے اس احتمال کا اظہار کیا ہے کہ یہاں پر "شیاطین" کے وسیع معانی مراد ہیں یہاں تک کہ اس کا مفہوم انسانی شیطان پر بھی محیط ہے اور اس سے وہ "گمراہی کے سرداروں اور سرغنوں" کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو یادِ خدا سے غافل افراد پر غالب، مسلط اور ان کے ہمراہی ہوتے ہیں۔ اور وسیع مفہوم پر مبنی یہ احتمال بھی بعید نہیں ہے۔

پھر ایسے دو اہم امور کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو ان غافلوں کے بارے میں یہ شیطان انجام دیتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

وہ (شیاطین) ان لوگوں کو خدا کی راہ سے روکتے ہیں (وانھم لیصدونھم عن السبیل)۔[1]

جب وہ خدا کی طرف رجوع کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو شیاطین ان کی راہوں میں روڑے اٹکاتے اور رکاوٹیں کھڑی کر دیتے ہیں تاکہ وہ کسی بھی صورت میں صراطِ مستقیم کی طرف نہ لوٹ آئیں۔

وہ گمراہی کے راستوں کو ان کی آنکھوں میں اس قدر عمدہ کر کے پیش کرتے ہیں کہ "وہ گمان کرتے ہیں کہ صرف وہی لوگ راہِ ہدایت پر ہیں (ویحسبون انھم مھتدون)۔

جبکہ سورۂ عنکبوت آیت ۳۸ میں قومِ عاد و ثمود کے بارے میں ہے:

"وزین لھم الشیطان اعمالھم فصدھم عن السبیل وکانوا مستبصرین"

"شیطان نے ان کے اعمال کو ان کی نگاہوں میں مزین کر دیا ہے اور انھیں سیدھی راہ سے روک دیا ہے حالانکہ وہ راہ تلاش کر چکے تھے"

خلاصہ کلام یہ کیفیت اسی صورت میں برقرار رہے گی۔ غافل اور بے خبر انسان اپنی گمراہی میں اور شیاطین اسے گمراہ

---

[1] "انھم" اور بعد کے جملے میں جمع کی ضمیر "شیاطین" کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے یہ ضمیر مفرد کی صورت میں آچکی ہے، کیونکہ درحقیقت اس میں جمع کا معنی پایا جاتا ہے۔

کرنے میں لگے رہیں گے، یہاں تک کہ تمام پردے ہٹ جائیں گے اور انسان کی حقیقت بین نگاہیں کھلیں گی اور جب وہ ہمارے پاس آئے گا اور اس کا ساتھی بھی اسی طرح اس کے ہمراہ ہوگا، وہی ساتھی جو اس کی تمام تر تباہیوں کا باعث تھا، تو وہ پکار پکار کر کہے گا کہ اے کاش! مجھ میں اور تجھ میں مشرق اور مغرب کا فاصلہ ہوتا اور تو کیا ہی بُرا ساتھی ہے" (حتّٰی اذا جاءنا قال یالیت بینی وبینک بعد المشرقین فبئس القرین)۔

تمام عذاب ایک طرف اور اس بُرے ساتھی کی صحبت ایک طرف، ایسے شیطان کی صحبت جو اسے ہر وقت نفرت کی نگاہوں سے دیکھتا رہتا ہے، گمراہی اور بدبختی کی تمام یادیں اس کی نگاہ کے سامنے مجسم ہو کر آجائیں گی۔ وہی شیطان جو تمام برائیوں کو اس کے سامنے اچھائیاں بنا کر اور غلط راہ کو صحیح راستے کی صُورت میں اور گمراہی کو ہدایت کی صُورت میں پیش کرتا تھا ہائے افسوس! وہی اس کا ہمیشہ کا ساتھی اور ہم رکاب ہے۔

جی ہاں اس دنیا میں رونما ہونے والے واقعات کو قیامت کے میدان میں وسیع تر صُورت میں مجسم کر کے پیش کیا جائے گا اور جو ساتھی، دوست اور راہنمائیاں پر ہوگا وہی وہاں پر ہوگا۔ حتّٰی کہ بعض مفسرین کے بقول وہاں پر دونوں دوست ایک ہی زنجیر میں جکڑے ہوں گے۔

ظاہر سی بات کہ "مشرقین" (دو مشرق) سے مراد مشرق اور مغرب ہیں کیونکہ عربوں کی عادت ہے کہ جب وہ دو مختلف ہم جنس چیزوں کو تثنیہ بنانا چاہتے ہیں تو ان میں سے ایک لفظ کو لے کر تثنیہ بنا دیتے ہیں۔ جیسے "شمسین" (سُورج اور چاند کی طرف اشارہ ہے) "ظهرین" (نماز ظہر و عصر کی طرف اشارہ ہے) اور "عشائین" (نماز مغرب و عشاء کی طرف اشارہ ہے)

مفسرین نے اس بارے میں اور بھی تفاسیر ذکر کی ہیں لیکن زیرِ تفسیر آیت میں کوئی بھی تفسیر مناسب معلوم نہیں ہوتی۔ مثلاً سردیوں کے آغاز کی مشرق یا گرمیوں کی ابتدا کی مشرق، اگرچہ دوسرے مقامات پر مناسب ہے۔

صُورت حال خواہ کچھ ہو یہ تعبیر دور ترین قابل تصور فاصلے کو بیان کر رہی ہے۔ کیونکہ "مشرق و مغرب کی دوری" اس بارے میں ایک مشہور محاورہ ہے۔

لیکن یہ آرزو کبھی پوری نہیں ہوگی اور ان لوگوں کے اور شیطانوں کے درمیان کبھی جدائی واقع نہیں ہوگی۔ اسی لیے بعد کی آیت میں فرمایا گیا ہے: آج اس قسم کی گفتگو اور پشیمانی ہرگز تمھیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی کیونکہ تم ظلم کر چکے ہو اور نتیجے کے طور پر تم عذاب میں شریک ہو۔ (ولن ینفعکم الیوم اذ ظلمتم انکم فی العذاب مشترکون)۔

تمھیں چاہیئے کہ تم اس بُرے ساتھی کے عذاب کے ساتھ اور عذاب کا مزہ بھی ہمیشہ کے لیے چکھتے رہو۔[1]

اس طرح سے ان کی شیاطین سے جدائی کی آرزو ہمیشہ کے لیے نا اُمیدی میں بدل جائے گی اور اس ساتھی کی صحبت

---

[1] اس طرح "ینفع" کا فاعل وہی سابقہ گفتگو ہے جس میں انہوں نے اپنے اور شیطان کے درمیان مشرق و مغرب کے فاصلے کی آرزو کی ہے اور "اذ ظلمتم" کا نفع نہ پہنچانے کا سبب بیان کر رہا ہے اور "انکم فی العذاب مشترکون" کا جُملہ اسی ظلم کا نتیجہ ہے۔

کس قدر رُوح فرسا ہوگی۔

اس آیت کی تفسیر میں اور بھی کئی احتمال ذکر کیے گئے ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب انسان اپنے ہمدردوں کو دیکھتا ہے تو اس کا دُکھ درد بھی کسی حد تک کم ہو جاتا ہے کیونکہ مثل مشہور ہے کہ۔

"البلیۃ اذا عمت طابت"

"جب مصیبت عمومی حیثیت اختیار کر لیتی ہے تو قابلِ قبول بن جاتی ہے"

لیکن اس موقع پر بھی ان سے کہا جائے گا "یہاں پر اس قسم کی تسلی بھی تمہارے لیے نہیں ہے بلکہ تم عذاب میں اس حد تک غرق ہو چکے ہو کہ تمہارے ہم رکاب شیطان کا عذاب بھی تمہیں قلبی سکون فراہم نہیں کر سکتا۔ [1]

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو انسان اس کے نتائج کو اپنے دوستوں میں بانٹ دیتا ہے، جس سے کسی حد تک مصیبت کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی وہاں نہیں ہوگی کیونکہ ہر ایک کے لیے عذاب الٰہی کا اپنا حصہ اس حد تک زیادہ ہوگا کہ دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھا سکے گا۔

لیکن چونکہ یہ آیت اپنے سے ماقبل آیت کے لیے تتمہ کی حیثیت رکھتی ہے لہٰذا وہی پہلی تفسیر کہ جسے ہم نے منتخب کیا ہے زیادہ مناسب ہے۔

یہاں پر قرآن مجید نے ان لوگوں کو اپنے حال پر چھوڑتے ہوئے روئے سخن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کر لیا ہے اور ان دل کے اندھے غافل افراد کے بارے میں گفتگو شروع کر دی ہے جو ہمیشہ آپ کو جھٹلاتے تھے اور گزشتہ آیات میں مذکور لوگوں کی قسم سے تھے۔ چنانچہ فرماتا ہے:

"آیا آپ بہروں کو سنا سکتے ہیں؟ یا اندھوں کو ہدایت کر سکتے ہیں؟ یا ان لوگوں کو راہ راست کی دعوت دے سکتے ہیں جو کھلم کھلا گمراہی میں ہیں اور اس گمراہی کا احساس بھی نہیں کرتے؟" (افانت تسمع الصم او تھدی العمی ومن کان فی ضلال مبین)۔

اس طرح کا ایک اور تذکرہ بھی قرآن مجید کی دوسری آیات میں آچکا ہے جن میں ہٹ دھرم، ناقابل ہدایت، بے بصیرت اور گناہوں میں مستغرق ہوس پرستوں کو اندھوں، گونگوں، بلکہ مُردوں سے تشبیہ دی گئی ہے، چنانچہ سورۂ یونس کی آیت ۴۲ میں ہم پڑھتے ہیں:

"افانت تسمع الصم ولو کانوا لا یعقلون"

"تو کیا آپ اپنی آواز کو بہروں تک بھی پہنچا سکتے ہیں، اگرچہ وہ عقل سے کام نہ بھی لیں؟"

سورۂ نمل کی آیت ۸۰ میں ہے کہ:

"انک لا تسمع الموتی ولا تسمع الصم الدعاء اذا ولوا مدبرین"

---

[1] اس تفسیر کی بنا پر "انکم فی العذاب مشترکون" کا جملہ "ینفع" کا فاعل بنے گا نہ کہ اس کا متعلق۔

"آپ نہ تو مُردوں کے کانوں تک اپنی آواز پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی بہروں کو اپنی طرف متوجہ کر سکتے ہیں
کہ جب وہ مُنہ پھیر کر پیٹھ کر لیتے ہیں"

اسی طرح کی اور بھی کئی آیات ہیں۔

اس قسم کی تصریحات اس لیے ہیں کیونکہ قرآن مجید کے نزدیک انسان کے لیے" دو قسم کے کان، دو قسم کی آنکھیں اور دو قسم کی زندگیاں ہوتی ہیں۔ ایک ظاہری اور دوسری باطنی۔ ان میں سے دوسری قسم زیادہ اہم ہے۔ کیونکہ اگر انسان کے باطنی ادراک اور حیات بے کار ہو جائیں تو نہ تو اس میں کوئی وعظ و نصیحت مؤثر ہو سکتی ہے اور نہ ہی تنبیہ اور دھمکی !!

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ گزشتہ آیات میں ایسے لوگوں کو ان افراد سے تشبیہ دی گئی تھی جن کی آنکھیں کمزور اور نگاہ محدود ہوتی ہے۔ لیکن اس آخری آیت میں انہیں بہروں اور اندھوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب انسان دُنیا کے ساتھ مشغول ہو جاتا ہے تو اس وقت اس شخص کی مانند ہوتا ہے جس کی آنکھیں تھوڑی بہت حد تک دیکھتی ہیں۔ لیکن جُوں جُوں دنیا کے ساتھ اس کی مشغولیت بڑھتی جاتی ہے، مادیات کی طرف اس کے رجحان میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور روحانیت سے بے اعتنائی زیادہ ہو جاتی ہے تو نگاہ میں کمی کے مراحل بھی بڑھتے جاتے ہیں، مختصر دردے پہلے تو نگاہ میں کمی کا مرحلہ آتا ہے اور پھر نوبت نابینائی تک جا پہنچتی ہے۔ یہ وہی چیز ہے جس نے ان قطعی دلائل کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا ہے کہ انسان کا کسی عمل پر اصرار اور تکرار اس کے وجُود میں مثبت یا منفی اثرات کی شدت اور ملکہ کے راسخ ہونے کا سبب بنتا ہے۔ اور قرآن پاک نے بھی اسی ترتیب کو ملحوظ رکھا ہے۔[1]

---

[1] تفسیر کبیر از فخر رازی جلد ۲۰ صفحہ ۲۱۴ و صفحہ ۲۱۵۔

۴۱۔ فَإِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَإِنَّا مِنْهُمْ مُنْتَقِمُونَ ۝
۴۲۔ أَوْ نُرِيَنَّكَ الَّذِي وَعَدْنَاهُمْ فَإِنَّا عَلَيْهِمْ مُقْتَدِرُونَ ۝
۴۳۔ فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِي أُوحِيَ إِلَيْكَ ۖ إِنَّكَ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝
۴۴۔ وَإِنَّهُ لَذِكْرٌ لَكَ وَلِقَوْمِكَ ۖ وَسَوْفَ تُسْأَلُونَ ۝
۴۵۔ وَاسْأَلْ مَنْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُسُلِنَا أَجَعَلْنَا مِنْ دُونِ الرَّحْمَٰنِ آلِهَةً يُعْبَدُونَ ۝

ترجمہ

۴۱۔ تو اگر ہم تجھے ان کے درمیان سے لے جائیں تو ہم ان کو سزا ضرور دیں گے۔
۴۲۔ یا اگر تیری ہی زندگی میں جس عذاب کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے تجھے دکھا دیں۔ پھر بھی ہم ان پر ہر طرح سے قابو رکھتے ہیں۔
۴۳۔ جو کچھ تجھ پر وحی کی گئی ہے تو اسے مضبوطی سے تھامے رہ کہ یقیناً تو سیدھی راہ پر ہے۔
۴۴۔ اور یہ تیرے لیے اور تیری قوم کے لیے یاد آوری کا ایک ذریعہ ہے اور عنقریب تم لوگوں سے باز پرس کی جائے گی۔
۴۵۔ اور ہم نے تجھ سے پہلے اپنے جتنے پیغمبر بھیجے ہیں ان سب سے دریافت کر دیکھ۔ آیا ہم نے رحمان خدا کے علاوہ ہم نے اور معبود ان کی پرستش کے لیے مقرر کیے تھے؟

تفسیر

دامن وحی مضبوطی سے پکڑے رہیں

گذشتہ آیات میں ہٹ دھرم اور ناقابل ہدایت کفار اور ظالمین کے ذکر کے بعد زیر تفسیر آیات میں رُوئے سخن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کرکے ایسے لوگوں کو شدید تنبیہ اور اور پیغمبر اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی تسلی اور دلجوئی کی خاطر ارشاد فرمایا گیا ہے: اگر ہم تجھے ان کے درمیان سے لے جائیں تو ہم ان سے ضرور انتقام لیں گے اور انہیں ضرور سزا دیں گے:

(فاما ننذهبن بك فانا منهم منتقمون)۔

اس قوم کے درمیان سے پیغمبرؐ کے لے جانے سے مراد خواہ رسولؐ پاک کی وفات ہو یا مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت دونوں صورتوں میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر آپؐ شاہد اور ناظر نہ بھی ہوں اور وہ لوگ اپنی اسی روش پر باقی رہیں پھر بھی ہم ان کو سخت سزا دیں گے۔ کیونکہ دراصل "انتقام" کا معنی سزا دینا ہے۔ ہر چند کہ متعدد دوسری قرآنی آیات سے جو اس بارے میں نازل ہوئی ہیں یہ بات سمجھ آتی ہے کہ پیغمبرؐ کو "لے جانے" سے مراد آپ کی وفات ہے جیسا کہ سورۂ یونس کی ۴۶ ویں آیت میں ہے:

"واما نرينك بعض الذى نعدهم او نتوفينك فالينا مرجعهم ثم الله شهيد على ما يفعلون"

"اگر ہم آپ کی زندگی میں ان کو کچھ وہ سزائیں دیں جن کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے، یا آپ کو یہاں سے اُٹھالیں اور آپ انھیں نہ دیکھ پائیں، ہر حالت میں اس کی بازگشت ہماری طرف ہے اور خدا ان اعمال کا گواہ ہے جو وہ انجام دیتے رہتے ہیں"

یہی چیز سورہ رعد کی چالیسویں اور سورۂ مومن کی ۷۷ ویں آیت میں بھی آچکی ہے۔ لہٰذا زیر نظر آیت سے ہجرت مراد لینا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: اگر تو زندہ بھی رہے اور ہم نے ان سے جس عذاب کا وعدہ کیا ہے، وہ دکھا بھی دیں پھر بھی ہم ان پر ہر طرح سے قابو رکھتے ہیں (او نرينك الذى وعدناهم فانا عليهم مقتدرون)۔

وہ ہر حالت میں ہمارے قابو میں ہیں، خواہ آپ ان لوگوں کے درمیان موجود ہوں یا نہ ہوں اور ان کی اسی روش پر قائم رہنے کی صورت میں یہ لوگ ہمارے انتقام اور ہماری سزا سے نہیں بچ سکتے، خواہ ان کا یہ انجام آپؐ کی زندگی میں ہو خواہ آپ کی وفات کے بعد جلدی یا دیر تو ہوسکتی ہے لیکن بچ ہرگز نہیں سکتے۔

قرآن کی یہ تاکید ممکن ہے ایک طرف تو کفار کی اس بے تابی کی طرف اشارہ ہو جو وہ کہتے تھے:

اگر تو سچ کہتا ہے تو پھر ہم پر وہ مصیبت نازل کیوں نہیں ہوتی۔

دوسری جانب ممکن ہے ان کی طرف سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موت کے انتظار کی طرف اشارہ ہو کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ جونہی آپ اس دُنیا سے تشریف لے جائیں گے ساری بات ختم ہو جائے گی۔

اس تنبیہ کے بعد رسُولِ پاکؐ کو خدا کی طرف سے حکم ملتا ہے: تیری طرف جو وحی کی گئی ہے تو اسے مضبوطی سے تھامے رہ کیونکہ تو یقیناً سیدھی راہ پر ہے۔ (فاستمسك بالذی اوحی الیك انك علیٰ صراط مستقیم)۔

تیری کتاب اور طرزِ عمل میں ذرہ بھر کجی اور ٹیڑھا پن نہیں ہے اور کفار و مشرکین کے ایک ٹولے کا انھیں قبول نہ کرنا تیری حقانیت کی نفی کی دلیل نہیں بن سکتا۔ تو اپنے اس سلسلے کو پوری طرح سے جاری رکھ باقی سب ہمارے ذمہ ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: یہ قرآن کہ جس کی تجھ پر وحی کی گئی ہے تیرے لیے اور تیری قوم کے لیے یاد آوری کا ایک ذریعہ ہے (وانه لذكر لك ولقومك)۔

اسکے نزول کا مقصد ہی لوگوں کو بیدار کرنا اور ان کے فرائض سے انھیں آگاہ کرنا ہے۔

"اور تم لوگوں سے عنقریب ہی باز پرس کی جائے گی" کہ تم نے اس خدائی پروگرام اور اس آسمانی وحی کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ (وسوف تسئلون)۔

اس تفسیر کے مطابق مندرجہ بالا آیت میں "ذکر" سے مراد "ذکر اللہ" اور دینی فرائض سے آشنائی اور آگاہی ہے۔ جیسا کہ اسی سُورت کی پانچویں اور چھتیسویں آیات میں بھی یہ بات آئی ہے، قرآن کی بہت سی دوسری آیات کے مانند۔

اصولی طور پر قرآن مجید کا ایک نام "ذِکر" بھی ہے، ذکر بھی وہ کہ جو یاد آوری اور ذکر اللہ ہے اور سُورۂ قمر میں تو یہ جُملہ متعدد بار آیا ہے:

"ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مذکر"

"یعنی ہم نے قرآن مجید کو یاد آوری کے لیے آسان اور سہل بنا دیا ہے آیا کوئی ہے جو یاد دے کام لے"؟

ملاحظہ ہو اسی سُورت کی آیات نمبر ۱۷، ۲۲، ۳۲ اور ۴۰۔

اس کے علاوہ "وسوف تسئلون" کا جُملہ اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ یہاں پر سوال سے مراد اس خدائی پروگرام پر عمل کے بارے میں پُوچھ گچھ ہے۔

ان تمام باتوں کے باوجود اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ اس آیت کے لیے بہت سے مفسرین نے ایک اور تفسیر کا انتخاب کیا ہے جو مذکورہ تفسیر سے مناسبت نہیں رکھتی۔ منجملہ انھوں نے یہ کہا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے:

"یہ قرآن تیرے اور تیری قوم کے لیے سرمایہ شرف و آبرو یا ذکرِ خیر ہے اور عرب و قریشی یا تیری اُمت کو شرف عطا کرتا ہے کیونکہ انہی کی زبان میں نازل ہوا ہے اور اس نعمت الٰہی کے بارے میں عنقریب ان سے باز پُرس ہوگی۔"[1]

---

[1] ملاحظہ ہو تفسیر مجمع البیان، تفسیر کبیر فخر رازی، تفسیر قرطبی، تفسیر مراغی اور تفسیر ابوالفتوح، انہی آیات کے ذیل میں۔

یہ ٹھیک ہے کہ قرآن مجید نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور عربوں بلکہ تمام مسلمانوں کو ساری کائنات میں شہرت دی ہے اور چودہ سو سال سے زیادہ عرصے سے پیغمبر اکرمؐ کا نام ہر صبح و شام گلدستۂ اذان پر عظمت و احترام کے ساتھ لیا جارہا ہے۔ زمانۂ جاہلیت کے بے نام و نشان عربوں کو نام ملا ہے اور اسی کے پرتو میں اُمتِ اسلامیہ کو شرف اور سربلندی نصیب ہوئی ہے۔

اور یہ بات بھی ٹھیک ہے کہ قرآن میں کہیں کہیں پر "ذکر" کا لفظ اس معنی میں بھی آیا ہے، لیکن اس میں بھی شک نہیں ہے کہ پہلا معنی قرآنی آیات میں زیادہ وسعت رکھتا ہے اور نزولِ قرآن اور زیرِ بحث آیات کے مقاصد سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔

بعض مفسرین نے سورۂ انبیاء کی دسویں آیت کو دوسری تفسیر پر شاہد قرار دیا ہے۔ آیت یہ ہے:

"لقد انزلنا الیکم کتابا فیہ ذکرکم افلا تعقلون"

"ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب نازل کی ہے کہ جس میں تمہاری یاد کا ذریعہ ہے آیا تم عقل سے کام نہیں لیتے"؟ [1]

حالانکہ یہ آیت بھی پہلی تفسیر کے لیے زیادہ موزون ہے، جیسا کہ ہم تفسیر نمونہ کی تیرھویں جلد میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ [2]

اس آیت کے ذیل میں حدیث کی کتابوں میں کچھ روایات ذکر ہوئی ہیں، جو بعد میں بیان کی جائیں گی۔

پھر بت پرستی کی نفی اور مشرکین کے عقاید باطل کرنے کے لیے ایک اور دلیل پیش کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اور ہم نے تجھ سے پہلے جتنے پیغمبر بھیجے ہیں ان سب سے دریافت کر دیکھ، آیا ہم نے رحمان خدا کے علاوہ اور معبود قرار دیئے تھے کہ ان کی عبادت کی جائے۔ (و سئل من ارسلنا من قبلک من رسلنا اجعلنا من دون الرحمٰن آلھۃ یعبدون)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تمام انبیاءؑ نے توحید کی طرف بلایا ہے اور سب نے دو ٹوک الفاظ میں بت پرستی کی مذمت کی ہے بنا بریں پیغمبر اسلامؐ نے بتوں سے اپنی مخالفت کے سلسلے میں کوئی نیا کام انجام نہیں دیا۔ بلکہ انبیاء علیہم السلام کی دائمی سُنّت کا احیاء فرمایا ہے اور یہ بت پرست اور مشرکین ہی ہیں جنہوں نے تمام انبیاء کے مکتب کے خلاف قدم اٹھایا ہے۔

اس تفسیر میں اگرچہ مخاطب حضرت رسُول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی ہیں لیکن مراد تمام اُمت ہے حتیٰ کہ آپؐ کے مخالفین بھی۔

اور جن سے سوال کیا جاتا ہے وہ انبیائے ماسلف کے پیروکار ہیں۔ البتہ سچے اور قابلِ اعتماد پیروکار بھی اور عام پیروکار

---

[1] تفسیر قرطبی اپنی آیات کے ذیل میں۔

[2] ایک اور بات جو مشہور تفسیر کے لیے دلیل بن سکتی ہے وہ لفظ "قوم" کے بارے میں ہے جو مندرجہ بالا آیات میں مذکور ہے وہ یہ کہ قرآن مجید ساری دُنیا کے لوگوں کے لیے یاد آوری کا ایک ذریعہ ہے، نہ صرف پیغمبر اکرمؐ کی قوم یا ملت اسلامیہ کے لیے۔ لیکن یہ بات بھی جواب طلب ہے، کیونکہ مذکورہ گروہ دوسروں سے پہلے قرآن سے بہرہ مند ہوئے ہیں، اسی لیے ان کے ذکر پر زور دیا گیا ہے۔

بھی کیونکہ ان کے مجموعی اقوال سے "خبر متواتر" دستیاب ہو گی جو انبیاء علیہم السلام کے توحیدی مکتب کی مظہر ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اصول توحید سے روگردانی کرنے والے (موجودہ دور کے عیسائی جو تثلیث کے پیروکار ہیں) تک توحید کا دم بھرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہماری تثلیث، توحید کے منافی نہیں ہے جو تمام انبیاء کا دین ہے اسی لیے ان امتوں کی طرف رجوع بھی مشرکین کے دعوٰی کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔

لیکن کچھ مفسرین نے بعض روایات کی روشنی میں ایک اور تفسیر کا احتمال ذکر کیا ہے۔[1]

وہ یہ کہ سوال کرنے والے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور سوال کیے جانے والے خود انبیائے ماسلف ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ واقعہ شب معراج پیش آیا کیونکہ آنحضرتؐ نے وہاں پر انبیائے ماسلف کی ارواح سے رابطہ قائم کیا اور امر توحید کی تاکید کے لیے ان سے سوال کیا اور جواب پایا۔

بعض مفسرین یہ بھی کہتے ہیں کہ شب معراج کے علاوہ بھی یہ رابطہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے امکان پذیر تھا کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے انبیائے ماسلف کی ارواح سے رابطے کے لیے زمانی اور مکانی فاصلے رکاوٹ نہیں بن سکتے تھے اور پیغمبر گرامی قدر ہر لمحہ اور ہر جگہ ان سے رابطہ قائم کر سکتے تھے۔

البتہ ان تفسیروں میں کوئی عقلی مشکل موجود نہیں ہے۔ لیکن آیت کا مقصد مشرکین کے مذہب کی نفی کرنا ہے کہ رسولِ پاک کو تسلی دینا، کیونکہ رسولِ پاک مسئلہ توحید میں اس قدر مستغرق اور شرک سے اس قدر بیزار تھے کہ سوال کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں فرماتے تھے اور مشرکین کے مقابلے کے لیے دلیل قائم کرنے کے لیے رسول اللہؐ کا انبیائے ماسبق کی ارواح سے روحانی رابطہ قائم کرنا انہیں مانع نہیں کر سکتا تھا۔ لہذا پہلی تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے اور ممکن ہے کہ دوسری تفسیر آیت کے باطنی معنی کی طرف اشارہ ہو، کیونکہ قرآنی آیات کا ظاہر بھی ہوتا ہے اور باطن بھی۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں خدا کے ناموں سے ایک نام "رحمان" کو ذکر کیا گیا ہے جو اس سوال کی طرف اشارہ ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ایسے خدا کو چھوڑ دیں جس کی رحمت عام اور سب پر محیط ہے اور ان بتوں کے پیچھے لگ جائیں جن سے کسی قسم کی اچھائی یا برائی کی کوئی توقع نہیں ہے۔

پیغمبر کی قوم کون لوگ ہیں؟

"وانہ لذکر لک ولقومک" والی آیت کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس میں مذکور "قوم" سے کون لوگ مراد ہیں؟ چنانچہ اس بارے میں تین احتمال ہیں۔

ایک تو تمام اُمت مسلمہ، دوسرے عرب قوم اور تیسرے قبیلہ قریش۔

---

[1] یہ روایات تفسیر قرطبی، تفسیر فخر رازی اور تفسیر مجمع البیان میں ابن عباس سے منقول ہیں۔ اور تفسیر نور الثقلین میں اس بارے میں دو مفصل روایتیں "احتجاج طبرسی" اور تفسیر علی بن ابراہیم سے منقول ہیں۔ (دیکھئے تفسیر نمونہ جلد نہم)۔

چونکہ قرآنی نظر سے بہت سی آیات میں "قوم" کا لفظ انبیاء کی اُمتوں یا ان کی معاصر اقوام کے لیے استعمال ہوا ہے لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر بھی یہی معنی پیشِ نظر ہیں۔

اس صورت میں قرآن مجید تمام اسلامی اُمتوں کے لیے ذکر و آگاہی کا سبب ہوگا (پہلی تفسیر کے مطابق) اور ان سب کے لیے سرمایہ شرف و افتخار ہوگا (دوسری تفسیر کے مطابق)

لیکن اہلبیت علیہم السلام کے ذرائع سے ہم تک پہنچنے والی متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آئمہ معصومین علیہم السلام فرماتے ہیں کہ اس آیت میں "قوم" سے مراد ہم لوگ یعنی اہل بیت پیغمبر ہیں۔[1]

لیکن کوئی بعید نہیں ہے کہ وہ آیت کا ایک روشن مصداق ہوں۔ قوم کا مفہوم خواہ تمام اسلامی امتیں ہوں یا عرب اقوام یا پھر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قبیلہ، ہر صورت میں ائمہ اہل بیت علیہم السلام اس کا واضح ترین مصداق ہیں۔

---

[1] ان احادیث کو تفسیر نور الثقلین کے مؤلف نے جلد چہارم صفحہ ۶۴ تا صفحہ ۶۵ میں جمع کر دیا۔

۴۶۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَقَالَ اِنِّیْ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○

۴۷۔ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِاٰیٰتِنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا یَضْحَكُوْنَ ○

۴۸۔ وَمَا نُرِیْهِمْ مِّنْ اٰیَةٍ اِلَّا هِیَ اَكْبَرُ مِنْ اُخْتِهَا ۫ وَاَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ○

۴۹۔ وَقَالُوْا یٰۤاَیُّهَ السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ ○

۵۰۔ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِذَا هُمْ یَنْكُثُوْنَ ○

ترجمہ

۴۶۔ اور ہم ہی نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے درباریوں کے پاس بھیجا تو (اس نے ان سے) کہا، میں سارے جہانوں کے پالنے والے خدا کا رسول ہوں۔

۴۷۔ لیکن جب وہ ان کے پاس ہماری آیات لے کر آیا تو وہ لوگ اس کی ہنسی اڑانے لگے۔

۴۸۔ اور ہم جو آیت (اور معجزہ) ان کو دکھاتے تھے وہ دوسرے سے بڑھ کر (اور اہم تر) ہوتا تھا اور انہیں سزا کے ذریعے متنبہ کیا تاکہ وہ باز آجائیں۔

۴۹۔ اور جب وہ عذاب میں مبتلا ہوئے تو کہنے لگے اے جادوگر! اس وعدے کے

مطابق جو تمہارے پروردگار نے تم سے کیا ہے ہمارے واسطے دُعا کر (تاکہ وہ ہمیں اس درد و رنج سے نجات دے) ہم ضرور ہدایت پر آجائیں گے۔

۵۰۔ لیکن جب ہم ان سے عذاب ہٹا دیتے تو وہ اپنا عہد توڑ ڈالتے۔

تفسیر

مغرور اور عہد شکن فرعونی

ان آیات میں خدا کے رسول حضرت "موسیٰ بن عمران" کے کچھ حالات اور ان کی فرعون کے ساتھ ملاقات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے تاکہ مشرکین کی ان بے بنیاد باتوں کا جواب دیا جائے کہ جو وہ کہتے تھے "اگر چہ، خدا نے کوئی پیغمبر ہی بھیجنا تھا تو مکہ یا طائف کے کسی دولت مند شخص کو اس عظیم منصب پر فائز کیوں نہیں کیا؟"

فرعون نے بھی مُوسیٰ علیہ السلام پر یہی اعتراض کیا تھا اور اس کی بھی بالکل یہی منطق تھی۔ فرعون نے مُوسیٰ علیہ السلام کو بھی اُونی لباس اور سونے چاندی کے زیورات نہ رکھنے کی بنا پر طعن و تشنیع کی تھی۔

چنانچہ زیرِ نظر پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: اور ہم ہی نے مُوسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف بھیجا: (ولقد ارسلنا موسیٰ بآیاتنا الیٰ فرعون وملائہ)۔

"(تو مُوسیٰ نے ان سے) کہا: میں سارے جہانوں کے پالنے والے خدا کا رسُول ہوں" (فقال انی رسول رب العالمین)۔

"آیات" سے مراد وہ معجزے ہیں جو مُوسیٰؑ کے پاس تھے اور وہ اپنی حقانیت کو انہی معجزات کے ذریعے ثابت کیا کرتے تھے۔ ان میں سے دو اہم معجزات تھے: ایک "عصا" اور دوسرا "یدِ بیضاء"

اور جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں "ملاء" (بروزن خلاء) "ملا" (بروزن خلع) کے مادہ سے ہے، جس کا معنیٰ ہے ایسا گروہ جس کے تمام افراد کا ایک ہی مشترکہ ہدف ہو اور دیکھنے میں بہت بڑی تعداد نظر آئے، قرآن مجید میں عموماً اشراف، دولت مندوں یا درباریوں کے لیے یہ لفظ بولا گیا ہے۔

"رب العالمین" کا تذکرہ درحقیقت دعویٰ کے ساتھ دلیل کے لحاظ سے ہے۔ کیونکہ صرف وہی عبودیت کے لائق ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار اور ان کا مالک اور مربی ہے، نہ کہ فرعون اور بتوں جیسی محتاج اور نیازمند مخلوق۔

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ مُوسیٰ علیہ السلام کے منطقی دلائل اور واضح معجزات کے مقابلے میں فرعون اور فرعونیوں کا پہلا ردِّ عمل کیا تھا۔ اس بارے میں قرآن بعد کی آیتوں میں فرماتا ہے: لیکن جب مُوسیٰؑ ان کے پاس ہمارے معجزے لے کر آئے تو وہ سب اس

پر ہنستے تھے۔ (فلما جاءھم بآیاتنا اذا ھم منھا یضحکون)۔

سچے راہنماؤں کے خلاف تمام طاغوتوں اور متکبروں کا یہی پہلا ردعمل ہوتا ہے۔ ان کی دعوت اور دلائل کو سنجیدہ نہ سمجھنا اور سب کا ہنسی مذاق اُڑا کر ان کی دعوت کا جواب دینا ان کا شیوہ ہوتا ہے تاکہ اس طرح سے وہ دوسرے لوگوں کو سمجھا سکیں کہ سرے سے ان رہبروں کی دعوت نہ تو کسی قسم کے غور کے قابل ہے اور نہ ہی اس کے لیے کسی جواب کی ضرورت ہے اور نہ ہی اس کا سنجیدگی سے نوٹس لینے کی ضرورت ہے۔

لیکن ہم اتمام حجت کے طور پر اپنی آیات اور نشانیاں یکے بعد دیگرے بھیجتے رہے "اور ہم جو آیت (اور معجزہ) ان کو دکھاتے تھے وہ دوسرے سے بڑھ کر (اور اہم تر) ہوتا تھا" (وما نریھم من آیۃ الا ھی اکبر من اختھا)۔[1]

غرض ہم نے اپنی نشانیاں انھیں دکھائیں جن میں سے ہر ایک دوسری سے زیادہ اہم، زیادہ واضح اور زیادہ دندان شکن تھی۔ تاکہ ان کی طرف سے کوئی بہانہ باقی نہ رہ جائے اور وہ غرور، نخوت اور خود خواہی کو ترک کر دیں۔

اس طرح سے ہم نے "عصا" اور "یدِ بیضا" جیسے معجزوں کے بعد طوفان، ٹڈی دل، جوؤں اور مینڈکوں وغیرہ جیسے معجزے انھیں دکھائے۔[2]

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: ہم نے انہیں متنبہ کرنے والے عذابوں اور سزاؤں میں مبتلا کر دیا شاید کہ وہ بیدار ہو جائیں اور راہ حق کی طرف لوٹ آئیں (واخذناھم بالعذاب لعلھم یرجعون)۔

خشک سالی، قحط اور پھلوں کی کمی نے انہیں آلیا۔ جیسا کہ سورۂ اعراف کی آیت ۱۳۰ میں ہے:

"ولقد اخذنا آل فرعون بالسنین ونقص من الثمرات"

کبھی دریائے نیل کا پانی خون کا رنگ اختیار کر لیتا جو نہ تو پینے کے قابل ہوتا اور نہ ہی آب پاشی کے اور کبھی زرعی آفات ان کے اناج کو نیست و نابود کر دیتیں۔

یہ تلخ اور دردناک حوادث اگرچہ وقتی طور پر ان کو بیدار کر دیتے تھے اور وہ حضرت موسیٰ کا دامن پکڑتے تھے لیکن جب مصیبت ٹل جاتی تو وہ سب کچھ بھلا دیتے تھے اور موسیٰ علیہ السلام پر تہمتوں کے تیر چلاتے تھے۔

جیسا کہ بعد کی آیت میں ہے: انہوں نے کہا اے جادوگر! اس عہد کے مطابق جو تیرے پروردگار نے تجھ سے کیا ہے ہمارے واسطے دعا کر تاکہ وہ ہمیں اس درد و رنج اور بلا و مصیبت سے نجات دے اور مطمئن رہ کر ہم ہدایت کی راہ کو ضرور اختیار کریں گے۔ (وقالوا یا ایھا الساحر ادع لنا ربک بما عھد عندک انا لمھتدون)۔

---

[1] "اخت" (بہن) لغت عرب میں ہم قدم اور ہم جنس چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، جس طرح دو بہنوں کی آپس میں نسبت ہوتی ہے۔

[2] حضرت موسیٰ بن عمران کے نو معجزات کی تفصیل تفسیر نمونہ جلد ۱۲ میں سورۂ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۱۰۱ کے ذیل میں بیان ہو چکی ہے۔

یہ عجیب بات ہے، ایک طرف تو حضرت موسیٰؑ کو ساحر کہتے ہیں اور دوسری طرف بلاؤں اور مصیبتوں کے دُور کرنے کے لیے ان کے دست بداماں ہوتے ہیں اور تیسری طرف ان سے ہدایت اپنانے کا وعدہ کرتے ہیں۔

ان تینوں امور کا ظاہری باہمی عدم تناسب مختلف تفسیروں کا سبب بن گیا ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہاں پر "ساحر" بمعنی "عالم" کے ہے کیونکہ اس زمانے میں خاص کر مصر کے علاقے میں ساحروں کو محترم سمجھا جاتا تھا اور انھیں دانشور کی حیثیت سے دیکھا جاتا تھا۔

بعض کا خیال ہے کہ یہاں پر "سحر" کا معنی ایک اہم کام بجالانا ہے۔ جیسے ہم اپنی روزمرہ کی گفتگو میں کہتے ہیں کہ "فلاں شخص اپنے کام میں اس حد تک ماہر ہے گویا جادو کرتا ہے"۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے عام لوگوں کے ذہن میں جادوگر مراد ہے۔ اس طرح کی کئی دوسری تفسیریں بھی ہیں۔

لیکن خود پسند جاہلوں، مغروروں اور ظالم طاغوتوں کے اندازِ گفتگو سے واقف لوگ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ ان کے ہاں متناقص باتیں ملتی ہیں اور کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ پہلے انھوں نے حضرت موسیٰ کو جادوگر کہا ہو، پھر ان کے دامن سے متمسک ہوئے ہوں اور آخر میں ہدایت قبول کرنے کا وعدہ کیا ہو۔

اس طرح آیت کی تعبیرات باقی رہتی ہیں اور دوسری توجیہوں اور تفسیروں کی ضرورت نہیں پڑتی۔

بہرحال ان کے اندازِ گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ضرورت کے احساس کے باوجود ان سے جھوٹے وعدے کیا کرتے تھے، حتی کہ بے چارگی اور سخت ضرورت کو بیان کرتے وقت بھی وہ غرور کو نہیں چھوڑتے تھے۔ اس لیے انہوں نے "ربک" (تیرا رب) اور "بما عھد عندک" (اس نے جو وعدہ تجھ سے کیا ہے) کے الفاظ استعمال کیے اور کبھی نہیں کہا "ہمارا پروردگار" یا "جو وعدہ اس نے ہم سے فرمایا ہے"۔ حالانکہ موسیٰ علیہ السلام نے انھیں واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ "میں سارے جہانوں کے پروردگار کا رسول ہوں" نہ کہ "اپنے پروردگار" کا۔

جی ہاں جب سر پھرے مغرور، تختِ اقتدار پر متمکن ہو جاتے ہیں تو ان کی منطق ایسی ہی ہوتی ہے۔

لیکن موسیٰ علیہ السلام نے اس قسم کی چبھتی اور توہین آمیز گفتگو کی وجہ سے کبھی ان کی ہدایت سے دست کشی نہیں کی اور ان کی خیرسری پر مایوس نہیں ہوئے اور نہ ہی تھکنے کا نام لیا بلکہ اپنا کام برابر جاری رکھا۔ بارہا دُعا کی کہ طوفانِ بلا تھم جائے اور وہ تھم جاتا، لیکن جیسا کہ بعد کی آیت میں فرمایا گیا ہے: جب بھی ہم ان سے عذاب ہٹا دیتے وہ اپنا عہد توڑ ڈالتے۔ اور اپنی ہٹ دھرمی اور للکار پر قائم رہتے۔ (فلما کشفنا عنھم العذاب اذا ھم ینکثون)۔

یہ سب مسلمانوں کے لیے زندہ اور گویا درس ہیں اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دل جوئی اور تسلی کا باعث ہیں کہ وہ مخالفوں کی ہٹ دھرمی اور مخالفت سے ہرگز نہ گھبرائیں بلکہ اپنی انتھک کوششوں کو جاری رکھیں۔ خدا چاہتا ہے اُن کے قلب و رُوح پر مایوسی اور نا اُمیدی کی گرد نہ پڑے اور انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ

ع رگ رگ است ایں آب شیریں و آب شور

لہٰذا انھیں استقامت اور پامردی کے ساتھ پہلے سے زیادہ پیش قدمی کرنی چاہیئے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور

بنی اسرائیل نے کہا اور انجام کار وہ فرعون اور فرعونیوں پر غالب آئے۔

نیز یہ سخت اور ہٹ دھرم اور دشمنوں کے لیے ایک سخت تنبیہ ہے کہ وہ فرعون اور اس کے ساتھیوں سے نہ تو زیادہ طاقت ور ہیں اور نہ ہی ان جیسے صاحب اقتدار، لہٰذا ان کے کاموں کا انجام بھی دیکھ لیں اور اپنے کاموں کی عاقبت کے بارے میں بھی سوچ لیں۔

۵۱۔ وَنَادٰی فِرْعَوْنُ فِیْ قَوْمِهٖ قَالَ یٰقَوْمِ اَلَیْسَ لِیْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝

۵۲۔ اَمْ اَنَا خَیْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِیْ هُوَ مَهِیْنٌ ۙ وَّلَا یَكَادُ یُبِیْنُ ۝

۵۳۔ فَلَوْلَا اُلْقِیَ عَلَیْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِیْنَ ۝

۵۴۔ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ۝

۵۵۔ فَلَمَّاۤ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِیْنَ ۙ ۝

۵۶۔ فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّمَثَلًا لِّلْاٰخِرِیْنَ ۝ ع

ترجمہ

۵۱۔ اور فرعون نے اپنے لوگوں سے پکار کر کہا اے میری قوم! کیا مصر کی حکومت میری نہیں اور کیا یہ دریا میرے حکم سے نہیں بہ رہے۔ کیا تم دیکھ نہیں رہے ہو؟

۵۲۔ میں اس شخص سے برتر ہوں جو ایک پست خاندان اور طبقے سے تعلق رکھتا ہے اور صاف گفتگو بھی نہیں کر سکتا۔

۵۳۔ (اگر وہ سچ کہتا ہے تو پھر) اسے سونے کے کنگن کیوں نہیں دیئے گئے؟ یا یہ کہ اس کے ساتھ فرشتے کیوں نہیں آئے (تاکہ اس کی باتوں کی تصدیق کرتے)؟

۵۴۔ غرض فرعون نے (ان باتوں کے ذریعے) اپنی قوم کو احمق بنایا اور لوگوں نے اس

کی اطاعت کی ، بیشک وہ لوگ بدعمل تھے۔

۵۵۔ تو جب ان لوگوں نے ہمیں غضب ناک کر دیا تو ہم نے بھی ان سے بدلہ لیا اور ہم نے ان سب کو غرق کر دیا۔

۵۶ اور انھیں (عذاب میں) پیش قدم اور دوسروں کے لیے عبرت بنا دیا۔

تفسیر

مُوسیٰؑ کے پاس سونے کے کنگن کیوں نہیں ؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی منطق ایک طرف، ان کے مختلف معجزات دوسری طرف اور مصر کے لوگوں پر نازل ہونیوالی بلائیں جو مُوسیٰؑ کی دُعا کی برکت سے ٹل جاتی تھیں تیسری طرف، ان سب اسباب نے مجموعی طور پر اس ماحول پر گہرے اثرات ڈالے اور فرعون کے بارے میں لوگوں کے افکار کو ڈانواں ڈول کر دیا اور انھیں پُورے مذہبی اور معاشرتی نظام کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا۔

اس موقع پر فرعون نے اپنی دھوکہ دہی کے ذریعے موسیٰ علیہ السلام کا اثر مصری لوگوں کے ذہن سے ختم کرنے کی کوشش کی اور پست اقدار کا سہارا لیا جو اس ماحول پر حکم فرماتیں۔ اُنھیں اقدار کے ذریعے اپنا اور مُوسیٰ علیہ السلام کا موازنہ شروع کر دیا تاکہ اس طرح لوگوں پر اپنی برتری کو پایۂ ثبوت تک پہنچائے۔ جیسا کہ قرآن پاک انہی آیات میں فرماتا ہے۔

اور فرعون نے اپنے لوگوں کو پکار کر کہا : اے میری قوم ! آیا مصر کی وسیع و عریض سرزمین پہ میری حکومت نہیں ہے اور کیا یہ عظیم دریا میرے حکم سے نہیں بہ رہے اور میرے محلوں، کھیتوں اور باغوں سے نہیں گزرتے ہیں؛ کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟ (و نادیٰ فرعون فی قومہ قال یاقوم الیس لی ملک مصر وھذہ الانھار تجری من تحتی افلا تبصرون) [1]

لیکن مُوسیٰ کے پاس کیا ہے، کچھ بھی نہیں۔ ایک لاٹھی اور ایک ادنی لباس اور بس تو کیا اس کی شخصیت بڑی ہوگی یا میری؟ ؟ آیا وہ سچ بات کہتا ہے یا میں؟ اپنی آنکھیں کھولو اور بات اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرو۔"

---

[1] "وھذہ الانھار تجری من تحتی" میں موجود "واؤ" ممکن ہے کہ "عاطفہ" اور اس کا عطف "ملک مصر" پر اور ممکن ہے کہ "حالیہ" ہو۔ (تفسیر کشاف) لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اس طرح فرعون نے مصنوعی اقدار کو لوگوں کے سامنے پیش کیا، بالکل ویسے ہی جیسے عصر جاہلیت کے بُت پرستوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلے میں مال ومقام کو صحیح انسانی اقدار سمجھ رکھا تھا۔

لفظ "نادیٰ" (پکار کر کہا) سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعون نے اپنی مملکت کے مشاہیر کی ایک عظیم محفل جمائی اور بلند آواز کے ساتھ ان سب کو مخاطب کرتے ہوئے یہ جملے ادا کیے، یا حکم دیا کہ اس کی اس آواز کو ایک سرکاری حکم نامے کے ذریعے پورے ملک میں بیان کیا جائے۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دریائے نیل کو "انہار" (نہر کی جمع) سے کیوں تعبیر کیا گیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ عظیم دریا ایک وسیع سمندر کے مانند ہے جو نہروں میں تقسیم ہو کر مصر کے تمام آباد علاقوں کو سیراب کرتا ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ دریائے نیل سے تین سو ساٹھ (۳۶۰) نہریں نکلتی تھیں جن میں سے زیادہ اہم "نہر الملک" "نہر طولون" "نہر دمیاط" اور "نہر تنیس" تھیں۔

آخر فرعون نے نیل کی نہروں پر زیادہ زور کیوں دیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصر کی تمام آبادی، دولت، طاقت اور تمدن اسی دریا کے مرہونِ منت تھے۔ لہٰذا فرعون نے اس پر ناز کیا اور موسیٰؑ پر اپنی برتری جتائی۔

"تجری من تحتی" کا مقصد یہ نہیں کہ دریائے نیل اس کے محل کے نیچے سے گزر رہا تھا، جیسا کہ کئی مفسرین نے مراد لیا ہے کیونکہ دریائے نیل اس سے بہت بڑا تھا کہ وہ اس کے محل کے نیچے سے گزرے اور اگر اس سے مراد یہ ہے کہ اس کے محل کے پاس سے گزرتا تھا تو مصر کے بہت سے محلات ایسے تھے، جن کے پاس سے یہ دریا گزرتا تھا اور ملک کی بہت بڑی آبادی اس کے دونوں کناروں پر آباد تھی، بلکہ مراد یہ ہے کہ یہ دریا میرے زیرِ فرمان چل رہا ہے اور اس کی تقسیم کا نظام بھی میرے حسب منشاء مقرر کردہ قوانین کے تحت چل رہا ہے۔

قرآن آگے چل کر فرماتا ہے کہ فرعون نے کہا: میں اس شخص سے برتر ہوں جو ایک پست خاندان اور طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ اور صاف طور پر بات بھی نہیں کر سکتا۔ (ام انا خیر من ھذا الذی ھو مھین ولا یکاد یبین)[1]

اس طرح سے اس نے اپنے لیے دو بڑے اعزازات (حکومت مصر اور نیل کی ملکیت) اور موسیٰ کے دو کمزور پہلو (فقر اور لکنت زبان) بیان کر دیئے۔

حالانکہ اس وقت حضرت موسیٰ کی زبان میں لکنت نہ تھی۔ کیونکہ خدا نے ان کی دعا کو قبول فرما لیا تھا اور زبان کی لکنت کو دور کر دیا تھا کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے مبعوث ہوتے ہی خدا سے یہ دعا مانگی تھی کہ "واحلل عقدۃ من لسانی" (خداوندا میری زبان کی گرہیں کھول دے) (ملاحظہ ہو سورۂ طٰہٰ آیت ۲۷) اور یقیناً ان کی دعا قبول ہوئی اور قرآن بھی اس بات پر گواہ ہے۔

---

[1] مندرجہ بالا جملے میں کچھ مفسرین نے "ام" کو "منقطعہ" اور "بل" کے معنی میں لیا ہے اور بعض نے اسے "متصلہ" اور "افلا تبصرون" سے متعلق سمجھا ہے، جو تقدیری طور پر یوں ہوگا:

"افلا تبصرون ام تبصرون انا خیر من ھذا ....."

بے پناہ دولت، فاخرہ لباس اور چکا چوند کرتے محلات مظلوم طبقے پر ظلم وستم کے ذریعے حاصل ہوتے ہیں۔ ان کا مالک نہ ہونا صرف عیب کی بات ہی نہیں بلکہ باعث صد افتخار شرافت اور عزت کا سبب بھی ہے۔

"مہین" (پست) کی تعبیر سے ممکن ہے اس دور کے اجتماعی طبقات کی طرف اشارہ ہو، کیونکہ اس دور میں بڑے بڑے سرمایہ داروں کا معاشرے کے بلند طبقوں میں شمار ہوتا تھا اور محنت کشوں اور کم آمدنی والے لوگوں کا پست طبقے میں۔ یا پھر ممکن ہے موسیٰ کی قوم کی طرف اشارہ ہو کیونکہ ان کا تعلق بنی اسرائیل سے تھا اور فرعون کی قبطی قوم اپنے آپ کو سردار اور آقا سمجھتی تھی۔

پھر فرعون دو اور بہانوں کا سہارا لیتے ہوئے کہتا ہے: اسے سونے کے کنگن کیوں نہیں دیئے گئے یا اس کے ساتھ فرشتے کیوں نہیں آئے کہ جو اس کی باتوں کی تصدیق کرتے: (فلولا القی علیہ اسورۃ من ذھب او جاء معہ الملائکۃ مقترنین)۔[1]

اگر خدا نے اسے رسول بنایا ہے تو دوسرے رسولوں کے مانند اسے طلائی کنگن کیوں نہیں دیئے اور اس کے لیے مددگار کیوں نہیں مقرر کیے؟

کہتے ہیں کہ فرعونی قوم کا عقیدہ تھا کہ روسا اور سربراہوں کو ہمیشہ طلائی کنگنوں اور سونے کے ہاروں سے مزین ہونا چاہیئے اور چونکہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس اس قسم کے زیورات نہیں تھے بلکہ ان زیورات کے بجائے وہ چرواہوں والا موٹا سا اونی کرتہ زیب تن کیے ہوئے تھے، لہٰذا ان لوگوں نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا اور یہی حال ان لوگوں کا ہوتا ہے جو انسانی شخصیت کے پرکھنے کا معیار سونا، چاندی اور دوسرے زیورات کو سمجھتے ہیں۔

لیکن انبیاء کرام علیہم السلام ایسی چیزوں سے ہٹ کر رہتے ہیں۔ خاص کر وہ اپنے کردار سے ایسی جھوٹی اقدار کا خاتمہ کر کے انکی جگہ صحیح انسانی اقدار یعنی علم، تقوے اور طہارت کی حکمرانی دیکھنا چاہتے ہیں، کیونکہ جب تک کسی معاشرے کی قدروں کا نظام درست نہیں ہوگا وہ معاشرہ کبھی بھی سعادت اور سربلندیوں پر فائز نہیں ہو سکتا۔

بہر حال فرعون کا یہ بہانہ بھی مشرکین مکہ کے اس بہانے کے مانند تھا جس کے متعلق ہم چند آیات پہلے پڑھ چکے ہیں کہ وہ کہتے تھے کہ یہ قرآن مکہ یا طائف کے کسی دولت مند شخص پر کیوں نازل نہیں ہوا؟

دوسرا بہانہ وہی مشہور بہانہ ہے جو بہت سی گمراہ اور سرکش امتیں انبیاء کرام علیہم السلام کے سامنے پیش کیا کرتی تھیں، کبھی تو کہتی تھیں کہ "وہ انسان کیوں ہے اور فرشتہ کیوں نہیں؟ اور کبھی کہتی تھیں کہ "اگر وہ انسان ہے تو پھر کم از کم اس کے ہمراہ کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا؟"

حالانکہ انسانوں کی طرف بھیجے ہوئے رسولوں کو نوع انسانی کا حاصل ہونا چاہیئے تاکہ وہ ان کی ضرورتوں، مشکلوں اور مسائل کو محسوس کر سکیں اور انہیں ان کا جواب دے سکیں اور عملی لحاظ سے ان کے لیے نمونہ اور اسوہ قرار پا سکیں۔[2]

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ "اسورۃ" "سوار" (بروزن "ہزار") کی جمع ہے، جس کا معنی "کنگن" ہے، خواہ وہ طلائی ہوں

---

[1] "مقترنین" کا معنی "متتابعین" یا "متعاضدین" بیان کیا گیا ہے اور بعض مفسرین کہتے ہیں یہاں پر "اقتران" یعنی "تقارن" ہے

[2] اس بارے میں تفسیر نمونہ کی پانچویں جلد میں سورۂ انعام کی آیت ۹ کے ذیل میں تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے۔

یا نقرئی اور اس کی بنیاد ایک فارسی لفظ "دستوارہ" ہے۔ وہ اور "اساور" جمع الجموع ہے۔

بعد کی آیت میں قرآن مجید ایک لطیف نکتے کی جانب اشارہ کرتا ہے اور وہ یہ کہ فرعون حقیقت الامر سے قطعاً غافل نہیں تھا اور ان اقدار کے بے وقعت ہونے کی طرف بھی کم و بیش متوجہ تھا۔ لیکن "اس نے ان باتوں کے ذریعے اپنی قوم کو احمق بنایا اور ان کی عقلوں کو ہلکا سمجھا اور انھوں نے اس کی اطاعت کی (فاستخف قومہ فاطاعوہ)۔

اصولی طور پر تمام جابر اور فاسد حکومتوں کا طریق کار یہی ہوتا ہے کہ اپنی خودسری اور ظالمانہ روش کو جاری رکھنے کے لیے لوگوں کی سطح فکر کو پست کر دیتی ہیں، مختلف حیلوں اور بہانوں سے انھیں احمق اور بے وقوف بنائے رکھتی ہیں۔ انھیں حقائق کے ادراک سے دُور رکھتی ہیں اور جھوٹی اقدار کی جگہ جھوٹی اقدار کو رواج دیتی ہیں۔ اور ہمیشہ حقائق سے دُور رکھنے کے لیے ان کی برین واشنگ (BRAIN WASH-ING) کرتی رہتی ہیں کیونکہ ملتوں اور اقوام کی بیداری اور ان کی فکری آگاہی خود غرض اور شیطانی حکومتوں کی بہت بڑی دشمن ہوتی ہے جسے یہ حکومتیں اپنی پوری طاقت سے ختم کرنے کے درپے ہوتی ہیں۔

فرعون کا یہ طریقہ کار یعنی لوگوں کو احمق بنانا اور ان کی عقلوں کو ہلکا سمجھنا، ہمارے دور کے بھی تمام فاسد معاشروں میں بڑی شدّ و مدّ کے ساتھ حکم فرما ہے۔ اس مقصد تک پہنچنے کے لیے فرعون کے پاس تو محدود وسائل تھے مگر آج کے طاغوتوں کے پاس اس سے زیادہ وسائل موجود ہیں۔ ذرائع ابلاغ عامہ، اخبارات و رسائل، ریڈیو، ٹیلیویژن اور طرح طرح کی فلمیں حتیٰ کہ گمراہ کن کھیلیں اور نت نئے فیشن کہ جن کے ذریعے وہ اقوام و ملل کو بے وقوف بنا رہے ہیں تاکہ اس طرح سے پوری طرح سے حقائق سے بے خبر رہیں اور ان طاغوتوں کی اطاعت کرتے رہیں۔ اسی لیے دین دوست دانشوروں اور رہنماؤں پر ایک عظیم ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کو بے وقوف بنانے کے پروگرام کا ڈٹ کر مقابلہ کریں اور یہی ان کا اہم ترین فریضہ ہے۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیات کو اس جملے کے ساتھ مکمل کیا گیا ہے: "بے شک وہ لوگ بدکار تھے" (انھم کانوا قوما فاسقین)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر یہ لوگ فاسق نہ ہوتے اور خدا کی اطاعت اور عقل کے فیصلوں سے خارج نہ ہوتے تو اس قسم کے پروپیگنڈا اور ڈینگوں کو قطعاً صحیح نہ سمجھتے اور اپنی ہی گمراہی کے اسباب خود فراہم نہ کرتے۔ اسی لیے وہ ہرگز معذور اور مجبور نہ تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ فرعون نے ان کی عقلوں پر ڈاکہ ڈال کر اپنی اطاعت پر مائل کر لیا تھا، لیکن اندھا دھند طریقے سے اس کے آگے سر تسلیم خم کر کے انھوں نے اس ڈاکے کے اسباب از خود فراہم کیے تھے۔ یقیناً وہ خود بھی فاسق تھے اور ایک فاسق کے تابع فرمان بن گئے تھے۔

یہ تھی خدا کے رسول حضرت موسیٰؑ کے مقابلے میں فرعون اور اہل فرعون کی فریب کاری۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان تمام وعظ و نصیحت اور مختلف طریقوں سے اتمام حجت کے بعد اور ان کے حق کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنے کی وجہ سے ان کا انجام کیا ہوا۔؟

اس بارے میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے: جب ان لوگوں نے اپنے کرتوتوں کی وجہ سے ہمیں غضب ناک کر دیا تو ہم نے بھی ان سے بدلہ لیا اور ان سب کو غرق کر دیا۔ (فلما اٰسفونا انتقمنا منھم فاغرقناھم اجمعین)۔

خداوند عالم نے ان کے لیے اپنے تمام عذابوں میں سے غرقابی کے عذاب کو خاص طور پر منتخب کیا، کیونکہ ان کی تمام عزت وعظمت اور شان وشوکت دریائے نیل اور اس کی عظیم و وسیع نہروں کی وجہ سے تھی کہ اپنے تمام قدرتی وسائل میں سے فرعون نے صرف اسی کا ذکر کیا اور کہا:

"الیس لی ملک مصر و ھٰذہ الانھار تجری من تحتی۔"

"آیا مصر پر میری حکومت نہیں ہے اور کیا یہ نہریں میرے حکم کے مطابق نہیں چل رہیں؟"

تو جو چیزیں ان کی زندگی اور طاقت کا سبب تھیں، انھیں کو ان کی فنا و بربادی کا موجب اور گورستان بننا چاہیئے تھا تاکہ سب لوگ اس سے عبرت حاصل کریں۔[1]

"اٰسفونا"، "اسف" کے مادہ سے ہے جس کا معنی "غم" بھی ہے اور "غصہ" بھی۔ بلکہ "مفردات" میں "راغب" کے بقول کبھی "غم وغصہ" یعنی دونوں معانی کے لیے بھی آتا ہے اور کبھی علیحدہ علیحدہ معانی کے لیے بھی آتا ہے، کیونکہ درحقیقت ایک اندرونی ہیجان ہوتا ہے، جو انسان کو انتقام پر آمادہ کرتا ہے اور جب اس کی نسبت اپنے ماتحتوں کی طرف ہو تو غصے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور جب افراد بالا کی طرف ہو تو "غم" کی صورت میں آشکارا ہوتا ہے۔ لہٰذا جب ابن عباس سے پوچھا گیا کہ "حزن" اور غضب میں کیا فرق ہے تو انھوں نے جواب دیا: ان کی بنیاد اور اصل تو ایک ہے، لیکن الفاظ مختلف ہیں۔[2]

بعض مفسرین نے "اٰسفونا" کا مفہوم "اٰسفو رسلنا" لیا ہے (یعنی ہمارے رسولوں کو محزون اور مغموم کر دیا) لیکن یہ تفسیر بعید معلوم ہوتی ہے اور اس قسم کے ظاہری اختلاف کو اپنانے کی ضرورت بھی معلوم نہیں ہوتی۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ خدا کے بارے میں نہ تو "رنج وغم" کا کوئی مفہوم ہوتا ہے، اور نہ ہی "غصے" کا جیسا کہ ہمارے درمیان مشہور ہے۔ بلکہ خدا کا "غیظ وغضب" "سزا کا ارادہ" ہوتا ہے، اور اس کی رضامندی "ثواب کا ارادہ" ہوتا ہے۔

زیر تفسیر آیات میں سے آخری آیت کو اس مجموعی گفتگو کے نتیجے کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے: اور ہم نے انھیں عذاب میں پیش قدم اور دوسروں کے لیے عبرت بنا دیا (فجعلناھم سلفًا ومثلًا للاٰخرین)۔

لغت میں "سلف" آگے جانے والی چیز کو کہتے ہیں۔ لہٰذا آگے چلی جانے والی نسلوں کو "سلف" اور ان کے

---

[1] جیسا کہ شاعر کہتا ہے:

در سرداری کہ با شدت سرداری
ہم در سر آں روی کہ سرداری

ترجمہ:۔ جس سرداری میں تم زور وشور سے سر کھپا رہے ہو۔ اسی چیز کے سر میں تمھیں جانا چاہیئے، کہ جس کا خیال تم اپنے سر میں رکھے ہوئے ہو۔

[2] مفردات راغب ماده "اسف"۔

بعد آنے والوں کو "خلف" کہا جاتا ہے اور جو سودے پیشگی طے پا جاتے ہیں انھیں بھی "سلف" کہا جاتا ہے، کیونکہ ان کی قیمت پیشگی ادا کر دی جاتی ہے۔

نیز "مثل" کا معنی وہ گفتگو ہے جو لوگوں کے درمیان عبرت کی صورت میں رائج ہوتی ہے چونکہ فرعون اور فرعونیوں کا ماجرا اور ان کا دردناک انجام ایک عظیم عبرت کی حیثیت رکھتا ہے اسی لیے اسے دوسری قوموں کے لیے "مثل" کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے۔

۵۷۔ وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا إِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّونَ ○
۵۸۔ وَقَالُوا أَآلِهَتُنَا خَيْرٌ أَمْ هُوَ مَا ضَرَبُوهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُونَ ○
۵۹۔ إِنْ هُوَ إِلَّا عَبْدٌ أَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنَاهُ مَثَلًا لِبَنِي إِسْرَائِيلَ ○
۶۰۔ وَلَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَلَائِكَةً فِي الْأَرْضِ يَخْلُفُونَ ○
۶۱۔ وَإِنَّهُ لَعِلْمٌ لِلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُونِ ۚ هَٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ○
۶۲۔ وَلَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطَانُ ۖ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ○

ترجمہ

۵۷۔ اور جب مریم کے بیٹے کی مثال بیان کی گئی تو اس سے تیری قوم کے لوگ ہنسنے (اور مذاق کرنے) لگے۔
۵۸۔ اور بول اُٹھے کہ بھلا ہمارے معبود اچھے ہیں یا وہ (عیسٰی اور اگر ہمارے معبود جہنم میں ہیں تو وہ بھی جہنم میں ہے، کیونکہ وہ بھی تو ایک معبود تھا) ان لوگوں نے جو مثال تجھ سے بیان کی ہے وہ تو صرف جھگڑنے کو ہے، جبکہ وہ لوگ تو ہیں ہی کینہ پرور اور جھگڑالو۔
۵۹۔ اور وہ تو بس ایک بندہ تھا جسے ہم نے اپنی نعمتوں سے نوازا اور اسے ہم نے

بنی اسرائیل کے لیے ایک نمونہ بنایا۔

۶۰۔ اور اگر ہم چاہتے تو زمین پر تمہاری جگہ پر فرشتوں کو قرار دے دیتے جو (تمہارے) جانشین ہوتے۔

۶۱۔ اور وہ تو یقیناً قیامت کی آگاہی کا سبب ہے (عیسٰی کا نزول قیامت کے قریب ہونے کی علامت ہے) تم لوگ ہرگز اس میں شک نہ کرو اور میری پیروی کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔

۶۲۔ اور کہیں شیطان تمہیں (راہِ خدا سے) روک نہ دے، کیونکہ وہ تمہارا کھلم کھلا دشمن ہے۔

شانِ نزول

سیرت ابن ہشام میں ہے۔

ایک دن رسولِ خدا ولید بن مغیرہ کے ساتھ مسجد میں تشریف فرما تھے کہ نضر بن حارث بھی ان کے ساتھ آکر بیٹھ گیا۔ قریشی سرداروں کے کئی اور لوگ بھی اس محفل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان سے بات کی تو نضر بن حارث آپؐ کے مقابلے میں کھڑا ہو گیا۔ رسولؐ اللہ نے بت پرستی کے غلط ہونے کو ثابت کرتے ہوئے منطقی دلائل کے ذریعے اسے خاموش کر دیا اور پھر ان کے سامنے اس آیت کی تلاوت کی۔

"انکم وما تعبدون من دون اللہ حصب جہنم انتم لہا واردون لو کان ھؤلاء الھۃ ما وردوھا وکل فیھا خالدون ....."

تم لوگ اور خدا کے علاوہ وہ معبود کہ جن کی تم پرستش کرتے ہو جہنم کا ایندھن ہو گے، اور تم سب اس میں داخل ہو گے۔ اگر یہ خدا ہوتے تو کبھی جہنم میں نہ جاتے اور تم سب اس میں ہمیشہ رہو گے۔"

اس واقعے کے بعد آنحضرتؐ اپنی جگہ اُٹھ کر چلے گئے۔ اسی اثنا میں عبداللہ بن زبعری

آگیا اور ان لوگوں سے مل گیا۔ ولید نے عبداللہ سے کہا: نضر بن حارث تو محمد (ص) کے مقابلے میں عاجز آ گیا ہے اور کوئی جواب نہیں دے سکا۔ محمدؐ کا گمان ہے کہ ہم اور ہمارے سارے معبود جہنم کا ایندھن ہیں، عبداللہ نے کہا: خدا کی قسم! اگر میں اسے دیکھتا تو ضرور اس کو جواب دیتا۔ تم اس سے پوچھو کہ اگر ایسی ہی صورتِ حال ہے تو کیا سب عابد اور معبود جہنم میں جائیں گے؟ پھر ہم تو فرشتوں کی عبادت کرتے ہیں، یہودی عزیر کی اور نصاریٰ عیسیٰ بن مریم کی (پھر کیا حرج ہے کہ ہم فرشتوں اور عزیر و عیسیٰ جیسے انبیاء کے ساتھ ایک ہی جگہ پر ہوں)۔

یہ جواب ولید اور دوسرے حاضرین کو بہت پسند آیا، ان کے نزدیک یہ ایک دندان شکن جواب تھا۔ چنانچہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں جا کر یہی کچھ کہا تو آنحضرت نے ارشاد فرمایا: جی ہاں! جسے بھی معبود بننا پسند ہے وہ اپنے عابدوں کے ساتھ جہنم میں جائے گا اور یہ بت پرست تو درحقیقت شیطانوں کی عبادت کرتے تھے اور جن چیزوں کی عبادت کا شیطان انھیں حکم دیتا تھا۔

اس موقع پر سورہ انبیاء کی آیت ۱۰۱ نازل ہوئی کہ:

"ان الذین سبقت لھم منا الحسنیٰ اولئک عنھا مبعدون"

جن لوگوں سے ہم نے اس سے قبل نیکی کا وعدہ کیا تھا (وہ باایمان لوگ جو معبود بننے پر ہرگز راضی نہیں تھے) وہ اس سے دور رکھے جائیں گے۔

اسی سلسلے میں زیر تفسیر آیت "ولما ضرب ابن مریم ....." بھی نازل ہوئی۔[1]

تفسیر

کون سے معبود جہنمی ہیں؟

ان آیات میں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خدا ہونے کے بارے میں اور ان کی اور بتوں کی خدائی کے بارے میں مشرکین کے عقیدے کی نفی کی بات کی گئی ہے اور گزشتہ آیات میں حضرت موسیٰؑ کی دعوت اور ان کی فرعونی بت پرستوں کے ساتھ محاذ آرائی کا جو تذکرہ کیا گیا ہے، اس کے تتمہ کی صورت میں بیان ہو رہی ہیں اور زمانہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشرکوں بلکہ تمام کائنات کے مشرکوں کے لیے زبردست تنبیہ بھی ہے۔

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد اول ص ۳۹۵ تھوڑے سے اختصار کے ساتھ۔

اگرچہ یہ آیات مجمل صورت میں گفتگو کر رہی ہیں، لیکن خود ان آیات میں اور قرآن کی دوسری آیات میں جو قرینہ پایا جاتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف مفسرین کی طرح طرح کی تفسیروں کے برعکس ان کا مضمون کسی طرح بھی پیچیدہ نہیں ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: اور جب مریم کے بیٹے کی مثال بیان کی گئی تو اس سے تیری قوم کے افراد ہنسنے لگے اور روگردان ہو گئے (ولما ضرب ابن مریم مثلاً اذا قومك منه یصدون)۔[1]

یہ مثال کیا تھی اور کس نے عیسیٰ بن مریمؑ کے بارے میں پیش کی تھی؟ یہ وہ سوال ہے کہ جس کے جواب میں مفسرین میں اختلاف ہے۔ آیت کی تفسیر کے سمجھنے کا راز بھی خود اسی میں مضمر ہے۔ لیکن بعد کی آیات میں غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ "مثل" مشرکین کی طرف سے تھی اور ان کے بتوں ہی سے متعلق تھی، کیونکہ بعد کی آیات میں ہے۔

"ما ضربوہ لك الا جدلاً۔"

انھوں نے یہ مثال صرف بیان ہی جھگڑے کے لیے کی تھی۔

اس حقیقت کو اور شانِ نزول میں بیان ہونے والے حقائق کے پیش نظر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مثال سے مراد وہی چیز ہے، جب مشرکین نے یہ آیت:

"انکم وما تعبدون من دون اللہ حصب جہنم"

"تم اور خدا کے علاوہ تمام وہ معبود جن کی تم عبادت کرتے ہو، جہنم کا ایندھن ہیں۔"

(سورۂ انبیاء، ۹۸)

سننے کے بعد استہزار اور مذاق کے طور پر کہی تھی اور وہ یہ تھی کہ عیسیٰ بن مریم بھی تو معبود تھے اور اس آیت کی رُو سے انھیں بھی جہنم میں جانا چاہیئے، اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہم اور ہمارے بُت حضرت عیسیٰؑ کے ہمسائے ہوں۔ انہوں نے یہ کہا اور کھل کھلا کر ہنسنے لگے اور خوب مذاق اڑانے لگے۔

پھر انہوں نے کہا: آیا ہمارے خدا بہتر ہیں یا عیسیٰ مسیحؑ (وقالوا ءالهتنا خیر ام ھو)۔

اگر وہ جہنم میں جائیں گے تو ہمارے معبود تو ان سے بڑھ کر نہیں ہیں۔

لیکن تجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ تمام حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اور ان لوگوں نے جو مثال تجھ سے بیان کی ہے تو وہ صرف جھگڑنے کے لیے ہے (ما ضربوہ لك الا جدلاً)۔

"بلکہ یہ لوگ تو ہیں ہی کینہ پرور اور جھگڑالو، اور حق کے خلاف باطل کا سہارا لیتے ہیں (بل ھم قوم خصمون)۔[2]

وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ صرف وہی معبود جہنم میں جائیں گے جو اپنے لیے عبادت کرنے والوں کی عبادت پر راضی تھے جیسے

---

[1] "یصدون" "صد" کے مادہ سے ہے (اگر اس کا فعل مضارع صاد کے کسرہ کے ساتھ ہو) تو اس کا معنی کھلکھلا کر ہنسنا، اٹھنے مارنا اور شور مچانا ہے (جیسا کہ عام طور پر کسی کا استہزار کرنے کے وقت کیا جاتا ہے) (ملاحظہ ہو لسان العرب مادہ "صدد")

[2] "خصمون" "خصم" (بروزن "فلس") کی جمع ہے جس کا معنی ہے بہت ہی لڑنے جھگڑنے والا۔

فرعون کہ جس نے لوگوں کو اپنی عبادت کی دعوت دی تھی نہ کہ مسیح جیسے، جو لوگوں کے اس قسم کے عمل سے بیزار تھے، اور بیزار ہیں۔

"بلکہ وہ تو صرف ایک بندہ تھا جسے ہم نے اپنی نعمتوں سے نوازا" ہم نے اسے منصب عطا کر کے لوگوں کی ہدایت کے لیے مبعوث کیا تھا (ان ھو الا عبد انعمنا علیہ)۔

اور اسے ہم نے بنی اسرائیل کے لیے ایک نمونہ بنایا (وجعلناہ مثلاً لبنی اسرائیل)۔

اس کا بغیر باپ کے شکم مادر سے پیدا ہونا خدا کی آیات میں سے ایک آیت تھا۔ گہوارے میں باتیں کرنا ایک اور آیت اور پھر اس کا ہر ایک معجزہ عظمتِ الٰہی اور اس کی اپنی نبوت کی واضح نشانی تھی۔ عیسیٰ ساری زندگی خدا کی بندگی میں رہا اور تمام لوگوں کو اسی کی بندگی کی دعوت دیتا رہا جیسا کہ خدا تعالیٰ خود کہتا ہے: جب تک وہ اس دُنیا میں تھا، اُس نے توحید کی راہ سے کسی کو بھٹکنے کی اجازت نہ دی جبکہ عیسیٰؑ کی الوہیت یا تثلیث کے خرافاتی عقیدے کی بنیاد ان کے بعد لوگوں نے ڈالی۔ [1]

---

[1] مفسرین نے مندرجہ بالا آیات کی تفسیر میں اور بھی کئی احتمال ذکر کیے ہیں اور ان میں سے مجموعی طور پر کوئی بھی آیات کے مضامین میں سے مطابقت نہیں رکھتا۔

۱۔ کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ مشرکین نے جو "مثال" بیان کی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے قرآنی آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی سرگزشت کا ذکر کرنے کے بعد کہا کہ "محمدؐ" اس بات کے لیے راہ ہموار کر رہا ہے، کہ وہ ہمیں اپنی خدائی کی دعوت دے۔"

لیکن قرآن مجید آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دفاع کرتے ہوئے کہتا ہے: "نہ تو عیسیٰ الوہیت کے مدعی تھے اور نہ ہی وہ ہوں گے۔

۲۔ بعض نے کہا ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں "مثل" سے مراد وہ تشبیہ ہے جو خدا تعالیٰ نے سورۂ آلِ عمران کی آیت ۵۹ میں حضرت عیسیٰؑ اور حضرت آدمؑ کے بارے میں ذکر فرمائی کہ:

"ان مثل عیسٰی عند اللہ کمثل اٰدم خلقہ من تراب ثم قال لہ کن فیکون"

"اللہ کے نزدیک عیسیٰؑ بھی آدمؑ کے مانند ہے کہ جسے خدا نے مٹی سے بنایا، پھر فرمایا کہ ہو جا، پس وہ ہو گیا"

(اگر عیسیٰ باپ کے بغیر پیدا ہوا ہے، تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، کیونکہ آدم تو ماں اور باپ (دونوں) کے بغیر مٹی سے پیدا کیا گیا ہے)

۳۔ بعض نے کہا ہے کہ "مثل" سے مراد مشرکین کی وہ باتیں ہیں جو وہ کہتے تھے کہ "اگر عیسائی عیسیٰ کی عبادت کر سکتے ہیں تو ہم کیوں نہ اپنے معبودوں کی عبادت کریں، جو اُن سے افضل ہیں"

لیکن مندرجہ بالا آیات میں جو خصوصیات بیان کی گئی ہیں اگر ان کی طرف دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مذکورہ تینوں تفسیروں میں سے کوئی بھی ٹھیک نہیں ہے۔ کیونکہ آیات سے بخوبی معلوم ہوتا ہے:

۱۔ یہ مثل خود مشرکین کی طرف سے تھی۔

۲۔ ایسی بات تھی جو ان کی نگاہوں میں عجیب و غریب اور مضحکہ خیز تھی۔ (بقیہ صفحہ برآیندہ)

یہ بات بھی لائق توجہ اور قابل ذکر ہے کہ شیعہ اور سُنی طریقوں سے منقول ہونیوالی متعدد روایات میں موجود ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ سے فرمایا:

"ان فیک مثلا من عیسیٰ احبه قوم فهلکوا فیه وابغضه قوم فهلکوا فیه فقال المنافقون ما رضی له مثلا الا عیسیٰ. فنزلت قوله تعالیٰ: ولما ضرب ابن مریم مثلاً اذا قومك منه یصدون۔"

"تمہارے اندر عیسیٰ کی علامتیں موجود ہیں، کچھ لوگوں نے تو ان سے محبت کی اور اس قدر غلو کیا کہ انہیں خدا کہنے لگے، اور اسی وجہ سے وہ ہلاک ہو گئے اور کچھ لوگوں نے ان سے دشمنی کا اظہار کیا (جیسا کہ یہودیوں نے کیا کہ وہ ان کے قتل پر کمربستہ ہو گئے) وہ بھی ہلاک ہو گئے۔ (اسی طرح کچھ لوگ تمہیں خدا سمجھیں گے اور کچھ لوگ دشمنی پر کمر باندھیں گے) تو منافقین نے جب یہ بات سُنی تو اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ عیسیٰ کے علاوہ انہیں کوئی مثال نہیں ملی؟ تو اس موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی، ولما ضرب ابن مریم ۔۔۔"

مندرجہ بالا گفتگو اس روایت کا متن ہے جسے اہل سنت کے مشہور عالم حافظ ابوبکر بن مردویہ نے اپنی کتاب "مناقب" میں ذکر کیا ہے۔ (منقول از کشف الغمہ ص ۹۵)

بعینہٖ اسی چیز کو میر محمد صالح کشفی ترمذی نے تھوڑے سے فرق کے ساتھ اپنی کتاب مناقب مرتضوی میں قلمبند کیا ہے۔

اس بات کو بہت سے اہل سُنت علماء اور عظیم شیعہ علماء نے اپنی متعدد کتابوں میں نقل کیا ہے۔ کہیں پر تو انھوں نے اس کے ساتھ مندرجہ بالا آیت کو ذکر کیا ہے اور کہیں پر ذکر نہیں کیا۔[1]

آیات میں موجود قرینوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مشہور حدیث ایک قسم کی مطابقت کی حیثیت رکھتی ہے، اس کی شان نزول نہیں ہے۔ بالفاظ دیگر آیت کی شان نزول تو وہی عیسیٰ علیہ السلام کی داستان، مشرکین عرب کی گفتگو اور ان کے بُت تھے، لیکن چونکہ اس سے ملتا جلتا ایک اور تاریخی واقعہ پیغمبر اکرمؐ کی مذکورہ تاریخی گفتگو کے بعد رونما ہوا لہٰذا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس مقام پر بھی یہ آیت تلاوت فرمائی، کیونکہ یہ ماجرا بھی مختلف جہات سے اس کے ایک مصداق کی حیثیت رکھتا ہے۔

بعد کی آیت میں اس لیے کہ انھیں یہ وہم نہ ہو کہ خدا کو ان کی بندگی کی ضرورت ہے، وضاحت کرتے ہوئے بیان فرمایا گیا ہے: اگر ہم چاہیں تو زمین پر تمہاری جگہ فرشتے لے آئیں کہ جو تمہارے جانشین ہوں۔ ولو نشاء لجعلنا منکم ملائکة فی

(بقیہ حاشیہ گذشتہ سے پیوستہ) ۳۔ ایسی چیز تھی جو عیسیٰ کی الوہیت کے خلاف تھی۔

۴۔ ان کے اس مقصد کو پورا کر رہی تھی جس کی وجہ سے ایک جھوٹی بات پر جھگڑا کھڑا ہو گیا تھا۔

اور یہ تمام خصوصیات صرف اس تفسیر سے مطابقت رکھتی ہیں جو ہم نے مسطور بالا میں متن میں بیان کی ہیں۔

[1] مزید معلومات کے لیے کتاب "احقاق الحق" جلد ۳ ص ۳۶۰، تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۲۰۹ اور تفسیر "مجمع البیان" کی طرف انہی آیات کے ذیل میں رجوع فرمائیں۔

(ارض یخلفون)

وہ فرشتے کہ جو فرمان حق کے تابع ہیں اور اس کی اطاعت و بندگی کے سوا اور کچھ نہیں جانتے۔

کچھ مفسرین نے یہاں پر ایک اور تفسیر ذکر کی ہے جس کی وجہ سے آیت کا مفہوم یوں ہوگا کہ "اگر ہم چاہیں تو تمہاری اولاد کو فرشتے بنا دیں جو زمین میں تمہارے جانشین ہوں"۔

لہٰذا تم اس بات پر تعجب نہ کرو کہ عیسیٰ بغیر باپ کے پیدا ہوئے ہیں خدا تو اس بات پر بھی قادر ہے کہ فرشتے جو ایک علیحدہ نوع ہیں انسانوں سے پیدا کرے۔[1]

اور چونکہ انسان سے فرشتوں کا پیدا ہونا کسی طرح مناسب معلوم نہیں ہوتا لہٰذا بعض عظیم مفسرین نے اس سے فرشتہ صفت لوگ مراد لیے ہیں۔ ان مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تم تعجب نہ کرو کہ مسیح جیسا خدا کا ایک بندہ حکم خدا سے مردوں کو زندہ کرنے اور بیماروں کو شفا بخشنے کی طاقت رکھتا ہے، جبکہ وہ مخلص اور فرمانِ الٰہی کا تابع بھی ہو۔ اگر خدا چاہے تو تمہاری اولاد میں سے ایسے لوگوں کو پیدا کر دے جن کی تمام صفات اور عادات فرشتوں کی سی ہوں۔[2]

لیکن ان سب تفسیروں میں سے پہلی تفسیر آیت کے ظاہری معنی کے ساتھ زیادہ مطابقت رکھتی ہے باقی سب بعید معلوم ہوتی ہیں۔[3]

بعد کی آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اور خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ تو یقیناً قیامت کی آگاہی کا ایک سبب ہے (وانہ لعلم للساعۃ)۔

یا اس وجہ سے کہ اس کی بغیر باپ کے ولادت خدا کی بے انتہا قدرت کی دلیل ہے، جس کے پرتو میں مرنے کے بعد کی زندگی (حیات بعد الموت) کا مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے۔

یا اس لحاظ سے کہ متعدد اسلامی روایات کے مطابق عیسیٰؑ کا آسمان سے نزول آخری زمانے میں ہوگا اور یہ قیامت کے قیام کی دلیل ہے۔

جابر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے پیغمبر اکرمؐ کو یہ فرماتے سنا ہے:

"ینزل عیسی بن مریم فیقول امیرھم تعال صل بنا، فیقول لا ان بعضکم علی بعض امراء، تکرمۃ من اللہ لھذہ الامۃ"۔

عیسیٰ اتریں گے اور مسلمانوں کا امیر ان پر امیر سے مراد حضرت مہدیؑ ہیں جیسا کہ دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے) ان سے کہے گا، آیئے اور ہمیں نماز پڑھایئے! اور وہ کہیں گے نہ، امیر

---

[1] پہلی تفسیر کو طبرسیؒ نے مجمع البیان میں شیخ طوسیؒ نے تبیان میں اور بعض دوسرے مفسرین نے انتخاب کیا ہے، جبکہ دوسری تفسیر کو قرطبیؒ، فخر رازی اور آلوسی نے اپنی کتاب روح المعانی میں، زمخشری نے کشاف میں اور مراغی نے دوسرا معنی دو معانی میں سے ایک کے طور پر نقل کیا ہے۔

[2] تفسیر المیزان اسی آیت کے ذیل میں۔

[3] پہلی تفسیر کے مطابق "من" بدل کے لیے ہے، جبکہ دوسری اور تیسری تفسیر کے مطابق "من" تشویہ ہے۔

تمہیں میں سے ہوگا اور یہ عزت اللہ نے اس امت کو عطا فرمائی ہے ۔ (پھر حضرت عیسیٰ جناب امام مہدی علیہ السلام کی اقتدا کریں گے ۔) [1]

ایک اور حدیث میں جناب رسالت مآبؐ فرماتے ہیں۔

" کیف انتم اذا نزل فیکم ابن مریم وامامکم منکم ؟

تمہارا اس وقت کیا حال ہوگا جب مریم کے فرزند تمہارے درمیان نازل ہوں گے جب کہ تمہارا امام تمہیں میں سے ہوگا۔ [2]

بہر حال حضرت مسیحؑ پر لفظ "علم" کا اطلاق ایک قسم کی تاکید اور مبالغہ کی صورت میں ہے، جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کا نزول یقیناً قیامت کی ایک نشانی ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ "انہ" میں موجود ضمیر "قرآن" کی طرف لوٹ رہی ہو جس کے مطابق آیت کا معنی یوں ہوگا: قرآن جو کہ آخری کتاب ہے، اس کا نزول قیامت کے قریب ہونے کی دلیل ہے اور قیامت کے قائم ہونے کی خبر دیتا ہے۔

لیکن آیات کا سیاق وسباق جو حضرت عیسیٰؑ سے متعلق ہے، پہلی تفسیر کی تقویت کرتا ہے۔

بہر حال اس کے فوراً بعد فرمایا گیا ہے قیامت کا قیام یقینی ہے اور اس کا واقع ہونا نزدیک ہے۔ "اور تم لوگ ہرگز اس میں شک نہ کرو: (فلا تمترن بها)۔

نہ تو عقیدے کے لحاظ سے اور نہ ہی عمل کے لحاظ سے، جیسا کہ غافل لوگ کر رہے ہیں، اور میری پیروی کرو کہ یہی سیدھا راستہ ہے: (واتبعون هٰذا صراط مستقیم)۔

اس سے بڑھ کر اور کونسا راستہ سیدھا ہو سکتا ہے، جو تمہیں آئندہ درپیش آنے والے خوفناک حالات سے آگاہ کرتا ہے اور بروز قیامت ان خطرات سے نجات کا راستہ تمہیں بتاتا ہے۔

لیکن شیطان تو چاہتا ہے کہ ہمیشہ تمہیں غافل اور بے علم رکھے، لیکن تمہیں خود ہوش سے کام لینا چاہیئے کہ "کہیں شیطان تمہیں راہ خدا اور بروز قیامت اپنی تقدیر سنوارنے سے تمہیں روک نہ دے، کیونکہ وہ تمہارا کھلم کھلا دشمن ہے۔" (ولا یصدنکم الشیطان انه لکم عدو مبین)۔

اس نے اپنی عداوت اور دشمنی کا اظہار تو روز اوّل ہی سے کر دیا تھا، جب اس نے تمہارے ماں باپ (آدم وحوا) کے دل میں وسوسہ ڈال کر بہشت سے نکلوا دیا تھا اور دوسری مرتبہ اس نے قسم کھائی کہ "مخلصین" کے سوا باقی تمام بنی آدم کو گمراہ کر کے چھوڑے گا۔ لہٰذا تم ایسے قسم کھانے والے دشمن کے مقابلے میں کیونکر خاموش بیٹھ سکتے ہو اور اسے اس بات کی اجازت کیسے دے سکتے ہو کہ وہ تمہاری رُوح اور جسم پر غلبہ پالے اور اپنے مسلسل وسوسوں سے تمہیں سیدھی راہ سے روک دے۔

---

[1] اس حدیث کو صاحب تفسیر "مجمع البیان" نے "صحیح مسلم" سے اسی آیت کے ذیل میں نقل کیا ہے۔

[2] تفسیر مجمع البیان اسی آیت کے ذیل میں اور تفسیر روح المعانی جلد ۲۵ ص۔

۶۳۔ وَلَمَّا جَآءَ عِيْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ○

۶۴۔ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ○

۶۵۔ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ○

ترجمہ

۶۳۔ اور جب عیسیٰ واضح دلائل لے کر آئے تو کہا میں تمہارے پاس دانائی لے کر آیا ہوں، تاکہ بعض باتیں جن میں تم اختلاف کرتے ہو، تمہیں صاف صاف بتادوں، تو تم لوگ خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

۶۴۔ بے شک خدا ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے، اسی کی عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔

۶۵۔ لیکن ان میں کئی فرقے بن گئے جنہوں نے (عیسیٰ کے بارے میں) اختلاف کیا (اور کچھ لوگوں نے انھیں خدا سمجھا) تو جن لوگوں نے ظلم کیا ان کے لیے اس دن کے عذاب کا افسوس ہے کہ جو بہت دردناک ہے۔

تفسیر

جن لوگوں نے عیسٰی کے بارے میں غلو کیا

گزشتہ آیات میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کی زندگی کے کچھ خصوصی پہلو ذکر کیے گئے تھے۔ زیر تفسیر آیات اس سلسلے کو آگے بڑھاتی ہیں، اور خالص دین کی طرف ان کی دعوت اور ہر طرح کے شرک کی نفی کا ذکر کرتی ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے: جب عیسٰی واضح دلائل (معجزات اور خدائی آیات) لے کر آئے تو کہا: میں تمہارے پاس دانائی لے کر آیا ہوں تاکہ بعض باتیں جن میں تم اختلاف کرتے ہو صاف صاف بتا دوں۔ (ولما جاء عیسٰی بالبینات قال قد جئتکم بالحکمة ولابین لکم بعض الذی تختلفون فیه)۔

اس طرح سے حضرت عیسٰی علیہ السلام کا سرمایہ "بینات" یعنی خدا کی آیتیں اور معجزات تھے، جو ایک طرف تو ان کی حقانیت کو بیان کر رہے تھے اور دوسری طرف ان حقائق کو جو مبدا اور معاد اور انسانی زندگی کی ضروریات سے متعلق ہیں۔

اس عبارت میں حضرت عیسٰی علیہ السلام حکمت کو اپنی دعوت کا محور بتا رہے ہیں اور ہم سب جانتے ہیں کہ "حکمت" کا اصلی معنی "اصلاح کی غرض سے کسی چیز سے روکنا" ہے۔ اس کے بعد تمام عقاید حقہ اور اس صحیح نظام زندگی کا اعلان فرما رہے ہیں جو انسانوں کو ہر قسم کی بے راہ روی ایمان اور عمل میں ہر قسم کی بے راہ روی سے روکتا ہے اور جس میں تہذیب، نفس اور اخلاق بھی شامل ہیں تو اس طرح سے یہاں پر حکمت کا وسیع معنی مراد ہے جو "حکمت عملی" اور "حکمت علمی" دونوں پر محیط ہے۔ یہ حکمت علاوہ ازیں ایک اور ہدف کو بھی پیش نظر رکھے ہوئے ہے اور وہ ہے ان اختلافات کا دور کرنا کہ جن کی وجہ سے تمام معاشرتی نظام درہم برہم ہو جاتے ہیں، اور لوگ سرگرداں ہو جاتے ہیں اسی لیے جناب عیسٰی علیہ السلام نے اپنی گفتگو میں اسی چیز پر زیادہ زور دیا ہے۔

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور اکثر مفسرین نے بھی اس طرف توجہ کی ہے اور وہ یہ ہے کہ جناب عیسٰی علیہ السلام نے یہ کیوں کہا ہے کہ میں تمہارے درمیان موجود بعض اختلافات کو دور کرنے کے لیے آیا ہوں۔ انھوں نے تمام اختلافات کو دور کرنے کا کیوں نہیں کہا؟

اس سوال کے ویسے تو کئی جواب دیئے گئے ہیں، لیکن سب سے مناسب جواب یہ ہے کہ:

لوگوں کے درمیان دو قسم کے اختلافات ہوتے ہیں ایک قسم تو ان اختلافات کی ہے جو اعتقادی اور عملی نکتہ نظر سے انسان سازی میں اور انفرادی و اجتماعی لحاظ سے مؤثر ہوتے ہیں اور دوسری قسم کے وہ اختلافات ہوتے ہیں، جو انسان کے لیے کسی طرح بھی مناسب نہیں ہوتے، جیسے منظومہ شمسی کی پیدائشی کیفیت، افلاک اور ستاروں کی حقیقت، انسانی روح کی ماہیت اور زندگی کی حقیقت وغیرہ کے بارے میں اختلافات۔

پس صاف ظاہر ہے کہ انبیاء کا فریضہ یہ ہے کہ پہلی قسم کے اختلافات کو حقائق کے ذریعے ختم کریں اور ان کی یہ ذمہ داری

نہیں ہوتی کہ ہر قسم کے اختلافات کا خاتمہ کریں، اگرچہ انسان کی تقدیر کے ساتھ ان کا کسی قسم کا تعلق بھی ہو۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ بعض اختلافات کے بیان کرنے کا مقصد خود انبیاءؑ کی دعوت کا نتیجہ اور اس کی غرض وغایت ہے، یعنی انجام کار وہ موفق ہو جائیں گے اور ان کے بعض اختلافات کو حل کریں گے۔ لیکن تمام اختلافات کا دُنیا میں حل کرنا ممکن نہیں ہے، اسی لیے قرآن مجید کی متعدد آیات میں قیامت کی ایک خصوصیت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ اس دن تمام اختلافات ختم ہو جائیں گے، جیسا کہ سورۂ نحل کی ۹۲ ویں آیت میں ہے کہ:

" ولیبین لکم یوم القیامۃ ما کنتم فیہ تختلفون "

" جن چیزوں میں تم اختلاف کرتے ہو انہیں یقیناً قیامت کے دن تمہارے لیے بیان کرے گا"

(اور یہی بات سُورۂ آل عمران کی آیت ۵۵، سورۂ مائدہ کی آیت ۴۸، سُورۂ انعام کی آیت ۱۶۴ اور سُورۂ حج کی آیت ۶۹ وغیرہ میں بیان ہوئی ہے) [1]

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: اب جب کہ صورت حال یہ ہے اور میری دعوت کا لب لباب یہی ہے "تو تم لوگ خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو" (فاتقوا اللہ واطیعون)۔

پھر اپنی الوہیت کے بارے میں ہر قسم کے شک وشبہ کو دُور کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "بے شک میرا پروردگار اور تمہارا پروردگار اللہ ہی ہے" (ان اللہ ھو ربی وربکم)۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ انہوں نے اس آیت میں کلمۂ "رب" دو مرتبہ بیان کیا ہے۔ ایک مرتبہ اپنے لیے اور دوسری مرتبہ عام لوگوں کے لیے تاکہ واضح کر دیں کہ میں اور تم، سب برابر ہیں اور تمہارا اور میرا پروردگار ایک ہی ہے۔

میں بھی اپنے وجُود اور ہستی کے لیے تمہاری طرح ایک مدبّر اور خالق کا محتاج ہوں، وہی میرا مالک اور رہنما ہے۔

مزید تاکید کے طور پر فرماتے ہیں: جب یہ عالم ہے تو پھر تم اسی کی عبادت کرو (فاعبدوہ)۔

کیونکہ اس کے علاوہ اور کوئی بھی لائق عبادت نہیں، تمام چیزیں مربوب ہیں اور وہ رب ہے، تمام اس کے مملوک ہیں اور وہ سب کا مالک ہے۔

ایک بار پھر اپنی اس گفتگو پر تاکید کرتے ہیں تاکہ کسی قسم کے بہانے کی گنجائش باقی نہ رہ جائے، فرماتے ہیں: یہی سیدھا راستہ ہے (ھٰذا صراط مستقیم)[2]

---

[1] کچھ اور مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں پر لفظ "بعض" "کل" کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یا "بعض الذی تختلفون فیہ" کی تعبیر موصوف کی صفت کی طرف اضافت ہے۔ جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ میں صرف تمہارے لیے دینی امور بیان کرتا ہوں نہ کہ تمہارے دنیاوی امور لیکن ان میں سے کوئی تفسیر بھی قابلِ توجیہ نہیں ہے۔

[2] اس طرح کی باتیں مختصر سے فرق کے ساتھ سورۂ مریم کی آیت ۳۶ اور سورۂ انعام کی آیت ۵۱ میں بھی بیان ہوئی ہیں اور اس معنی کا تکرار اس حقیقت کی تاکید ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی بندگی کے بارے میں ان سب پر اتمام حجت کر دیا۔

جی ہاں! راہ راست وہی خدا کی عبودت اور بندگی کا راستہ ہے جس میں کسی قسم کی کجی اور ٹیڑھا پن نہیں ہے، جیسا کہ سورۂ یٰسین کی ۶۱ ویں آیت میں آیا ہے" وان اعبدونی ھٰذا صراط مستقیم" آیا میں نے تم سے یہ عہد نہیں کیا تھا کہ میری عبادت کرو کیونکہ سیدھا راستہ یہی ہے۔

لیکن تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ اس قدر تاکید کے باوجود عیسیٰ کی وفات کے بعد ان میں کئی فرقے بن گئے جنہوں نے (عیسیٰ کے بارے میں) اختلاف کیا" (فاختلف الاحزاب من بینھم)۔[1]

کچھ لوگوں نے تو انھیں خدا سمجھا کہ جو زمین پر اُتر آیا تھا جبکہ کچھ لوگوں نے انہیں خدا کا بیٹا جانا اور کچھ لوگوں نے انھیں "اقانیم ثلثہ" (باپ، بیٹا اور رُوح القدس) میں سے ایک سمجھا۔

صرف چند لوگوں نے انہیں خدا کا بندہ اور رسُول سمجھا، لیکن ایسے افراد اقلیت میں ہیں۔ آخر کار اکثریت کا عقیدہ غالب آگیا اور تثلیث اور تین خداؤں کے عقیدے نے تمام مسیحی دُنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

اس بارے میں ہم نے سُورۂ مریم کی آیت ۳۶ کے ذیل میں تفسیر نمونہ کی تیرھویں جلد میں ایک دلچسپ اور تاریخی حدیث بیان کی ہے۔

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ صرف عیسائیوں کے درمیان ہی اختلاف موجود نہیں تھا، بلکہ حضرت عیسیٰ کے بارے میں یہودیوں اور عیسائیوں کے درمیان بھی اختلاف کھڑے ہو گئے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ کے پیروکاروں نے ان کے بارے میں غلو سے کام لیا اور انھیں خدا سمجھنے لگے، جبکہ عیسیٰؑ کے دشمنوں نے انہیں اور ان کی پاک دامن ماں، جنابِ مریم پر مختلف تہمتیں لگائیں اور جاہلوں کا طریقہ کار ایسے ہی ہوا کرتا ہے۔ کچھ لوگ افراط کا شکار ہوتے ہیں اور کچھ تفریط کا۔ یا بقول امیر المومنین علی علیہ السلام کچھ لوگ "محب غال" ہوتے ہیں اور کچھ "مبغض قال" ہوتے ہیں۔

جیسا کہ آپ فرماتے ہیں:

"ھلک فی رجلان محب غال ومبغض قال۔"

"میرے بارے میں دو قسم کے لوگ ہلاک ہوئے ایک تو وہ دوست جنہوں نے مجھے خدا جانا اور دوسرے وہ تہمت لگانے والے دشمن جنہوں نے مجھ پر طرح طرح کے الزامات لگائے۔"[2]

ان دونوں بزرگواروں کے حالات کس قدر ملتے جلتے ہیں۔

آیت کے آخر میں ان لوگوں کو روز قیامت کے دردناک عذاب کی دھمکی دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جن لوگوں نے ظلم کیا اور صراطِ مستقیم سے منحرف ہو گئے، ان کے لیے دردناک دن کے عذاب کا افسوس ہے (فویل للذین

---

[1] "بینھم" میں "ھم" کی ضمیر ان لوگوں کی طرف لوٹ رہی ہے جنھیں اس سے پہلی آیت میں حضرت عیسیٰؑ نے مخاطب کیا، اور خدا کی عبادت کی دعوت دی۔

[2] نہج البلاغہ کلمات قصار جملہ ۱۱۷۔

ظلموا من عذاب یوم الیم[1]

جی ہاں! قیامت کا دن دردناک دن ہوگا، اس کے حساب کا طول دردناک، اس کا عذاب اور سزا دردناک، اس کی حسرت واندوہ دردناک اور اس کی رسوائی اور ذلت دردناک۔

---

[1] توجہ رہے کہ "الیم" "یوم" کی صفت ہے نہ کہ "عذاب" کی۔

۶۶۔ هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا السَّاعَةَ أَنْ تَأْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ○

۶۷۔ الْأَخِلَّاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ ○ ط

۶۸۔ يَا عِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَا أَنْتُمْ تَحْزَنُونَ ○ ج

۶۹۔ الَّذِينَ آمَنُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا مُسْلِمِينَ ○ ج

ترجمہ

۶۶۔ وہ لوگ کس انتظار میں ہیں؟ کیا اس میں کہ اچانک ان پر قیامت آجائے اور ان کو خبر تک نہ ہو۔

۶۷۔ اس دن دوست ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے ہاں البتہ پرہیزگار (کہ وہ دوست ہی رہیں گے)۔

۶۸۔ اے میرے بندو! آج نہ تمھیں کوئی خوف ہے اور نہ ہی تم غمگین ہوگے۔

۶۹۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جو ہماری آیات پر ایمان لائے تھے اور ہمارے فرماں بردار تھے۔

تفسیر

کِس انتظار میں ہو؟

گذشتہ آیات میں رسُولِ اسلام کے زمانے کے ہٹ دھرم بُت پرستوں نیز اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کی اُمت میں سے گمراہ اور مُشرک لوگوں کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیرِ نظر آیات میں ان کے انجام کو مجسم کرکے پیش کیا جارہا ہے۔

فرمایا گیا ہے: وہ لوگ کس انتظار میں ہیں سوائے اس کے کہ اچانک ہی ان پر قیامت آجائے اور ان کو خبر تک نہ ہو (ھل ینظرون الّا الساعۃ ان تأتیھم بغتۃ وھم لا یشعرون)۔

یہ سوال جو استفہام انکاری کی صُورت میں پیش کیا گیا ہے درحقیقت اس قسم کے افراد کی حقیقتِ حال واضح کرنے کے لیے ہے۔ جیسے کسی ایسے شخص کی مذمت میں جو کسی بھی خیر خواہ کی نصیحت کو نہیں سُنتا اور اپنی تباہی کے اسباب خُود فراہم کرتا ہے، یہ کہا جاتا ہے کہ وہ تو صرف اپنی موت کا منتظر ہے۔

اس آیت میں بھی بہت سی دوسری قرآنی آیات کے مانند "ساعۃ" سے مراد قیامت کا دن ہے، کیونکہ اس کے حوادث بہت جلد عملی جامہ پہن لیں گے گویا ایک ہی گھڑی میں سب کچھ ہوجائے گا۔

البتہ یہ کلمہ کہیں پر دُنیا کے خاتمے کے آخری لمحے کے لیے بھی استعمال ہُوا ہے اور چونکہ ان دونوں کا آپس میں زیادہ فاصلہ نہیں ہے لہٰذا ممکن ہے اس قسم کی تعبیر ان دونوں مراحل کے بارے میں ہو۔

بہرحال قیامت کا قیام جو دُنیا کے ناگہانی طور پر خاتمے کے ساتھ شروع ہوجائے گا کے بارے میں مندرجہ بالا آیت میں دو صفات بیان کی گئی ہیں ایک یہی "بغتۃ" (اچانک طور پر) اور دوسرے اس کے وقوع پذیر ہونے سے لوگوں کی لاعلمی۔

ممکن ہے کوئی ایسی چیز اچانک اور ناگہانی صُورت میں واقع ہو کہ جس کا ہمیں پہلے سے انتظار تھا اور اس کا سامنا کرنے کے لیے ہم پہلے سے تیار ہوں، لیکن مصیبت یہ ہے کہ قیامت کا عظیم ترین، تباہ کُن اور طاقت فرسا حادثہ اچانک اور ناگہانی صُورت میں واقع ہوگا اور ہم بالکل اس سے غافل ہوں گے۔

ان مجرموں کا حال بھی بالکل ایسا ہی ہے۔ وہ اس حد تک غفلت میں پڑے ہوں گے کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ایک حدیث کے مطابق:

"تقوم الساعۃ والرجلان یحلبان الناقۃ، والرجلان یطویان الثوب ثُمّ قرأ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم "ھل ینظرون الّا الساعۃ ان تأتیھم بغتۃ وھم لا یشعرون"۔

"قیامت اچانک واقع ہوگی، جب کہ ہر شخص اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہوگا، کچھ لوگ

گوسفند کا دودھ دوہ رہے ہوں گے اور کچھ (خرید وفروخت کے لیے) کپڑا پھیلا رہے ہوں گے۔

پھر آنحضرتؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ "ھل ینظرون الا ..... "[1]

کس قدر دردناک بات ہوگی کہ ایسے حالات میں انسان واپسی کی راہیں کھو بیٹھے گا۔ اس قدر غفلت کا شکار ہو جائے گا کہ کسی قسم کی تیاری کے بغیر اس کی موجوں میں غرق ہو جائے گا۔

بعد کی آیت میں ان دوستوں کی صورت حال بیان کی جا رہی ہے جو جرم وگناہ اور دُنیا کی چکا چوند زندگی کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ دوستی کی پینگیں بڑھائے ہُوئے ہیں، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اس دن دوست ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے، مگر پرہیزگار (کہ وہ دوست ہی رہیں گے) (الاخلاء یومئذ بعضھم لبعض عدو الا المتقین)۔[2]

یہ آیت چونکہ عرصہ محشر کی تصویر کشی کر رہی ہے لہٰذا اس سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ آیت میں بھی "ساعۃ" سے مُراد قیامت کا دن ہے کہ جس دن دوستی کے سب رشتے ٹوٹ جائیں گے، لیکن جو رشتے خدا کے لیے اور خدا کے نام پر استوار کئے گئے ہوں وہ برقرار رہیں گے۔

اس دن اس قسم کی دوستیوں کا دشمنی میں تبدیل ہو جانا فطری بات ہے، کیونکہ اس دن ہر دوست اپنے دوست کو اپنی تباہی اور بربادی کا سبب سمجھے گا گویا اس سے کہے گا کہ تو نے ہی مجھے یہ راستہ دکھایا تھا اور مجھے اس کی دعوت دی تھی، تو نے ہی دُنیا کو میری آنکھوں میں بنا سجا کر پیش کیا تھا اور مجھے اس کی ترغیب دلائی تھی تو ہی تو تھا جس نے مجھے غفلت اور غرور کے سمندروں میں غرق کر دیا تھا اور مجھے میرے انجام سے بے خبر رکھا تھا، ہر ایک اپنے دوست سے یہی کہے گا۔

صرف پرہیزگاروں کی دوستی پائیدار اور جاودانی ہوگی، کیونکہ ان کی دوستی کے معیار اور اقرار پائیدار ہوتے ہیں جس کے نتائج بروز قیامت آشکار ہوں گے اور دوستی کو مزید استحکام ملے گا۔

یہ ایک فطری بات ہے کہ دوست اُمور زندگانی میں ایک دوسرے کے معاون ومددگار ہوتے ہیں۔ اگر دوستی شر وفساد کی بنیاد پر استوار ہو تو ایک دوسرے کے جرم میں شریک ہوتے ہیں اور اگر خیر وصلاح کی بنیادوں پر قائم ہو تو ثواب میں شریک ہوتے ہیں بنابریں اگر پہلی قسم کی دوستی بروز قیامت دشمنی میں بدل جائے تو اس پر تعجب نہیں کرنا چاہیئے اور اگر دوسری قسم کی دوستی مستحکم تر ہو تو بھی باعث تعجب نہیں۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

---

[1] تفسیر "روح البیان" جلد ۲۵ صفحہ ۵۹۔

[2] "اخلاء" "خلیل" کی جمع ہے اور "خلۃ" کے مادہ سے ہے۔ جس کا معنی "مودت" اور "دوستی" ہے اور اس کی بنیاد "خلل" (بروزن "شرف") ہے جس کا معنی "دو جسموں کا درمیانی فاصلہ ہے" اور چونکہ محبت اور دوستی گویا انسانی دل میں راسخ ہو جاتی ہے۔ لہٰذا یہ لفظ اس کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

"الا کل خلۃ کانت فی الدنیا فی غیر اللہ عزوجل فانھا تصیر

عداوۃ یوم القیامۃ"

"تمھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ دُنیا میں جو بھی دوستی خدا کے لیے نہ ہوگی وہ قیامت میں عداوت اور دشمنی میں بدل جائے گی"[1]

اس دن خداوند عالم انھیں فرمائے گا: اے میرے بندو! آج نہ تو تمھارے لیے کوئی خوف ہے اور نہ ہی تم غمگین ہوگے (یا عباد لا خوف علیکم الیوم ولا انتم تحزنون)۔

کس قدر دلکش پیغام ہے، خدا کی جانب سے براہِ راست پیغام، ایسا پیغام جو بہترین اوصاف کے ساتھ شروع ہوتا ہے یعنی اے میرے بندو! ایسا پیغام جو پریشان کُن دن میں ہر قسم کی پریشانی دُور کردے گا۔ ایسا پیغام جس سے تمام گزشتہ رنج و غم کافور ہو جائیں گے جی ہاں اس پیغام میں مذکورہ چاروں خوبیاں موجود ہیں۔

زیرِ تفسیر آیات کے سلسلہ کی آخری آیت میں ان پرہیزگاروں اور خدا کے مکرم و محترم بندوں کو دو اور صفات کے ساتھ نمایاں فرمارہا ہے کہ "یہ وہ لوگ ہوں گے جو ہماری آیات پر ایمان لے آئے اور ہمارے فرمانبردار تھے" (الذین اٰمنوا بایاتنا وکانوا مسلمین)۔

جی ہاں! ایسے مؤمن لوگ ہی خدا کے قابلِ افتخار خطاب کے مخاطب اور اس قسم کی نعمتوں کے حقدار ہوں گے۔

درحقیقت مندرجہ بالا دونوں جُملے ان کے اعتقاد و عمل کی مُنہ بولتی تصویر ہیں۔ "ایمان" ان کی اعتقادی بنیادوں پر استوار عمارت کو واضح کررہا ہے اور "اسلام" ان کے فرمانِ الٰہی کو عملی جامہ پہنانے کی نشاندہی کررہا ہے۔

---

[1] تفسیر "علی بن ابراہیم" (جیسا کہ تفسیر نور الثقلین جلد ۴ صفحہ ۶۱۲ پر درج کیا گیا ہے)۔

۷۰۔ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ ○
۷۱۔ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَّاَكْوَابٍ ۚ وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ ۚ وَاَنْتُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○
۷۲۔ وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○
۷۳۔ لَكُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ كَثِيْرَةٌ مِّنْهَا تَاْكُلُوْنَ ○

ترجمہ

۷۰۔ (ان سے کہا جائے گا) تم اپنی بیویوں سمیت نہایت ہی خوشی اور شادمانی کے ساتھ بہشت میں داخل ہو جاؤ۔
۷۱۔ ان کے گرد (کھانے کے طلائی برتنوں اور سنہری جاموں کا دور چلے گا اور وہاں (بہشت میں) جس چیز کو ان کا جی چاہے گا اور جس سے آنکھیں لذت اٹھائیں، سب موجود ہو گا اور تم اس میں ہمیشہ رہو گے۔
۷۲۔ یہ وہی بہشت ہے جس کے تم اپنے انجام دیئے ہوئے اعمال کے باعث وارث بنو گے۔
۷۳۔ وہاں تمہارے لیے فراواں پھل ہیں جنہیں تم کھاؤ گے۔

تفسیر

جو جی چاہے اور جس سے آنکھ لذّت اُٹھائے

یہ آیات خدا کے ان خالص بندوں اور صالح مؤمنین کی جزا بیان کر رہی ہیں، جن کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے اور بہشت بریں کی سات قیمتی نعمتوں کی خوشخبری دے رہی ہیں۔

پہلے فرمایا گیا ہے: خداوند عظیم و منان کی طرف سے انہیں خطاب ہوگا: بہشت میں داخل ہو جاؤ (ادخلوا الجنّة)۔

اس طرح ان کا حقیقی میزبان خود خدا ہی ہوگا جو اپنے مہمانوں کو دعوت دے کر فرمائے گا کہ تشریف لائیے اور جنت میں داخل ہو جائیے۔

پھر پہلی نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: تم بھی اور تمہاری بیویاں بھی (انتم وازواجکم)۔

ظاہر سی بات ہے کہ مؤمن اور مہربان بیویوں کا اپنے شوہروں کے ساتھ ساتھ ہونا مردوں کے لیے بھی خوشی کی بات ہوگی اور عورتوں کے لیے بھی، کیونکہ اگر وہ دُنیا میں ایک دوسرے کے دُکھ درد کے شریک تھے تو آخرت کی خوشیوں میں بھی ایک دوسرے کے ہمرکاب ہوں گے۔

بعض مفسرین نے یہاں پر "ازواج" کا معنی ہم رکاب، دوست اور نزدیکی لوگ کیا ہے اور اگر ایسا بھی ہو تو یہ بات بجائے خود ایک عظیم نعمت ہے۔ لیکن آیت کا ظاہری معنی وہی پہلا ہے۔

پھر فرمایا گیا ہے: تم سب خوشی اور شادمانی میں مستغرق رہو، اس طرح کہ اس خوشی کے آثار تمہارے چہروں سے ظاہر ہوں۔ (تحبرون)۔

"تحبرون" "حبر" (بروزن ابر) کے مادہ سے ہے، جس کا معنی ہے "حسب دل خواہ اثر" اور کبھی اس کا اطلاق سنگھار اور خوشی کے ان آثار پر بھی ہوتا ہے جو چہرے پر نمایاں ہوتے ہیں اور اگر "عطا" کو "احبار" (جَبر بروزن اَبر کی جمع) کہا جاتا ہے، تو ان آثار کی وجہ سے جو انسانی معاشروں میں باقی رہ جاتے ہیں، جیسا کہ امیرالمؤمنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"العلماء باقون ما بقی الدھر اعیانھم مفقودة وامثالھم فی القلوب موجودة"۔

"جب تک دُنیا باقی ہے، علماء زندہ ہیں۔ وہ بذاتِ خود تو ہمارے درمیان موجود نہیں ہوتے لیکن ان کے آثار دلوں میں موجود ہوتے ہیں۔" [1]

---

[1] نہج البلاغہ، کلمات قصار جملہ نمبر ۱۴۷۔

تیسری نعمت کے بارے میں فرمایا گیا ہے: خاص خدمت گاروں کے ذریعے بہترین غذا اور بہشتی مشروبات سے بھرے کھانوں کے طلائی برتن اور شراب طہور کے زرین جام ان کے گرد اگرد گھمائے جائیں گے (یطاف علیھم بصحاف من ذھب و اکواب)۔

بہترین ظروف اور بہترین کھانوں سے نہایت ہی آرام، اطمینان اور صدق و صفا کے ساتھ اور کسی قسم کی پریشانی کے بغیر ان کی تواضع کی جائے گی۔

"صحاف" "صحفة" (بروزن "صفحہ") کی جمع ہے جو دراصل "صحف" کے مادہ سے لیا گیا ہے، جس کا معنی "وسعت دینا" ہے اور یہاں پر بڑے بڑے اور وسیع ظروف کے معنی میں ہے۔

"اکواب" "کوب" کی جمع ہے، جس کا معنی ہے "پانی کے ایسے برتن جن کا دستہ نہیں ہوتا"؛ اور آج کی اصطلاح میں انہیں "جام" یا "پیالہ" کہا جاتا ہے۔

اگرچہ مذکورہ بالا آیت میں صرف طلائی برتنوں کی بات کی گئی ہے اور خوراک و مشروبات کی بحث نہیں کی گئی لیکن ظاہر ہے کہ مہمانوں کی خاطر تواضع کے لیے خالی برتنوں کا دور کبھی نہیں چلتا۔

چوتھے اور پانچویں مرحلے پر دو اور نعمتوں کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ جن میں تمام مادی اور معنوی نعمتیں جمع ہیں، ارشاد ہوتا ہے: اور بہشت میں جس چیز کو جی چاہے اور جس سے آنکھیں لذت اٹھائیں، سب کچھ موجود ہوگا (وفیھا ماتشتھیہ الانفس وتلذ الاعین)۔

تفسیر مجمع البیان میں مرحوم طبرسی کے بقول اگر کائنات کی تمام مخلوق جمع ہو کر ہر طرح کی بہشتی نعمتوں کی تعریف و توصیف کرنے لگے پھر بھی اس حد کو نہیں پہنچ سکے گی جو اس جملے میں موجود ہے۔

اس سے بڑھ کر اور کیا زیبا اور جامع تعبیر ہو سکتی ہے؟ ایسی تعبیر جو کائنات کی وسعتوں اور ان تمام تصورات کی وسعتوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے جو ہمارے ذہن میں آ سکتے ہیں اور جو نہیں آ سکتے۔ ایسی تعبیر جس سے بڑھ کر اور کوئی تعبیر نہیں ہو سکتی۔

پھر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ دل پسند چیزوں کو آنکھ کی لذتوں سے علیحدہ بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ علیحدگی بھی بڑی معنی خیز ہے۔ یہاں پر پہلے ایک عمومی اور ہمہ گیر چیز بیان کرنے کے بعد اس میں سے کچھ خاص چیزوں کو جدا کر کے بیان کیا گیا ہے بایں معنی کہ "آنکھ کی لذت" کی اہمیت سب سے زیادہ اور دوسری تمام لذتوں سے برتر اور بالاتر ہوتی ہے، یا اس لحاظ سے کہ "ما تشتھیہ الانفس" کا جملہ ذائقہ (چکھنے کی)، شامہ (سونگھنے کی)، سامعہ (سننے کی) اور لامسہ (مس کرنے اور چھونے کی) لذتوں کو بیان کر رہا ہے، لیکن "تلذ الاعین" کا جملہ آنکھ کی لذت کو بیان کر رہا ہے۔

بعض مفسرین یہ سمجھتے ہیں کہ "ما تشتھیہ الانفس" تمام جسمانی لذتوں کی طرف اشارہ ہے، جبکہ "تلذ الاعین" روحانی لذات کا بیان کر رہا ہے اور بہشت میں اس سے بڑھ کر اور کیا لذت ہو سکتی ہے کہ انسان اپنے دل کی آنکھوں سے پروردگار کے جمال بے مثال کا مشاہدہ کرے کہ جس کا ایک لمحہ بہشت کی تمام مادی نعمتوں سے افضل اور برتر ہے۔

ظاہر ہے کہ شوق وصال جس قدر زیادہ ہوگا دیدار کی لذت بھی اتنی ہی زیادہ ہوگی۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں پر مفسرین کو ایک سوال درپیش ہے اور وہ یہ کہ آیا اس آیت کا عمومی مفہوم اس بات کی دلیل ہے کہ جن چیزوں کو اس دُنیا میں خدا نے حرام کیا ہے اگر ان چیزوں کا وہ بہشت میں تقاضا کریں گے تو وہ بھی انھیں ملیں گی؟

اس طرح کا سوال درحقیقت ایک نکتے کی طرف توجہ نہ کرنے کی وجہ سے ذہن میں اٹھتا ہے اور وہ یہ کہ حرام کردہ اور بُری چیزیں درحقیقت اس خوراک کے مانند ہیں جو انسانی رُوح کے لیے قطعاً مناسب نہیں ہوتیں اور یقیناً صحیح وسالم رُوح اس قسم کی غذا کی خواہش نہیں کرتی، یہ تو بیمار رُوحیں ہوتی ہیں جو زہریلی اور نامناسب غذاؤں کی خواہش کا اظہار کرتی ہیں۔

ہم ایسے بیماروں کو بھی دیکھتے ہیں جو بیماری کی حالت میں مٹی یا اس قسم کی دوسری چیزوں تک کو کھانے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں لیکن جونہی یہ بیماری برطرف ہو جاتی ہے، اس قسم کی غلط خواہشیں از خود ختم ہو جاتی ہیں۔ یقیناً جنتی لوگ ہرگز اس قسم کے اعمال کی خواہش نہیں کریں گے، کیونکہ ایسے اعمال کی خواہش بیمار جہنمی ارواح کی خصوصیات میں شامل ہے۔

یہ سوال بالکل اس طرح ہے جیسے روایت میں آیا ہے۔

"ایک اعرابی پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگا، آیا بہشت میں اونٹ بھی ہوں گے، کیوں کہ میں اونٹوں سے بہت محبت کرتا ہوں۔

پیغمبر اسلام تو جانتے تھے کہ وہاں پر ایسی ایسی نعمتیں ہوں گے کہ جنہیں دیکھ کر یہ اعرابی اپنے اونٹوں کو بھول جائے گا، لہٰذا آپ نے مختصر مگر جامع الفاظ میں اسے یوں جواب دیا:

"یا اعرابی ان ادخلک اللہ الجنۃ اصبت فیھا ما اشتھت نفسک ولذۃ عینک"۔

"اے اعرابی! اگر خدا نے تجھے بہشت میں بھیج دیا تو تجھے وہاں پر وہ کچھ ملے گا جو تمہارا جی چاہے گا اور تمہاری آنکھیں جس سے لذت اُٹھائیں گی۔"[1]

دوسرے لفظوں میں وہاں پر ایسا عالم ہوگا کہ انسان اپنے آپ کو حقائق سے پوری طرح ہم آہنگ کرے گا اور بقول شاعر:

آنچہ بینی دلت ھمان خواھد وآنچہ خواھد دلت ھمان بینی

"جو کچھ تمہاری آنکھیں دیکھیں گی تمہارا جی بھی وہی چاہے گا اور جو کچھ تمہارا جی چاہے گا، تمہاری آنکھیں بھی وہی کچھ دیکھیں گی۔"

بہرحال نعمت کی صحیح قیمت تب ہوتی ہے جب وہ پائیدار اور دائمی ہو۔ اس لیے چھٹی صفت میں اہل بہشت کو اس لحاظ سے بھی اطمینان خاطر دلاتے ہوئے فرمایا گیا ہے: تم وہاں پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہو گے۔ (وانتم فیھا خالدون)۔

---

[1] تفسیر روح البیان جلد ۸ صفحہ ۲۹۱۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ نعمتوں کے زوال کی فکر انھیں آئندہ کے لیے پریشان کردے۔

یہاں پر اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کہ بہشت کی یہ سب نعمتیں "قیمت" کے بدلے میں دی جاتی ہیں نہ کہ کسی بہانے کے ذریعے ارشاد فرمایا گیا ہے: یہ وہی بہشت ہے کہ جس کے تم اپنے انجام دیئے گئے اعمال کی وجہ سے وارث کردیئے گئے ہو۔ (وتلک الجنۃ التی اورثتموھا بما کنتم تعملون)۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ ایک طرف تو اعمال کے بدلے کی بات کی گئی ہے اور دوسری طرف "وراثت" کا ذکر کیا گیا ہے، جو عام طور پر ایسے مواقع پر استعمال ہوتا ہے جہاں پر محنت اور بھاگ دوڑ اور تکلیف اُٹھائے بغیر کوئی نعمت انسان کو حاصل ہوتی ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تمہاری نجات کا اصل سبب تو تمہارے اعمال ہی ہیں، لیکن جو کچھ تمھیں مل رہا ہے وہ تمہارے اعمال کے مقابلے میں اس قدر زیادہ ہے گویا وہ تمھیں بالکل مفت مل رہا ہے۔

بعض مفسرین اس تعبیر کو اس بات کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ہر انسان کا ایک مقام بہشت میں ہوتا ہے اور دوسرا جہنم میں۔ چنانچہ بہشتی لوگ جہنمیوں کے وارث ہوں گے اور جہنمی اہل بہشت کے۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

ساتویں اور آخری نعمت بہشتی پھلوں کی ہے جو اللہ کی سب سے اہم اور بہترین نعمت ہے ارشاد ہوتا ہے: بہشت میں تمہارے لیے بہت سے پھل ہیں جنہیں تم کھاؤ گے (لکم فیھا فاکھۃ کثیرۃ منھا تاکلون)۔

درحقیقت ظروف اور جام مختلف کھانوں اور مشروبات کے وجود کو بیان کر رہے تھے۔ لیکن پھلوں کی بات اپنی جگہ ہے۔ لہٰذا زیرِ تفسیر آیات کی آخری آیت میں اسی چیز کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ "منھا" کے لفظ سے یہ حقیقت بیان کی جارہی ہے کہ بہشت کے پھل اس قدر زیادہ ہوں گے کہ تم ان میں سے صرف کچھ ہی کھاؤ گے اور اس طرح وہاں پر فنا و خاتمہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے درخت ہمیشہ پھل دار اور لدے ہوں گے۔

ایک حدیث میں ہے۔

"لا ینزع رجل فی الجنۃ ثمرۃ من ثمرھا الا نبت مثلاھا"۔

"کوئی بھی شخص بہشتی درختوں سے کوئی بھی پھل نہیں توڑے گا مگر یہ کہ اس کی جگہ دو پھل اور پیدا ہو جائیں گے"۔

یہ تھی جنت کی رُوح پرور نعمتوں کی ایک جھلک جو ان لوگوں کے انتظار میں ہے جن کا ایمان روشن اور اعمال صالح ہیں۔

۷۴۔ اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ۝ صلے ج
۷۵۔ لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَهُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ۝ ج
۷۶۔ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِيْنَ ۝
۷۷۔ وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ؕ قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ ۝
۷۸۔ لَقَدْ جِئْنٰكُمْ بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ۝
۷۹۔ اَمْ اَبْرَمُوْٓا اَمْرًا فَاِنَّا مُبْرِمُوْنَ ۝ ج
۸۰۔ اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ ؕ بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ ۝

ترجمہ

۷۴۔ مجرم جہنم کے عذاب میں ہمیشہ رہیں گے۔
۷۵۔ ان کے عذاب میں ہرگز کمی نہیں کی جائے گی اور وہ وہاں ہر چیز سے مایوس ہوں گے۔
۷۶۔ ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ وہ ظالم تھے۔
۷۷۔ اور وہ پکاریں گے: اے مالک! ہماری آرزو ہے کہ تمہارا پروردگار ہمیں موت دے دے (تاکہ ہم آسودہ خاطر ہو جائیں) وہ جواب دے گا تمہیں اسی حال میں رہنا ہے۔
۷۸۔ ہم تو تمہارے پاس حق لے کر آئے ہیں، لیکن تم میں سے اکثر حق کو ناپسند کرتے ہو۔

۷۹۔ بلکہ انھوں نے سازشوں پر کمر باندھلی ہے ہم نے بھی (اُنکے بارے میں) کچھ ٹھان لیا ہے۔
۸۰۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کے بھید اور ان کی سرگوشیوں کو نہیں سنتے۔ جی ہاں ہمارے رسُول (اور فرشتے) ان کے پاس ہیں اور لکھتے جاتے ہیں۔

تفسیر

مرنے اور عذاب سے جان چھڑانے کی آرزُو

ان آیات میں بروز قیامت مجرمین اور کفار کا انجام بتایا گیا ہے تاکہ پروردگار کے فرمانبردار مؤمنین کی تشویق آور انجام سے ان کا تقابل کیا جائے اور دونوں پہلو واضح ہو جائیں۔

پہلے فرمایا گیا ہے: مجرم جہنم کے عذاب میں ہمیشہ رہیں گے۔ (انّ المجرمین فی عذاب جہنم خالدون)۔

"مجرمین" "جرم" کے مادہ سے ہے اور دراصل "کاٹنے" کے معنی میں آتا ہے جو بنیادی طور پر درخت سے پھل توڑنے اور خود درخت کاٹنے کے لیے استعمال ہوا لیکن بعد میں ہر قسم کے بُرے اعمال کے لیے استعمال ہونے لگا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ یہ بُرے اعمال انسان کو خدا اور انسانی اقدار سے جُدا کر دیتے ہیں۔

لیکن ایک بات مسلّم ہے کہ یہاں پر تمام مجرمین نہیں بلکہ ایسے مجرمین مراد ہیں جنہوں نے کُفر اختیار کیا ہے اس کی وجہ ایک تو خلود یعنی عذاب میں ہمیشہ رہنے کا قرینہ ہے اور دوسرا ان مؤمنین کے ساتھ مقابلے کا قرینہ ہے جن کا ذکر گذشتہ آیات میں ہو چکا ہے۔ یہ جو مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد تمام مجرم ہیں، بہت بعید معلوم ہوتا ہے۔

ہو سکتا ہے کوئی سوچے کہ شاید زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ "دائمی عذاب" کی شدت میں کمی واقع ہو جائے اور یہ عذاب آہستہ آہستہ گھٹتا جائے، لہٰذا بعد کی آیت میں فرمایا گیا ہے کہ ان کے عذاب میں ہرگز کمی نہیں کی جائے گی اور ان کے لیے کسی قسم کی نجات کا راستہ نہیں ہوگا اور وہ وہاں پر ہر چیز سے مایوس ہوں گے (لا یفتر عنھم وھم فیہ مبلسون)۔

اس طرح سے ان کا عذاب ایک تو زمانے کے لحاظ سے دائمی ہوگا اور دوسرے شدت کے اعتبار سے، کیونکہ "مفردات" میں "راغب" کے بقول "فتور" کا معنی تیزی کے بعد سکون، سختی کے بعد نرمی اور طاقت کے بعد کمزوری ہے۔

"مبلس" "ابلاس" کے مادہ سے ہے جو دراصل اس غم کے معنی میں ہے جو سخت پریشانی کی وجہ سے انسان کو لاحق ہوتا ہے اور چونکہ اس قسم کا غم انسان کو خاموشی اور سکوت کی دعوت دیتا ہے لہٰذا "ابلاس" کا مادہ سکوت و خاموشی اور جواب نہ دے سکنے کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے اور چونکہ سخت مصائب میں انسان اپنی نجات سے مایوس ہو جاتا ہے، لہٰذا یہ مادہ مایوس ہونے کے لیے بھی استعمال ہوا ہے اور "ابلیس" کو بھی اس وجہ سے ابلیس کہتے ہیں کہ وہ خدا کی رحمت سے مایوس ہے۔

بہر حال ان دو آیات میں تین نکات پر زیادہ زور دیا گیا ہے، ایک تو عذاب کا دوام، دوسرے عذاب میں کمی کا نہ ہونا اور تیسرے غم اور مطلقاً مایوسی۔ کس قدر دردناک ہے ایسا عذاب جس میں یہ تینوں چیزیں جمع ہوں۔

بعد کی آیت میں یہ نکتہ ذہن نشین کرایا جا رہا ہے کہ خدا کا یہ دردناک عذاب ایک ایسی چیز ہے جسے ان لوگوں نے اپنے لیے خود ہی فراہم کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ وہ لوگ خود ظالم تھے۔ (وما ظلمناھم ولکن کانوا ھم الظالمین)۔

درحقیقت جس طرح سابقہ آیات میں ان بے انتہا نعمتوں کا سرچشمہ پرہیزگار مومنین کے اعمال کو بتایا گیا ہے یہاں پر بھی جاودانی عذاب کا سرچشمہ خود ان ظالموں کے اعمال کو بتایا گیا ہے۔

اس سے بڑھ کر اور کیا ظلم ہو سکتا ہے کہ انسان خدا کی آیات کا انکار کر کے اپنی سعادت کی جڑوں پر کلہاڑا چلا دے۔ سورہ صف آیت نمبر ۷ میں ارشاد ہوتا ہے:

"ومن اظلم ممن افتری علی اللہ الکذب"۔

"اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو سکتے ہیں جو اللہ پر جھوٹ باندھیں"۔

جی ہاں! قرآن مجید نے انسان کی سعادت اور شقاوت کا اصلی منبع خود انسان اور اس کے اعمال کو ہی بتایا ہے نہ کہ وہ خیالی مسائل جو بعض لوگوں نے اپنی طرف سے گھڑ لیے ہیں۔

پھر ان مجرمین کی ایک اور ناتوانی کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ پکاریں گے اے مالکِ جہنم! ہماری آرزو ہے کہ تمہارا پروردگار ہمیں موت ہی دے دے (تاکہ ہم آسودہ خاطر ہو جائیں)۔ (ونادوا یا مالک لیقض علینا ربک)۔

حالانکہ ہر شخص موت سے بھاگتا اور زندگی کے دوام کا خواہش مند ہوتا ہے لیکن بعض اوقات انسان پر مصائب کے اس قدر پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں کہ وہ خدا سے موت کی آرزو کرنے لگتا ہے۔ ایسا اتفاق دنیا میں خال خال لوگوں کے لیے پیش آتا ہے، لیکن وہاں پر مجرمین کے لیے یہ آرزو عمومی حیثیت کی حامل ہوگی اور تمام مجرم موت کی تمنا کریں گے۔

لیکن یہ آرزو بے فائدہ ہوگی، کیونکہ داروغۂ جہنم انھیں جواب دے گا: "تمھیں اسی حال میں رہنا ہوگا اور موت کے ذریعہ تمھیں نجات نہیں مل سکتی"۔ (قال انکم ماکثون)۔ [1]

پھر عجیب بات یہ ہے کہ بعض مورخین کے بقول داروغۂ جہنم انھیں بڑی بے پرواہی کے ساتھ ایک ہزار سال بعد یہ جواب دیگا اور یہ بے اعتنائی کس قدر دردناک ہوگی [2]

---

[1] "ماکثون" "مکث" کے مادہ سے ہے جس کا معنی کسی چیز کے انتظار میں ٹھہرنا ہوتا ہے۔ شاید مالکِ دوزخ کی طرف سے یہ تعبیر ان کا ایک قسم کا مذاق اڑانا ہو۔ جیسے اگر کوئی غیر مستحق شخص کسی چیز کا تقاضا کرتا ہے تو اسے کہا جاتا ہے، انتظار کرو۔

[2] تفسیر مجمع البیان" اپنی آیات کے ذیل میں، البتہ بعض مفسرین نے سالوں کے اس فاصلے کا عدد ۱۰۰۰ بتایا ہے اور بعض نے ۴۰، لیکن سالوں کی تعداد خواہ کچھ ہو، بے اعتنائی کی دلیل ضرور ہے۔

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ وہ اچھی طرح جانتے ہوں گے اور انھیں پورا یقین ہوگا کہ وہاں پر موت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، پھر ان کی یہ کیسی درخواست ہوگی؟ لیکن اس بات کی طرف بھی توجہ کرنی چاہیئے کہ جب ایک ناتواں شخص ہر جگہ سے مایوس ہو جاتا ہے تو اس کی طرف سے اس قسم کی درخواستیں فطری بات ہوتی ہیں۔

جی ہاں! جب وہ نجات کی تمام راہیں اپنے لیے مسدود دیکھیں گے تو دل سے اس قسم کی چیخ و پکار کریں گے۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ خود براہ راست خدا سے یہ درخواست کیوں نہیں کریں گے، بلکہ داروغۂ جہنم سے التماس کریں گے کہ وہ اپنے خدا سے ان کی موت مانگے؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ اس دن خدا سے محجوب (چھپے ہوئے) ہوں گے۔ جیسا کہ سورۂ مطففین کی پندرہویں آیت میں ہے:

"کلّا انھم عن ربھم یومئذ لمحجوبون"۔

لہٰذا وہ فرشتۂ عذاب کے ذریعے درخواست کریں گے، یا پھر اس لیے کہ داروغۂ جہنم فرشتہ ہوگا اور فرشتے خدا کے مقرب ہوتے ہیں۔

بعد کی آیت میں جو درحقیقت ان کے آتش جہنم میں دائمی عذاب کی وجہ بیان کر رہی ہے، فرمایا گیا ہے: ہم تو تمھارے پاس حق لے کر آئے ہیں لیکن تم میں سے بہت سے لوگ حق کو ناپسند کرتے ہیں اور اسے نہیں مانتے۔ (لقد جئناکم بالحق ولکن اکثرکم للحق کارھون)۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ بات داروغۂ جہنم کی ہے اور "ما" سے مراد فرشتوں کی جماعت ہے اور مالک دوزخ بھی اس جماعت میں ہے یا خدا کی طرف سے ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے دو نظریئے ہیں۔

البتہ کلام کا سیاق اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ یہ مالک دوزخ کی بات ہو۔ لیکن آیت کا مضمون یہ بتاتا ہے کہ کلام خدا ہے کیونکہ اسی سے مناسبت رکھتا ہے، جیسا کہ سورۂ زمر کی آیت ۷۱ اسی بات کی شاہد ہے:

"وقال لھم خزنتھا الم یأتکم رسل منکم یتلون علیکم اٰیات ربکم"۔

"جہنم کے خازنین انھیں کہیں گے، کیا تمھارے پاس تم میں سے رسول نہیں آئے جو تمھارے سامنے تمھارے رب کی آیات کی تلاوت کرتے تھے؟"

یہاں پر خازنین جہنم نے رسولوں کو حق لانے والا بتایا ہے نہ کہ خود کو۔

"حق" کا وسیع معنی ہے جو تمام تقدیر ساز حقائق پر محیط ہے اگرچہ توحید، معاد اور قرآن کا مسئلہ ان میں سرفہرست ہے۔

یہ تعبیر درحقیقت اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تم صرف انبیاء کرام ہی کے مخالف نہیں تھے، بلکہ سرے سے حق کے مخالف تھے اور یہی مخالفت تمھارے لیے دائمی عذاب کا تحفہ لے کر آئی ہے۔

بعد کی آیت میں ان کی حق سے بیزاری اور باطل کی طرفداری کے ایک گوشے کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: بلکہ انھوں نے سازشوں پر کمر باندھ لی ہے، ہم نے بھی ان کے بارے میں کچھ ٹھان لیا ہے (ام ابرموا امرا فانا مبرمون)[1]

---

[1] مذکورہ بالا آیت میں "ام" منقطعہ ہے اور "بل" کے معنی میں ہے اور "ابرام" کا معنی بل دینا اور پختہ کرنا ہے۔

انھوں نے نورِ اسلام کو بجھانے، پیغمبر اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے قتل اور ہر ممکنہ کوشش سے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی سازش تیار کی ہے۔

اور ہم نے بھی یہ ٹھان لیا ہے کہ انھیں اس جہاں اور اُس جہاں، دونوں میں سخت سزا دیں گے۔

بعض مفسرین نے اس آیت کی شانِ نزول، ہجرت سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کی سازش سے متعلق بتائی ہے کہ جس کی طرف سورہ انفال کی آیت ۳۰ میں ان الفاظ کے ساتھ اشارہ کیا گیا ہے:

"واذ یمکربک الذین کفروا ....."[1]

لیکن ظاہری مفہوم یہ ہے کہ یہ امر ایک طرح کی مطابقت ہے نہ کہ اس کی شانِ نزول۔

بعد کی آیت درحقیقت ان کی سازشوں کے اسباب میں سے ایک سبب بیان کر رہی ہے، ارشاد ہوتا ہے: بلکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کے بھید اور سرگوشیوں کو نہیں سنتے۔ (امر یحسبون انا لا نسمع سرھم ونجواھم)۔

لیکن ایسی بات نہیں ہے، ہم خود بھی ان کی باتوں کو سنتے ہیں اور ہمارے رسول اور فرشتے ان کے پاس موجود ہیں اور ہمیشہ ان کی ظاہر اور پوشیدہ باتوں کو لکھتے جاتے ہیں: (بلیٰ ورسلنا لدیھم یکتبون)۔

"سر" وہ بات ہوتی ہے جسے انسان اپنے دل میں چھپائے رہتا ہے یا پھر اپنے رازدار دوستوں سے کہتا ہے اور "نجویٰ" سرگوشی کو کہتے ہیں۔

جی ہاں! خدا صرف ان کی پوشیدہ باتوں ہی کو نہیں جانتا جو چپ چھپا کر اور سرگوشی کی صورت میں کرتے ہیں بلکہ حدیث نفس اور ان کے دل کے ساتھ ہونے والی باتوں سے بھی آگاہ ہے کیونکہ اس کے نزدیک مخفی اور آشکار میں کوئی فرق نہیں۔ جو فرشتے انسان کے اعمال اور گفتار لکھنے کے لیے مقرر کیے گئے ہیں وہ بھی ہمیشہ ان باتوں کو ان کے نامۂ اعمال میں لکھتے رہتے ہیں۔ اگرچہ اس کے بغیر بھی حقائق روشن ہیں، لیکن یہ اس لیے ہے تاکہ وہ دُنیا و آخرت میں اپنے اعمال، گفتار اور سازشوں کا نتیجہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔

---

[1] تفسیر فخر رازی اسی آیت کے ذیل میں۔

۸۱۔ قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ○
۸۲۔ سُبْحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○
۸۳۔ فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِىْ يُوْعَدُوْنَ ○
۸۴۔ وَهُوَ الَّذِىْ فِى السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِى الْاَرْضِ اِلٰهٌ ۭ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ○
۸۵۔ وَتَبٰرَكَ الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۚ وَعِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○

ترجمہ

۸۱۔ کہہ دے کہ اگر رحمٰن کا کوئی بیٹا ہوتا تو سب سے پہلے میں اس کا اطاعت گزار ہوتا۔
۸۲۔ منزّہ ہے آسمانوں اور زمین کا پروردگار، عرش کا پروردگار اس سے کہ جو یہ اس کی تعریف کرتے ہیں۔
۸۳۔ تو انہیں ان کے حال پر چھوڑ دے تاکہ وہ باطل میں غوطے کھاتے رہیں اور کھیل کود میں لگے رہیں۔ یہاں تک کہ جس دن کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے ان کے سامنے آ موجود ہو (اور وہ اپنے کیے کو پالیں)۔
۸۴۔ وہ تو وہی ہے جو آسمان میں بھی معبود ہے اور زمین میں بھی معبود ہے اور وہ حکیم و

علیم ہے۔

۸۵۔ بہت بابرکت اور ناقابلِ زوال ہے وہ جو آسمانوں، زمین اور ان کے درمیان کی ہر چیز کا مالک اور حاکم ہے اور قیامِ قیامت کی خبر بھی اسی کو ہے اور تم لوگ اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

تفسیر

انہیں باطل میں غوطے کھانے دو

گذشتہ آیات، خصوصاً سورت کی ابتدا میں خدا کے لیے اولاد کے بارے میں مشرکین کی گفتگو اور ان کے عقائد کا تذکرہ تھا کہ وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھتے تھے۔ نیز چند آیات قبل حضرت عیسیٰؑ اور ان کی خالص توحید اور پروردگار کی عبادت کی طرف دعوت کا تذکرہ بھی تھا، لہٰذا ان آیات میں باطل عقائد کی نفی کے لیے ایک اور طریقہ اختیار کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ خدا فرماتا ہے: جو لوگ خدا کے لیے اولاد ہونے کا دم بھرتے ہیں، ان سے کہہ دے کہ اگر رحمٰن کی کوئی اولاد ہوتی تو میں اس کا سب سے پہلا احترام کرنے والا اور اطاعت گزار ہوتا۔ (قل ان کان للرحمٰن ولد فانا اوّل العابدین)۔

کیونکہ خدا پر ایمان اور اعتقاد بھی مجھے تم سے زیادہ ہے اور اس کی آگاہی اور معرفت بھی زیادہ ہے اور اس کی اولاد کا احترام بھی میں تم سے پہلے کرتا اور اس کی اطاعت بھی۔

اگرچہ اس آیت کا مضمون کچھ مفسرین کی نظر میں پیچیدہ ہے اور انہوں نے اس کی مختلف توجیہیں کی ہے کہ جن میں سے بعض توجیہات تو عجیب معلوم ہوتی ہیں۔[1]

لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اس مضمون میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایسا دل کش اندازِ گفتگو ہے جو ہٹ دھرم

---

[1] بعض مفسرین نے "ان" کو نفی کے معنی میں اور "انا اوّل العابدین" کو خدا کا سب سے پہلا عبادت کرنے والا، کے معنی میں لیا ہے۔ اس تفسیر کے مطابق آیت کا معنی یوں ہوگا: "خدا کی کوئی اولاد نہیں اور میں سب سے پہلا عبادت کرنے والا ہوں"۔ جب کہ کئی اور مفسرین نے "عابدین" کو "عبادت سے انکار کرنے والا" کے معنی میں لیا ہے، تو اس صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا: اگر خدا کی کوئی اولاد ہوتی تو میں ایسے خدا کی ہرگز عبادت نہ کرتا، کیونکہ صاحب اولاد کبھی خدا نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی تفسیریں کسی بھی صورت میں آیت کے ظاہر سے مطابقت نہیں رکھتیں۔

اور جھگڑالو لوگوں کے لیے ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص غلط فہمی کی بنا پر ایسے شخص کے بارے میں یہ کہے کہ وہ "اعلم" ہے جو "اعلم" نہ ہو تو ہم اسے کہیں گے: اگر وہ اعلم ہوتا تو سب سے پہلے ہم اس کی اقتدا کرتے۔ یہ اس لیے ہوتا ہے تاکہ وہ اپنے دعوٰی کے استدلال کے بارے میں غور و فکر سے کام لے اور جب اسے سمجھ آجائے تو خواب غفلت سے بیدار ہو جائے۔

غرض، یہاں پر دو نکتوں کی طرف توجہ ضروری ہے۔

پہلا یہ کہ لفظ عبادت ہر جگہ پرستش کے معنی میں نہیں ہوتا، بلکہ کبھی اطاعت، تعظیم اور احترام کے معنی میں بھی آتا ہے اور یہاں پر بھی اسی معنی میں ہے۔ کیونکہ بفرض محال اگر خدا کی اولاد ہوتی تو بھی اس کی عبادت کے لیے کوئی دلیل موجود نہ تھی اور چونکہ اسی فرض محال کی بنا پر خدا کی اولاد ہے، لہٰذا اس کی اطاعت اور احترام کا ذکر کیا گیا ہے۔

دوسرا یہ کہ عربی ادب کی رُو سے عام طور پر "لو" "ان" کے معنی میں آتا ہے جو محال ہونے پر دلالت کرتا ہے اور اگر اس آیت میں ایسا نہیں کہا گیا تو اس کی وجہ صرف فریق مخالف سے اندازِ گفتگو میں ہم آہنگی اور رواداری کا مظاہرہ کرنا ہے۔

اس طرح سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں مطمئن کرنے کے لیے کہا کہ خدا کے لیے اولاد کا تصور نہیں کیا جا سکتا، اگر اس کی کوئی اولاد ہوتی تو میں سب سے پہلے اس کا احترام کرتا۔

اس گفتگو کے بعد ان بے بنیاد دعووں کی نفی کے لیے ایک اور روشن دلیل پیش کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ لوگ جو کچھ بیان کرتے ہیں تمام آسمانوں اور زمین کا مالک، عرش کا مالک اس سے پاک و پاکیزہ ہے (سبحان رب السماوات والارض رب العرش عما یصفون)۔

جو ذات آسمانوں اور زمین کی مالک مدبر ہے اور عرش عظیم کی پروردگار ہے، اسے اولاد کی کیا ضرورت ہے، وہ غیر متناہی اور تمام کائنات پر حاوی ہے اور تمام مخلوقات کی مربی ہے۔ اولاد کی تو اسے ضرورت ہوتی ہے، جسے مرجانا ہو لہٰذا اولاد کے ذریعے وہ اپنی نسل کو باقی رکھنا چاہے۔

اولاد کی تو اسے ضرورت ہوتی ہے، جسے کمزوری اور تنہائی کے موقع پر تعاون اور محبت کی ضرورت ہو۔

غرض اولاد کا وجود جسم ہونے اور زمان و مکان میں محدود ہو جانے کی دلیل ہوتا ہے۔

عرش، آسمان اور زمین کے پروردگار کو جو ان سب سے بے نیاز ہے، اولاد کی ضرورت نہیں ہے۔

"رب السماوات والارض" کے بعد "رب العرش" کا ذکر درحقیقت "عام" کے بعد خاص کا ذکر ہے، کیونکہ جس طرح ہم پہلے بتا چکے ہیں "عرش" کا اطلاق تمام کائنات پر ہوتا ہے جو کہ خالق اکبر کا تختِ حکومت ہے۔

ایک یہ احتمال بھی ہے کہ "عرش" کے لفظ سے مافوق الطبیعۃ کائنات کی طرف اشارہ ہو جو کہ "سماوات وارض" کے مقابل میں ہے جس سے مادی کائنات کی طرف اشارہ ہے۔

(عرش کے معنی کی مزید تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۲ سورۂ بقرہ آیت ۲۵۵ نیز تفسیر نمونہ جلد ۲، سورۂ بقرہ آیت نمبر ۷ کی تفسیر کا مطالعہ فرمائیں)۔

پھر ان ہٹ دھرم لوگوں سے بے نیازی، بے اعتنائی اور تہدید کا انداز اختیار کیا گیا ہے اور یہ بذاتِ خود اس قماش کے لوگوں کے

ساتھ بحث کا ایک طریقہ ہے۔ ان کے بارے میں رسُول اکرمؐ سے فرمایا گیا ہے: اب جب صورتِ حال یہی ہے تو انھیں تو اُنکے حال پر چھوڑ دے تاکہ وہ باطل میں غوطے کھاتے رہیں اور کھیل کُود میں لگے رہیں یہاں تک کہ جس دن کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے ان کے سامنے آموجود ہو (اور وہ اپنے تلخ اعمال اور بُرے اور شرمناک افکار کا ثمرہ چکھ لیں۔ (فذرھم یخوضوا ویلعبوا حتّٰی یلاقوا یومھم الذی یوعدون)۔

ظاہر ہے کہ اس روز سے مُراد وہی قیامت کا موعود دن ہے۔ بعض مفسرین نے جو یہ احتمال پیش کیا ہے کہ اس سے مُراد موت کا لمحہ ہے، بہت بعید معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اعمال کی سزا و جزا قیامت کے دن ملے گی نہ کہ موت کے وقت۔

یہ وہی یوم موعود ہے جس کے متعلق سُورہ بُرُوج کی آیت ۲ میں قسم کھائی گئی ہے کہ "والیوم الموعود" روز موعود (قیامت کے دن) کی قسم۔

بعد کی آیت میں مسئلہ توحید کے بارے میں سلسلہ گفتگو کو جاری رکھا گیا ہے جو ایک لحاظ سے تو ماقبل کی آیات کا نتیجہ ہے اور دوسرے لحاظ سے ان کی تکمیل اور استحکام کی دلیل ہے اور اس میں خداوند کریم کی سات صفات کو بیان کیا گیا ہے جو سب کی سب نظریہ توحید کی بنیادوں کے استحکام کے لیے مؤثر ہیں۔

پہلے تو ان مشرکین کے عقائد کی نفی کی جاتی ہے جو بزعم خود آسمان اور زمین کے لیے علیحدہ علیحدہ خداؤں کے قائل تھے، بلکہ دریا صحرا، جنگ، صُلح حتی کہ مختلف انواع کے لیے علیحدہ اور جداگانہ خداؤں کے قائل تھے۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ تو وہی ہے جو آسمانوں میں بھی معبُود ہے اور زمین میں بھی۔ (وھو الذی فی السماء الٰہ وفی الارض الٰہ)۔

کیونکہ گزشتہ آیات میں مذکور اس کی آسمانوں اور زمین میں ربوبیت کو قبول کر لینے سے الوہیت کا مسئلہ بھی ثابت ہو جائے گا کیونکہ صحیح معنوں میں معبُود وہی ہے جو کائنات کا رب، مدبر اور مدبر ہے۔

نہ تو ارباب انواع اور فرشتے عبادت کے لائق ہیں اور نہ ہی حضرت عیسٰی علیہ السلام اور بُت! کیونکہ ان میں سے کوئی بھی مقام ربوبیت کا حامل نہیں ہے، بلکہ اپنے اپنے مقام پر مخلوق، مربوب اور اس کے خوان نعمت کے نمک خوار ہیں اور اسی کی عبادت کرتے ہیں۔

پھر دوسری اور تیسری صفت کو بیان کرتے ہُوئے فرمایا گیا ہے: اور وہی حکیم و علیم ہے (وھو الحکیم العلیم)۔

اس کے تمام کام حساب و کتاب اور حکمت پر مبنی ہیں اور وہ ہر چیز سے آگاہ اور باخبر ہے۔

اس طرح سے بندوں کے اعمال سے بخوبی واقف ہے اور اپنی حکمت کے مطابق انھیں جزا یا سزا دیتا ہے۔

چوتھی اور پانچویں صفت میں اس کے وجُود کی بے پناہ اور دائمی برکات اور آسمان و زمین میں اس کی مالکیت کے بارے میں گفتگو کرتے ہُوئے قرآن کہتا ہے: بہت ہی بابرکت اور ناقابل زوال ہے وہ جو آسمانوں، زمین اور ان دونوں کے درمیان کی ہر چیز کا مالک ہے: (وتبارک الذی لہ ملک السمٰوٰت والارض وما بینھما)۔

"تبارک" "برکت" کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے "عظیم اور بہت بڑی اچھائی کا مالک ہونا" یا "ثبات و بقا کا مالک ہونا" یا "اچھائی اور ثبات و بقا ہر دو کا مالک ہونا"۔ اور خداوند عالم کے بارے میں دونوں باتیں صادق آتی ہیں کیونکہ ایک تو اس کا وجود جاودانی اور برقرار ہے اور دوسرے عظیم اور بہت بڑی اچھائی کا منبع ہے۔

بلکہ اصولی طور پر عظیم خیر و خوبی کا تصور بغیر ثبات و برقراری کے ناممکن ہوتا ہے، کیونکہ اچھائیاں اور خوبیاں خواہ کتنی ہی زیادہ ہوں لیکن عارضی ہیں، لہٰذا ناپائیدار کے لیے فراوانی اور عظمت بے معنی ہے۔

آخر میں چھٹی اور ساتویں صفت کے بارے میں فرمایا گیا ہے: اور قیام قیامت کی خبر بھی صرف اسی کو ہے اور تم سب لوگ اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے "(وعندہ علم الساعۃ والیہ ترجعون)۔

اسی لیے اگر تمہیں خیر و برکت کی ضرورت ہے تو اسی سے طلب کرو نہ کہ بتوں سے اور قیامت کے دن تمہارا مقدر اسی سے وابستہ ہے اور اس دن تمہاری بازگشت اسی کی طرف ہے۔ اور بت ہوں یا دوسرے معبود ان کا اس بارے میں کوئی عمل دخل نہیں ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ **سماوات وارض کا تین مرتبہ ذکر:** یہ الفاظ ایک بار تو پروردگار کی ربوبیت اور اس کے تمام امور میں تصرف اور تدبر کے عنوان سے، ایک مرتبہ پروردگار کی الوہیت کے بیان کے طور پر اور ایک مرتبہ اس کی حاکمیت اور مالکیت کو بیان کرنے کے لیے زیر بحث آیات میں آئے ہیں اور یہ تینوں آپس میں مربوط ہیں اور درحقیقت ایک دوسرے کی علت و معلول ہیں۔ وہ "مالک" ہے اور اسی وجہ سے "رب" ہے اور نتیجہ کے طور پر "الٰہ" ہے، اور "حکیم" "علیم" کے ساتھ اس کی توصیف بھی ان معانی کا تتمہ ہے۔

۲۔ **زندیقین کا غلط استنباط:** بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض زندیق اور مشرکین نے مندرجہ بالا آیت "وھو الذی فی السماء الٰہ وفی الارض الٰہ" کو اپنے عقیدہ کے ثبوت کے لیے ایک دستاویز بنا لیا اور اپنے غلط وہم کی وجہ سے اس کی یہ تفسیر کی کہ آسمان میں ایک معبود ہے اور زمین میں کوئی دوسرا معبود ہے، حالانکہ خود آیت اس کے برعکس کہتی ہے اور وہ یہ کہ وہ آسمانوں میں بھی معبود ہے اور زمین میں بھی یعنی ہر جگہ معبود صرف وہ ہے۔

چنانچہ جب اس بات کو سوال کے طور پر ائمہ معصومین علیہم السلام کے سامنے پیش کیا گیا تو انھوں نے اس کا "نقضی جواب" بھی دیا اور "حلی جواب" بھی۔

جب کہ کتاب کافی میں "ہشام بن حکم" سے منقول ہے کہ "ابو شاکر دیصانی"[1] نے مجھے کہا کہ قرآن میں ایک ایسی آیت ہے جو ہماری بات کہتی ہے۔ میں نے کہا: وہ کیا؟

تو اس نے یہ آیت پڑھی: "وھو الذی فی السماء الٰہ وفی الارض الٰہ"۔ مجھ سے اس کا جواب نہ بن پڑا۔

میں اس سال خانۂ خدا کی زیارت سے مشرف ہوا اور امام جعفر صادقؑ کے پاس جا کر حاضری دی اور تمام ماجرا ان کی خدمت میں عرض کیا۔ آپؑ نے فرمایا "یہ کسی خبیث ملحد کی بات ہے، جب تم واپس جاؤ تو اس سے پوچھو کہ کوفہ میں تمہارا کیا نام ہے تو وہ کہے گا کہ فلاں، پھر پوچھو کہ بصرہ میں تمہیں کس نام سے پکارتے ہیں تو وہ کہے گا کہ فلاں سے، تو تم کہنا کہ ہمارا پروردگار بھی اسی طرح ہے، آسمانوں میں "الٰہ"

---

[1] "ابو شاکر دیصانی" فرقہ "دیصانیہ" کے علماء میں سے ایک ماہر "ثنویت" (دو گانہ پرستی) کا عقیدہ رکھتے تھے اور نور اور ظلمت کے خداؤں کے قائل تھے۔ (ملاحظہ ہو لغت نامہ "دھخدا" مادہ "دیصان")

اور معبود وہی ہے اور زمین بھی الٰہ اور معبود وہی ہے ، اسی طرح دریاؤں اور صحراؤں غرض ہر جگہ وہی الٰہ اور معبود ہے ۔

ہشام کہتے ہیں کہ جب میں واپس آیا تو "ابو شاکر" کے پاس جا کر اس کا جواب دیا ، ابو شاکر نے کہا "یہ تمھارا جواب نہیں ہو سکتا بلکہ اسے تم حجاز سے لائے ہو" [1]

عظیم مفسر "طبرسی" نے زیر تفسیر آیت میں لفظ "الٰہ" کے تکرار کی دو علتیں بیان کی ہیں ایک تو ہر جگہ پروردگار کی الوہیت کی تاکید اور دوسری یہ کہ آسمان کے فرشتے بھی اس کی عبادت کرتے ہیں اور زمین کے انسان بھی اس کی پرستش کرتے ہیں۔ بنا بریں وہ فرشتوں، انسانوں اور زمین و آسمان میں موجود تمام موجودات کا معبود ہے ۔

---

[1] اصول کافی جلد اول کتاب التوحید "باب الحرکۃ والانتقال" حدیث ۱۰۔

۸۶۔ وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ○

۸۷۔ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ○

۸۸۔ وَقِيْلِهٖ يٰرَبِّ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ○

۸۹۔ فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلٰمٌ ؕ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ○

ترجمہ

۸۶۔ اس کے سوا یہ جن کو پکارتے ہیں وہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے، ہاں مگر وہ لوگ کہ جو حق کی شہادت دیتے ہیں اور خوب آگاہ ہیں۔

۸۷۔ اگر تو ان سے پوچھے کہ انھیں کس نے پیدا کیا ہے تو یقیناً وہ کہیں گے خدا نے تو پھر وہ خدا کی عبادت سے کیوں کر روگردانی کرتے ہیں۔

۸۸۔ وہ لوگ پیغمبر کی اس شکایت سے کیسے غافل ہیں کہ وہ کہے گا پروردگارا! یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان نہیں لاتے۔

۸۹۔ (اب جبکہ یہ عالم ہے) تو تُو ان سے مُنہ پھیر لے اور کہہ دے کہ تم کو سلام، لیکن وہ بہت جلد جان لیں گے۔

تفسیر

شفاعت کون کرسکتا ہے؟

ان آیات میں جو سورۂ زخرف کی آخری آیتیں ہیں، حسبِ سابق مشرکین کے تلخ انجام اور کئی دلائل کے ذریعے ان کے عقیدے کے باطل ہونے کو واضح کیا گیا ہے، سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: اگر وہ شفاعت کے گمان میں ایسے معبودوں کی عبادت کرتے ہیں تو انھیں معلوم ہونا چاہیئے: "خدا کے سوا جن لوگوں کی یہ عبادت کرتے ہیں وہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے" (ولا یملک الذین یدعون من دونہ الشفاعۃ)۔

خدا کی بارگاہ میں "شفاعت" کا حق اسی کے اذن و فرمان کے مطابق ہوگا اور حکمت والے خدا نے ان بے قدر و قیمت اور عقل و شعور سے عاری پتھروں اور لکڑیوں کو ہرگز یہ اذن و فرمان نہیں دیا۔

لیکن چونکہ ان کے معبودوں میں فرشتے اور ان جیسی دوسری مخلوق بھی ہے۔ لہٰذا اسی آیت کے ضمن ہی میں ان کو مستثنیٰ کرتے ہوئے فرمایا "مگر وہ کہ جنہوں نے حق کی شہادت دی" (الا من شھد بالحق)۔

وہی جنہوں نے تمام مراحل میں خدا کی توحید اور یگانگت کو دل و جان سے قبول کیا اور حق کے آگے پوری طرح جھک گئے، یقیناً ایسے لوگ بحکم پروردگار شفاعت کے مالک ہوں گے۔

لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ ہر شخص کے لیے شفاعت کریں گے خواہ وہ بت پرست، مشرک اور آئینِ توحید سے منحرف ہی کیوں نہ ہوں! بلکہ "وہ اچھی طرح جانتے ہیں" کہ کن لوگوں کے حق میں شفاعت کر سکتے ہیں۔ (وھم یعلمون)۔

تو اس طرح سے ان (مشرکین) کی فرشتوں سے شفاعت کی امید کو دو دلیلوں کے ساتھ قطع کرتا ہے: ایک تو یہ کہ خود فرشتے توحید کی شہادت دیتے ہیں اسی لیے انھیں شفاعت کی اجازت ہے اور دوسرے یہ کہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ کن لوگوں کے حق میں شفاعت کرنی ہے۔[1]

بعض مفسرین نے "وھم یعلمون" کے جملہ کو "الا من شھد بالحق" کا تتمہ سمجھا ہے، جس کے مطابق جملے کا مفہوم یوں ہوگا کہ: صرف وہی لوگ شفاعت کا حق رکھتے ہیں جو توحید کی شہادت دیتے ہیں اور اس کی حقیقت سے آگاہ ہیں۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

---

[1] اس تفسیر کے مطابق "الا من شھد بالحق" میں "استثنائے متصل" ہے، لیکن اگر "الذین یدعون من دونہ الشفاعۃ" سے مراد خاص کر بت ہوں تو پھر "استثنائے منقطع" ہوگا، لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے خاص کر "الذین" کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، کیونکہ وہ عقلمندوں کے لیے یا عاقل اور غیر عاقل دونوں کے لیے غلبہ کی صورت میں استعمال ہوتا ہے۔

بہر حال یہ آیت اللہ کی بارگاہ میں شفاعت کرنے والوں کی اہم شرط کو بیان کر رہی ہے، کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو حق کی گواہی دیتے ہیں، تمام مرحلوں پر حق کو پہچانتے ہیں، توحید کی رُوح سے اچھی طرح واقف ہیں اور ان شرائط سے بھی باخبر ہیں جو شفاعت کیئے جانے والے لوگوں میں پائی جانی چاہئیں۔

پھر خود مشرکین کے اپنے عقائد کو سامنے رکھتے ہُوئے انہیں دندان شکن جواب دیتا ہے، ارشاد فرماتا ہے: "اگر تم ان سے پوچھو گے کہ ان کو کس نے پیدا کیا ہے، تو یقیناً وہ کہیں گے کہ خدا نے" (ولئن سألتهم من خلقهم ليقولن الله)۔

ہم کئی مرتبہ بتا چکے ہیں کہ عرب اور غیر عرب مشرکین میں بہت کم ایسے لوگ ملیں گے جو بُتوں کو خالق اور پیدا کرنے والا مانتے ہوں بلکہ وہ یا تو انھیں خدا کی بارگاہ میں شفاعت کا ایک ذریعہ جانتے تھے اور یا اولیاء اللہ کے مقدس وجود کی علامت اور نمونہ سمجھتے تھے لیکن ساتھ ہی ان کا یہ بہانہ بھی تھا کہ ہمارے معبُود کو ایک محسُوس چیز ہونا چاہیئے تاکہ ہم اس سے مانُوس ہو سکیں۔ اسی لیے وہ ان کی عبادت کیا کرتے تھے۔ لہٰذا جب ان سے خالق کے بارے میں پوچھا جاتا تھا تو فوراً کہہ دیتے تھے کہ "اللہ"۔

قرآن نے بارہا اس حقیقت کی یاد دھانی کرائی ہے کہ عبادت صرف اور صرف کائنات کے خالق اور مدبر کے شایانِ شان ہے۔ لہٰذا اگر تم اسی کو خالق اور مدبر سمجھتے ہو تو پھر اس کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں رہ جاتا کہ اسے "عبودیت" اور الوہیت سے مخصوص بھی سمجھو۔

اسی لیے آیت کے اختتام پر انھیں سرزنش کرتے ہُوئے فرمایا گیا ہے کہ اگر صورتِ حال یہی ہے تو "پھر وہ خدا کی عبادت سے مُنہ مُوڑ کر اس کے غیر کی طرف کیوں رُخ کرتے ہیں" (فانّٰی یُؤفکون)۔

بعد کی آیت میں رسُولِ پاک کی بارگاہ ایزدی میں اس ہٹ دھرم اور بے منطق قوم کی شکایت کے بارے میں فرمایا گیا ہے: وہ لوگ پیغمبر کی اس شکایت سے کیونکر غافل ہیں کہ وہ کہیں گے: پروردگارا! یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان نہیں لاتے۔ (وقيله يا رب انّ هٰؤلاء قوم لا يؤمنون)۔

پیغمبرؐ کہیں گے کہ مَیں نے انہیں شب و روز تبلیغ کی، انھیں بہشت کی خوش خبری دی اور جہنم کے عذاب سے ڈرایا، گزشتہ اقوام کے انجام سے انہیں مطلع کیا، تیرے عذاب سے انھیں ڈرایا اور گمراہی سے بچنے کی صُورت میں انھیں تیری رحمت کی ترغیب دلائی، غرض اپنی بساط کے مطابق انہیں سب کچھ بتایا اور جو کہنے کی باتیں تھیں، ان سے کہیں، لیکن پھر بھی میری ان گرم باتوں نے ان کے سرد دلوں پر کوئی اثر نہ کیا اور وہ ایمان نہیں لائے، اس حقیقت سے تو بھی واقف ہے اور وہ بھی۔[1]

---

[1] "وقيله" کا عطف کس پر ہے، اس بارے میں مفسرین کی مختلف آراء ہیں۔ کچھ اسے تین آیات قبل موجُود لفظ "الساعة" پر عطف سمجھتے ہیں۔ اس صورت میں اس جُملے کا مفہوم یُوں ہوگا: خدا قیامت سے بھی باخبر ہے اور کفار کے بارے میں پیغمبر کی شکایت سے بھی۔ کچھ اسے "علم الساعة" پر معطوف سمجھتے ہیں۔ (البتہ اس شرط کے ساتھ کہ "قیلہ" سے پہلے "علم" محذوف ہے) تو ایسی صُورت میں معنی کے لحاظ سے اس کا پہلی تفسیر کے ساتھ زیادہ فرق نہیں ہے جبکہ بعض مفسرین نے واؤ کو قسم کے معنی سمجھا ہے۔ اس قسم کے اور بھی کئی احتمالات ہیں جن کو بیان کرنے سے بات لمبی ہو جائے گی۔ البتہ ایک اور قابلِ ذکر احتمال بھی ملتا ہے جو شاید سب سے بہتر ہے اور وہ یہ کہ اس کا عطف "انّٰی یؤفکون" پر ہے اور تقدیری طور پر یوں ہوگا۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

اسی سلسلے کی آخری آیت میں خداوند عالم اپنے پیغمبرؐ کو حکم دے رہا ہے: اب جبکہ صورتِ حال یہ ہے تو تو ان سے منہ پھیر لے۔ (فاصفح عنھم)۔

لیکن یہ روگردانی اور جدا ہونے کی صورت میں نہ ہو کہ جس میں سختی اور ترشی پائی جاتی ہو۔ بلکہ اُن سے کہہ دے: "تم پر سلام" (وقل سلام)۔

دوستی اور تحیہ کے عنوان سے نہیں بلکہ جدائی اور علیحدگی کے طور پر سلام ہو۔ اور یہ سلام درحقیقت اس سلام کے مشابہ ہے جو سورۂ فرقان کی آیت ۶۳ میں بیان ہوا ہے۔

"واذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما"۔

جب جاہل لوگ ان کو بُرے لفظوں کے ساتھ مخاطب کرتے ہیں تو وہ جواب میں "سلام" کہہ دیتے ہیں۔

ایسا سلام جو بے اعتنائی اور بزرگواری کی علامت ہوتا ہے۔

لیکن اس کے باوجود انھیں ایک معنی خیز جملے کے ساتھ دھمکی بھی دی جاتی ہے تاکہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ جدائی اور علیحدگی اس بات کی دلیل ہے کہ اب خدا کا ان سے کوئی سروکار ہی نہیں رہا، ارشاد ہوتا ہے: لیکن وہ بہت جلد جان لیں گے۔ (فسوف یعلمون)۔

جی ہاں انھیں معلوم ہو جائے گا کہ انھوں نے اپنی ہٹ دھرمیوں اور ضد کی وجہ سے کیسی آگ اور کس قدر دردناک عذاب فراہم کر لیا ہے؟

بعض مفسرین نے "ولا یملک الذین یدعون ..... کی شانِ نزول ذکر کی ہے اور وہ یہ کہ "نضر بن حارث" اور قریش کے چند دیگر لوگوں نے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جو کچھ کہتا ہے اگر وہ حق ہے تو ہمیں اس کی شفاعت کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ ہماری فرشتوں سے دوستی ہے اور ہم انھیں اپنا ولی سمجھتے ہیں اور وہی شفاعت کرنے کے بھی زیادہ سزاوار ہیں۔ اس موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی (جس میں انھیں خبردار کیا گیا ہے کہ بروز قیامت ملائکہ کسی کی شفاعت نہیں کریں گے۔ اگر کریں گے بھی تو ان لوگوں کی جو حق کی گواہی دیتے ہیں۔ یعنی مومنین کی)[1] دے

یہاں پر سورۂ زخرف ختم ہو جاتی ہے۔

(بقیہ حاشیہ ص گا)

"انی یؤفکون من عبادۃ ومن قیلہ یارب ان ھؤلاء قوم لا یؤمنون"۔

"خدا کی عبادت سے کیوں انحراف کرتے ہیں اور اس بے ایمان قوم سے پیغمبرؐ کی شکایت کو کیونکر اندازہ کر سکتے ہیں"؟

[1] اس تفسیر کے مطابق "الا من شھد بالحق" کا جملہ شفاعت کئے جانے والوں کی صفت ہے نہ کہ شفاعت کرنے والوں کی۔

[2] تفسیر قرطبی جلد ۹ ص ۵۱۲۲

پروردگارا! ہمارا رابطہ اپنے ساتھ اور اپنے اولیاء کے ساتھ روز بروز زیادہ سے زیادہ مستحکم فرما، تاکہ ان کی شفاعت ہمارے شاملِ حال ہو سکے۔

خداوندا! ہمیں ہر قسم کے جلی اور خفی شرک سے محفوظ فرما اور اُس سے دُور رکھ۔

بارِ الٰہا! قیامت کے دن کے جو اوصاف تو نے اپنی آسمانی کتابوں میں بیان فرمائے ہیں، اُن کے مطابق وہ دن بہت سخت اور طاقت فرسا ہوگا۔ اُس دن تو ہمارے ساتھ اپنے فضل و کرم کا مظاہرہ فرمانہ کہ اپنے عدل کا۔ آمین!

آمین یارب العالمین!

تفسیر سُورۂ زخرف کا اختتام

۳۰ رجب ۱۴۰۵ھ

۱۳۶۴/۱/۵

سُورۂ "دخان"

* ــــ مکہ میں نازل ہُوئی
* ــــ اس کی ۵۹ آیتیں ہیں

تاریخ آغاز
۳، رجب المرجب ۱۴۰۵ھ

سورۂ دخان
کے
مضامین

یہ "حوامیم" کی سات سورتوں میں سے پانچویں سورت ہے، چونکہ یہ مکی سورتوں میں سے ہے لہٰذا انھیں کے مضامین کی حامل بھی ہے۔ یعنی اس میں زیادہ تر گفتگو مبدأ، معاد اور قرآن پاک کے بارے میں کی گئی ہے۔

اس بارے میں اس کی آیات یوں منظم کی گئی ہیں کہ سوئے ہوئے اور غافل دلوں کو جھنجھوڑ کر بیدار کر رہی ہیں اور انھیں ایمان، تقویٰ، حق اور عدالت کی دعوت دے رہی ہیں۔

اس سورت کو سات حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

① سورت کی ابتدا حروفِ مقطعات سے ہوتی ہے، پھر عظمتِ قرآن کا تذکرہ ہے اور اسی تذکرے میں پہلی بار بتایا گیا ہے کہ اس کا نزول شبِ قدر میں ہوا ہے۔

② اس کے دوسرے حصے میں خدا کی توحید کا ذکر ہے اور کائنات میں اس کی عظمت کی کچھ نشانیوں کا بیان ہے۔

③ اس کے اچھے خاصے حصے میں کفار کا انجام اور انہیں ملنے والے طرح طرح کے دردناک عذاب کا تذکرہ ہے۔

④ اس کے ایک اور حصے میں ان غافلوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لیے فرعون اور فرعون کے ساتھیوں اور بنی اسرائیل کے مقابلے میں فرعونیوں کی زبردست شکست اور تباہی و بربادی کے تذکرے ہیں۔

⑤ آیات کے ایک حصے میں قیامت کے مسئلے کو بیان کیا گیا ہے اور اس دن جہنمیوں کے دردناک عذاب اور پرہیزگاروں کے لیے روح پرور جزا کو بیان کیا گیا ہے۔

⑥ متعدد آیات میں تخلیقِ کائنات کا مقصد بیان کیا گیا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ آسمان و زمین کی تخلیق بے فائدہ نہیں ہے۔

⑦ جس طرح سورت کا آغاز عظمتِ قرآن کے ذکر سے ہوا ہے، اسی طرح اس کا اختتام بھی قرآن کی عظمت کے تذکرے کے ساتھ ہوتا ہے۔

اس سورت کی دسویں آیت میں "دخان مبین" کا لفظ آیا ہے۔ اس لیے اس کا نام سورۂ "دخان" ہے۔

سورۂ "دخان" کی تلاوت کا ثواب

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے:

"من قرأ سورة الدخان ليلة الجمعة ويوم الجمعة بنى الله له بيتا في الجنة"

"جو شخص شب جمعہ اور جمعہ کے دن سورہ دخان کی تلاوت کرے گا خدا اس کے لیے بہشت میں گھر بنائے گا۔" [1]

آپ ہی سے روایت ہے۔

"من قرأ سورة الدخان في ليلة، اصبح يستغفر له سبعون الف ملك"

"جو شخص سورۂ دخان کو رات کو پڑھے، ایسی حالت میں صبح کرے گا کہ ستر ہزار فرشتے اس کے لیے استغفار کرتے ہوں گے۔" [2]

ایک اور حدیث میں ابوحمزہ ثمالی نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے یوں روایت کی ہے:

"من قرأ سورة الدخان في فرائضه ونوافله بعثه الله من الآمنين يوم القيامة، واظله تحت ظل عرشه، وحاسبه حسابا يسيرا، واعطى كتابه بيمينه"

"جو شخص اپنی فرض و نفل نمازوں میں سورۂ دخان کی تلاوت کرے گا خدا اسے ان لوگوں کے ساتھ محشور کرے گا جو قیامت کے دن امن و امان میں ہوں گے، اسے اپنے عرش کے زیر سایہ رکھے گا، اس کا حساب آسان طریقے سے لے گا اور اس کے نامۂ اعمال کو اس کے دائیں ہاتھ میں دے گا۔" [3]

---

[1]، [2] و [3] مجمع البیان جلد ۹ سورۂ دخان کا آغاز۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱۔ حٰمٓ ①

۲۔ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ②

۳۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ○

۴۔ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ○

۵۔ اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا ؕ اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ○

۶۔ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○

۷۔ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۘ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ○

۸۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ؕ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ○

ترجمہ

مہربان اور رحم کرنے والے خدا کے نام سے

۱۔ حٰمٓ

۲۔ اس واضح کتاب کی قسم۔

۳۔ کہ جسے ہم نے مبارک رات میں نازل کیا، ہم ہمیشہ سے ڈرانے والے تھے۔

۴۔ وہ رات کہ جس میں ہر امر خدا کی حکمت کے مطابق مرتب ہوتا ہے۔

۵۔ ہماری طرف سے ایک حکم تھا، ہم ہی نے (محمدؐ کو) بھیجا ہے۔

۶۔ یہ سب تمہارے پروردگار کی رحمت کی وجہ سے ہے، بیشک وہ سُننے والا اور جاننے والا ہے۔

۷۔ وہ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا پروردگار ہے، اگر تم اہلِ یقین ہو۔

۸۔ اس کے سوا کوئی معبُود نہیں، وہی جِلاتا اور مارتا ہے، تمہارا پروردگار اور تمہارے اگلے باپ دادا کا بھی پروردگار ہے۔

تفسیر

مبارک رات میں قرآن کا نزُول

اس سُورت کے آغاز میں بھی گزشتہ چار اور آئندہ دو سورتوں کی طرح، جو مجموعی طور پر سات سُورتیں بنتی ہیں ہم ایک بار پھر حروفِ مقطعات (حٰم) کی زیارت کر رہے ہیں۔ حروفِ مقطعات کے بارے میں ہم پہلے ہی تفصیل کے ساتھ مکمل تفسیر بیان کر چکے ہیں۔[1]

خصوصی طور پر "حٰم" کے بارے میں "حوامیم" میں سے پہلی سُورت (مؤمن) اور پھر سُورت "حٰم سجدہ" کے آغاز میں تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔

یہاں پر یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ اس مقام پر بعض مفسرین نے "حٰم" کی قسم کے معنی سے تفسیر کی ہے۔ یعنی اس جگہ دو قسمیں بیان ہو رہی ہیں، ایک اسی "حٰم" کے ساتھ اور دوسری بعد کی آیت میں "کتاب مبین" کے ساتھ۔ دونوں قسمیں پے در پے اور ایک دوسرے کے ساتھ مُناسبت رکھتی ہیں۔ ایک تو "حٰم" کے حرفوں کے ساتھ قسم اور دوسری اس مقدس کتاب کے ساتھ قسم جس نے ان جیسے حروف سے ہی کتاب کی شکل اختیار کی ہے۔

اس سُورت کی دوسری آیت میں، جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں، قرآن مجید کی قسم کھائی گئی ہے کہ "قسم ہے اس آشکار

---

[1] اس بارے میں تفسیر نمونہ جلد اوّل سُورۂ بقرہ کے آغاز، تفسیر نمونہ جلد ۲ سُورہ آلِ عمران کے آغاز اور جلد ششم سُورۂ اعراف کے آغاز کا مطالعہ فرمائیے۔

کتاب کی : (والکتاب المبین)۔

ایسی کتاب جس کے مندرجات روشن، جس کے معارف آشکار، جس کی تعلیمات زندہ، جس کے احکام تعمیری اور جس کے پروگرام منظم اور جچے تلے ہیں۔ ایسی کتاب جو اپنی حقانیت کی آپ دلیل ہے، آفتاب آمد دلیل آفتاب۔[1]

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ قسم کس لیے کھائی گئی ہے؟ بعد والی آیت اس حقیقت کو واضح کرتے ہوئے کہتی ہے یقیناً ہم نے قرآن مجید کو (جو پیغمبر اسلام کی حقانیت کی دلیل ہے) مبارک رات میں نازل کیا ہے۔ (انا انزلناہ فی لیلۃ مبارکۃ)۔

"مبارک" "برکت" کے مادہ سے ہے، جس کا معنی ہے سودمند، نفع بخش اور دائمی۔

یہ کونسی رات ہے جو تمام اچھائیوں کا مبداء اور پائیدار خوبیوں کا سرچشمہ ہے۔ اکثر مفسرین نے اس سے شب قدر مراد لی ہے۔ یہ ایسی بابرکت رات ہے جس میں عالم بشریت اور دنیائے انسانیت کی تقدیر قرآن کے نزول کی وجہ سے نیا رنگ اختیار کر گئی ہے۔ ایسی رات جس میں مخلوق کا انجام اور اس کی تقدیر یکساں طور پر قلم بند کی جاتی ہے۔ جی ہاں! قرآن ایسی تقدیر ساز رات میں پیغمبر اکرم کے پاک و پاکیزہ دل پر اترا۔

یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام قرآن شب قدر میں نازل ہوا۔

لیکن اس کے نزول کا اصل مقصد کیا ہے؟ وہ جس کی طرف اسی آیت میں اشارہ ہوا ہے کہ "ہم ہمیشہ سے ڈرانے والے تھے" (انا کنا منذرین)۔

یہ ہمارا دیرینہ طریقہ کار ہے کہ ہم اپنے انبیاء اور رسولوں کو ظالموں اور مشرکوں کے ڈرانے کے لیے مامور کرتے آئے ہیں اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کتاب دے کر بھیجنا بھی اسی سلسلے کی آخری کڑی ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ انبیائے کرام "انذار" (ڈرانے) کے لیے آتے ہیں وہ "بشارت" (خوشخبری دینے) کے لیے بھی ہوتے ہیں، لیکن چونکہ ظالم اور مجرم لوگوں کے لیے اُن کی دعوت کی اصل بنیاد زیادہ تر انذار اور ڈرانے پر ہی استوار ہوتی ہے لہٰذا انذار پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔

قرآن دفعتاً نازل ہوا ہے یا تدریجی طور پر؟

اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل امور غور طلب ہیں:۔

① ہم جانتے ہیں کہ قرآن مجید پیغمبر اسلام کی نبوت کے ۲۳ سالہ دور میں نازل ہوتا رہا ہے پھر یہ کہ قرآن مجید کے مضامین ایسے ہیں جن کا پیغمبر اسلام اور مسلمانوں کی ۲۳ سالہ زندگی کے مختلف واقعات سے تعلق ہے۔ اگر ان واقعات کو قرآن مجید سے جدا کیا جائے تو وہ بے معنی ہو جائیں۔

اس صراحت کے پیش نظر یہ معلوم کرنا ہے کہ قرآن مجید شب قدر میں مکمل طور پر کس طرح نازل ہوا؟

---

[1] قرآن مجید کی قسموں کے فلسفے اور ان کے اہداف و مقاصد کے بارے میں انشاء اللہ ہم آخری پارے کی تفسیر میں تفصیل سے بحث کریں گے جس کی بہت سی آیات میں قسموں کا ذکر ہے۔

اس سوال کے جواب میں بعض مفسرین نے قرآن کا یہاں معنی آغازِ نزول قرآن کیا ہے۔ لہٰذا یہ بات کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ اس کا آغاز تو شب قدر میں ہوا اور ۲۳ سال تک اس کے نزول کا سلسلہ جاری رہا۔

لیکن جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں یہ تفسیر زیرِ نظر آیت اور دوسری آیات کے ظاہری معنی سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے اس بات کی طرف توجہ کرنا ہوگی کہ آیت میں ایک طرف تو یہ ہے کہ "قرآن مبارک رات میں نازل ہوا ہے" جب کہ دوسری طرف سورۂ بقرہ کی ۱۸۵ ویں آیت میں ہے:

"شهر رمضان الذی انزل فیه القرآن"

"ماہ رمضان میں روزے رکھا کرو، یہ وہ مہینہ ہے جس میں قرآن اترا ہے"

جب کہ سورۂ قدر میں ہے:

"انا انزلناه فی لیلة القدر"

"ہم نے اسے شب قدر میں نازل کیا ہے"

مجموعی طور پر ان آیات سے یہ بات بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے کہ وہ مبارک رات جو زیرِ تفسیر آیت میں ذکر ہوئی ہے شب قدر ہے جو ماہ رمضان المبارک میں ہے۔

ان تمام باتوں سے قطع نظر اور بھی کئی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن کے تدریجی نزول سے پہلے اس سے آگاہ تھے، جیسا کہ سورۂ طٰہٰ کی ۱۱۴ ویں آیت میں ہے:

"ولا تعجل بالقرآن من قبل ان یقضٰی الیك وحیه"

"وحی کے نازل ہونے سے پہلے قرآن کے بارے میں جلدی نہ کیجیے"

اسی طرح سورۂ قیامت کی ۱۶ ویں آیت میں ہے:

"لا تحرك به لسانك لتعجل به"

"اپنی زبان کو قرآن کے لیے جلدی جلدی حرکت نہ دیں"

ان تمام آیات کو ملا کر جو نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کے نزول کے دو طریقے تھے۔ ایک "دفعتاً نزول" کہ ایک ہی مرتبہ مجموعی صورت میں خدا کی طرف سے پیغمبر کے پاک دل پر ماہِ رمضان المبارک کی شب قدر میں نازل ہوا اور دوسرا "تدریجی نزول" جو حالات، واقعات اور ضروریات کے پیشِ نظر ۲۳ سال تک آنحضرتؐ پر نازل ہوتا رہا۔

اس بات کا ایک اور گواہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی بعض آیات میں "انزال" اور بعض میں "نزول" کا لفظ استعمال ہوا ہے بعض لغات سے معلوم ہوتا ہے کہ "تنزیل" کا اطلاق عام طور پر ایسے مواقع پر ہوتا ہے جہاں پر تدریجی طور پر نازل ہونا مقصود ہوتا ہے لیکن "انزال" کا مفہوم وسیع ہے جو تدریجی اور دفعتاً دونوں طرح کے نزول کا معنیٰ دیتا ہے۔[1]

---

[1] مفردات راغب ماده "نزل" کا مطالعہ فرمائیں۔

اور یہ بات بھی بڑی لائق توجہ ہے کہ مندرجہ بالا تمام آیات میں جہاں پر قرآن کے ماہ رمضان اور شب قدر میں نازل ہونے کا ذکر ہے وہاں پر "انزال" کے کلمہ کا استعمال ہوا ہے جو "دفعتاً نزول" کے معنی سے ہم آہنگ ہے اور جہاں پر "تدریجی نزول کی بات ہوئی ہے وہاں پر صرف "تنزیل" کا کلمہ استعمال ہوا ہے۔

لیکن قلب پیغمبرؐ پر "دفعتاً نزول" کس صورت میں ہوا؟ آیا اسی موجودہ قرآن کی صورت میں یا مختلف آیات اور سورتوں کی صورت میں؟ یا ان کے مجموعی مفہوم اور حقائق کی صورت میں؟

اس بارے میں بات پوری طرح واضح نہیں ہے۔ مندرجہ بالا قرینے سے صرف اسی قدر بات سمجھی جا سکتی ہے کہ ایک مرتبہ تو یہ قرآن پاک پیغمبر اسلامؐ کے مقدس قلب پر ایک ہی رات میں نازل ہوا اور دوسری مرتبہ ۲۳ سال کی تدریجی مدت میں۔

(۲) اس بات کا ایک اور شاہد یہ بھی ہے کہ زیر بحث آیت میں قرآن کے لفظ سے مراد تمام قرآن مجید ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ قرآن کا لفظ "کل" اور "جزو" دونوں کے لیے بولا جا سکتا ہے۔ لیکن اس بات سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ جب تک اس لفظ کے ساتھ کوئی اور قرینہ موجود نہ ہو اس وقت تک اس سے مراد تمام قرآن مجید ہے۔

بعض مفسرین نے زیر تفسیر آیت کا مفہوم "نزول قرآن کا آغاز" لیا ہے اور کہا ہے کہ قرآن کی سب سے پہلی آیت ماہ رمضان کی شب قدر میں نازل ہوئی۔ یہ تفسیر آیت کے ظاہری معنی کے بالکل خلاف ہے۔

اور اس سے بھی کمزور تر ان لوگوں کا قول ہے جو یہ کہتے ہیں کہ "چونکہ سورۂ حمد تمام قرآن کا نچوڑ اور خلاصہ ہے اور وہ شب قدر میں نازل ہوئی ہے، لہٰذا اسے "انا انزلناہ فی لیلۃ القدر" کہا گیا ہے"۔

یہ سب کے سب احتمالات قرآن کی آیات کے ظاہری مفہوم کے خلاف ہیں کیونکہ آیات کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام قرآن شب قدر میں نازل ہوا ہے نہ کہ اس کا کچھ حصہ۔

یہاں پر ایک چیز باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ تفسیر علی بن ابراہیم میں حضرت امام محمد باقرؑ، حضرت امام جعفر صادقؑ اور امام موسیٰ کاظم علیہم السلام سے بہت سی روایات درج کی گئی ہیں جو انھوں نے "انا انزلناہ فی لیلۃ مبارکۃ" کی تفسیر میں ارشاد فرمائی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے:

"ھی لیلۃ القدر انزل اللہ عزوجل القرآن فیھا الی البیت المعمور جملۃ واحدۃ، ثم نزل من البیت المعمور علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ فی طول عشرین سنۃ"

"اس مبارک رات سے مراد شب قدر ہے، جس میں خدائے بزرگ و برتر نے قرآن کو ایک ہی مرتبہ "بیت المعمور" کی طرف نازل کیا پھر بیس سال کے عرصے میں رسول پاکؐ پر تدریجی طور پر نازل فرماتا رہا"۔

یہاں پر یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس روایت میں قرآن مجید کے دفعتاً نزول کے بارے میں "انزل" اور تدریجی نزول کے بارے میں "نزل" کے کلمات استعمال ہوئے

ہیں۔[1]

"بیت المعمور" کہاں واقع ہے؟ اس بارے میں متعدد روایات میں اس بات کی تصریح کی گئی ہے کہ آسمانوں میں خانہ کعبہ کے مقابل میں ایک گھر ہے جو فرشتوں کی عبادت گاہ ہے، اور روزانہ ستر ہزار فرشتے اس میں داخل ہوتے ہیں، جو قیامت تک اس کی طرف واپس نہیں پلٹیں گے۔

اس کی تفصیل انشاء اللہ سورۂ طور کی آیت نمبر ۴ میں بیان ہوگی۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "بیت المعمور" کون سے آسمان میں واقع ہے؟ اس بارے میں مختلف روایات میں ہے کہ وہ چوتھے آسمان پر ہے اور بعض روایات میں ہے کہ آسمان اوّل (آسمان دنیا) میں ہے اور بعض دوسری روایات میں ساتویں آسمان سے متعلق بتایا گیا ہے۔ مرحوم طبرسیؒ نے تفسیر "مجمع البیان" میں سورہ طور کی تفسیر میں حضرت علی علیہ السلام سے بیت المعمور کے بارے میں یہ روایت نقل کی ہے:

"هو بيت في السماء الرابعة بحيال الكعبة معمرة الملائكة بما يكون منها فيه من العبادة، ويدخله كل يوم سبعون الف ملك ثم لا يعودون اليه ابدا۔"

"وہ خانہ کعبہ کے مقابل میں چوتھے آسمان میں واقع ہے۔ روزانہ ستر ہزار ایسے فرشتے اس میں داخل ہوتے ہیں کہ جو پھر تا ابد اس کی طرف نہیں آئیں گے۔"[2]

صورتِ حال خواہ کچھ ہو، قرآن مجید کا شب قدر میں مکمل طور پر بیت المعمور کی طرف نازل ہونا اس بات کے منافی نہیں ہے کہ رسولِ پاکؐ اس سے باخبر تھے، کیونکہ آنحضرتؐ لوحِ محفوظ جو خدا کا مخفی علم ہے کے سوا دوسرے تمام عالموں سے آگاہ ہیں۔

بالفاظ دیگر تمام مذکورہ آیات سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کریم دو مرتبہ آنحضرتؐ پر نازل ہوا۔ ایک مرتبہ "دفعتاً نزول" کی صورت میں اور دوسری مرتبہ "تدریجی نزول" کی صورت میں جو آپؐ پر ۲۳ سال کے عرصے میں نازل ہوتا رہا۔ یہ بات مندرجہ بالا حدیث کے منافی بھی نہیں ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن پاک شب قدر میں بیت المعمور پر نازل ہوا، کیونکہ پیغمبرؐ کا قلب مبارک، "بیت المعمور" سے بھی تو آگاہ ہے۔

اس سوال کے جواب سے ایک اور سوال کا جواب بھی واضح ہو جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر قرآن مجید شب قدر میں نازل

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ صفحہ ۶۲۰۔ اس حدیث میں قرآن کے تدریجی نزول کی مدت میں سال بتائی گئی ہے، جب کہ ہم جانتے ہیں کہ نبوت کا دورانیہ کہ جس میں قرآن نازل ہوتا رہا ۲۳ سال ہے۔ ممکن ہے کہ یہ تعبیر یا تو راوی کی طرف سے غلط فہمی کی وجہ سے ہے یا پھر حدیث کے نسخوں میں غلطی واقع ہوئی ہے۔

[2] تفسیر مجمع البیان جلد ۹ صفحہ ۱۹۳۔ مرحوم علامہ مجلسیؒ نے بحار الانوار جلد ۵۰ صفحہ ۵۵ پر "بیت المعمور" سے متعلق روایات کو جمع کیا ہے۔

ہوا ہے تو پھر آنحضرتؐ کی تاریخ بعثت سے کس طرح مطابقت رکھتا ہے؛ جبکہ مشہور روایات کی بنا پر تاریخ بعثت ۲۷ رجب ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کا دفعتاً نزول تو ماہ رمضان المبارک میں ہوا ہے اور ۲۷ رجب المرجب میں اس کا تدریجی نزول شروع ہوا ہے۔ لہٰذا اس صورت میں کوئی مسئلہ غیر واضح نہیں رہتا۔

بعد کی آیت میں شب قدر کی توصیف اور توضیح ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: شب قدر وہ رات ہے جس میں ہر امر خدا کی حکمت کے مطابق تفصیل کے ساتھ مرتب ہوتا ہے: (فیھا یفرق کل امر حکیم)۔

"یفرق" کے لفظ کے ساتھ اس بات کی طرف ارشاد کیا گیا ہے کہ اس رات میں تمام تقدیر ساز امور اور مسائل مقدر میں لکھ دیئے جاتے ہیں اور "حکیم" کا لفظ اس خدائی تقدیر کے استحکام کے ناقابل تغیر اور اس کے محکم ہونے کو بیان کر رہا ہے۔ البتہ قرآن مجید میں یہ صفت عام طور پر خداوند تعالیٰ کے لیے استعمال ہوتی ہے اگر کسی اور چیز کو اس سے متصف کریں تو یہ اس کی تاکید کے لیے ہوگا۔[1]

یہ بیان ان بہت سی روایات کے ساتھ ہم آہنگ ہے جن میں کہا گیا ہے کہ شب قدر میں تمام لوگوں کی سال بھر کی تقدیر لکھ دی جاتی ہے اور رزق اور عمر وغیرہ بھی اسی رات کو معین کر دیئے جاتے ہیں۔

شب قدر سے متعلق تمام امور پر سورۂ قدر کی تفسیر میں تفصیل کے ساتھ گفتگو کی جائے گی اور بتایا جائے گا کہ انسان کا اپنا ارادہ خدا کی تقدیر اور مشیت سے متصادم نہیں ہوتا۔

بعد کی آیت میں اس بات کی ایک بار پھر تاکید کی گئی ہے کہ قرآن مجید خدا کی جانب سے ہی ہے، چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے: شب قدر میں قرآن کا نزول ہماری طرف سے ایک حکم تھا اور ہم ہی نے پیغمبر اسلام کو مبعوث کیا اور بھیجا ہے (امرا من عندنا انا کنا مرسلین)۔[2]

---

[1] تفسیر "المیزان" میں اس آیت کی ایک اور تفسیر بیان ہوئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ، اس کائنات کے امور دو مراحل پر مشتمل ہیں۔ ایک اجمال اور ابہام کا مرحلہ جسے "حکیم" سے تعبیر کیا گیا ہے اور دوسرا تفصیل اور کثرت کا مرحلہ جسے "یفرق" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (جلد ۱۸ صفحہ ۱۴۰)

[2] "امرا من عندنا۔۔۔۔" کا جملہ اعراب کے لحاظ سے کیا واقع ہو رہا ہے اور گزشتہ آیات کی کس بحث سے اس کا تعلق ہے؛ اس بارے میں کئی احتمال ذکر کئے گئے ہیں، جن میں سے زیادہ مناسب یہی ہے کہ "امرا من عندنا" "انا انزلناہ" میں موجود مفعول کی ضمیر کا حال واقع ہو رہا ہو۔ جس کا معنی یہ ہوگا کہ "ہم نے قرآن کو نازل کیا جب کہ یہ ہماری طرف سے ایک امر ہے"۔ اور اس صورت میں "انا کنا مرسلین" کے جملہ سے مکمل طور پر ہم آہنگ بھی ہے جس میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کا تذکرہ ہے۔

نیز یہ احتمال بھی ہے کہ یہ "کل امر حکیم" کی وضاحت ہو اور اس کی نصب اختصاص ہے اور ایسی صورت میں اس کا معنی یہ ہوگا "اعنی بھذا الامر امرا حاصلا من عندنا"۔

پھر نزول قرآن، ارسال پیغمبر اور شب قدر میں تمام چیزوں کی تقدیر کے اصل سبب کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: یہ سب تمہارے پروردگار کی رحمت کی وجہ سے ہے (رحمۃ من ربک)[1]

جی ہاں! اس کی ناپیدا کنار رحمت اس بات کی متقاضی ہے کہ وہ اپنے بندوں کو ان کے حال پر نہ چھوڑ دے۔ بلکہ ان کے لیے کوئی پروگرام اور رہنما بھیجے تاکہ وہ ان کی ہر ہر موڑ پر ارتقاء اور خدا کی جانب رہنمائی کرے۔ بنیادی طور پر کائنات کی ہر چیز اس کی بے انتہا رحمت سے فیض یاب ہو رہی ہے، لیکن انسان باقی چیزوں سے زیادہ اس رحمت کا مشمول ہے۔

اسی آیت کے آخر میں اور بعد کی دوسری آیات میں خداوند عالم کی سات صفات کا تذکرہ ہے جو سب کی سب اس کے مقام وحدانیت کو بیان کرتی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ بے شک بڑا سننے والا اور جاننے والا ہے۔ (انہ ھو السمیع العلیم)۔

وہ اپنے بندوں کی دعاؤں اور درخواستوں کو سنتا ہے اور ان کے رازوں سے آگاہ ہے۔

پھر تیسری صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ ایسا خدا ہے جو آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، سب کا پروردگار ہے۔ اگر تم اہل یقین ہو۔ (رب السماوات والارض وما بینھما ان کنتم موقنین)[2][3]

چونکہ بہت سے مشرکین کئی خداؤں اور کئی ارباب کے قائل تھے اور ہر نوع کے لیے علیحدہ رب کا عقیدہ رکھتے تھے اور ممکن تھا کہ گذشتہ آیت میں "ربنا" (تیرا رب) سے ان کے دل میں یہ توہم پیدا ہو کہ محمد مصطفےٰ کا رب اور ہے اور دوسری چیزوں کا رب اور ہے۔ لہٰذا اس آیت میں "رب السماوات والارض وما بینھما" کہہ کر باقی تمام خداؤں پر خط تنسیخ کھینچ دیا گیا ہے اور واضح کر دیا گیا ہے کہ تمام موجودات عالم کا ایک ہی رب ہے۔

"ان کنتم موقنین" (اگر تم اہل یقین ہو) کا جملہ جو جملہ شرطیہ کی صورت میں آیا ہے، یہ سوال ذہن میں پیدا کر رہا ہے کہ آیا پروردگار عالم کی ربوبیت ایسی شرط سے مشروط ہے؟

لیکن بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس جملے کے ذکر سے مندرجہ ذیل دو امور میں سے کوئی ایک یا دونوں امور مقصود ہیں۔

ایک تو یہ کہ اگر تم یقین کے طلب گار ہو تو اس کا واحد راستہ یہی ہے۔ واحد راستہ یہی ہے کہ تم پروردگار عالم کی ربوبیت مطلقہ کے بارے میں غور و فکر سے کام لو۔

دوسرا یہ کہ "اگر تم اہل یقین ہو تو بہترین یقین پیدا کرنے کا مقام یہی ہے۔ اگر تم تمام کائنات میں خدا کی ربوبیت کے آثار

---

[1] "رحمۃ من ربک" یا تو "انا انزلناہ" کا مفعول لہ ہے یا "یفرق کل امر حکیم" کا مفعول لہ ہے یا دونوں کا مفعول لہ ہے۔

[2] اس آیت میں "رب" کا کسرہ گزشتہ آیت میں مذکور "رب" کا بدل ہے۔

[3] ان کنتم موقنین" جملہ شرطیہ ہے اور اس کی جزاء محذوف ہے جو تقدیری طور پر یوں ہے۔

ان کنتم من اھل الیقین او فی طلب الیقین علمتم ان اللہ رب السماوات والارض وما بینھما

دیکھ رہے ہو اور ہر ذرے کے دل کو شگافتہ کر کے اس میں اس کی ربوبیت کے نشان پاتے ہو، پھر بھی اس کی ربوبیت پر یقین نہیں رکھتے تو پھر کائنات کی کس چیز پر ایمان اور یقین پیدا کرو گے؟

چوتھی، پانچویں اور چھٹی صفت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہی جلاتا اور مارتا ہے (لا الٰہ الا ھو یحیی ویمیت)۔[1]

تمہاری زندگی اور موت اُسی کے ہاتھ میں ہے، تمہارا اور تمام کائنات کا پروردگار وہی ہے۔ اسی لیے اس کے بغیر کوئی معبود ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا، آیا جس کے پاس نہ تو ربوبیت کا عہدہ ہے اور نہ ہی موت و حیات کا مالک ہے، وہ معبود بن سکتا ہے؟

ساتویں اور آخری صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: تمہارا پروردگار اور تمہارے اگلے باپ دادا کا بھی پروردگار ہے (ربکم ورب اٰبائکم الاولین)۔

اگر بُت پرستی کے جواز کے لیے تمہاری دلیل یہ ہے کہ تمہارے باپ دادا ان کی پرستش کیا کرتے تھے تو تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ان کا پروردگار بھی خدائے وحدہٗ لاشریک ہے، لہٰذا تمہارا اپنے آباؤ اجداد سے یہ تعلق بھی اسی بات کا متقاضی ہے کہ خدائے واحد و یکتا کے علاوہ کسی کے آستان پر سر نہ جھکاؤ اور اگر ان کا بھی اس کے علاوہ کوئی اور راستہ تھا تو وہ بھی یقیناً غلطی پر تھے۔

واضح سی بات ہے کہ موت اور حیات کا تعلق بھی پروردگار عالم کی تدبیر سے ہے۔ اگر اس نے اسے خصوصی طور پر ذکر کیا ہے تو اس کی وجہ اسے خاص طور پر اہمیت دینا ہے اور حتمی طور پر معاد کی طرف بھی اشارہ ہے۔ یہ پہلی مرتبہ نہیں ہے کہ قرآن مجید نے موت و حیات کا مسئلہ بیان کیا ہے، بلکہ کئی مرتبہ اسے خداوند عالم کے مخصوص افعال میں سے ایک فعل کی صورت میں بیان کیا جا چکا ہے کیونکہ یہ انسانی زندگی کا تقدیر ساز اور کائنات کا ایک پیچیدہ ترین مسئلہ ہے اور قدرت الٰہی کی ایک روشن ترین دلیل ہے۔

قرآن مجید کا شب قدر سے رابطہ

یہ بات قابل توجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں اشارے کے طور پر اور سورۂ قدر میں صراحت کے ساتھ یہ بات بیان ہوئی ہے کہ قرآن مجید شب قدر میں نازل ہوا ہے اور یہ بات کس قدر معنیٰ خیز ہے۔

---

[1] "لا الٰہ الا ھو" کا جملہ ممکن ہے کہ جملہ استینافیہ ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جملہ اسمیہ محذوف کی خبر ہو جس کی تقدیر یہ ہو۔

"ھو لا الٰہ الا ھو"

لیکن پہلا امکان زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

یہ ایسی رات ہے جس میں بندوں کی تقدیر اور رزق و روزی مقدر کی جاتی ہے، اسی رات کو رسولِ پاکؐ کے مقدس اور پاکیزہ قلب پر قرآن نازل ہوا۔ آیا اس کا یہ معنی تو نہیں کہ تم لوگوں کی تقدیر اور انجام اسی آسمانی کتاب کے مندرجات ہی سے مربوط اور متعلق ہے اور ان کا آپس میں نزدیکی رابطہ ہے۔

آیا اس کلام کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ صرف تمھاری معنوی زندگی کا ہی نہیں بلکہ مادی زندگی کا بھی اس سے اٹوٹ رابطہ ہے، دشمنوں پر تمہاری آزادی، سرفرازی اور استقلال اور تمھاری بستیوں اور شہروں کی آبادی اسی سے وابستہ ہے۔

جی ہاں! جس رات میں کائنات کی تقدیر متعین ہوتی ہے اسی رات میں یہ نازل ہوا ہے۔

۹۔ بَلْ هُمْ فِیْ شَكٍّ یَّلْعَبُوْنَ ○

۱۰۔ فَارْتَقِبْ یَوْمَ تَاْتِی السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِیْنٍ ○

۱۱۔ یَّغْشَی النَّاسَ ؕ هٰذَا عَذَابٌ اَلِیْمٌ ○

۱۲۔ رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ ○

۱۳۔ اَنّٰی لَهُمُ الذِّكْرٰی وَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِیْنٌ ○

۱۴۔ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ○

۱۵۔ اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِیْلًا اِنَّكُمْ عَآئِدُوْنَ ○

۱۶۔ یَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰی ۚ اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ○

ترجمہ

۹۔ لیکن یہ لوگ تو شک میں پڑے (حقائق کے ساتھ) کھیل رہے ہیں۔

۱۰۔ اس دن کا انتظار کر کہ جب آسمان سے ظاہر نظاہر دھواں نکلے گا۔

۱۱۔ وہ تمام لوگوں پر چھا جائے گا۔ یہ دردناک عذاب ہے۔

۱۲۔ (وہ کہیں گے) پروردگارا! ہم سے عذاب کو دُور کر دے کہ ہم ایمان لاتے ہیں۔

۱۳۔ وہ کس طرح سے اور کہاں نصیحت حاصل کریں گے جب کہ ان کے پاس (روشن معجزات اور دلائل کے ساتھ) آشکار رسُول آچکا۔

۱۴۔ پھر وہ اس سے روگردان ہوکر کہنے لگے یہ تو دیوانہ ہے جسے دوسرے لوگ

سکھاتے پڑھاتے ہیں۔

۱۵۔ ہم تھوڑے سے عرصہ کے لیے عذاب کو ٹال دیتے ہیں، لیکن تم اپنے کاموں کی طرف لوٹ جاتے ہو۔

۱۶۔ ہم ان سے پُورا بدلہ تو اس دن لیں گے جس دن سخت گرفت کریں گے، یقیناً ہم ان سے بدلہ لے کر رہیں گے۔

تفسیر

جب ھولناک دھواں آسمان پر چھا جائیگا

گزشتہ آیات میں اس باب کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی کہ اگر وہ یقین کے خواہاں ہیں، تو یقین کے حصول کے اسباب بہت ہیں اور فراہم بھی ہیں۔ زیرِ تفسیر آیات میں سے پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: وہ یقین اور حق کے طلب گار نہیں ہیں "بلکہ وہ تو شک میں پڑے (حقائق کے ساتھ) کھیل رہے ہیں" (بل ھم فی شک یلعبون)۔

اگر وہ اس آسمانی کتاب اور آپ کی نبوت کی حقانیت میں شک کرتے ہیں تو اس وجہ سے نہیں کہ یہ کوئی پیچیدہ مسئلہ ہے۔ بلکہ اس لیے شک کرتے ہیں کہ اس پر سنجیدگی سے غور نہیں کرتے، بلکہ ہنسی مذاق میں بات کو ٹال دیتے ہیں کبھی تو اس کا تمسخر اڑاتے ہیں اور کبھی از خود تجاہل عارفانہ کا اظہار کرتے ہیں اور فقط نئے کھیل میں لگے رہتے ہیں۔

"یلعبون" "لعاب" کے مادہ سے ہے جس کا معنی "مفردات" میں "راغب" کے بقول وہ "لعاب دہن" (تھوک) ہے جو منہ سے ٹپکتا ہے۔ چونکہ کھیل اور مذاق کے موقع پر انسان کا اپنے کام سے کوئی خاص مقصد پیشِ نظر نہیں ہوتا، لہٰذا اسے ایسی تھوک سے تشبیہ دی گئی ہے جو انسان کے منہ سے ٹپکتی ہے۔

بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ مسائل پر سنجیدگی سے غور و خوض انسان کو حقائق کی شناخت میں بہت مدد دے سکتا ہے اور غیر سنجیدہ طریقۂ کار حقائق کے چہرے پر پردے ڈال دیتا ہے۔

بعد کی آیت میں رسولِ پاک کو مخاطب کرتے ہوئے ان ہٹ دھرم اور سخت منکرین کو دھمکی دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس دن کا انتظار کرو کہ جس دن آسمان سے ظاہر بظاہر دھواں نکلے گا۔ (فارتقب یوم تأتی السماء بدخان مبین)۔

ایسا دھواں جو تمام لوگوں کو ڈھانک لے گا۔ (یغشی الناس)۔

پھر ان سے کہا جائے گا کہ یہ خدا کا دردناک عذاب ہے: (ھٰذا عذاب الیم)۔

وحشت اور اضطراب ان کے تمام وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ ان کی آنکھوں سے تمام پردے ہٹا دیئے جائیں گے، اور وہ اپنی عظیم غلطیوں سے واقف ہو جائیں گے۔ بارگاہ ایزدی کی طرف رجوع کر کے کہیں گے: پروردگارا! ہم سے عذاب دُور کر دے کہ ہم ایمان لاتے ہیں۔ (ربنا اکشف عنا العذاب انا مؤمنون)۔

لیکن ان نابکاروں کے اس دعوے کی تردید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ کس طرح سے اور کہاں نصیحت حاصل کریں گے جب کہ ان کے پاس روشن معجزات اور دلائل کے ساتھ رسُول آچکا (انّٰی لھم الذکریٰ وقد جاءھم رسول مبین)۔

ایسا پیغمبر جو خود بھی ظاہر اور آشکار تھا اور اس کی تعلیمات، پروگرام، دلائل اور معجزات بھی واضح تھے۔

لیکن بجائے اس کے کہ وہ لوگ اس رسُولؐ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتے، خداوند واحد لاشریک کی ذات پر ایمان لے آتے اور اس کے احکام کو جان و دل سے قبول کرتے "اس سے روگردان ہو کر کہنے لگے یہ تو دیوانہ ہے جسے دوسرے لوگ ایسی باتیں سکھاتے پڑھاتے ہیں"۔ (ثم تولوا عنہ وقالوا معلم مجنون)۔

کبھی وہ کہتے تھے کہ ایک "رُومی غلام" انبیاء کے قصّے کہانیاں سُن کر انہیں بتاتا ہے اور یہ آیات انہی قصّوں کی بنیاد پر گھڑی گئی ہیں۔ خداوند عالم اس بارے میں فرماتا ہے:

"ولقد نعلم انھم یقولون، انما یعلمہ بشر لسان الذی یلحدون الیہ اعجمی وھٰذا لسان عربی مبین"

"ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ کوئی بشر اسے تعلیم دیتا ہے، حالانکہ جس شخص کی طرف یہ الحادی نسبت دیتے ہیں، اس کی زبان عجمی ہے اور اس کی زبان واضح اور کھلم کھلا عربی ہے"۔

(نحل - ۱۰۳)

کبھی کہتے تھے کہ ان کے حواس مختل ہیں اور اسی اختلال کے سبب ان سے یہ باتیں سرزد ہو رہی ہیں، یعنی وہ دماغی توازن کھو چکے ہیں۔

پھر فرمایا گیا ہے: ہم تھوڑے سے عرصے کے لیے تم سے عذاب کو ٹال دیتے ہیں، لیکن تم عبرت حاصل نہیں کرتے اور پھر اپنے کاموں کی طرف لوٹ جاتے ہو (انا کاشفوا العذاب قلیلا انکم عائدون)۔

یہاں پر یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اگر کبھی وہ عذاب کے چنگل میں پھنس جاتے تو اپنے کئے پر اظہار ندامت کرتے اور اپنی کرتوتوں پر نظر ثانی کرنے کی ٹھان لیتے جو عارضی ہوتی تھی، لیکن جونہی طوفان حوادث تھم جاتا تو وہ اپنی سابقہ کرتوتوں میں لگ جاتے۔

زیر تفسیر آیات میں سے آخری آیت میں فرمایا گیا ہے: ہم ان سے پُورا بدلہ تو اس عظیم اور سخت سزا کے دن لیں گے، یقیناً ہم بدلہ لے کر رہیں گے۔ (یوم نبطش البطشۃ الکبریٰ انا منتقمون)۔[1]

---

[1] اس جملے کی ترکیب میں بہت سے احتمالات پیش کیے گئے ہیں۔ جس احتمال کو اکثر مفسرین نے قبول کیا ہے اور آیت کے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

"بطش" (بروزن "نقش") کا معنی کسی چیز کو مضبوطی کے ساتھ پکڑنا ہے۔ یہاں پر سخت سزا کے لیے گرفت میں لینے کے معنی میں ہے اور "بطشۃ" کو "کبریٰ" سے موصوف کرنا اس سزا کی شدت اور سنگینی کی طرف اشارہ ہے، جو ان لوگوں کے انتظار میں ہے۔

خلاصہ یہ کہ بالفرض اگر ان کی عارضی سزا میں کمی واقع ہو جائے یا عارضی طور پر ختم ہو جائے تو شدید اور سخت ترین سزا ان کے انتظار میں ہے، جس سے راہ فرار اختیار نہیں کی جا سکتی۔

"منتقمون" "انتقام" کے مادہ سے ہے، جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں اس کے معنی سزا دینا ہے۔ اگرچہ یہ لفظ آج کل کے روزمرہ کے استعمال میں ایک اور معنی اختیار کر چکا ہے اور وہ ہے غصے کی آگ بجھانے اور دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے سزا دینا۔ لیکن اس کے لغوی معنی میں یہ چیزیں نہیں پائی جاتیں۔

"دخان مبین" سے کیا مراد ہے؟

ان آیات میں مذکور "دخان" (دھوئیں) سے کیا مراد ہے جو عذاب الٰہی کی ایک علامت کے طور پر بیان کیا گیا ہے، اس بارے میں مفسرین کی مختلف آراء ہیں۔ ان میں سے دو نظریئے اہم ہیں:

① اس سزا کی طرف اشارہ ہے، جس میں کفار قریش پیغمبر اکرم کے زمانے میں مبتلا ہوئے تھے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے بارے میں نفرین اور بددعا کی تھی اور کہا تھا:

"اللھم سنین کسنی یوسف"

"خداوندا! انھیں یوسف علیہ السلام کے زمانے کی سی قحط سالی اور خشک سالی میں مبتلا فرما۔"

اس کے بعد قحط سالی مکہ کے اطراف میں ایسی حکم فرما ہوئی کہ مکہ کے لوگ بھوک اور پیاس کی شدت میں مبتلا ہو گئے اور اس ابتلاء کے دور میں جب بھی وہ آسمان کی طرف نگاہ کرتے تو انھیں ہر طرف دھواں ہی دھواں دکھائی دیتا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ مردار اور مردہ جانوروں کی ہڈیاں تک کھانے پر مجبور ہو گئے۔

وہ پیغمبر گرامی قدر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آکر کہنے لگے۔

"محمدؐ! آپ ہی تو ہمیں صلۂ رحمی کا حکم دیتے ہیں، جب کہ آپ ہی کے رشتہ دار اس صورت حال کی وجہ سے فنا و برباد ہو رہے ہیں۔ اگر یہ عذاب ہم سے برطرف ہو گیا تو ہم یقیناً ایمان

(بقیہ حاشیہ صفحہ کا) اندازے بھی مطابقت رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ "یوم" کا لفظ "نبطش" فعل سے متعلق ہے جو "انا منتقمون" کے جملے سے سمجھا جاتا ہے۔ بنابریں اس کی تقدیری صورت یہ ہوگی۔

"نبطش بھم یوم نبطش البطشۃ الکبریٰ انا منتقمون"

لے آئیں گے"۔

آنحضرتؐ نے ان کے حق میں دُعا کی، نعمت کی فراوانی انھیں نصیب ہوئی اور عذاب ان سے دُور ہوگیا۔ لیکن انھوں نے اس ماجرے سے بھی عبرت حاصل نہیں کی اور اپنی اصلی حالت (کفر) کی طرف پلٹ گئے۔ [1]

اس تفسیر کے مطابق "بطشۃ کبریٰ" جو سخت اور سنگین سزا ہے، سے مراد جنگِ بدر ہے، جس میں مشرکین نے مسلمانوں سے زبردست شکست کھائی۔

اس تفسیر کے مطابق حقیقت میں دھویں کا کوئی وجود نہیں تھا، بلکہ بھوک کے پیاسے لوگوں کی نگاہوں میں آسمان سیاہ اور تاریک ہوگیا تھا۔ اسی لیے اس مقام پر "دخان" مجازی حیثیت رکھتا ہے اور اس سخت اور وحشت ناک حالت کی طرف اشارہ ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ بنیادی طور پر عربی ادبیات میں "دخان" عمومی مصیبت اور بلا کے لیے کنایہ ہے۔ [2]

بعض دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ خشک سالی اور بارش کی کمی کی وجہ سے عام طور پر سیاہ اور دبیز گرد و غبار آسمان پر چھا جاتا ہے، جسے "دخان" سے تعبیر کرتے ہیں، کیونکہ بارش ہی گرد و غبار کو فرو کر کے فضا کو صاف و شفاف بناتی ہے۔ [3]

مذکورہ تمام اوصاف کے پیشِ نظر اس تفسیر کے مطابق "دخان" کے کلمہ کا معنی مجازی ہوگا۔

(۲) "دخان مبین" سے مراد وہ گہرا دھواں ہے جو کائنات کے خاتمے اور قیامِ قیامت سے پہلے تمام آسمان کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا اور یہی چیز دُنیا کے اختتام اور ظالموں اور مفسدین کے لیے عذابِ الیم کے آغاز کی نشانی ہوگی۔

ایسے موقع پر ظالموں کا یہ ٹولہ خوابِ غفلت سے بیدار ہوگا اور عذاب دُور کرنے اور دُنیا کی معمول کی زندگی کی طرف بازگشت کی درخواست کرے گا، جو قبول نہیں کی جائے گی۔

اس تفسیر کے مطابق "دخان" کا حقیقی معنی مراد ہے اور ان آیات کا مضمون بھی وہی ہے جو دوسری قرآنی آیات کا ہے کہ قیامت کے قریب کے زمانے میں یا خود قیامت کے دن گناہگار اور کافر لوگ عذاب کے برطرف ہونے اور دُنیا میں لوٹ جانے کی درخواست کریں گے لیکن ان کی یہ درخواست مسترد کر دی جائے گی۔ [4]

اس تفسیر کے مطابق ایک مشکل باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ یہ تفسیر "انا کاشفوا العذاب قلیلا انکم عائدون" (ہم تھوڑا سا عذاب برطرف کریں گے، لیکن تم لوگ پھر اپنی کارستانیوں کی طرف لوٹ جاؤ گے) کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے، کیونکہ دُنیا کے خاتمے یا قیامت کے دن خدا کا عذاب کم نہیں ہوگا کہ وہ لوگ کفر یا گناہ کی حالت کی طرف پلٹ جائیں۔

لیکن مگر اس جملے کا ایک قضیہ شرطیہ کی صورت میں معنی کریں ہر چند کہ تھوڑا سا ظاہر میں تو مخالف ہوگا۔ لیکن یہ مشکل ضرور برطرف

---

[1] مجمع البیان جلد ۹ صفحہ ابتدائی آیات کے ذیل میں۔

[2] فخر رازی کہتے ہیں "ان العرب یسمون الشر الغالب بالدخان" (جلد ۲۷، ص ۲۲۲)

[3] تفسیر روح المعانی جلد ۲۵ صفحہ ۱۰۷۔

[4] اس بارے میں سورۂ انعام کی آیات ۲۷ تا ۳۰ کی طرف رجوع فرمائیں۔

ہو جائے گی کیونکہ آیت کا مفہوم یوں ہوگا: جب ہم ان سے تھوڑا سا عذاب برطرف کریں گے تو وہ اپنی پہلی راہ روش کو دوبارہ اختیار کرلیں گے" جو درحقیقت سورۂ انعام کی ۲۸ ویں آیت کے مانند ہو جائے گا، جس میں کہا گیا ہے۔

"ولو ردّوا لعادوا لما نهوا عنه"

"اگر وہ دُنیا کی طرف لوٹا بھی دیئے جائیں تو جن اعمال سے انھیں روکا گیا تھا، ان کا ارتکاب کریں گے"

اس کے علاوہ "البطشة الکبریٰ" (سخت اور شدید سزا) کی جنگِ بدر کے واقعے سے تفسیر بعید معلوم ہوتی ہے، جبکہ یہ تعبیر قیامت کی سزاؤں سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔ [1]

دوسری تفسیر کا ایک اور شاہد وہ روایات ہیں جو پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہیں اور جن میں "دخان" کی تفسیر اس دھویں سے کی گئی ہے جو قربِ قیامت کے زمانہ میں تمام دُنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ مثلاً جناب حذیفہ یمانیؓ پیغمبرِ اکرمؐ سے روایت کرتے ہیں:

"چار چیزیں قربِ قیامت کی علامات ہیں۔ پہلی دجال کا ظاہر ہونا، دوسری عیسیٰ علیہ السلام کا نازل ہونا، تیسری سرزمین عدن کی گہرائیوں سے آگ کا اُٹھنا، اور چوتھی دھواں۔

حذیفہ نے پوچھا یا رسول اللہ! وہ "دخان" (دھواں) کیا ہے؟ تو آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

"فارتقب یوم تأتی السماء بدخان مبین"

پھر فرمایا۔

"یملأ ما بین المشرق والمغرب، یمکث اربعین یوماً ولیلة، اما المؤمن فیصیبه منه کهیئة الزکمة، واما الکافر بمنزلة السکران یخرج من منخریه و اذنیه ودبره"

"وہ مشرق اور مغرب کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لے گا اور چالیس شبانہ روز چھایا رہے گا۔ مؤمن کی یہ حالت ہوگی جیسے کسی کو زکام ہوتا ہے، اور کافر کی حالت یہ ہوگی جیسے کوئی مدہوش ہوتا ہے۔ دھواں اس کی ناک کے نتھنوں، کانوں اور پیچھے سے باہر نکلتا رہے گا۔" [2]

ایک اور روایت میں ابو مالک اشعری رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

---

[1] راغب اپنی کتاب "مفردات" میں کہتے ہیں۔

"لبطش هو تناول الشیء بصولة"

لبطش کا معنی کسی چیز کو پوری طاقت سے پکڑنا ہے۔

جو عام طور پر سزا دینے کا پیش خیمہ ہوا کرتا ہے۔

[2] تفسیر درمنثور جلد ۶ صفحہ ۷۹

"ان ربکما نذرکم ثلاثا: الدخان یأخذ المؤمن منه کالزکمة، و یأخذ الکافر فینفخ حتی یخرج من کل مسمع منه، والثانیة الدابة والثالثة الدجال۔"

"تمہارے پروردگار نے تمہیں تین چیزوں سے ڈرایا ہے، ایک تو "دخان" (دھواں) ہے جس کی وجہ سے مومن کو زکام جیسی تکلیف ہوگی اور کافر کا تمام جسم پھول جائے گا اور دھواں اس کے تمام مشام بدن سے باہر نکلے گا، دوسرے دابۃ الارض ہے اور تیسرے دجال ہے۔ [1]

"دابۃ الارض" کے بارے میں سورۂ نمل کی آیت ۸۲ کے ذیل میں (تفسیر نمونہ جلد ۱۵ میں) تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔

"دخان" کے بارے میں ابو سعید خدریؓ نے آنحضرتؐ سے اسی طرح کی ایک اور روایت بھی بیان کی ہے۔ [2]

اہل بیت اطہار علیہم السلام کے ذریعہ سے نقل ہونے والی روایات میں بھی اسی قسم کی تعبیرات ملتی ہیں، بلکہ اس سے زیادہ مفصل جن میں سے ایک وہ روایت بھی ہے جو امیر المومنینؑ نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان کی ہے آپ فرماتے ہیں۔

"عشر قبل الساعة لابد منها، السفیانی، والدجال، والدخان، والدابة وخروج القائمؑ وطلوع الشمس من مغربها ونزول عیسیٰؑ وخسف بالمشرق، وخسف بجزیرة العرب و نار تخرج من قعر عدن تسوق الناس الی المحشر۔"

"قیامت سے قبل دس نشانیاں ہر صورت میں ظاہر ہو کر رہیں گی: سفیانی، دجال، دخان (دھواں)، دابۃ الارض، قیام مہدی، مغرب سے سورج کا طلوع، عیسیٰ کا نزول، مشرق زمین پر ایک زلزلہ جس سے زمین دھنس جائے گی، جزیرۃ العرب میں بھی اسی نوعیت کا زلزلہ اور سرزمین عدن کی گہرائیوں سے آگ کا نکلنا جو لوگوں کو ہنکا کر عرصہ محشر میں لے آئے گی۔ [3]

مجموعی گفتگو سے یہ نتیجہ نکلا کہ دوسری تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

---

[1] و [2] تفسیر درمنثور جلد ۶ ص ۷۲

[3] بحار الانوار جلد ۵۲ ص ۳۰۹۔

۱۷۔ وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ ۙ
۱۸۔ اَنْ اَدُّوْٓا اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ ؕ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۙ
۱۹۔ وَّاَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَى اللّٰهِ ۚ اِنِّيْٓ اٰتِيْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۚ
۲۰۔ وَاِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ ۚ
۲۱۔ وَاِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِيْ فَاعْتَزِلُوْنِ

ترجمہ

۱۷۔ اور ان سے پہلے ہم نے قوم فرعون کی آزمائش کی اور ان کے پاس ایک پیغمبر بزرگوار آیا۔

۱۸۔ (اور کہا) اے خدا کے بندو! جس چیز کا تمھیں حکم ملا ہے اسے بجا لاؤ اور میرے سامنے سر تسلیم خم کرو کہ میں تمھارے لیے رسولِ امین ہوں۔

۱۹۔ اور خدا کے سامنے تکبر نہ کرو، کیونکہ میں تمھارے پاس ایک واضح اور روشن دلیل لے کر آیا ہوں۔

۲۰۔ اور اس بات سے کہ تم مجھے مہتم (یا سنگسار) کرو، میں اپنے اور تمھارے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں۔

۲۱۔ اور اگر تم مجھ پر ایمان نہیں لاتے تو کم از کم مجھ سے کنارہ کشی کرلو (اور دوسروں کو تو ایمان لانے سے نہ روکو)۔

تفسیر

خود ایمان نہیں لاتے تو دوسروں کو تو نہ روکو

گزشتہ آیات میں مشرکین عرب کی سرکشی اور حق کے آگے ان کے نہ جھکنے کا ذکر تھا ان آیات میں گزشتہ امتوں کا ایک نمونہ پیش کیا گیا ہے کہ جنہوں نے اسی راستے کو اختیار کیا جس کے نتیجے میں وہ دردناک عذاب کا شکار اور شکست فاش سے دوچار ہوئے تاکہ جہاں پر یہ بات مؤمنین کے دل کی تسلی کا باعث ہو وہاں پر ہٹ دھرم منکرین کے لیے تنبیہ اور تہدید بھی بن جائے۔

اور وہ ہے موسیٰ اور فرعون کی داستان جس کے بارے میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے: اور اُن سے پہلے ہم نے قوم فرعون کی آزمائش کی، ولقد فتنا قبلھم قوم فرعون)۔

"فتنا" کا کلمہ "فتنہ" کے مادہ سے ہے، جس کا معنی ہے کندن بنانے کے لیے سونے کو آگ کی بھٹی میں ڈالنا، بعد ازاں انسان کے خلوص کی ہر گونہ آزمائش وامتحان پر اس کا اطلاق ہونے لگا، ایسی آزمائش جو تمام انسانی زندگی اور انسانی معاشرہ پر محیط ہے۔ بالفاظ دیگر انسان کی زندگی کا تمام دورانیہ انہی آزمائشوں اور امتحان میں گزرتا رہتا ہے، کیونکہ یہ دُنیا ہے ہی امتحان کا گھر۔

قوم فرعون ایک طاقت ور حکومت، بے پناہ دولت اور بے اندازہ وسائل کا مالک ہونے کی وجہ سے نہایت شان و شوکت کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ اسی شان وشوکت نے اسے مغرور بنا دیا اور وہ مختلف گناہوں اور ظلم وستم کا ارتکاب کرنے لگی۔

"اور اسی اثنا میں ان کے پاس ایک بزرگوار رسُول آیا۔ (وجاءھم رسول کریم)۔

"اخلاق واوصاف کے لحاظ سے "کریم" بارگاہِ حق میں مقام ومرتبہ کے لحاظ سے "کریم" نسب کے لحاظ سے "کریم" اور یہ رسُول جناب موسیٰ بن عمرانؑ کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔[1]

موسیٰ علیہ السلام نے نہایت سُلجھے ہوئے انداز میں اور سنجیدہ لہجے میں، دل پذیر اور محبت بھرے انداز سے انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: میرے آنے کا مقصد یہ ہے کہ اے خدا کے بندو! میرے سامنے سر تسلیم خم کرو اور جس چیز کا تمھیں حکم ملا ہے اسے ادا کرو کہ میں اس کا بھیجا ہوا ہوں۔ (ان ادّوا الیّ عباداللہ)۔[2]

---

[1] مفرداتِ راغب کے مطابق لفظ "کریم" جب خدا کی صفت کے لیے استعمال کیا جائے تو اس کا معنی ظاہر بظاہر انعام واحسان ہوتا ہے اور جب کسی انسان کی صفت کے لیے استعمال ہو تو اس کا معنی حسن اخلاق اور اعمال حسنہ ہوتا ہے، جو انسان سے ظاہر ہوتے ہیں۔ البتہ قرآن مجید میں یہ لفظ دوسری چیزوں کی صفت کے طور پر بھی آیا ہے۔ جیسے کتاب کریم، کل زوج کریم، رزق کریم، مقام کریم، اور اجر کریم وغیرہ۔

[2] "ادّوا الیّ عباداللہ" میں لفظ "ان" اس فعل مقدر کی تفسیر ہے جو اس سے ماقبل کلام سے سمجھا جاتا ہے اور وہ تقدیر یوں ہے۔ (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

اس تفسیر کے مطابق "عباد اللہ" مخاطب ہے اور اس سے مراد قوم فرعون ہے۔ اگرچہ قرآنی آیات کی رُو سے یہ تعبیر خدا کے نیک بندوں کے بارے میں استعمال ہوئی ہے، لیکن بہت سے مقامات پر کفار اور گناہگاروں کی دل جوئی اور ان کی حق کی طرف تالیف قلب کے لیے بھی یہ کلمہ استعمال ہوا ہے۔[1]

بنابریں "ادّوا" (ادا کرو) سے مراد فرمانِ الٰہی کی اطاعت اور اس کے احکام کی بجاآوری ہے۔

بعض مفسرین نے اس آیت کی ایک اور تفسیر کی ہے اور کہا ہے کہ "عباد اللہ" سے مراد "بنی اسرائیل" ہیں اور "ادّوا" سے مراد انھیں موسیٰ علیہ السلام کے سپرد کرنا اور انھیں قید و بند سے آزاد کرنا ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے سورۂ شعرا کی ۱۷ ویں آیت میں مذکور ہے۔

"ان ارسل معنا بنی اسرائیل"۔

"میری تجویز یہ ہے کہ تم بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دو"۔

(یہی بات سورۂ اعراف کی ۱۰۵ ویں اور سورۂ طٰہٰ کی ۴۷ ویں آیت میں بھی بیان ہوئی ہے)۔

لیکن جو چیز اس تفسیر سے ہم آہنگ نہیں وہ لفظ "ادّوا" ہے، جو عام طور پر مال، امانتوں اور فرائض کی ادائیگی کے لیے استعمال ہوتا ہے نہ کہ افراد سپرد کرنے کے لیے۔

اس کلمہ کے استعمال سے اس کا موضوع بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔

بہرحال، آیت کے آخر میں اپنے اوپر لگائے جانے والے الزامات کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "میں تمھارا ایک امانت دار پیغمبر ہوں" (انی لکم رسول امین)۔

یہ تعبیر درحقیقت ان ناجائز الزامات کی پیش بندی کے طور پر ہے جو فرعونیوں نے ان پر لگائے تھے۔ مثلاً جادوگری، جاہ و منصب اور سرزمین مصر میں اپنی حکومت کا قیام، نیز اس سرزمین کے اصل باشندوں کو باہر نکال دینے کا قصد وغیرہ۔ ان الزامات کے بارے میں مختلف آیاتِ قرآنی میں اشارہ ہوا ہے۔

پھر موسیٰ علیہ السلام انہیں اطاعت خداوندی کی دعوت یا بنی اسرائیل کی رہائی کی پیش کش کے طور پر فرماتے ہیں: میں اس بات پر بھی مامور ہوں کہ تمھیں یہ بتاؤں کہ "خدا کے سامنے سرکشی اور تکبر نہ کرو۔ اپنی حدود میں رہو۔ کیونکہ میں تمھارے لیے ایک واضح اور روشن دلیل لے کر آیا ہوں" (وان لا تعلوا علی اللہ انی آتیکم بسلطان مبین)۔

واضح معجزات بھی اور کھلم کھلا منطقی دلائل بھی۔

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ کا)

"جئتکم ان ادّوا الیّ عباد اللہ"۔

[1] جیسے سورۂ فرقان آیت ۱۰، سورۂ سبا آیت ۱۳ اور سورۂ فرقان آیت ۵۰ وغیرہ۔

خدا کے سامنے "علو" نہ کرنے سے مراد ہر قسم کا وہ عمل ہے جو بندگی کے اصولوں کے منافی ہے۔ خواہ وہ خدا کی مخالفت اور نافرمانی ہو یا خدا کے رسول کو ایذا رسانی ہو یا خدائی کا دعویٰ ہو، سب اسی زمرے میں آجاتے ہیں۔

چونکہ دُنیا پرست متکبرین جب اپنے ناجائز مفادات پر زد پڑتی دیکھتے ہیں تو کسی قسم کی تہمت، الزام تراشی، ناروا باتوں، حتی کہ قتل اور موت کے گھاٹ اتارنے سے بھی نہیں چوکتے، اسی لیے موسیٰ علیہ السلام نے حفظ ماتقدم کے طور پر پہلے ہی سے کہہ دیا کہ اس بات سے کہ تم مجھے متہم یا سنگسار کردیں اپنے اور تمھارے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں "وانی عذت بربی وربکم ان ترجمون"۔

ممکن ہے یہ بات اس چیز کی طرف بھی اشارہ ہو کہ مجھے تمھاری دھمکیوں کی پرواہ نہیں ہے اور میں آخر دم تک اپنے موقف پر ڈٹا ہوا ہوں۔ خدا میرا محافظ اور نگہبان ہے۔

اس قسم کی تعبیر خدائی رہبروں کے عزم اور حوصلے کو تقویت پہنچاتی، دشمنوں کے حوصلوں کو پست کرتی، اور دوستوں کے عزم واستقلال میں اضافے کا موجب بنتی ہے، کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کا قائد اور رہبر آخری سانس تک اپنے موقف پر ڈٹا رہے گا۔

"رجم" (سنگسار) کی بات شاید اس لیے کی گئی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام سے قبل بہت سے انبیاء کو "رجم" کی دھمکی دی گئی تھی۔ جیسا کہ نوح علیہ السلام کے بارے میں ہے:

"قالوا لئن لم تنته یانوح لتکونن من المرجومین"۔

"وہ کہنے لگے، اے نوحؑ! اگر تم اپنے کام سے باز نہ آئے تو تمھیں سنگسار کردیا جائے گا"۔

(شعراء - ۱۱۶)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آذر نے سنگسار کرنے کی دھمکی دیتے ہوئے کہا:

"لئن لم تنته لارجمنک"۔

"اگر تو باز نہ آیا تو تجھے سنگسار کردوں گا"۔ (مریم - ۴۶)

جناب شعیب علیہ السلام کو بت پرستوں نے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

"ولولا رهطک لرجمناک"۔

"اگر تیرے قبیلے کا پاس نہ ہوتا تو تجھے سنگسار کردیتے"۔ (ھود - ۹۱)

موت کی تمام سزاؤں میں سنگساری کی سزا کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ وہ سب سے زیادہ سخت سزا ہوتی ہے۔ بعض اربابِ لغت کے بقول "رجم" کا کلمہ مطلقاً قتل کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

بہت سے مفسرین کی طرف سے یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ "رجم" کا معنی کسی کو متہم کرنا، کسی پر الزام لگانا اور کسی کو گالی دینا ہے، کیونکہ یہ لفظ اس معنی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور یہاں پر اس کا استعمال درحقیقت ان الزامات کی پیش بندی ہے جو بعد میں موسیٰ پر لگائے گئے۔

اس کلمے کا استعمال وسیع صورت میں دونوں معانی کے لیے بھی ہو سکتا ہے۔

اسی سلسلے کی آخری آیت میں حرفِ آخر کے طور پر جناب موسیٰ انھیں فرماتے ہیں: اگر تم مجھ پر ایمان نہیں لاتے تو کم از کم مجھے چھوڑ دو، مجھ سے دُور ہو جاؤ اور دوسرے لوگوں کو ایمان لانے سے نہ روکو۔ (وان لم تؤمنوا لی فاعتزلون)۔

کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پوری طرح مطمئن تھے کہ وہ اپنے واضح اور آشکار معجزات، پختہ دلائل اور خدا کے پکے وعدوں کی وجہ سے مختلف لوگوں میں اپنے مشن کو جاری رکھیں گے اور اپنے انقلاب کو ساحلِ کامرانی سے ہم کنار کر دیں گے اسی لیے انھوں نے اپنے یقین کی بنا پر ان لوگوں سے کہا کہ میرے لیے سدِ راہ نہ بنو اور میرے رستے میں روڑے نہ اٹکاؤ۔

لیکن کیا یہ بات ممکن ہے کہ مغرور اور سرکش ظالم اور جابر لوگ جو اپنی شیطانی طاقتوں اور ناجائز مفادات کو خطرے میں پڑتا دیکھتے ہیں وہ خاموشی سے بیٹھ جاتے ہیں اور اس قسم کی پیشکش کو فوراً قبول کر لیتے ہیں؟ آئندہ آیات یہی ماجرا بیان کرتی ہیں۔

۲۲۔ فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ ○

۲۳۔ فَاَسْرِ بِعِبَادِیْ لَیْلًا اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ○

۲۴۔ وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ؕ اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ ○

۲۵۔ كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ ○

۲۶۔ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِیْمٍ ○

۲۷۔ وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِیْهَا فٰكِهِیْنَ ○

۲۸۔ كَذٰلِكَ ۫ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِیْنَ ○

۲۹۔ فَمَا بَكَتْ عَلَیْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِیْنَ ع

ترجمہ

۲۲۔ (موسیٰ نے) اپنے رب کی بارگاہ میں عرض کیا کہ یہ مجرم لوگ ہیں۔

۲۳۔ (موسیٰ کو خدا کا حکم ملا) تو میرے بندوں کو راتوں رات لے کر نکل جا، جبکہ وہ تیرے پیچھے آئیں گے۔

۲۴۔ (جب تو دریا عبور کر لے تو) دریا کو کھلا اور ٹھہرا ہوا رہنے دے کہ وہ غرق ہونے والا لشکر ہیں۔

۲۵۔ وہ لوگ کتنے باغات اور چشمے چھوڑ گئے۔

۲۶۔ اور کھیتیاں اور دلکش و گراں قیمت محلات۔

۲۷۔ اور دوسری بہت سی نعمتیں جن میں وہ عیش کیا کرتے تھے۔

۲۸۔ یہ تھا اُن کا ماجرا اور ہم نے ان تمام چیزوں کا دوسرے لوگوں کو وارث بنایا۔

۲۹۔ نہ تو آسمان نے ان پر گریہ کیا اور نہ ہی زمین نے اور نہ اُنھیں مہلت ہی دی گئی۔

تفسیر

محلات، باغات اور خزانوں کو چھوڑ کر چلے گئے

حضرت مُوسیٰ علیہ السلام ان مجرموں کے تاریک دلوں میں اثر پیدا کرنے کے لیے ہدایت کے تمام وسائل بروئے کار لائے۔ لیکن فرعونیوں میں ان کا ذرہ بھر بھی اثر نہ ہوا۔ ہر ایک کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن کہیں کچھ شنوائی نہ ہوئی۔

اسی لیے وہ ان سے مایوس ہو گئے اور ان پر نفرین کے علاوہ انھیں اور کوئی رستہ دکھائی نہ دیا۔ کیونکہ جس فاسد قوم کی ہدایت کی کوئی امید باقی نہ رہے، نظام آفرینش میں اسے جینے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اس کے لیے صرف ایک ہی راہ ہوتی ہے کہ اس پر عذاب الٰہی نازل ہو کہ جو اس کا ستیاناس کر کے اس کے ناپاک وجود کو صفحۂ ہستی سے مٹا دے۔

اسی لیے زیرِ نظر پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: مُوسیٰ نے اپنے پروردگار کی بارگاہ میں عرض کیا کہ یہ مجرم اور گناہگار لوگ ہیں۔ (فدعا ربہ ان ھٰؤلاء قوم مجرمون)۔

کیسی عمدہ بددعا ہے؟ مُوسیٰؑ یہ نہیں کہتے کہ خدایا ان کے ساتھ یہ کر اور وہ کر بلکہ صرف یہی کہتے ہیں کہ یہ مجرم لوگ ہیں ان کی ہدایت کی کوئی امید باقی نہیں رہ گئی۔

خدا نے بھی ان کی دُعا قبول فرمائی اور فرعونیوں پر عذاب کے نزول اور بنی اسرائیل کی اس عذاب سے نجات کے مقدمے کے طور پر مُوسیٰ کو حکم دیا: تو میرے بندوں کو راتوں رات لے کر نکل جا، کیونکہ فرعون اور اس کے لشکر والے تمہارے پیچھے آئیں گے (فاسر بعبادی لیلاً انکم متبعون)۔

لیکن گھبراؤ نہیں! ضروری ہے کہ وہ تمہارا پیچھا کریں تاکہ اس انجام کو دیکھ لیں، جس کے وہ منتظر ہیں۔

حضرت مُوسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوتا ہے کہ راتوں رات خدا کے مؤمن بندوں یعنی بنی اسرائیل کو کہ جو ان پر ایمان لا چکے تھے اور کچھ دوسرے مصریوں کو جو ایمان لانے پر آمادہ تھے اور ان کی آواز پر لبیک کہہ چکے تھے، اپنے ساتھ لے کر چل پڑیں اور نیل کے ساحل پر پہنچ جائیں اور معجزانہ طریقے پر دریائے نیل کو عبور کر کے اپنی موعود سرزمین یعنی فلسطین پہنچ جائیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ حضرت مُوسیٰؑ اور ان کے پیروکاروں نے رات کو یہ سفر اختیار کیا، لیکن یہ بھی مسلّم ہے کہ اتنی بڑی تعداد کا سفر اختیار کرنا زیادہ عرصے تک فرعونیوں کی نگاہوں سے مخفی نہیں رہ سکتا تھا، شاید اس واقعے کو چند ہی گھنٹے گزرے

ہوں گے کہ فرعون کے جاسوسوں نے اُسے اس عظیم واقعے یا بالفاظ دیگر" غلاموں کے اجتماعی فرار" کی خبر پہنچادی۔ فرعون نے حکم دیا کہ ایک عظیم لشکر کے ساتھ ان کا تعاقب کیا جائے۔ دِل چسپ بات یہ ہے کہ یہ تمام مطالب اور یہ سب کچھ مندرجہ بالا آیت میں ایک نہایت ہی مختصر سے جُملے میں بیان کر دیا گیا ہے اور وہ ہے:

" انکم متبعون:

" تمہارا تعاقب کیا جائے گا"

جو کچھ یہاں پر اختصار کے لیے حذف ہوا ہے وہ قرآن کی دوسری آیات میں مختصر عبارتوں کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ جیسا کہ سُورۂ طٰہٰ کی ۷۷ ویں آیت میں ہے۔

" ولقد اوحینا الیٰ موسیٰ ان اسر بعبادی فاضرب لھم طریقاً فی البحر یبساً لا تخاف درکاً ولا تخشیٰ"

" ہم نے مُوسیٰ کو وحی کی کہ ہمارے بندوں کو راتوں رات باہر لے جا اور ان کے لیے دریا میں خشک راستہ کھول، نہ تو تجھے دشمن کے تعاقب کا خوف ہوگا اور نہ ہی غرق ہونے کا خدشہ"

پھر زیرِ تفسیر آیات میں بیان فرمایا گیا ہے: جب تم سلامتی کے ساتھ دریا کو عبور کر لو تو دریا کو کھلا اور ٹھہرا ہوا رہنے دو۔ (واترک البحر رھوًا)۔

ان آیات میں دریا سے مراد وہی عظیم دریائے نیل ہے۔

مفسرینِ کرام اور ارباب لغت نے " رھو" (بروزن "سہو") کے دو معانی ذکر کیے ہیں۔ ایک معنی ہے" ٹھہرا ہوا" اور دوسرا" کھلا ہوا"۔ اس مقام پر دونوں معانی کو جمع کر دینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

لیکن حضرت مُوسیٰؑ کو یہ حکم کیوں دیا گیا؟ تو یہ ایک فطری سی بات ہے کہ جناب مُوسیٰ اور بنی اسرائیل تو یہ چاہتے تھے کہ جب وہ اس دریا سے گزر جائیں تو فوراً دونوں طرف کا پانی آپس میں مِل جائے اور یہ خشکی کا راستہ فوراً بھر جائے، تاکہ وہ جلدی اور سلامتی کے ساتھ لشکرِ فرعون سے دُور ہو جائیں اور موعود سرزمین کی طرف چل پڑیں۔ لیکن انھیں حُکم ملتا ہے کہ دریا کو عبور کرتے وقت جلد بازی سے کام نہ لیں اور دریا کو اسی حال پر رہنے دیں تاکہ فرعون اور اس کی فوج کا آخری شخص تک اس میں داخل ہو جائے، کیونکہ نیل کی ٹھاٹھیں مارتی ہوئی موجوں کو انکی تباہی اور بربادی کا حکم دیا جا چکا ہے۔

اسی لیے آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا گیا ہے: وہ سب غرق شدہ لشکر ہیں (انھم جند مغرقون)۔

خدا کا یہ حتمی فرمان ان مغرور اور سرکش لوگوں کے بارے میں ہے کہ انھیں نیل کے اس عظیم دریا میں غرق ہونا چاہیئے جو اُن کی ثروت اور طاقت کا سرچشمہ ہے اور جو ان کی زندگی اور حیات کا عامل ہے اسے ہی خدا کے ایک فرمان کے ذریعے موت اور تباہی و بربادی کا سبب بننا چاہیئے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا، جب فرعون اور اس کے لشکر والے نیل کے ساحل پر پہنچے تو اس وقت تک بنی اسرائیل دوسرے کنارے سے دریا عبور کر چکے تھے۔ چونکہ اس قسم کے راستے کا نیل کے درمیان میں نمودار ہونا ہر ابجد خواں بچے کو خدا کے ایک عظیم معجزہ

ہونے کی جانب متوجہ کرنے کے لیے کافی تھا لیکن غرور اور تکبر نے ان عقل کے اندھوں کو اس کھلم کھلا حقیقت کو سمجھنے کی اجازت نہیں دی کہ وہ اپنی غلطی کو محسوس کرتے اور خدا کی بارگاہ میں سربسجود ہو جاتے۔ شاید انھوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ نیل میں اس قسم کی تبدیلی بھی فرعون کے حکم سے عمل میں آئی ہے۔ اور شاید فرعون یہی بات اپنے پیروکاروں سے کہہ کر اس دنیائی راستے پر چل پڑا اور اس کے پیروکاروں کا آخری فرد بھی اس کے پیچھے آ گیا۔ وہ سب دریا کے درمیانی حصے میں پہنچ گئے تو اچانک نیل کی ٹھاٹھیں مارتی موجیں بوسیدہ عمارت کی طرح یک دم ان پر آ گریں اور سب کو دریا میں غرق کر دیا۔

ایک نکتہ جو ان آیات میں انسان کی توجہ اپنی جانب مبذول کرواتا ہے وہ ان آیات کا نہایت ہی اختصار ہے اور وہ اپنے اس اختصار کے باوجود جامع بھی ہیں، کیونکہ ان اضافی جملوں کو حذف کر دیا گیا ہے جو یا تو قرائن کی وجہ سے یا پھر دوسرے جملوں کی وجہ سے سمجھ میں آ جاتے ہیں۔ ایک مفصل داستان کو تین آیتوں یا تین مختصر جملوں میں بیان کیا جا رہا ہے اور وہ تین جملے صرف یہی کہہ رہے ہیں کہ:

"موسیٰ نے اپنے رب کی بارگاہ میں عرض کی یہ لوگ مجرم ہیں"۔

"اسے کہا گیا کہ میرے بندوں کو راتوں رات یہاں سے نکال لے جا کہ تمہارا تعاقب ہوگا"۔

"دریا کو کھلا اور ٹھہرا ہوا چھوڑ دے کہ وہ غرق شدہ لشکر ہیں"۔

باوجودیکہ وہ ابھی غرق نہیں ہوئے تھے ان کے لیے "غرق شدہ" کی تعبیر خدا کے اس فرمان کے قطعی اور حتمی ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ فرعون اور فرعونیوں کے غرق ہونے کے بعد کون کون سے عبرت انگیز واقعات رونما ہوئے۔

قرآن کریم نے بعد کی آیات میں ان کی اس عظیم دولت کو پانچ موضوعات کی صورت میں بیان کیا ہے جو ان کی تمام زندگی کی فہرست بنتی ہے اور وہ بنی اسرائیل کو میراث کی صورت میں ملے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: وہ لوگ کتنے باغات اور چشمے چھوڑ کر چلے گئے۔ (کم ترکوا من جنّات و عیون)۔

باغات اور چشمے اُن کے تمام اموال میں زیادہ قیمتی اور نہایت اہم سرمایہ تھے کیونکہ نیل ہی کی بدولت مصر کی سرزمین زرخیز اور ثمر آور تھی۔ ان چشموں سے مراد ممکن ہے وہ چشمے ہوں جو بعض پہاڑوں سے پھوٹ کر زمینوں کو سیراب کیا کرتے تھے یا پھر وہ چھوٹے بڑے ندی نالے ہوں جو دریائے نیل سے نکالے گئے تھے اور ان کے سرسبز و شاداب اور خرم و آباد باغوں سے گزرتے تھے اور ان ندی نالوں پر "عین" (چشمے) کا اطلاق بعید نہیں۔

پھر فرمایا گیا ہے: اور کھیتیاں اور دل کش، خوبصورت اور گراں قیمت محلات۔ (و زروع و مقام کریم)۔

یہ دونوں بھی ان کا اہم سرمایہ تھے۔ عظیم ترکھیتی باڑی جس کی نیل کے پانی سے آبپاشی کی جاتی تھی اور پورے مصر کا اس پر دارومدار تھا۔ انواع و اقسام کی اجناس کی پیداوار اور دوسری زرعی چیزیں جن سے خود بھی استفادہ کرتے تھے اور دوسرے ملکوں کو بھی برآمد کیا کرتے تھے اور پورے ملک کا اقتصادی نظام اسی زراعت کا مرہون منت تھا۔

یہی حال اونچے اونچے محلات اور آبادیوں کا ہے، کیونکہ انسانی زندگی میں انھیں بھی بہت اہمیت حاصل ہے۔

البتہ ان محلات کا "کریم" اور قیمتی ہونا، ظاہری نقطۂ نظر سے ہے اور خود ان کے اپنے نظریئے کا بیان ہے، ورنہ قرآنی منطق کی رُو سے تو اس قسم کے طاغوتی ٹھاٹھ باٹھ اور یادِ خدا سے غافل کرنے والے مکانات اور محلات کسی قسم کی "کریمی" کے حامل نہیں ہیں۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ "مقامٍ کریم" سے مراد جشن و شادمانی کی محفلیں ہیں اور یا وہ منبر ہیں جن پر قصیدہ خواں اور شعراء لوگ بیٹھ کر فرعون کی قصیدہ خوانی کیا کرتے تھے۔ لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

چونکہ ان کے پاس مذکورہ چار اہم امور کے علاوہ بڑی مقدار میں حصولِ نعمت کے اور بھی بہت سے وسائل تھے، جن کی طرف ایک مختصر سے جملے میں اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اور دوسری بہت سی نعمتیں جن میں عیش و عشرت کیا کرتے تھے اور ناز و نعمت کے ساتھ زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ (ونعمۃ کانوا فیھا فاکھین)۔ [1] و [2]

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: جی ہاں! ان کے ساتھ ایسا ہی ہوا اور ہم نے فرعون والوں کی تمام دولت و سلطنت اور اموال کا وارث دوسرے لوگوں کو بنا دیا (کذالک واورثناھا قوماً اٰخرین)۔ [3]

"قوماً اٰخرین" سے مراد بنی اسرائیل ہیں کیونکہ سورۂ شعراء کی آیت ۵۹ میں اس بارے میں تصریح ہو چکی ہے اور لفظ "ارث" سے اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ وہ کسی دُکھ درد اور تکلیف اُٹھائے اور خونِ جگر دیئے بغیر ان تمام اموال اور ثروت کے مالک بن گئے جس طرح انسان کو کسی تکلیف کے بغیر وراثت ملتی ہے۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اسی آیت سے اور اس جیسی سورۂ شعراء کی آیت سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ فرعون اور فرعون کے ساتھیوں کے غرق ہو جانے کے بعد بنی اسرائیل سرزمین مصر کی طرف لوٹ آئے اور فراعنہ کی میراث کے وارث بنے اور وہیں پر اپنی حکومت قائم کی اور حالات کا رُخ بھی یہی بتاتا ہے کہ مصر میں فرعونیوں کے اقتدار اور حکومت کے خاتمے کے بعد موسیٰ علیہ السلام ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دے سکتے تھے کہ وہ مُلک کسی قسم کے سیاسی خلفشار کا شکار ہو جائے۔

---

[1] "نعمۃ" (نون پر زبر کے ساتھ) کا معنی حصولِ نعمت ہے۔ اور نون کی زیر کے ساتھ ہو تو معنی نعمت کا بھیجنا ہے۔ یہ تصریح بیشتر مفسرین اور ارباب لغت کی ہے، جب کہ دوسرے مفسرین کا نظریہ ہے کہ دونوں کا ایک ہی معنی ہے اور ہر قسم کا اہم فائدہ اس کے مفہوم میں شامل ہے۔

[2] "فاکھین" کا معنی کبھی تو "فواکہ" یعنی پھلوں سے استفادہ کرنے کے معنی میں آتا ہے اور کبھی فکاہی اور دل لگی کی باتوں کے معنی میں اور کبھی کبھی ہر قسم کی لذت اُٹھانے اور نعمتوں سے بہرہ ور ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ البتہ آخری معنی دوسرے تمام معنوں سے زیادہ جامع ہے۔

[3] "کذالک" مقتضائے محذوف کی خبر ہے اور اس کی تقدیر یوں ہے "الامر کذالک" اور اس طرح کے الفاظ تاکید کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ بعض مفسرین نے اس کی ترکیب کے متعلق اور بھی کئی احتمالات کا ذکر کیا ہے۔

لیکن یہ بات قرآن مجید کی ان تصریحات کے منافی نہیں ہے جن میں بتایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل، فرعون والوں کے چنگل سے آزاد ہو جانے کے بعد فلسطین کی موعود سرزمین کی طرف چل دیئے، جس کے واقعات بھی قرآن مجید میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں، کیونکہ اس بات کا امکان ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ جن کے قبضے میں مصر کی زمین آچکی تھی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نمائندوں کی حیثیت سے وہیں پر رہ گئے ہوں اور دوسرے بہت سے لوگ راہی دیارِ فلسطین ہو گئے ہوں۔

(اس سلسلے میں مزید تفصیل کے لیے سورۂ شعراء کی ۵۹ ویں آیت کے ذیل میں تفسیر نمونہ کی ۱۵ ویں جلد کا مطالعہ فرمائیں۔)

اسی سلسلے کی آخری آیت میں فرمایا گیا ہے: نہ تو آسمان نے ان پر گریہ کیا اور نہ ہی زمین نے اور نہ ہی انھیں بلاؤں کے نازل ہونے کے وقت کوئی مہلت دی گئی۔ (فما بکت علیھم السماء والارض وما کانوا منظرین)۔

ان پر آسمان و زمین کے گریہ نہ کرنے سے شاید ان کی حقارت، اور ان کے لیے کسی دوست اور ہمدرد کا نہ ہونا مراد ہے کیونکہ عربوں میں یہ معمول ہے کہ جب کسی پر واقع ہونے والی مصیبت کے موقع پر اس کے مقام کی عظمت اور اہمیت کو جتلانا چاہیں تو کہتے ہیں "اس پر آسمان و زمین روئے اور اس کے فقدان پر سورج اور چاند تاریک ہو گئے"۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اس سے مراد "زمین و آسمان والوں کا گریہ ہے" کیونکہ وہ مومنین اور خدا کے مقربین کے لیے گریہ کرتے ہیں نہ کہ فرعونیوں جیسے جابروں کے لیے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ آسمان و زمین کا گریہ حقیقی گریہ ہوتا ہے جو ایک قسم کی تبدیلی اور مخصوص سرخی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے (طلوع و غروب کے موقع پر رونما ہونے والی سرخی کے علاوہ)۔

جیسا کہ ایک روایت میں ہے:

"لما قتل الحسین بن علی بن ابی طالب بکت السماء علیہ و بکائھا حمرۃ اطرافھا"۔

"جب حسینؑ بن علیؑ بن ابی طالب کو شہید کر دیا گیا تو آسمان نے آپ پر گریہ کیا اور یہ رونا ایک خاص سرخی کی صورت میں تھا جو اس کے کناروں پر نمایاں ہوئی۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ایک روایت میں ہے۔

"بکت السماء علی یحییٰ بن زکریا وعلی الحسین بن علی (علیھما السلام) اربعین صباحًا ولم تبک الا علیھما، قلت وما بکاءھا؟ قال کانت تطلع حمراء وتغیب حمراء"۔

آسمان یحییٰ بن زکریا علیہ السلام (جو اپنے زمانے کے طاغوت کے ہاتھوں نہایت ہی دردناک

لہ تفسیر مجمع البیان جلد ۹ ص (اسی آیت کے ذیل میں)

صورت میں شہید کیے گئے) اور حسین بن علی علیہما السلام پر چالیس دن روتا رہا اور ان دونوں کے علاوہ کسی اور پر نہیں رویا۔ راوی نے کہا: میں نے امام سے پوچھا کہ آسمان کا رونا کس قسم کا تھا؟ تو امام نے فرمایا: طلوع اور غروب آفتاب کے وقت ایک خاص سُرخی آسمان پر ظاہر ہو جایا کرتی تھی۔[1]

لیکن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ایک اور حدیث میں ہے:

"ما من مؤمن الا وله باب يصعد منه عمله وباب ينزل منه رزقه فاذا مات بكيا عليه"

"کوئی مومن ایسا نہیں ہے جس کے لیے آسمان میں ایک دروازہ نہ ہو کہ جس سے اس کے اعمال اوپر جاتے ہیں اور ایک دروازہ ایسا ہے جس سے اس کا رزق نازل ہوتا ہے جب وہ مرجاتا ہے تو یہ دونوں دروازے اس پر گریہ کرتے ہیں۔[2]

ان روایات میں کسی قسم کا باہمی تضاد نہیں ہے کیونکہ حضرت امام حسینؑ اور حضرت یحییٰ بن زکریا کی شہادت کے بارے میں مسئلے کی عمومی حیثیت ہے کہ تمام آسمانوں نے ان پر گریہ کیا، جب کہ آخری روایت ایک خاص اور محدود پہلو کی نشاندہی کرتی ہے۔[3]

بہر صورت ان تفاسیر کا آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے اور سب آیت کے مفہوم میں جمع ہو سکتی ہیں۔

ہاں البتہ! یہ بات یقینی ہے کہ ظالموں اور تباہ کاروں کی موت پر نہ تو چشم فلک کو رونا آیا اور نہ ہی سورج پژمردہ ہوا، کیونکہ وہ ایسے خبیث افراد تھے گویا ان کا کائنات اور عالم بشریت کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔

جب عالم سے یہ بیگانے دھتکار دیئے گئے تو کسی کو بھی ان کی جدائی کا صدمہ نہ ہوا، نہ تو روئے زمین پر اور نہ ہی افلاک کی بلندیوں پر اور نہ ہی انسانی دلوں کی گہرائی میں۔ اسی لیے کسی نے بھی ان کی موت پر ایک آنسو تک نہیں بہایا۔

ہم ان آیات کے بارے میں امیر المومنین علیہ السلام کی ایک روایت نقل کر کے اپنی بات ختم کرتے ہیں۔ روایت میں ہے کہ جب امیر المومنین علیہ السلام مدائن سے گزر رہے تھے تو آپ کا گزر کسریٰ (نوشیرواں اور ساسانی بادشاہوں کے آثار سے ہوا۔ آپ نے ان آثار کا مشاہدہ فرمایا جو گرنے کے بالکل قریب تھے۔ تو آپ کے ہم رکاب لوگوں میں سے ایک

---

[1] تفسیر مجمع البیان جلد ۹ صفحہ ۔ (اسی آیت کے ذیل میں۔)

[2] تفسیر مجمع البیان جلد ۹ صفحہ ۔

[3] تفسیر "در منثور" میں ایک حدیث بیان کی گئی ہے، جس میں ان روایات کو جمع کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

(منقول از تفسیر المیزان جلد ۱۸، صفحہ ۱۵۱)

شخص نے عبرت کے عنوان سے یہ شعر پڑھا:

جرت الریاح علی رسوم دیارھم فکأنھم کانوا علی میعاد

"ہوائیں ان کی سرزمین کے باقی ماندہ آثار پر چلنے لگیں (اور ان کے محلات سے سوائے ہوا کی سنسناہٹ کے اور کچھ سنائی نہ دیا) گویا ان سب کی ایک وعدہ گاہ تھی جس کی طرف وہ روانہ ہو چکے ہیں۔"

حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا تم نے اس شعر کے بجائے یہ آیت کیوں نہیں تلاوت کی:

"کم ترکوا من جنات وعیون وزروع ومقام کریم ونعمۃ کانوا فیھا فاکھین .... فما بکت علیھم السماء والارض وما کانوا منظرین۔"[1]

---

[1] سفینۃ البحار جلد ۲ صفحہ ۵۳۱ (مادہ مون)

*

۳۰۔ وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِينِ ۝
۳۱۔ مِن فِرْعَوْنَ ۚ إِنَّهُ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِينَ ۝
۳۲۔ وَلَقَدِ اخْتَرْنَاهُمْ عَلَىٰ عِلْمٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ۝
۳۳۔ وَآتَيْنَاهُم مِّنَ الْآيَاتِ مَا فِيهِ بَلَاءٌ مُّبِينٌ ۝

ترجمہ

۳۰۔ اور ہم نے بنی اسرائیل کو رسوا کن عذاب سے نجات دلائی۔
۳۱۔ فرعون سے، کہ وہ ایک متکبر شخص اور حد سے تجاوز کرنے والوں میں سے تھا۔
۳۲۔ اور ہم نے اپنے علم کی بناء پر انھیں عالمین میں سے منتخب کیا اور برتری دی۔
۳۳۔ اور ہم نے انھیں (اپنی قدرت کی) ایسی نشانیاں دیں کہ جن میں آزمائش تھی۔ (لیکن انہوں نے کفرانِ نعمت کیا اور سزا پائی)۔

تفسیر

بنی اسرائیل کی آزمائش

گزشتہ آیات میں فرعونیوں کے غرق اور ہلاک ہونے اور ان کی شان و شوکت اور اقتدار کے خاتمے اور اقتدار اور شان و شوکت کا دوسروں کو منتقل ہونے کا تذکرہ تھا۔ زیر تفسیر آیات میں اس کے دوسرے پہلو یعنی بنی اسرائیل کی نجات کی بات ہو رہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے بنی اسرائیل کو رسوا کن عذاب سے نجات دلائی (ولقد نجینا بنی اسرائیل من العذاب المھین)۔

سخت اور طاقت فرسا جسمانی اور روحانی اذیتوں سے کہ جو ان کے دل کی گہرائیوں میں اُتر چکی تھیں۔ یعنی نومولود لڑکوں کو قتل کر دیا جاتا تھا اور خدمت اور ہوس بازی کے لیے لڑکیوں کو زندہ رکھا جاتا تھا، ان سے بے گار لی جاتی تھی اور کس قدر دردناک ہے ایسی قوم کا مقدر جو اس قسم کے خونخوار اور دیو سیرت دشمن کے چنگل میں پھنس جائے۔

جی ہاں! خداوندِ عالم نے موسیٰ علیہ السلام کے بحکم خدا قیام اور تحریک کی وجہ سے اس مظلوم قوم کو تاریخ کے سفاک ظالموں کے چنگل سے نجات بخشی لہٰذا اس کے بعد ارشاد فرمایا گیا ہے: "فرعون کے چنگل سے" (من فرعون)۔

کیونکہ وہ ایک متکبر شخص اور حد سے تجاوز کرنے والوں میں سے تھا۔ (انہ کان عالیاً من المسرفین)

یہاں پر "عالی" سے مراد مقام و منزلت کی سربلندی نہیں بلکہ اس کی برتری کی خواہش اور تجاوز اور اسراف میں بلندی ہے، جیسا کہ سورۂ قصص کی چوتھی آیت میں بھی آچکا ہے کہ:

"ان فرعون علا فی الارض"

"فرعون نے زمین میں برتری چاہی (اور یہ برتری کی خواہش اس حد تک بڑھ گئی کہ اس نے خدائی کا دعویٰ کر ڈالا اور خود کو ربّ اعلیٰ کہلانے لگا۔)

"مسرف" "اسراف" کے مادہ سے ہے جو حد سے ہر قسم کے تجاوز کو کہتے ہیں، خواہ وہ اعمال میں ہو یا گفتار میں۔ اسی لیے قرآن مجید کی مختلف آیات میں تباہ کاروں کے بارے میں "مسرف" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جو ظلم و فساد میں حد سے بڑھ گئے ہیں نیز مطلقاً گناہوں کو بھی "اسراف" کہا گیا ہے۔ جیسا کہ سورۂ زمر کی ۵۳ ویں آیت میں ہے۔

"قل یا عبادی الذین اسرفوا علیٰ انفسھم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ"

"کہہ دے: اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنے آپ سے زیادتی کی ہے! خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔"

بعد کی آیت میں بنی اسرائیل پر خدا کی ایک اور نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

ہم نے انھیں اپنے علم کی بنا پر اس زمانے کے عالمین پر برتری دی اور انھیں برگزیدہ کیا۔ (ولقد اخترناھم علی علم علی العالمین)۔

لیکن انہوں نے ان نعمتوں کی قدر نہیں جانی، بلکہ کفرانِ نعمت کیا اور اپنے کیے کی سزا پائی۔

اس طرح سے وہ اپنے زمانے کی برگزیدہ اُمت تھے۔ کیونکہ "عالمین" اُس دور کے لوگ ہیں نہ کہ تمام زمانوں کے لوگ، کیونکہ قرآن نے صاف طور پر سورۂ آلِ عمران کی ایک سو دسویں آیت میں اُمتِ اسلامیہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"کنتم خیر امۃ اخرجت للناس ....."

"تم بہترین اُمت تھے، جنہوں نے لوگوں کے مفاد کے لیے عرصۂ وجود میں قدم رکھا۔"

جس طرح کہ ان سرزمینوں کے بارے میں ہے جن کے بنی اسرائیل وارث ہوئے، چنانچہ سورۂ اعراف کی ۱۳۷ ویں

آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

"واورثنا القوم الذین کانوا یستضعفون مشارق الارض ومغاربها التی بارکنا فیها"

ہم نے اس مستضعف قوم کو بابرکت زمین کے مشارق ومغارب کا وارث بنایا۔

ظاہر سی بات ہے کہ بنی اسرائیل اس زمانے میں تمام دُنیا کے وارث نہیں بنے تھے بلکہ اُن کے اپنے علاقہ کے مشرق ومغرب مراد ہیں۔

البتہ بعض مفسرین اس بات کے معتقد ہیں کہ بنی اسرائیل میں بعض ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو تاریخی طور پر صرف انہی کے ساتھ مخصوص ہیں جن میں سے ایک، انبیاء کی کثرت بھی ہے کیونکہ کسی قوم میں سے اس قدر انبیاء مبعوث نہیں ہوئے۔

لیکن یہ بات علاوہ اس کے کہ ان کی مطلق خصوصیت ثابت نہیں کرتی، ان کی کسی قسم کی خصوصیت بھی نہیں بن سکتی کیونکہ ممکن ہے ہم ان میں سے کثیر تعداد میں انبیاء کے قیام کو ان کی نہایت سرکشی اور ڈھٹائی کی دلیل سمجھیں۔ جیسا کہ جناب موسیٰؑ کے قیام کے بعد والے واقعات اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ان لوگوں نے اپنے پیغمبر کے ساتھ کیا کیا کچھ کیا؟

بہر حال ہم نے جو کچھ مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں بیان کیا ہے وہ ایسی چیز ہے جسے بہت سے مفسرین نے بنی اسرائیل کی بالنسبۃ لیاقت کے طور پر قبول کیا ہے۔

لیکن اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ یہ ہٹ دھرم قوم بقول قرآن مجید ہمیشہ اپنے انبیاء کو ستاتی رہی، اور پوری ہٹ دھرمی اور خاص تعصب کی بنا پر احکام الٰہی کا مقابلہ کرتی رہی حتی کہ جب وہ تازہ تازہ دریائے نیل سے نجات پاچکی تھی موسیٰ علیہ السلام کو بُت سازی کی تجویز پیش کردی، ممکن ہے یہ بات کہی جائے کہ مندرجہ بالا آیت ان کے کسی خصوصی امتیاز کو بیان نہیں کر رہی، بلکہ ایک اور حقیقت کی نشاندہی کر رہی ہے اور اس آیت کا معنی یُوں ہے۔

"باوجودیکہ ہم جانتے تھے وہ خدا کی نعمتوں سے ناجائز مفاد اٹھائیں گے، پھر بھی ہم نے انھیں سربلندی عطا کی تاکہ ہم انھیں آزمائیں۔"

جیسا کہ بعد کی آیت سے بھی یہی سمجھا جاسکتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے انھیں اور بھی نعمتیں عطا کیں تاکہ انھیں آزمائے۔

تو اس طرح سے اللہ کا یہ انتخاب نہ فقط ان کی کسی خصوصیت کی دلیل نہیں بلکہ ضمنی طور پر ان کی مذمت کا حامل بھی ہے کیونکہ انہوں نے اس نعمت کا حق ادا نہیں کیا اور اس امتحان سے عہدہ برآ نہیں ہوئے۔

زیر تفسیر آیات کے سلسلے کی آخری آیت میں ان بعض نعمتوں کا ذکر ہے جو خدا نے انھیں عطا کی تھیں، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: اور ہم نے انھیں اپنی عظمت اور قدرت کی ایسی نشانیاں دیں جن میں ان کی صریح آزمائش تھی (واٰتیناھم من الاٰیات ما فیه بلاء مبین)۔

کبھی تو سینا کے صحراؤں اور تیہ کی وادیوں میں ان کے سروں پر بادلوں کا سایہ کیا، کبھی ان پر "من وسلویٰ" نازل کیا، کبھی سخت پتھروں کے دل سے پانی کا چشمہ ان کے لیے جاری کیا اور کبھی دوسری مادی اور روحانی نعمتیں ان کے نصیب کیں۔

لیکن یہ سب کچھ امتحان اور آزمائش کے لیے تھا، کیونکہ خدا تعالیٰ کچھ لوگوں کو مصیبت کے ذریعے آزماتا ہے، اور کچھ کو نعمت کے ذریعے، جیسا کہ سورۂ اعراف کی ۱۶۸ ویں آیت میں ہے:

"وبلوناھم بالحسنات والسیئات لعلھم یرجعون۔"

"ہم نے بنی اسرائیل کو نعمتوں کے ذریعے آزمایا کہ شاید وہ غلط راستے سے باز آجائیں۔"

بنی اسرائیل کی یہ سرگزشت صدر اسلام کے مسلمانوں کے لیے بیان کرنے کا مقصد شاید یہ ہو کہ وہ دشمنوں کی کثرت اور ان کی طاقت سے نہ گھبرائیں اور مطمئن رہیں کہ جو خدا فرعونوں کی طاقت، اقتدار اور عظمت کو خاک میں ملا سکتا ہے اور بنی اسرائیل کو ان کے ملک اور حکومت کا وارث بنا سکتا ہے وہ مستقبل قریب میں اس قسم کی کامیابی تمہارے نصیب بھی کر سکتا ہے لیکن جیسا کہ نعمتوں کے ذریعے ان کی آزمائش ہوئی ہے، تمہیں بھی اسی طرح امتحان کی بھٹی میں ڈالا جائے گا تاکہ معلوم ہو جائے کہ اقتدار اور طاقت کے حصول کے بعد تم کیا کرو گے؟

اور یہ زبردست تنبیہ ہے تمام اقوام اور ملتوں کے لیے کہ جب انھیں خدائی مہربانی، کامیابی اور نعمت نصیب ہو جاتی ہے تو اس موقع پر سخت امتحان کا دروازہ بھی کھل جاتا ہے۔

۳۴۔ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَيَقُوْلُوْنَ ۙ
۳۵۔ اِنْ هِيَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُوْلٰى وَمَا نَحْنُ بِمُنْشَرِيْنَ
۳۶۔ فَاْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ

ترجمہ

۳۴۔ یہ (مشرکین) کہتے ہیں۔
۳۵۔ ہمیں تو صرف ایک بار مرنا ہے اور ہرگز زندہ نہیں ہوں گے۔
۳۶۔ اگر تم سچ کہتے ہو تو ہمارے باپ دادا کو زندہ کر کے لے آؤ (تاکہ وہ گواہی دیں)

تفسیر

یہی موت ہے اور بس

گذشتہ آیات میں فرعون اور فرعونیوں کی زندگی کی تصویر کشی کی گئی تھی اور ان کے کفر و انکار کے انجام کا تذکرہ تھا۔ اب ایک بار پھر مشرکین کی باتوں کا ذکر کیا جا رہا ہے اور معاد کے بارے میں ان کے شکوک کو جو کہ سورت کے آغاز میں مذکور ہو چکے ہیں ایک مرتبہ پھر دوسرے لفظوں میں اس طرح بیان کیا جا رہا ہے: یہ مشرکین یوں کہتے ہیں۔ (ان ھؤلاء لیقولون)۔

ہمیں تو صرف ایک بار مرنا ہے اور ہم ہرگز دوبارہ زندہ نہیں ہوں گے (ان ھی الا موتتنا الاولی وما نحن بمنشرین)۔[1]

---

[1] ضمیر "ھی" کا مرجع کیا ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے مختلف نظریات ہیں۔ بعض مفسرین اسے "موتۃ" کی طرف پلٹاتے ہیں کیونکہ کلام کے سیاق سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ بنا بریں آیت کا معنی یہ ہوگا:
"ما الموتۃ الا موتتنا الاولی"۔
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

معاد، حیات بعد الموت، جزا و سزا اور جنّت و جہنّم کے بارے میں محمدؐ جو کچھ کہتے ہیں ان میں سے کسی ایک کی بھی کوئی حقیقت نہیں، بلکہ سرے سے حشر و نشر کا ہی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ مشرکین صرف پہلی موت پر ہی کیوں زیادہ زور دیتے ہیں؟ جس کا مطلب یہ ہے کہ اس موت کے بعد دوسری موت نہیں ہے، جبکہ ان کی مراد حیات بعد الموت کی نفی ہونا ہے نہ کہ دوسری موت کا انکار۔ دوسرے لفظوں میں انبیاء کرام علیہم السلام نے حیات بعد الموت کی خبر دی ہے نہ کہ دوسری موت کی۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کی مُراد بعد از مرگ دوسری حالت کے وجود کا انکار ہے، یعنی ہم فقط ایک بار مریں گے اور یہ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد نہ تو دوبارہ زندگی ہوگی اور نہ ہی دوبارہ موت۔ جو کچھ ہے صرف یہی ایک موت ہے۔ (غور کیجیے گا)[1]

درحقیقت اس آیت کا مفہوم سُورہ انعام کی ۲۹ ویں آیت سے بہت زیادہ ملتا جلتا ہے، جس میں کہا گیا ہے:

"وقالوا ان ھی الّا حیاتنا الدنیا وما نحن بمبعوثین"۔

"انھوں نے کہا: زندگی تو صرف یہی دُنیاوی زندگی ہے اور ہم ہرگز دوبارہ نہیں اُٹھائے جائیں گے"۔

اس کے بعد ان کی گفتار کو نقل کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے بے بنیاد دعوے کے لیے پورے دلائل پیش کرتے ہُوئے کہتے ہیں: اگر تم سچ کہتے ہو تو ہمارے باپ دادا کو زندہ کر کے ہمارے پاس لے آؤ تاکہ وہ تمھاری سچائی کی گواہی دیں (فأتوا بآبائنا ان کنتم صادقین)۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ باتیں کہنے والا ابوجہل تھا، جس نے رسُول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف مُنہ کر کے کہا:

"اگر تو سچ کہتا ہے تو اپنے جد "قصی بن کلاب" کو زندہ کر کیونکہ وہ ایک سچا انسان تھا اور ہم اس سے موت کے بعد کے حالات دریافت کریں گے"۔[2]

(بقیہ حاشیہ سابقہ صفحہ کا) ملاحظہ ہو تفسیر تبیان، تفسیر مجمع البیان اور تفسیر کشاف۔

جبکہ بعض دوسرے مفسرین ضمیر کا مرجع "عاقبۃ" اور "نھایۃ" کو جانتے ہیں، تو ایسی صُورت میں آیت کا معنی یوں ہوگا۔

"ما عاقبۃ امرنا الّا الموتۃ الاولیٰ"۔

(دیکھیے تفسیر رُوح المعانی اور تفسیر المیزان)

البتہ نتیجے کے لحاظ سے ان میں چنداں فرق نہیں ہے۔

[1] مفسرین نے اس جُملے کی تفسیر میں کئی اور احتمالات کو بھی ذکر کیا ہے جو سارے کے سارے بعید معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انھوں نے "موتۃ اولیٰ" کو "اس دُنیا میں موت قبل از حیات" کے معنی میں لیا ہے، تو اس قول کی بنا پر اس جُملے کا مفہوم یُوں ہوگا کہ وہ موت جو اس حیات کے بعد ہے فقط وہی موت ہے جو ہم اختیار کر چکے ہیں اور ہم سب مٹی تھے لیکن ہماری دوسرے موت کے بعد پھر زندگی کا وجود ہرگز نہیں ہے۔

[2] دیکھیے تفسیر مجمع البیان جلد ۹ صفحہ ۱۰۰ اور بعض دوسری تفسیریں۔

ظاہر ہے کہ یہ سب ان کے حیلے بہانے تھے۔ اگرچہ خداوند عالم کا طریقہ کار یہ نہیں ہے کہ مردوں کو اس دُنیا میں زندہ کرے تاکہ وہ اُس جہان کی خبریں اِس دُنیا میں لوگوں کو بتائیں۔ لیکن اگر بالفرض ایسا کام آنحضرتؐ سے انجام پا بھی جاتا تو پھر یہ لوگ کوئی اور راگ الاپنا شروع کر دیتے اور اسے جادُو یا کسی اور چیز کا نام دے دیتے۔ جس طرح انہوں نے بارہا آنحضرتؐ سے معجزے طلب کیے اور آپؐ نے وہ معجزے انہیں دکھائے بھی لیکن وہ ان کا انکار کر دیتے۔

معاد کے بارے میں مشرکین کا عقیدہ

مشرکین، خاص کر مشرکین عرب کا اعتقادی مسائل میں ایک رویہ نہیں تھا۔ وہ عقیدۂ شرک میں مشترک ہونے کے باوجود اعتقادی خصوصیات میں ایک دوسرے سے زبردست اختلاف رکھتے تھے۔

کچھ لوگ تو وہ تھے جو نہ تو خدا کو مانتے تھے اور نہ ہی معاد کو، یہ وہ لوگ تھے جن کی باتوں کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"ماھی الّا حیاتنا الدنیا نموت ونحیا وما یھلکنا الّا الدھر"

"اس دنیاوی زندگی کے علاوہ اور کچھ نہیں، کچھ لوگ مرجاتے ہیں تو کچھ لوگ پیدا ہوجاتے ہیں۔ اور ہمیں تو صرف طبیعت ہی موت دیتی ہے۔ (جاثیہ۔ ۲۴)

کچھ لوگ ایسے تھے جو خدا کو مانتے تھے اور بتوں کو اس کی بارگاہ کے لیے شفیع سمجھتے تھے، لیکن معاد کے مُنکر تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو کہا کرتے تھے:

"من یحی العظام وھی رمیم"

"ان گلی سڑی ہڈیوں کو کون دوبارہ زندہ کرے گا؟" (یٰسٓ۔ ۷۸)

یہ لوگ بُتوں کے لیے حج بھی بجالاتے تھے اور قربانی بھی کیا کرتے تھے، حلال وحرام کے قائل بھی تھے۔ اور اکثر مشرکین عرب اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔

بہت سے دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک طرح سے بقائے رُوح کے قائل بھی تھے، خواہ تناسخ اور تازہ ابدان میں ارواح کے انتقال کی صُورت میں یا کسی اور طرح سے۔[1]

خاص کر "ھامۃ" نامی ایک پرندے کے متعلق ان کا عقیدہ مشہور ہے۔ عربوں کی داستانوں میں مذکور ہے کہ ان میں کچھ لوگ ایسے تھے جن کا یہ عقیدہ تھا کہ انسانی رُوح ایک پرندہ ہے جو اس کے جسم میں پھیلا ہوا ہے۔ جب انسان مرجاتا ہے یا قتل ہو جاتا ہے تو وہ اس کے جسم سے باہر آکر اس کے جسم کا وحشت ناک صُورت میں چکر لگانا شروع کر دیتا ہے اور اس کی قبر کے اردگرد رٹا پیٹتا رہتا ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ یہ پرندہ پہلے پہل تو چھوٹا ہوتا ہے، لیکن بعد میں بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ اُلو جتنا ہوجاتا

---

[1] نہج البلاغہ ابن ابی الحدید جلد اوّل ص۔

ہے اور وہ ہمیشہ تنہائیوں میں رہتا ہے اور اس کا اکثر ٹھکانا پرانے کھنڈرات، خالی گھر، قبریں اور قتل گاہیں ہوتی ہیں۔

ان کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ اگر کسی کو قتل کر دیا جاتا تو "ھامۃ" اس کی قبر پر بیٹھ کر یہ فریاد کرتا رہتا ہے:

"اسقونی فانی صدیۃ"

"مجھے پانی پلاؤ کیونکہ میں بہت پیاسا ہوں"۔ [1]

اسلام نے ان تمام خرافاتی عقائد پر خط تنسیخ کھینچ دیا، لہٰذا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک مشہور حدیث منقول ہے کہ:

"لاھامۃ"

"ہامہ کا عقیدہ جھوٹ ہے"۔ [2]

بہرحال اگرچہ وہ معاد اور انسان کی بعد از موت زندگی کی طرف واپسی کے معتقد نہیں تھے، لیکن یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک طرح کے تناسخ اور بقائے رُوح کے قائل ضرور تھے۔

لیکن جسمانی معاد کے متعلق قرآن نے جو تصریحات پیش کی ہیں ان سب کے منکر تھے۔ مثلاً انسان کی مٹی دوبارہ اکٹھی کی جائے گی اور وہ نئی زندگی کا آغاز کرے گا اور رُوح اور جسم مشترکہ طور پر معاد کے حامل ہوں گے، وغیرہ، وہ ان عقائد کا انکار ہی نہیں کرتے تھے، بلکہ ان سے خائف بھی تھے۔ قرآن مجید نے مختلف بیانات کے ذریعہ ان عقائد کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور ان کا ثبوت پیش کیا ہے۔

---

[1] و [2] بلوغ الارب جلد ۲ صفحہ ۳۱۱۔

۳۷۔ اَهُمْ خَيْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ ۙ وَّالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ اَهْلَكْنٰهُمْ ۡ اِنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ○

۳۸۔ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ○

۳۹۔ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○

ترجمہ

۳۷۔ آیا وہ بہتر ہیں یا قوم تبع اور وہ لوگ جو ان سے پہلے تھے؟ ہم نے ان سب کو ہلاک کر ڈالا کیونکہ وہ مجرم لوگ تھے۔

۳۸۔ ہم نے آسمانوں کو اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، سب کو بے مقصد پیدا نہیں کیا۔

۳۹۔ ہم نے ان دونوں کو صرف حق کے ساتھ پیدا کیا ہے، لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔

تفسیر

آیا وہ بہتر ہیں یا قوم "تبع"؟

سرزمین یمن جزیرۃ العرب میں واقع ہے اور اس کا شمار دنیا کی ایسی آباد اور بابرکت زمینوں میں ہوتا ہے، جو ماضی میں

درخشندہ تمدن کی حامل تھیں۔ اس سرزمین پر ایسے بادشاہ حکومت کیا کرتے تھے جن کا نام "تبع" (جس کی جمع "تبابعہ" ہے) تھا۔ چونکہ لوگ ان کی "اتباع" کیا کرتے تھے، اس لیے ان کو "تبع" کہتے تھے یا پھر اس لیے کہ وہ کئی پشتوں تک یکے بعد دیگرے برسر اقتدار آتے رہے۔

بہرحال، تبع کی قوم ایسے افراد پر مشتمل تھی جن کے پاس بے پناہ طاقت تھی اور جو وسیع و عریض مملکت کی مالک تھی۔

مشرکین مکہ اور ان کے معاد و قیامت کے انکار کے تذکرے کے بعد "قوم تبع" کی داستان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھیں تنبیہ کی جارہی ہے کہ خدا کا عذاب قیامت ہی میں ان کا منتظر نہیں ہے بلکہ اس دنیا میں بھی "قوم تبع" جیسی کافر و گناہگار قوم جیسے انجام سے بھی دوچار ہوں گے۔

چنانچہ فرماتا ہے "آیا وہ بہتر ہیں یا قوم تبع اور وہ لوگ جو ان سے پہلے تھے؟ ہم نے ان سب کو ہلاک کر ڈالا۔ کیونکہ وہ مجرم لوگ تھے۔ (اھم خیر امقوم تبع والذین من قبلھم اھلکناھم انھم کانوا مجرمین)۔

ظاہر ہے کہ حجاز کے باشندے جو "قوم تبع" کے پڑوس میں رہتے تھے کہ کم و بیش ان کی سرگذشت سے بھی آگاہ تھے۔ اسی لیے آیت میں اس داستان کو تفصیل سے بیان نہیں کیا گیا۔ بس اتنا کہا گیا کہ اس بات سے ڈرو کہ کہیں تمہارا انجام بھی تبع کی قوم یا اس جیسی دوسری قوموں کا سا نہ ہو جو تمہارے اردگرد شام و مصر کے رستوں میں تمہارے نزدیک رہتی تھی۔

بالفرض اگر تم قیامت کے منکر ہو بھی جاؤ تو کیا اس عذاب کا انکار کر سکتے ہو جو ان مجرم اور سرکش قوموں پر نازل ہوا؟

"الذین من قبلھم" سے مراد قوم نوح، عاد اور ثمود جیسی قومیں ہیں۔

اور "قوم تبع" کے بارے میں انشاء اللہ تفصیلی گفتگو بعد میں آئے گی۔

گفتگو کا رُخ ایک بار پھر مسئلہ معاد کی جانب موڑ دیا گیا ہے اور لطیف پیرائے میں اس حقیقت کو استدلال کے ساتھ ثابت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے: ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، غرض سب کو بے فائدہ اور بے مقصد پیدا نہیں کیا (وما خلقنا السماوات والارض وما بینھما لاعبین)۔[1]

یقیناً اس عظیم اور وسیع تخلیق کا کوئی مقصد ضرور ہے، اگر تمہارے بقول موت، زندگی کے خاتمے کا نام ہے اور چند روز تک کھانے، پینے، سونے، لذتیں اٹھانے اور حیوانی خواہشات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے بعد یہ دنیا و زندگی فنا ہو جائے گی اور تمام چیزوں کا خاتمہ ہو جائے گا، پھر تو یہ آفرینش بے کار بیہودہ اور بے فائدہ ہوگی۔

لیکن یہ ماننے والی بات نہیں ہے کہ صاحب قدرت و حکمت خدا نے اس قدر عظیم کائنات کو صرف اس چند روزہ اور

---

[1] "لاعب" "لعب" کے مادہ سے ہے اور راغب کے بقول اس عمل کو کہتے ہیں جو کسی صحیح ارادہ کے بغیر انجام پائے اور ساتھ ہی یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ "ما بینھما" میں تثنیہ کی ضمیر آسمان اور زمین کی وجہ سے ہے۔

زود گزر زندگی کے لیے بے مقصد اور طرح طرح کے رنج وغم اور دکھ درد کے ہمراہ تخلیق کیا ہو۔ یہ بات خدا کی حکمت کے چنداں شایانِ شان نہیں۔

بنا بریں اس کائنات کا وضعی مشاہدہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ کائنات ایک اور عظیم تر اور ابدی ودائمی کائنات کے لیے ایک دالان کی حیثیت رکھتی ہے۔ تم اس بارے میں غور وفکر سے کام کیوں نہیں لیتے۔

اس حقیقت کو قرآن مجید نے کئی مقامات پر بیان کیا ہے۔ مثلاً سورۂ انبیاء آیت ۱۶ میں فرمایا گیا ہے:

" وما خلقنا السماء والارض وما بینھما لاعبین "

سورۂ واقعہ کی آیت ۶۲ میں ہے:

" ولقد علمتم النشأۃ الاولیٰ فلولا تذکرون "

" تم اپنی پہلی نشأۃ کو دیکھ چکے ہو پھر بھی نصیحت حاصل نہیں کرتے؟"

بہرحال اس دُنیا کی تخلیق اس وقت بامقصد ہوگی جب ایک اور کائنات اس کے بعد ہو، اس لیے تو الحادی مکتب فکر کے پیروکار اور معاد کے منکرین اس کائنات کی تخلیق کو بے مقصد اور بے فائدہ سمجھتے ہیں۔

پھر اس بات کی تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے: ہم نے ان دونوں کو صرف حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ (ما خلقنا ھما الا بالحق)۔

اس کائنات کا برحق ہونا اس بات کا متقاضی ہے کہ اس کا کوئی معقول ہدف اور مقصد ہو اور یہ مقصد اس وقت پُورا ہوتا ہے جب ایک اور جہاں کے وجُود کو تسلیم کیا جائے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ اس کا حق ہونا اس بات کا خواہاں ہے کہ نیک اور بدکار افراد یکساں نہ ہُوں۔

چونکہ ہم کو اس دُنیا میں بہت کم دیکھنے میں آتا ہے کہ نیکوکاروں کو جزا اور بدکاروں کو سزا صحیح معنی میں ملتی ہو، اسی لیے حق کا تقاضا یہی ہے کہ ایک اور جہاں میں حساب وکتاب اور سزا وجزا ہو تاکہ ہر شخص اپنے کیے کا پھل پالے۔

خلاصہ یہ کہ اس آیت میں "حق" ایک تو تخلیق کائنات کے بامقصد ہونے کی طرف اشارہ ہے، دوسرے انسانوں کی آزمائش کی طرف، تیسرے قانون ارتقاء کی طرف اور چوتھے اصول عدالت کے اجراء کی طرف۔

" لیکن ان میں سے اکثر لوگ ان حقائق کو نہیں جانتے۔ (ولکن اکثرھم لا یعلمون)۔

کیونکہ وہ اپنی سُوجھ بُوجھ اور سوچ سمجھ سے کام نہیں لیتے۔ اگر وہ ایسا کرنے لگ جائیں تو مبداء ومعاد کے دلائل واضح اور آشکار صُورت میں موجود ہیں۔

قوم تبّع کون تھی؟

قرآن مجید میں صرف دو مقامات پر "تبع" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ایک تو انہی آیات میں اور دوسرے سُورۂ "ق" کی

۱۴ویں آیت میں جہاں پر ارشاد ہوتا ہے:

" واصحاب الایکۃ وقوم تبع کل کذب الرسل فحق وعید "

" گھنے درختوں کی سرزمین والی قوم شعیب اور قوم تبع، ہر ایک نے خدا کے رسولوں کو جھٹلایا تو خدا کی تہدید بھی ان کے بارے میں سچ ثابت ہوگئی۔

جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے کہ "تبع" یمن کے بادشاہوں کا ایک عمومی لقب تھا، جس طرح ایران کے بادشاہوں کو کسریٰ ترک سلاطین کو خاقان، مصر کے بادشاہوں کو فرعون اور روم کے شہنشاہوں کو قیصر کہا جاتا تھا۔

یمن کے بادشاہوں کو "تبع" یا تو اس لیے کہا جاتا تھا کہ یہ لوگوں کو اپنی پیروی کی دعوت دیا کرتے تھے، یا پھر اس کے لیے کہ وہ یکے بعد دیگرے سریر آرائے مملکت ہوا کرتے تھے۔

بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید نے یمن کے تمام بادشاہوں کی بات نہیں کی، بلکہ کسی خاص بادشاہ کا ذکر کیا ہے (جیسا کہ حضرت موسیٰؑ کے معاصر خاص فرعون کی بات کی ہے)۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ اس کا نام "اسعد ابوکرب" تھا۔

بعض مفسرین کا یہ نظریہ ہے کہ وہ بذات خود حق طلب اور صاحب ایمان شخص تھا، انہوں نے قرآن مجید کی دونوں آیات سے استدلال کیا ہے، کیونکہ قرآن پاک کی مذکورہ دونوں آیات میں اس کی ذات کی مذمت نہیں کی گئی بلکہ اس کی قوم کی مذمت کی گئی ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کی جانے والی روایت بھی اسی بات کی شاہد ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔

" لا تسبوا تبعا فانہ قد اسلم "

" تبع کو برا بھلا مت کہو کیونکہ وہ ایمان لاچکا تھا۔" [1]

ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

" ان تبعا قال للاوس والخزرج کونوا ھاھنا حتی یخرج ھذا النبی، اما انا لو ادرکتہ لخدمتہ وخرجت معہ "

" تبع نے اوس اور خزرج سے کہا: تم یہیں پر رہ جاؤ! یہاں تک کہ اس پیغمبر کا ظہور ہو جائے، اگر مجھے ان کا زمانہ نصیب ہوجاتا تو میں ان کی پوری پوری خدمت کرتا، اور

---

[1] تفسیر مجمع البیان جلد ۹ صفحہ ۶۶ (اسی آیت کے ذیل میں) اسی سے ملتا جلتا مفہوم تفسیر درمنثور نے بھی نقل کیا ہے۔ اسی طرح تفسیر روح المعانی جلد ۲۵ صفحہ ۱۱۶ میں بھی بیان ہوا ہے۔

ان کے ساتھ قیام کرتا۔ [1]

ایک اور روایت میں ہے کہ جب "تبع" اپنے کشور کشائی کے ایک سفر میں مدینہ کے قریب پہنچا تو وہاں کے ساکن یہودی علماء کو پیغام بھیجا کہ اس سرزمین کو ویران کرنا چاہتا ہوں تاکہ کوئی بھی یہودی اس جگہ نہ رہنے پائے، اور عرب قانون حکم فرما ہو۔

یہودیوں کا سب سے بڑا عالم شامُول تھا۔ اس نے کہا: اے بادشاہ! یہ وہ شہر ہے جو حضرت اسماعیل کی نسل سے پیدا ہونے والے ایک پیغمبر کی ہجرت گاہ بنے گا۔ پھر اس نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چند صفات گنوائیں۔ تبع جس کے ذہن میں گویا اس بارے میں کچھ معلومات تھیں، نے کہا: تو پھر اس شہر کو ویران نہیں کروں گا۔ [2]

حتی کہ ایک اور روایت میں اسی داستان کے ذیل میں یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ اس نے "اوس" اور "خزرج" کے بعض قبائل کو جو اس کے ہمراہ تھے، حکم دیا کہ وہ اسی شہر میں رہ جائیں اور جب پیغمبر موعود ظہور کریں تو وہ ان کی امداد کریں اور اپنی اولاد کو بھی وہ اسی بات کی وصیت کرتا رہا۔ حتی کہ اس نے ایک خط بھی تحریر کر کے اس کے سپرد کر دیا، جس میں پیغمبر اسلامؐ پر ایمان لانے کا اظہار کیا گیا تھا۔ [3]

صاحب اعلام قرآن رقمطراز ہیں:

> "تبع" یمن کے عالمگیر بادشاہوں میں سے ایک تھا کہ جس نے ہندوستان تک فوج کشی کی اور اس علاقے کی تمام حکومتوں کو اپنے زیر نگیں کر لیا۔ اپنی فوج کشی کی ایک مہم کے دوران میں وہ مکۂ معظمہ پہنچا اور اس نے خانۂ کعبہ کے منہدم کرنے کا ارادہ کر لیا، لیکن وہ ایک ایسی بیماری میں مبتلا ہو گیا کہ طبیب اس کے معالجے سے عاجز آ گئے۔
>
> اس کے ہمرکابوں میں کچھ اہل علم بھی موجود تھے، جن کا سرپرست شامُول نامی ایک حکیم تھا، اس نے کہا: آپ کی بیماری کا اصل سبب خانۂ کعبہ کے بارے میں بُری نیت ہے۔
>
> "تبع" اپنے مقصد سے باز آ گیا اور نذر مانی کہ وہ خانۂ کعبہ کا احترام کرے گا اور صحت یاب ہونے کے بعد خانۂ کعبہ پر یمانی چادر کا غلاف چڑھائے گا۔

دوسری تاریخوں میں بھی خانۂ کعبہ پر غلاف چڑھانے کی داستان منقول ہے جو تواتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ یہ

---

[1] تفسیر مجمع البیان، انہی آیات کے ذیل میں۔

[2] تفسیر روح المعانی جلد ۲۵ صفحہ ۱۱۰۔

[3] تفسیر روح المعانی جلد ۲۵ صفحہ ۱۱۱۔

فوج کشی اور کعبہ پر غلاف چڑھانے کا مسئلہ ۱۰ھ عیسوی میں وقوع پذیر ہوا۔ اب بھی شہر مکہ میں ایک جگہ موجود ہے جس کا نام "دار التبابعۃ" ہے۔ [1]

بہر حال یمن کے بادشاہوں (تبابعہ یمن) کی داستان کا ایک بہت بڑا حصہ تاریخی لحاظ سے ابہام سے خالی نہیں ہے۔ کیونکہ ان کی تعداد اور انکی حکومت کے عرصہ کے بارے میں زیادہ معلومات مہیا نہیں ہیں۔ اس بارے میں بعض متضاد روایتیں بھی ملتی ہیں۔ جو کچھ اسلامی روایات میں ہے وہ تفسیری مواد ہو یا تاریخی اور حدیثی، صرف اسی بادشاہ کے بارے میں ہے، جس کا قرآن میں دو مرتبہ ذکر ہوا ہے۔

---

[1] (اعلام القرآن ص ۲۵۸ تا ص ۲۵۹ (تھوڑے سے اختصار کے ساتھ)

۴۰۔ اِنَّ یَوْمَ الْفَصْلِ مِیْقَاتُهُمْ اَجْمَعِیْنَ ۙ
۴۱۔ یَوْمَ لَا یُغْنِیْ مَوْلًی عَنْ مَّوْلًی شَیْئًا وَّلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ ۙ
۴۲۔ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ۧ

ترجمہ

۴۰۔ (باطل سے حق کی) جدائی کا دن ان سب کے لیے مقرر گھڑی ہے۔
۴۱۔ جس دن کوئی دوست اپنے دوست کی ذرہ بھر امداد نہیں کر سکے گا اور کسی طرف سے انہیں کمک نہ پہنچ سکے گی۔
۴۲۔ مگر جس پر خدا اپنی رحمت کرے، کیونکہ وہی عزیز و رحیم ہے۔

تفسیر

جدائی کا دن یا یوم الفصل

زیر نظر آیات درحقیقت معاد کے بارے میں گزشتہ آیات کا نتیجہ ہیں کہ جن میں اس کائنات کی تخلیق کی حکمت کے حوالے سے قیامت کے وجود پر استدلال کیا گیا تھا۔

سب سے پہلی آیت میں اس استدلال سے یہ نتیجہ حاصل کیا جا رہا ہے، کہ "یوم الفصل" یا جدائی کا دن ان سب کے لیے مقرر گھڑی ہے (ان یوم الفصل میقاتھم اجمعین)۔

قیامت کے دن کو "یوم الفصل" سے تعبیر کرنا کس قدر دلچسپ ہے کہ جس روز حق کو باطل سے جدا کر دیا جائے گا اور نیک لوگوں کی صفیں بدکاروں سے علیحدہ ہو جائیں گی، اور انسان اپنے نزدیک ترین دوستوں تک سے جدا ہو جائے گا۔ جی ہاں وہی دن تمام مجرمین کیلئے

مقرر شدہ ہے۔[1]

پھر اس جدائی کے دن کی کچھ تشریح کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس دن کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی فریاد کو نہیں پہنچے گا اور کوئی دوست اپنے دوست کی ذرہ بھر امداد نہیں کر سکے گا اور کہیں سے انہیں کمک نہیں پہنچے گی۔ (یوم لا یغنی مولیً عن مولیً شیئًا ولا ھم ینصرون)۔

یقیناً! وہی دن فصل اور جدائی کا دن ہوگا کہ جب انسان اپنے عمل کے سوا باقی تمام چیزوں سے جُدا ہو جائے گا۔ "مولیٰ" جس معنیٰ میں بھی ہو یعنی دوست ہو یا سرپرست، ولی نعمت ہو یا قریبی رشتہ دار، ہمسایہ ہو یا مددگار وغیرہ قیامت کی مشکلات میں ایک معمولی سی مشکل بھی حل کرنے سے عاجز ہوگا۔

"مولیٰ" "ولاء" کے مادہ سے ہے جس کا معنی دو چیزوں کا ایسا باہمی رابطہ ہے جن کے درمیان کوئی اجنبی نہ ہو۔ اس معنی کے کئی مصداق ہیں، جو لُغت کی کتابوں میں اس لفظ کے مختلف معانی کے طور پر ذکر ہُوئے ہیں، کیونکہ ان سب کی بنیاد اور اصل معانی مشترک ہیں۔[2]

وہاں پر نہ صرف دوست ایک دوسرے کی فریاد کو نہیں پہنچ سکیں گے اور رشتہ دار ایکدوسرے کی گرہ کشائی نہیں کر سکیں گے بلکہ تمام منصوبے نقش بر آب ثابت ہوں گے، تمام تدبیریں الٹی ہو جائیں گی اور تمام تیر نشانے سے چوک جائیں گے جیسا کہ سُورۂ طور کی آیت ۴۶ میں ہے۔

"یوم لا یغنی عنھم کیدھم شیئًا ولا ھم ینصرون"

"وہ دن ایسا ہوگا کہ جس میں ان کی تمام تدبیریں کسی مشکل کو حل نہیں کر پائیں گی اور ان کی کسی قسم کی مدد نہیں کی جا سکے گی۔"

"لا یغنی" اور "ولا ھم ینصرون" میں کیا فرق ہے؟ اس بارے میں بہترین قول یہ ہے کہ پہلا جُملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کوئی شخص اکیلا اور بذات خود اس دن کسی کی کوئی مشکل حل نہیں کر سکے گا اور دوسرا جُملہ اس بات کی

---

[1] "میقاتھم" کی ضمیر کا مرجع کیا ہے، اس بارے میں مفسرین نے کئی احتمال ذکر کیے ہیں۔ بعض مفسرین اسے تمام انسانوں کی طرف پلٹاتے ہیں۔ بعض مفسرین بالخصوص ان اقوام کی طرف جن کی طرف گذشتہ آیات میں اشارہ ہو چکا ہے۔ یعنی تبع کی قوم اور اس سے پہلے کی ظالم اقوام، لیکن پہلا معنی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

[2] لغت کی کتابوں میں "مولیٰ" کے بہت سے معانی ذکر ہُوئے ہیں، حتیٰ کہ بعض ارباب لغت نے اس کے ستائیس سے زیادہ معانی لکھے ہیں ۱۔ رب، ۲۔ چچا، ۳۔ چچازاد بھائی، ۴۔ بیٹا، ۵۔ بھانجا، ۶۔ آزاد کرنے والا، ۷۔ آزاد ہونے والا، ۸۔ بندہ، ۹۔ مالک، ۱۰۔ تابع، ۱۱۔ جس کو نعمت مل چکی ہو، ۱۲۔ شریک، ۱۳۔ ہم پیمان، ۱۴۔ دوست، ۱۵۔ ہمسایہ، ۱۶۔ مہمان، ۱۷۔ داماد، ۱۸۔ قریبی رشتہ دار، ۱۹۔ نعمت عطا کرنے والا، ۲۰۔ ضائع ہونے والا، ۲۱۔ سرپرست، ۲۲۔ زیادہ مناسب، ۲۳۔ آقا، ۲۴۔ دوست رکھنے والا، ۲۵۔ مددگار، ۲۶۔ اولیٰ بالتصرف، ۲۷۔ متولی۔ (الغدیر جلد ۱ ص ۳۶۲)

طرف اشارہ ہے کہ سب مل کر بھی ایک دوسرے کی مشکلات حل نہیں کر سکیں گے، کیونکہ نصرت کا اطلاق ایسے مقام پر ہوتا ہے جہاں کوئی شخص کسی دوسرے کی امداد کو پہنچے اور اس کی مدد کرے تاکہ دونوں مل کر مشکلات پر قابو پالیں۔

وہاں پر صرف ایک گروہ مستثنیٰ ہوگا، جیسا کہ بعد کی آیت میں فرمایا گیا ہے: مگر وہ کہ جس پر خدا نے رحمت کی ہو، کیونکہ خدا صاحبِ غلبہ اور رحیم ہے (الا من رحم اللہ انہ ھو العزیز الرحیم)۔

اس میں شک نہیں ہے کہ خدا کی یہ رحمت بلاشرط نہیں ہے، بلکہ صرف ان مومنین کے شاملِ حال ہوگی جو عملِ صالح انجام دے چکے ہیں اور اگر ان سے کوئی لغزش سرزد ہوئی بھی ہوگی تو بھی اس حد تک نہیں کہ ان کے خدا کے ساتھ رابطے کو منقطع کر دے۔ ایسے ہی لوگ لطفِ الٰہی کے دامان سے وابستہ ہوں گے۔ اس کے دریائے جود و کرم سے بہرہ ور، اس کے چشمۂ رحمت سے سیراب اور اس کے اولیاء کی شفاعت کے حق دار ہوں گے۔

یہیں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اس دن ہر قسم کے دوست، ولی اور یاور کی نفی مسئلہ شفاعت کے منافی نہیں ہے، کیونکہ شفاعت بھی اذن و فرمانِ رب العزت کے بغیر حاصل نہیں ہوگی۔

یہ بات بھی بڑی دلچسپ ہے کہ خدا کے "عزیز" اور "رحیم" ہونے کی صفات ایک دوسرے کے ساتھ ذکر ہوئی ہیں جن میں سے پہلی اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا بے انتہا قدرت کا مالک اور ناقابلِ شکست ہے اور دوسری اس کی بے پایاں رحمت کی طرف اشارہ ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ قدرت رکھنے کے باوجود رحمت کا مالک ہے۔

اہلِ بیتؑ اطہار سے منقول بعض روایات میں ہے کہ "الا من رحم اللہ" سے مراد وصی رسول امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام اور ان کے پیروکار ہیں۔ [1]

ظاہر ہے کہ ایسی روایات کا مقصد آیت کا ایک واضح مصداق بیان کرنا ہے۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ صفحہ ۶۲۹۔

۴۳۔ اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ۙ
۴۴۔ طَعَامُ الْاَثِیْمِ ۚ
۴۵۔ کَالْمُهْلِ ۚ یَغْلِیْ فِی الْبُطُوْنِ ۙ
۴۶۔ کَغَلْیِ الْحَمِیْمِ
۴۷۔ خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ اِلٰی سَوَآءِ الْجَحِیْمِ
۴۸۔ ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَاْسِهٖ مِنْ عَذَابِ الْحَمِیْمِ
۴۹۔ ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْكَرِیْمُ
۵۰۔ اِنَّ هٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ

ترجمہ

۴۳۔ تھوہر کا درخت ....
۴۴۔ گناہگاروں کی سزا ہے۔
۴۵۔ پگھلی ہوئی دھات کی طرح، پیٹ میں ابال کھائے گا۔
۴۶۔ جیسے کھولتا ہوا پانی۔
۴۷۔ اس مجرم کافر کو پکڑو اور دوزخ کے بیچ میں پھینک دو۔
۴۸۔ پھر اس کے سر پر کھولتا ہوا عذاب ڈالو۔

۴۹۔ (اس سے کہا جائے گا) مزا چکھ، کیونکہ تو (اپنے خیال کے مطابق) زبردست طاقت ور اور قابلِ احترام تھا۔

۵۰۔ یہ وہی چیز ہے، جس میں تم لوگ ہمیشہ شک کیا کرتے تھے۔

تفسیر

تھوہر کا درخت

گذشتہ آیات میں "یوم الفصل" یا جدائی کے دن کی بابت بات ہو رہی تھی، لیکن ان آیات میں دوزخیوں کے وحشت ناک اور لرزا دینے والے عذاب کی ایک جھلک پیش کی جا رہی ہے جو درحقیقت گذشتہ آیات کا تتمہ ہے۔

ارشاد ہوتا ہے، تھوہر کا درخت۔ (ان شجرت الزقوم)۔

گناہگاروں کی سزا ہے۔ (طعام الاثیم)۔

یہی لوگ ہوں گے جو اس کڑوے بدمزہ بدبودار اور مہلک درخت کو کھائیں گے۔

جیسا کہ ہم سورۂ صافات کی آیت ۶۲ کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں کہ مفسرین اور ارباب لغت کے بقول "زقوم" ایک ایسے پودے کا نام ہے جو کڑوا، بدمزہ اور بدبودار ہوتا ہے، جس کے پتے چھوٹے ہوتے ہیں اور جزیرۃ العرب کی سرزمین "تہامہ" میں پیدا ہوتا ہے اور جس سے مشرکین بھی آشنا تھے۔ یہ ایک ایسا پودا ہے جس کا شیرہ کڑوا ہوتا ہے۔ اگر یہ شیرہ بدن کو لگ جائے تو بدن سوج جاتا ہے۔[1]

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ "زقوم" کا اصلی معنی "نگلنا" ہے۔[2]

جبکہ بعض دوسرے لوگوں نے اسے جہنمیوں کی ہر قسم کی نفرت انگیز غذا کے معنی میں لیا ہے۔[3]

ایک روایت میں ہے کہ جب یہ لفظ قرآن مجید میں نازل ہوا تو کفارِ قریش کہنے لگے، اس قسم کا پودا ہمارے ملک میں پیدا نہیں ہوتا، تم میں سے کس شخص کو "زقوم" کے معنی کا علم ہے؟ تو وہاں پر ایک افریقی شخص بھی موجود تھا، اس نے

---

[1] تفسیر مجمع البیان، تفسیر روح البیان اور تفسیر روح المعانی۔

[2] لسان العرب مادہ "زقم"۔

[3] مفردات راغب مادہ "زقم"۔

کہا" ہماری زبان میں "زقوم" کا معنی "کھجور اور مکھن ہے" (شاید اس کا مقصد بھی مذاق اڑانا تھا) جب ابوجہل نے یہ بات سُنی تو اس نے استہزاء کے طور پر اپنی کنیز کو بلا کر کہا: "تھوڑا سا مکھن اور خرما لے آؤ تاکہ اس سے زقوم بنائیں"۔ چنانچہ "زقوم" تیار کیا گیا اور وہ کھاتے بھی جاتے تھے اور مذاق بھی اڑاتے جاتے تھے اور کہتے تھے "محمد ہمیں اسی چیز سے ڈراتا ہے"۔[1]

ساتھ ہی یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ لغت عرب اور قرآنی استعمال میں "شجرہ" کا لفظ کہیں پر تو "درخت" کے معنی میں آیا ہے اور کہیں پر مطلق "پودے" کے معنی میں۔

"اثیم" "اثم" کے مادہ سے ہے، جس کا معنی "ایسا شخص جو ہمیشہ گناہوں میں غرق رہتا ہے" یہاں پر ہٹ دھرم، حد سے تجاوز کرنے والے اور گناہوں میں غرق کفار مراد ہیں۔

پھر فرمایا گیا ہے: پگھلی ہوئی دھات کی طرح وہ گنا ہگاروں کے پیٹ میں ابال کھائے گا۔ (کالمھل یغلی فی البطون)۔

جیسے کھولتا ہوا پانی۔ (کغلی الحمیم)۔

بہت سے مفسرین اور ارباب لغت کے بقول "مھل" کے معنی پگھلی ہوئی دھات ہے اور مفردات میں راغب نے اور بعض دوسرے صاحبان لغت نے اس کا معنی "گھی یا تیل کی تلچھٹ" بتایا ہے، جو نہایت ہی ناپسندیدہ چیز ہوتی ہے لیکن اس کا پہلا معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

"حمیم" کے معنی "کھولتا ہوا گرم پانی" ہے اور کبھی اس کا اطلاق گہرے اور پکے دوست پر بھی ہوتا ہے، لیکن یہاں پر پہلا معنی مراد ہے۔

بہر حال جب تھوہر ان کے جسم میں پہنچے گا تو انتہائی زیادہ حرارت پیدا کر کے کھولتے ہوئے پانی کے مانند پیٹ میں ابال پیدا کر دے گا، یہ غذا قوت اور طاقت کا ذریعہ بننے کے بجائے مصیبت، عذاب اور دکھ درد کا سبب بن جائے گی۔

پھر فرمایا گیا ہے کہ دوزخ پر مامور فرشتوں کو خطاب ہوگا: گناہوں میں غرق ان مجرموں کو پکڑو اور انہیں جہنم میں پھینک دو۔ (خذوہ فاعتلوہ الی سواء الجحیم)۔

"فاعتلوہ" "عتل" (بروزن "قتل") کے مادہ سے ہے، جس کا معنی پکڑنا، گھسیٹنا اور پھینکنا ہے۔ جیسا برتاؤ قانون کی خلاف ورزی کرنے والے سرکش مجرمین کے ساتھ سرکاری کارندے کرتے ہیں۔

"سواء" کا معنی "درمیان" ہے، کیونکہ اس کا فاصلہ ہر طرف سے مساوی ہوتا ہے۔ ایسے افراد کو جہنم کے درمیان میں لے جانے کا مقصد یہ ہوگا کہ وہاں کی حرارت نسبتاً زیادہ شدید ہوگی اور آگ کے شعلے اسے ہر طرف سے گھیرے ہوں گے۔

پھر ان کی ایک اور المناک سزا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: پھر دوزخ پر مامور فرشتوں کو حکم دیا

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۸ صفحہ ۵۵۲۹ (سورۂ صافات کی ۶۲ ویں آیت کے ذیل میں)

جائے گا: اس کے سر پر کھولتا ہوا عذاب ڈالو (ثم صبوا فوق رأسه من عذاب الحميم)۔[1]

اس طرح سے ایک تو وہ اندر سے جلیں گے اور دوسرے باہر سے جہنم کی آگ ان کے تمام وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی اور آگ کے درمیان میں بھی ان پر کھولتا ہوا پانی ڈالا جائے گا۔

اسی سے ملتی جلتی ایک اور آیت سورۂ حج میں بھی بیان ہوئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

"يصب من فوق رؤوسهم الحميم" (حج، ۱۹)

ان تمام دردناک جسمانی عذابوں کے بعد انھیں جانکاہ روحانی سزاؤں سے بھی دوچار ہونا پڑے گا۔ ارشاد ہوتا ہے، کہ اس گناہگار سرکش اور بے ایمان مجرم سے کہا جائے گا: مزہ چکھ! کیونکہ تو وہی شخص تو ہے جو بزعم خویش سب سے زیادہ طاقتور اور سب سے زیادہ قابل احترام تھا۔ (ذق انك انت العزيز الكريم)۔

تو ہی تو تھا جس نے بینوا مظلوموں کو زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا، اُن پر ظلم وستم کیا کرتا تھا۔ اپنی ناقابل تسخیر طاقت کا لوہا منوانے کے درپے تھا اور لوگوں سے اپنا بہت زیادہ احترام کرواتا تھا۔

جی ہاں! یہ تو ہی تھا کہ اس تمام غرور کے ساتھ ہر قسم کے جرم کا ارتکاب کیا کرتا تھا۔ اب تو اپنے تمام اعمال کا مزہ چکھ کہ سب کچھ تیری آنکھوں کے سامنے مجسم ہو چکا ہے۔ جس طرح تو دنیا میں لوگوں کے جسم و روح کو جلایا کرتا تھا اب تو خود اندر اور باہر سے خدا کے قہر کی آگ اور کھولتے ہوئے گرم پانی میں جل رہا ہے۔

روایت میں ہے کہ ایک دن رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوجہل کا ہاتھ پکڑ کر کہا:

"اولى لك فاولى"

"ابوجہل! انتظار کرو، انتظار"

یہ سُن کر ابوجہل ناراض ہو گیا اور اپنا ہاتھ چھڑا کر کہنے لگا:

"بای شیء تهددنی؟ مالستطیع انت وصاحبك ان تفعلا بی شیئاً!
انی لمن اعز هذا الوادی واکرمه"

"مجھے کس بات کی دھمکی دے رہے ہو؟ نہ تو تم میرا کچھ بگاڑ سکتے ہو اور نہ ہی تمہارا صاحب (خدا) میرا کچھ بگاڑ سکتا ہے۔ میں مکہ کی تمام دھرتی میں سب سے زیادہ طاقت ور اور صاحب احترام شخصیت ہوں"

مندرجہ بالا آیت اسی چیز کو بیان کر رہی ہے۔ آیت کہتی ہے کہ جب اسے آتش جہنم میں ڈالا جائے گا تو اسے کہا جائے گا: اے طاقت ور سرزمین مکہ کے معزز انسان! اس عذاب کا مزہ چکھ۔[2]

---

[1] "عذاب الحمیم" اضافت بیانیہ ہے یعنی یہ کھولتا ہوا گرم پانی ایک عذاب ہے جو ان پر ڈالا جائے گا۔

[2] تفسیر مراغی جلد ۲۵ صفحہ ۱۲۵ (اسی آیت کے ذیل) تفسیر روح المعانی اور تفسیر کبیر فخر الدین رازی۔

اس سلسلے کی آخری آیت میں فرمایا گیا ہے: انہیں خطاب ہوگا: یہ وہی چیز ہے، جس کے بارے میں تم لوگ ہمیشہ شک وشبہ کیا کرتے تھے۔ (انّ ھذا ما کنتم بہ تمترون)۔

قرآن کی کس قدر آیات میں مختلف دلائل کے ذریعے اس دن کی حقانیت تمہارے گوش گزار کی گئی؟ آیا ہم نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ تم قیامت کا ثبوت عالم نباتات میں دیکھو کیونکہ "کذالک الخروج" قیامت کے دن تم بھی اسی طرح زندہ کیے جاؤ گے۔ (ق - ۱۱)

آیا تمہیں نہیں کہا تھا کہ جس طرح بارش مردہ زمینوں کو زندہ کرتی ہے تمہارا حشر ونشر بھی اسی طرح آسان ہے "کذالک النشور" (فاطر-۹)

کیا تمہیں نہیں بتایا گیا تھا کہ مُردوں کو زندہ کرنا خدا کے لیے بہت آسان ہے" وذالک علی اللہ یسیر۔" (تغابن - ۷)

کیا تمہیں نہیں کہا گیا تھا کہ آیا پہلی تخلیق ہمارے لیے مُشکل تھی کہ تم قیامت کے بارے میں شک کرتے ہو؟" افعیینا بالخلق الاوّل" (ق - ۱۵)

خلاصہ کلام مختلف طریقوں سے حقیقت تم سے بیان کر دی گئی تھی، لیکن افسوس کہ تمہارے پاس سننے والے کان نہیں تھے۔

جسمانی اور رُوحانی سزائیں

ہم جانتے ہیں کہ قرآنی تصریحات کے مطابق معاد دو پہلوؤں کی حامل ہے، ایک جسمانی اور دوسرے روحانی۔ یہ ایک فطری امر ہے کہ سزا اور جزا بھی دونوں پہلوؤں پر مشتمل ہو، لہٰذا آیات وروایات میں ان دونوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ عوام الناس کی زیادہ توجہ جسمانی پہلو کی طرف ہوتی ہے لہٰذا زیادہ تر وضاحت اور تشریح بھی جسمانی سزا اور جزا کی گئی ہے۔ لیکن روحانی سزا اور جزا کی طرف بھی کم اشارات نہیں ہیں۔

اسی بات کا ایک واضح نمونہ ہم نے مندرجہ بالا آیات میں دیکھ لیا ہے کہ جن میں کچھ دردناک جسمانی سزاؤں کو بیان کرنے کے بعد متکبر اور سرکش ظالموں کو رُوحانی سزاؤں کی طرف معنی خیز اشارے ملتے ہیں۔

قرآن مجید کی دوسری آیات میں بھی رُوحانی جزاؤں کے بارے میں اشارے ملتے ہیں سُورہ توبہ کی آیت ۷۲، میں فرمایا گیا ہے:

"ورضوان من اللہ اکبر۔"

"خدا کی خوشنودی اور رضامندی تمام جزاؤں سے برتر ہے۔"

سُورہ یٰس آیت ۵۸ میں فرمایا گیا ہے:

"سلام قولاً من ربّ رحیم۔"

"ان کے لیے سلام و مبارک بادی ہے رحیم اور مہربان خدا کی جانب سے"۔

سورۂ حجر کی ۴۷ ویں آیت میں ہے:

"ونزعنا ما فی صدورھم من غلّ اخوانًا علی سرر متقابلین"۔

"ہم ان کے دلوں سے ہر قسم کا حسد، کینہ اور دشمنی نکال دیں گے، سب بھائی بھائی ہوں گے اور تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے براجمان ہوں گے"۔

صاف ظاہر ہے کہ وہاں کی روحانی لذتیں بھی وسیع اور بے انتہا ہوں گی کہ جن کی تعریف و توصیف نہیں کی جا سکتی۔ اسی لیے قرآنی آیات میں بھی عام طور پر صرف اشاروں اشاروں سے کام لیا گیا ہے لیکن روحانی سزاؤں کو حقارت ڈانٹ ڈپٹ، سرزنش، افسوس اور رنج و غم کی صورت میں منعکس کیا گیا ہے کہ جن کا ایک نمونہ مندرجہ بالا آیات میں آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

۵۱۔ اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ مَقَامٍ اَمِیْنٍ ۙ
۵۲۔ فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ ۚ
۵۳۔ یَّلْبَسُوْنَ مِنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ ۚ
۵۴۔ كَذٰلِكَ ۗ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِیْنٍ ؕ
۵۵۔ یَدْعُوْنَ فِیْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِیْنَ ۙ
۵۶۔ لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰی ۚ وَوَقٰىهُمْ عَذَابَ الْجَحِیْمِ ۙ
۵۷۔ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۚ

ترجمہ

۵۱۔ پرہیزگار لوگ امن وامان کی جگہ میں ہوں گے۔
۵۲۔ باغوں اور چشموں میں۔
۵۳۔ ریشم کی نازک اور دبیز پوشاکیں پہنیں گے۔ اور ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔
۵۴۔ اسی طرح ہیں بہشت والے، اور ہم ان کی حورالعین کے ساتھ تزویج کریں گے۔
۵۵۔ وہ جس قسم کے پھل چاہیں گے انھیں دیئے جائیں گے۔ وہاں پر نہایت اطمینان

سے رہیں گے۔

۵۶۔ وہاں پہلی دفعہ کی موت کے سوا (جس کی دنیا میں تلخی چکھ چکے ہیں) ان کو موت کی تلخی چکھنی نہ پڑے گی، اور خدا انھیں دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھے گا۔

۵۷۔ یہ تمھارے پروردگار کا فضل اور اس کی بخشش ہے، یہی تو بہت بڑی کامیابی ہے۔

تفسیر

پرہیزگار لوگ اور بہشت کی گوناگون نعمتیں

چونکہ گذشتہ آیات میں جہنمیوں کے دردناک عذاب کا تذکرہ تھا، لہٰذا ان آیات میں اہل بہشت کی نعمتوں اور جزا کو شمار کرکے ان ہر دو کی اہمیت کو زیادہ آشکار کیا گیا ہے۔

اہل بہشت کی جزا کو سات قسموں میں خلاصہ کیا گیا ہے:

پہلی یہ کہ "پرہیزگار لوگ امن وامان کی جگہ میں ہوں گے" (ان المتقین فی مقام امین)[1]

اسی لیے انھیں کسی تکلیف اور بے چینی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ وہ آفات وبلیات، رنج وغم اور شیطانوں اور طاغوتوں سے بالکل محفوظ ہوں گے۔

پھر دوسری نعمت کو بیان کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: وہ باغوں اور چشموں میں رہیں گے اور ان کی قیام گاہوں کو ہر طرف سے چشموں اور باغوں نے اپنے گھیرے میں لیا ہوگا۔ (فی جنات وعیون)۔

"جنات" (گھنے باغات) کی تعبیر شاید باغوں کی مختلف تعداد کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ بہشت کے سب باغات یکساں نہیں ہیں، بلکہ بہشتیوں کے مختلف درجات کی وجہ سے باغات بھی مختلف ہوں گے۔

تیسرے مرحلے پر ان کے زیبا اور خوبصورت لباس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ نرم ونازک اور ضخیم

---

[1] یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ "امین" کو مقام اور جگہ کی صفت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے، گویا بہشت والوں کا خود مقام امین ہوگا اور ان سے کسی قسم کی خیانت کا اظہار نہیں کرے گا۔ اس قسم کی تعبیرات عام طور پر تاکید اور مبالغے کے لیے آتی ہیں۔

دبیز ریشمی لباس زیب تن کریں گے اور تختوں پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھیں گے۔ (یلبسون من سندس واستبرق متقابلین)۔

"سندس" ریشم کے نرم و نازک اور لطیف کپڑے کو کہتے ہیں۔ بعض نے اس کے ساتھ زربافت کی قید بھی لگائی ہے۔ یعنی زربافت نرم و نازک ریشمی کپڑا۔

"استبرق" ریشم کے ضخیم اور دبیز کپڑے کو کہتے ہیں۔ بعض اہل لغت اسے "استبر" یا "ستبر" (بمعنی ضخیم) فارسی کلمہ کا معرب سمجھتے ہیں۔ یہ احتمال بھی ہے کہ اسے عربی کا کلمہ "برق" (چمک دمک) سے لیا گیا ہو بوجہ اس خاص چمک دمک کے جو اس قسم کے کپڑوں میں ہوتی ہے۔

البتہ بہشت میں نہ تو سخت سردی ہوگی اور نہ ہی سخت گرمی کہ جسے اس قسم کے لباس کے ذریعے روکا جائے، بلکہ یہ بہشت والوں کے گوناگوں اور طرح طرح لباسوں کی طرف اشارہ ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ہمارے الفاظ و کلمات جو دُنیا میں ہماری روزمرہ کی حاجات پورا کرنے کے لیے وضع کیے گئے ہیں اس عظیم اور مکمل جہان کے مسائل بیان کرنے پر قادر نہیں ہیں بلکہ صرف ان کی طرف ایک اشارہ ہو سکتے ہیں۔

بعض علماء نے لباس کے مختلف ہونے کو اہل بہشت کے مقام قرب کے تفاوت کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔

یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ بہشت والوں کا ایک دوسرے کے رُوبرُو بیٹھنا اور ان کے درمیان ہر قسم کے امتیاز اور برتری کی نفی اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کی باہمی نشستوں میں انس و محبت اور اخوت اور بھائی چارے کی رُوح حکم فرما ہوگی اور اس فضا میں صدق و صفا اور روحانیت کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔

چوتھے مرحلے میں ان کی ازواج کا ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جی ہاں! اسی طرح ہیں اہل بہشت اور ہم انکی حورالعین کے ساتھ تزویج کر دیں گے۔ (کذالك وزوجناهم بحور عین)۔

"حور" جمع ہے "حوراء" اور "احور" کی جس کا معنی ہے، اس کی آنکھوں کی سیاہی مکمل طور پر سیاہ اور سفیدی مکمل طور پر شفاف ہے۔

"عین" (بروزن "چین") "اعین" اور "عیناء" کی جمع ہے، جس کا معنیٰ ہے موٹی آنکھ۔ چونکہ انسان کی خوبصورتی سب سے زیادہ اس کی آنکھوں میں ہوتی ہے، اسی لیے یہاں پر حورالعین کی خوبصورت آنکھوں کی تعریف کی گئی ہے۔ البتہ قرآن کی دوسری آیات میں اس کی دوسری خوبصورتیوں کو بھی خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

اس کے بعد اہل بہشت کی پانچویں نعمت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ جس قسم کے پھل چاہیں گے انھیں دیئے جائیں گے اور وہ وہاں پر نہایت ہی اطمینان سے رہیں گے۔ (یدعون فیها بکل فاکهة امنین)۔

حتی کہ دُنیا میں پھلوں سے استفادہ کرنے کے لیے جو مشکلات درپیش ہوتی ہیں ان کے لیے وہ بھی نہیں ہوں گی۔ تمام پھل ان کے نزدیک اور ان کی دسترس میں ہوں گے۔ لہٰذا اونچے اونچے درختوں سے پھل چننے کی زحمت بھی انھیں گوارا نہیں کرنا پڑے گی، کیونکہ "قطوفها دانیة" (حاقة۔ ۲۳)

جو پھل وہ چاہیں گے ان کا انتخاب بھی خود کریں گے۔" وفاکھة مما یتخیرون" (واقعہ۔۲۰)

وہ بیماری اور تکلیف جو بعض اوقات دُنیا میں پھل کھانے کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے، وہاں پر نہیں ہوگی اور نہ ہی ان میووں کے خراب ہونے، کمیاب ہونے اور ختم ہونے کا خطرہ ہوگا۔ غرض ہر لحاظ سے وہ مطمئن ہوں گے۔

بہر حال اگر جہنمیوں کی غذا "زقوم" ہوگی جو ان کے پیٹ میں کھولتے ہُوئے پانی کی طرح اُبال پیدا کر دے گی تو بہشتیوں کی غذا لذیذ پھل ہوں گے جو ہر قسم کی تکلیف سے مُبرا ہوں گے۔

بہشت اور بہشتی نعمتوں کا دوام اور ہمیشگی، متقین کے لیے خدا کی چھٹی نعمت ہوگی کیونکہ "وصال" کے وقت جو چیز انسان کو بے چین کر دیتی ہے وہ "فراق" کا اندیشہ ہے۔ اسی لیے خدا تعالیٰ فرماتا ہے: وہاں پہلی دفعہ کی موت کے سوا جس کی تلخی وہ دُنیا میں چکھ چکے ہوں گے انہیں موت کی تلخی نہیں چکھنی پڑے (لا یذوقون فیھا الموت الا الموتة الاولیٰ)۔

یہ بات بڑی دل چسپ ہے کہ قرآن مجید نے بہشت کی نعمتوں کے جاودانی ہونے کو مختلف تعبیرات کے ساتھ بیان کیا ہے، کہیں پر فرماتا ہے:

"خالدین فیھا"

"وہ بہشت کے باغوں میں ہمیشہ رہیں گے"۔ [1]

کبھی فرماتا ہے:

"عطاءً غیر مجذوذ"

"یہ ایسی عطا ہے جو کبھی منقطع نہیں ہوگی"۔ (ھود، ۱۰۸)

یہاں پر "الموتة الاولیٰ" (پہلی موت) کیوں کہا گیا ہے؟ اس بارے میں ایک تفصیلی گفتگو ہے، جو بعد میں بیان ہوگی۔

آخر میں اس سلسلے کی ساتویں اور آخری نعمت کو بیان کرتے ہُوئے فرمایا گیا ہے: اور خدا انھیں دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھے گا۔ (ووقاھم عذاب الجحیم)۔

ان نعمتوں کی تکمیل اس بات سے ہو رہی ہے کہ عذاب کا احتمال اور سزا کا خوف بہشت والوں کو پریشان نہیں کرے گا۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر پرہیزگاروں میں کسی قسم کی لغزش بھی ہوگی تو خداوند عالم اپنے لطف و کرم سے انہیں معاف کر دے گا اور انھیں اطمینان دلائے گا کہ وہ اس لحاظ سے پریشان نہ ہوں۔ بالفاظ دیگر معصومین کے علاوہ سب لوگ کسی نہ کسی لغزش کے مرتکب ضرور ہوتے ہیں۔ اگر خدا کی رحمت اور مغفرت ان کے شاملِ حال نہ ہو تو انھیں ہمیشہ

---

[1] اس قسم کی تعبیرات قرآن مجید کی بہت سی آیات میں آئی ہے، منجملہ ان کے سورۂ آلِ عمران کی آیات ۱۵ اور ۱۳۶، سورۂ نساء کی آیت ۱۲۲ اور سورۂ مائدہ کی آیت ۸۵ وغیرہ بھی ہیں۔

یہ خطرہ لاحق رہتا۔ لہٰذا یہ آیت انہیں اطمینان دلا رہی ہے۔

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ بعض مومنین اپنے گناہوں کی وجہ سے ایک عرصے تک جہنم میں رہیں گے، پھر وہ پاک ہو کر داخل بہشت ہوں گے، تو کیا مندرجہ بالا آیت کا اطلاق ان پر بھی ہوگا؟

جواباً گزارش ہے کہ مندرجہ بالا آیت بلند پایہ پرہیزگاروں کی بات کر رہی ہے جو ابتداء ہی میں بہشت میں داخل ہونگے اور دوسرے افراد کے بارے میں یہ آیت خاموش ہے۔

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ ایسے لوگ بھی بہشت میں داخل ہونے کے بعد جہنم کی طرف واپس جانے کے خوف سے بے نیاز ہو جائیں گے اور بالکل امن و سکون سے زندگی بسر کریں گے۔ یعنی مذکورہ آیت ان کی بہشت میں داخل ہونے کے بعد کی تصویر کشی بھی کر رہی ہے۔

اسی سلسلے کی آخری آیت میں مذکورہ ساتوں صفات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نتیجہ کے طور پر فرمایا گیا ہے: یہ سب تمہارے پروردگار کا فضل اور اس کی بخشش ہے اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے، جو پرہیزگاروں کے شامل حال ہے۔ (فضلاً من ربك ذالك هو الفوز العظيم)[1]

یہ ٹھیک ہے کہ پرہیزگاروں نے دنیا میں بہت زیادہ نیکیاں اور کارِ خیر انجام دیئے ہوں گے، لیکن ان ناچیز اعمال کی جزاء اس قدر بے انتہا اور جاودانی نعمتیں نہیں ہیں۔ یہ تو خدا کا فضل و کرم ہے جس کی وجہ سے انھیں یہ عظیم نعمتیں میسر آئیں گی۔

اس کے علاوہ اگر دنیا میں خدا کا فضل و کرم ان کے شامل حال نہ ہوتا تو وہ اس حد تک نیک اعمال انجام نہ دے سکتے۔ خدا نے انھیں عقل و دانش عطا کی، انبیاء اور آسمانی کتابیں بھیجیں اور ہدایت اور عمل کی توفیق ان کے شامل حال کی۔

جی ہاں! خداوندِ عالم کی اس قدر عظیم توفیقات سے بہرہ مند ہونا اور اس حد تک جزائے الٰہی تک پہنچنا ان توفیقات کے پرتو میں ہی "فوز عظیم" اور بہت بڑی کامیابی ہے، جو اس کے لطف و کرم کے سایہ ہی میں حاصل ہوتی ہے۔

"پہلی موت" کیا ہے؟

ہم نے مندرجہ بالا آیات میں پڑھا ہے کہ بہشتی لوگ پہلی موت کے علاوہ کسی اور موت کا ذائقہ نہیں چکھیں گے۔ اس سلسلے میں تین سوال پیدا ہوتے ہیں۔

پہلا یہ کہ "موتة اولیٰ" یا پہلی موت سے کیا مراد ہے؟ اگر اس سے مراد وہ موت ہے جو زندگی کے خاتمہ کا سبب

---

[1] "فضلاً" کے اعراب کے بارے میں کئی احتمال ہیں۔ ایک تو یہ کہ فعل محذوف "فضلهم فضلاً" کا مفعول مطلق ہے۔ دوسرے یہ کہ "مفعول لہٗ" واقع ہو رہا ہے اور تیسرے حال واقع ہو رہا ہے۔

بنتی ہے تو پھر یہ کیوں کہتا ہے کہ "اہل بہشت پہلی موت کے علاوہ کسی اور موت کا ذائقہ نہیں چکھیں گے" جبکہ وہ تو اس سے پہلے یہ ذائقہ چکھ چکے ہیں۔ (یہاں پر فعل ماضی استعمال ہونا چاہیئے تھا نہ کہ فعل مضارع)۔

تو اس سوال کے جواب میں بعض مفسرین نے "الا الموتۃ الاولیٰ" میں "الا" کو "بعد" کے معنی میں لیا ہے۔ ان کے بقول آیت کا معنی یوں ہوگا: "اس پہلی موت کے بعد کسی اور موت کا ذائقہ نہیں چکھیں گے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں پر ایک جملہ مقدر ہے جو یہ ہے:

"الا الموتۃ الاولی التی ذاقوھا"

"سوائے پہلی موت کے جو پہلے سے چکھ چکے ہیں"۔ [1]

دوسرا سوال یہ ہے کہ یہاں پر صرف پہلی موت کا تذکرہ کیوں ہوا ہے حالانکہ ہم سب کو معلوم ہے کہ ہر انسان نے دو موتوں کا مزہ چکھنا ہوتا ہے، ایک موت دنیاوی زندگی کے خاتمے پر اور دوسری برزخ کی زندگی کے اختتام پر۔

اس سوال کے کئی جوابات دیئے گئے ہیں، جن میں سے کوئی بھی قابل قبول نہیں ہے، لہٰذا ہم بھی انہیں یہاں پر لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ بہتر یہی ہے کہ یہ کہا جائے کہ برزخ کی زندگی اور موت معمول کی زندگی اور موت سے کسی بھی طرح مشابہ نہیں ہے بلکہ معاد جسمانی کے بموجب قیامت کی زندگی دنیاوی زندگی کے ساتھ کئی جہات سے مماثلت رکھتی ہے البتہ بلند اور بالا سطح پر۔ اسی لیے اہل بہشت سے کہا جائے گا کہ جو موت تم دنیا میں پا چکے ہو، وہی کافی ہے۔ اب تمہیں موت نہیں آئے گی اور چونکہ برزخ کی موت اور زندگی اس کے ساتھ مشابہت نہیں رکھتی لہٰذا اس کا ذکر ہی نہیں ہوا۔ [2]

تیسرا سوال یہ ہے کہ قیامت میں موت کا نہ ہونا صرف بہشت والوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ اہل دوزخ کو بھی تو موت نہیں آئے گی، تو پھر اس بارے میں خاص طور پر اہل بہشت کا ذکر کیوں کیا گیا ہے؟

مرحوم طبرسی نے "مجمع البیان" میں اس کا نہایت ہی خوبصورت جواب دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ اس لیے ہے تاکہ اہل بہشت کے لیے خوشخبری ہو کہ ان کے لیے خوشگوار حیات جاوید ہے، رہ گئے جہنمی تو چونکہ ان کی زندگی کا ہر لمحہ موت ہوگا گویا وہ ہمیشہ مرتے اور زندہ ہوتے رہیں گے، لہٰذا انہیں ایسی بات باور کروانے کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہے۔

بہرحال یہاں پر "لا یذوقون" (نہیں چکھیں گے) کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اہل بہشت کے لیے موت کی کمترین علامت بھی ظاہر نہیں ہوگی۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں کہ:

---

[1] بنابریں مندرجہ بالا استثنا بھی "استثنائے منقطع" ہے۔ کیونکہ ایسی موت کا ذائقہ بہشتی لوگ نہیں چکھیں گے بلکہ اس سے پہلے وہ چکھ چکے ہوں گے۔ (غور کیجیئے گا)

[2] برزخ کی موت وحیات کے بارے میں ہم نے تفسیر نمونہ کی بیسویں جلد سورۂ مومن کی گیارہویں آیت کے ذیل میں تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

خدا بروز قیامت کچھ بہشتیوں کے بارے میں کہے گا۔

"ومزتی وجلالی وعلوی وارتفاع مکانی، لانعطین لہ الیوم خمسة اشیاء ..... الا انھم شباب لا یھرمون، واصحاء لا یسقمون، و اغنیاء لا یفتقرون، وفرحون لا یحزنون، واحیاء لا یموتون، ثم تلا ھذہ الآیة، لا یذوقون فیھا الموت الا الموتة الاولیٰ"

"مجھے اپنی عزت وجلال کی قسم اور بلندی وعلو مقام کی قسم، میں انہیں پانچ چیزیں عطا کروں گا۔۔۔ وہ ہمیشہ جوان رہیں گے، کبھی بوڑھے نہیں ہوں گے، تندرست رہیں گے، بیمار نہیں ہوں گے تونگر رہیں گے غریب نہیں ہوں گے، مسرور رہیں گے، غمگین نہیں ہوں گے، زندہ رہیں گے مریں گے نہیں"

پھر آپؐ نے قرآن کی یہ آیت تلاوت فرمائی۔

"لا یذوقون فیھا الموت الا الموتة الاولیٰ" [1]

---

[1] تفسیر نورالثقلین جلد ۴ صفحہ ۶۳۴ بحوالہ اصول کافی۔

۵۸۔ فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ○
۵۹۔ فَارْتَقِبْ اِنَّهُمْ مُّرْتَقِبُوْنَ ○

ترجمہ

۵۸۔ ہم نے یہ (قرآن) تیری زبان میں آسان کر دیا ہے تاکہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔
۵۹۔ (لیکن اگر وہ نصیحت قبول نہ کریں) تو تو بھی منتظر رہ اور وہ بھی منتظر ہیں (تو خدا کی طرف سے کامیابی کا اور وہ عذاب اور شکست کا انتظار کریں)

تفسیر

آپ بھی منتظر رہیں اور وہ بھی منتظر ہیں

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ سورۂ دخان کا آغاز قرآنی آیات کی عظمت، گہرائی اور گیرائی کے ذکر کے ساتھ ہوا ہے اور یہ مندرجہ بالا آیات پر اختتام پذیر ہو رہی ہے جو قرآنی آیات کی گہری تاثیر بیان کر رہی ہیں تاکہ سورت کا آغاز اور انجام ہم آہنگ ہو جائے اور اس ابتدا اور انتہا کے درمیان کا حصہ بھی قرآنی نصائح اور مواعظ کی تاکید کا مظہر ہے۔

ارشاد فرمایا گیا ہے: ہم نے اس قرآن کو تیری زبان میں آسان کر دیا ہے تاکہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں (فانما یسرناہ بلسانک لعلھم یتذکرون)۔

اس کے مندرجات نہایت عمیق اور گہرے ہیں، اس کے تمام پہلو بہت وسیع اور ہمہ گیر ہیں اس کے مطالب ایسے سادہ اور روان ہیں کہ ہر شخص کے لیے قابل فہم اور ہر طبقے کے لیے قابل استفادہ ہیں، اس کی مثالیں زیبا ہیں، اس کی تشبیہیں فطری اور زود رس ہیں، اس کی داستانیں حقیقی اور سبق آموز ہیں اس کے دلائل روشن اور پختہ، اس کا بیان سادہ، مختصر اور پُر مغز ہے، ساتھ ہی اس حد تک شیریں اور پرکشش ہے کہ انسانی قلوب تک جا پہنچے، بے خبروں کو آگاہ اور آمادہ دلوں کو متوجہ کرتا ہے۔

بعض مفسرین نے اس آیت کی ایک اور تفسیر بیان کی ہے، جس کے مطابق اس سے یہ مراد ہے کہ باوجود یکہ تو نے کسی کے آگے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا تاہم آسانی اور سہولت کے ساتھ ان پُرمغز آیات کی تلاوت کرسکتا ہے جو خدا کے اعجاز اور وحی کی حامل ہیں۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔ درحقیقت یہ آیت سورۂ قمر کی اس آیت سے ملتی جلتی ہے، جس کا بار بار تکرار کیا گیا ہے یعنی:

"ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر۔"

"ہم نے قرآن کو نصیحت کے حصول کے لیے آسان بنادیا ہے، آیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے"؟

لیکن چونکہ ان اوصاف کے باوجود کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کلام حق کے سامنے سرِتسلیم خم کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے ہیں لہذا آخری آیت میں انھیں سخت الفاظ میں تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اگر وہ اس کے باوجود نصیحت قبول نہیں کرتے، تو تو بھی منتظر رہ اور وہ بھی منتظر ہیں (فارتقب انھم مرتقبون)۔

آپ تو کفار پر کامیابی کے سلسلے میں وعدہ الٰہی کی تکمیل کے منتظر رہیں اور وہ شکست کے۔ آپ، اس ظالم اور ہٹ دھرم قوم کے بارے میں خدا کے دردناک عذاب کے منتظر رہیں اور وہ جو زعم خویش آپ کی شکست اور ناکامی کے منتظر ہیں، تاکہ معلوم ہوجائے کہ ان دو میں سے کس کا انتظار صحیح ہے۔

بنا بریں اس آیت سے ہرگز یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیئے کہ خداوند عالم اپنے پیغمبرؐ کو حکم دے رہا ہے کہ تبلیغ سے ہاتھ اُٹھالیں اور اپنی تمام سعی و کوشش کو متوقف کرکے صرف انتظار پر ہی اکتفا کرلیں، بلکہ یہ ایک قسم کی تہدید اور تنبیہ ہے جو ہٹ دھرم قوم کو بیدار کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

چند نکات

۱۔ "ارتقب" دراصل "رقبۃ" (بروزن طلبہ) کے مادہ سے لیا گیا ہے، جس کا معنی "گردن" ہے۔ اور چونکہ انتظار کرنے والے لوگ ہمیشہ گردن اُٹھا اُٹھا کر اس کا انتظار کرتے ہیں، لہذا یہ کسی چیز کے انتظار کے معنی میں آتا ہے۔

۲۔ مندرجہ آیات اس بات کی بخوبی نشاندہی کررہی ہیں کہ قرآن مجید کا کسی خاص طبقے یا گروہ سے تعلق نہیں ہے۔ بلکہ عمومی طور پر فہم وادراک، متوجہ کرنے اور پند ونصیحت کے لیے ہے۔ لہذا جو لوگ قرآن مجید کو مبہم مفہوم اور نامعلوم مسائل کے پیچ وخم میں اُلجھادیتے ہیں کہ اس کے ادراک کا تعلق صرف ایک طبقے اور گروہ سے مخصوص ہے اور وہ خاص گروہ یا طبقات بھی اس سے کچھ سمجھ نہیں پاتے، وہ درحقیقت قرآن مجید کی اصل روح سے غافل ہیں۔

قرآن مجید کو ہر شعبۂ زندگی میں موجود ہونا چاہیئے، خواہ شہر ہو یا دیہات، انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی، پرائمری اسکول ہو یا یونیورسٹی، مسجد ہو یا میدان جنگ، غرض ہر جگہ پر اس کا ہونا ضروری ہے، کیونکہ خدا نے اسے سہل، سادہ، آسان اور روان

بنادیا ہے تاکہ سب لوگ اس کو سمجھ سکیں۔

اسی طرح اس آیت نے ان لوگوں کے افکار پر بھی خطِ تنسیخ کھینچ دیا ہے کہ جنہوں نے قرآن مجید کو تلاوت اور تجوید کی قواعد کے پیچ و خم میں منحصر کردیا ہے، جن کے پیشِ نظر صرف الفاظ کی مخارج سے ادائیگی اور وقف و وصل کے اصولوں کو مدِ نظر رکھنا ہوتا ہے۔ جبکہ قرآن کہتا ہے کہ یہ کتاب ساری کی ساری نصیحت پر مبنی ہے، ایسی نصیحت جو تحرک اور تعمیر کا عامل ہوتی ہے۔ ظاہری الفاظ کے اصولوں کو ملحوظ رکھنا اپنی جگہ پر بجا، لیکن اس کا منتہائے مقصود معانی ہیں، الفاظ نہیں۔

۳۔ ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

"لولا تیسیرہ لما قدر احد من خلقہ ان یتلفظ بحرف من القرآن، و انی لھم ذالک وھو کلام من لم یزل ولا یزال۔"

"اگر خدا نے قرآن کو زبانوں پر آسان نہ کردیا ہوتا تو کوئی شخص بھی اس کا ایک حرف زبان پر نہ لاسکتا اور یہ ہو بھی کیسے سکتا تھا، کیونکہ یہ خداوندِ ازلی و ابدی کا کلام ہے (اور اس قسم کے کلام کی عظمت و شوکت اس قدر ہوتی ہے کہ اس کے فضل و کرم کے بغیر کوئی انسان اسے ادا نہیں کرسکتا)۔"[1]

خداوندا! ہمیں ان لوگوں میں سے قرار دے جو تیرے اس عظیم و بے نظیر کلام یعنی قرآن پاک سے نصیحت حاصل کرتے ہیں اور تمام جہات میں اپنی زندگی کو اس کے ہم آہنگ کرتے ہیں!

خداوندا! جو سکون و اطمینان تو پرہیزگاروں کو عنایت کرتا ہے اور طوفانِ حوادث میں ان کے دل کی ڈھارس بندھاتا ہے ہمیں بھی عنایت فرما۔

بارِ الٰہا! تیری نعمتیں بے شمار، تیری رحمت بے حساب اور تیری سزا دردناک ہے۔ ہمارے اعمال ایسے نہیں ہیں جو ہمیں تیری رحمت سے ہم کنار اور سزا سے دُور کرسکیں۔ اپنا وہ فضل ہمارے شاملِ حال فرما، جس کا تو نے متقین سے وعدہ کیا ہے، وگرنہ ہم کسی قیمت پر بھی تیری جاودانی بہشت کی آغوش کے لائق نہیں۔

تفسیر سورہ دخان ختم ہوئی

منگل ۲۵ رجب المرجب ۱۴۰۵ھ

---

[1] تفسیر روح البیان، جلد ۸ صفحہ ۴۳۳۔

سورۂ جاثیہ

- مکہ میں نازل ہوئی
- اس کی ۳۷ آیات ہیں

آغازِ تفسیر
۲۵ رجب المرجب ۱۴۰۵ھ

سورۂ جاثیہ
کے
مضامین

"حوامیم" سورتوں میں سے یہ چھٹی سورت ہے اور اس کا شمار مکی سورتوں میں ہوتا ہے۔ یہ اس زمانے میں نازل ہوئی جب مکہ کی اجتماعی فضا مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان انتہائی کشیدہ تھی۔ اسی بنا پر اس سورت میں زیادہ تر توحید، شرک کے ساتھ نبرد آزمائی، قیامت کے عدل و انصاف سے ظالموں کو تنبیہ، اعمال کا لکھا جانا اور اسی طرح گزشتہ سرکش اقوام کے انجام جیسے مسائل کو زیادہ تر بیان کیا گیا ہے۔ اس سورت کے مندرجات کو سات حصوں میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے

(۱) — قرآن مجید کی عظمت اور اس کی اہمیت۔
(۲) — مشرکین کے سامنے توحید کے کچھ دلائل کا بیان۔
(۳) — نیچریوں کے کچھ دعوے اور ان کے منہ توڑ جوابات۔
(۴) — بنی اسرائیل جیسی بعض اقوام کے انجام کی طرف کچھ اشارہ جو سورت کے مباحث پر شاہد ہے۔
(۵) — ان گمراہ لوگوں کو زبردست تنبیہ جو اپنے گمراہ کن عقاید پر سختی سے ڈٹے ہوئے ہیں۔
(۶) — حق کی راہ سے سرمو انحراف کیے بغیر عفو و درگزشت سے کام لینے کی دعوت۔
(۷) — قیامت کے لرزا دینے والے واقعات کی طرف اشارے، خاص کر نامۂ اعمال کا تذکرہ جو انسان کے تمام اعمال کو بے کم و کاست بیان کرے گا۔

یہ سورت خداوندِ عالم کے "عزیز" و "رحیم" جیسے بزرگ ناموں سے شروع ہوتی ہے اور انہی ناموں پر ختم ہوتی ہے۔

اس سورت کا نام "جاثیہ" اس لیے ہے — اس کی ۲۸ ویں آیت سے یہ لفظ لیا گیا ہے جس کا معنی ہے "گھٹنے ٹیکنے والا"۔ قیامت کے دن عدلِ الٰہی کی دادگاہ میں بہت سے لوگوں کی یہی کیفیت ہوگی۔

مرحوم طبرسیؒ نے "مجمع البیان" میں اس کا ایک اور نام بھی تحریر کیا ہے جو زیادہ مشہور نہیں ہے اور وہ ہے "شریعت" جو اس سورت کی ۱۸ ویں آیت کی مناسبت سے ہے۔

سورت جاثیہ کی تلاوت کا ثواب

پیغمبر اسلامؐ کی ایک حدیث میں ہے:

"من قرأ حامیم الجاثیۃ ستر اللہ عورتہ وسکن روعتہ عند الحساب"۔

"جو شخص سورۂ جاثیہ کی تلاوت کرے گا (البتہ اس کے مطالب میں غور و فکر کرے گا، اور اپنی زندگی کو ان مطالب کے مطابق ڈھالے گا) خدا بروزِ قیامت اس کے تمام عیوب کی پردہ پوشی کرے گا اور اس کے خوف کو اطمینان میں بدل دے گا۔[1]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث مروی ہے، آپؑ فرماتے ہیں:۔

"من قرأ سورۃ الجاثیۃ کان ثوابھا ان لا یری النار ابدًا، ولا یسمع زفیر جہنم ولا شہیقھا، وھو مع محمدؐ"۔

جو شخص سورۂ جاثیہ کی (غور و فکر کے ساتھ جو عمل کا مقدمہ ہے) تلاوت کرے گا اُس کا ثواب یہ ہے کہ وہ آتش جہنم کو ہرگز نہیں دیکھ پائے گا اور دوزخ کی آواز نہیں سُن پائے گا اور اسے حضرت محمد (مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ہم نشینی کا شرف حاصل ہوگا۔[2]

---

[1] تفسیر مجمع البیان، سورۂ جاثیہ کے آغاز میں۔

[2] تفسیر برہان سورۂ جاثیہ کے آغاز میں، جلد ۴ ص ۱۲۶۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱۔ حٰمٓ ۚ

۲۔ تَنۡزِیۡلُ الۡکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَکِیۡمِ

۳۔ اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ؕ

۴۔ وَ فِیۡ خَلۡقِکُمۡ وَ مَا یَبُثُّ مِنۡ دَآبَّۃٍ اٰیٰتٌ لِّقَوۡمٍ یُّوۡقِنُوۡنَ ۙ

۵۔ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّہَارِ وَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ رِّزۡقٍ فَاَحۡیَا بِہِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا وَ تَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ اٰیٰتٌ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ

۶۔ تِلۡکَ اٰیٰتُ اللّٰہِ نَتۡلُوۡہَا عَلَیۡکَ بِالۡحَقِّ ۚ فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍۭ بَعۡدَ اللّٰہِ وَ اٰیٰتِہٖ یُؤۡمِنُوۡنَ

ترجمہ

رحمان اور رحیم خدا کے نام سے

۱۔ حٰمٓ۔

۲۔ یہ کتاب خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے جو غالب و دانا ہے۔

۳۔ بے شک آسمان اور زمین میں ایمان والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔

۴۔ اور اسی طرح تمھاری اور زمین میں پھیلے ہُوئے چلنے پھرنے والوں کی خلقت میں نشانیاں ہیں، اُن کے لیے جو اہلِ یقین ہیں۔

۵۔ اور رات اور دن کے آجانے میں اور اس نے آسمان سے جو رزق نازل فرمایا ہے اس کے ذریعے زمین کو مرنے کے بعد زندہ کیا ہے۔ اس میں بھی اور ہواؤں کے چلنے میں بھی عقل سے کام لینے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔

۶۔ یہ خدا کی آیات ہیں جن کو ہم حق کے مطابق تیرے سامنے پڑھتے ہیں، تو خدا اور اس کی آیتوں کے بعد کونسی بات ہوگی، جس پر یہ لوگ ایمان لائیں گے؟

تفسیر

ہر جگہ اس کی نشانیاں موجود ہیں

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ یہ چھٹی سُورت ہے جس کا آغاز حروف مقطعہ (حٰمٓ) سے ہو رہا ہے۔ بعد کی سُورت (احقاف) سے مل کر یہ پُوری سات سورتیں ہو جاتی ہیں۔ حروفِ مقطعات کے بارے میں ہم سُورۂ بقرہ، سُورۂ آلِ عمران، سُورۂ اعراف اور اسی طرح "حٰمٓ" سورتوں کے آغاز میں تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں۔

مشہور مفسر طبرسی اس آیت کے آغاز میں فرماتے ہیں:

"بہترین قول یہ ہے کہ یہ کہا جائے "حٰمٓ" اس سُورت کا نام ہے، (پھر بعض مفسرین سے نقل کرتے ہُوئے لکھتے ہیں) اسے "حٰمٓ" کے نام سے موسوم کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ قرآن جو سراپا اعجاز ہے، حروفِ تہجی سے تشکیل یافتہ ہے۔"

جی ہاں! یہ کتاب جو نور و ہدایت، راہنما اور رہبر ہے اور پیغمبرِ اسلام کا زندۂ جاوید معجزہ ہے انہی سادہ سے حرفوں کی ترکیب سے وجُود میں آئی ہے۔ یہ اس کی نہایت عظمت کی دلیل ہے کہ اس قدر اہم کتاب اس قدر سادہ سے حرفوں سے تشکیل پائی ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ فوراً قرآن کی عظمت کا تذکرہ کرتے ہُوئے فرمایا گیا ہے: یہ کتاب خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے

جو غالب و دانا ہے۔ (تنزیل الکتاب من اللہ العزیز الحکیم)[1]

"عزیز" کا معنی صاحب قدرت اور ناقابل شکست ہے اور "حکیم" کا معنی ایسی ذات ہے جو تمام چیزوں کے اسرار سے آگاہ ہے اور جس کے تمام افعال نچلے تُلے اور حکمت پر مبنی ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کی کتاب نازل کرنے کے لیے ایسی ہی بے انتہا حکمت اور غیر محدود قدرت ضروری ہوتی ہے جو خدا کے علاوہ کسی اور میں نہیں پائی جاتی۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ یہ آیت بعینہٖ قرآن مجید کی چار سورتوں کی ابتدا میں آئی ہے، جن میں سے تین حوامیم سورتیں ہیں (مؤمن، جاثیہ اور احقاف) اور ایک سورۂ زمر ہے، جو حوامیم کے علاوہ ہے۔ یہ تکرار اور تاکید اس لیے ہے کہ تمام لوگوں کی توجہ قرآنی اسرار کی گہرائی اور گیرائی اور اس کے مطالب کی عظمت کی طرف مبذول کروائی جائے تاکہ وہ اس کی کسی تعبیر کو معمولی نہ سمجھیں، کسی کلمہ کو بے حساب و کتاب نہ سمجھیں اور نہ ہی فہم و ادراک کی کسی حد پر قانع ہو جائیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ "عزیز" کے لفظ کے ساتھ بعض مقامات پر خود قرآن مجید کی بھی توصیف کی گئی ہے، جیسے "وانہ لکتاب عزیز" یعنی قرآن مجید وہ کتاب ہے جو طاقت ور اور ناقابل شکست ہے (حٰمٓ سجدہ-۴۱) یا وہ گو لوگوں کی اس تک دسترس نہیں ہو سکتی۔ مرور زمانہ کے ساتھ اس کی قدر و قیمت میں کمی نہیں آسکتی۔ اس کے حقائق کبھی بوسیدہ نہیں ہو سکتے۔ تحریف کرنے والوں کو رسوا کرتے ہوئے روز بروز آگے بڑھتا جائے گا۔

بعض مقامات پر خود قرآن نازل کرنے والے کی توصیف کی گئی ہے، جیسے زیر تفسیر آیت میں ہے اور دونوں جگہ اس کا استعمال صحیح ہے۔

پھر آفاق و انفس میں عظمت خداوندی کی آیات اور نشانیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: بے شک آسمانوں اور زمین میں ایمان والوں اور حق کے طلب گاروں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں (ان فی السماوات والارض لآیات للمؤمنین)۔

آسمانوں کی عظمت ایک طرف اور اس کا محیر العقول نظام کہ جس پر کروڑوں سال گزرنے کے باوجود اس میں سرمو انحراف نہ آنا دوسری طرف اور زمین کی ساخت اور اس کے عجائبات تیسری طرف، سب مل جل کر خدا کی نشانیوں میں سے ہیں۔

زمین، جو بعض دانش وروں کے بقول ۱۴ قسم کی حرکت کی حامل ہے اور بہت تیزی کے ساتھ اپنے محور کے گرد گھوم رہی ہے اور بڑی سرعت کے ساتھ سورج کے گرد گھوم رہی ہے اور پھر منظومہ شمسی کے ہمراہ ایک اور حرکت بھی

---

[1] "تنزیل الکتاب" ایک محذوف کی خبر ہے، جس کی تقدیر "ھذا تنزیل الکتاب" ساتھ ہی یہ بتاتے چلیں کہ "تنزیل" مصدر ہے اور یہاں پر اسم مفعول کے معنی میں ہے اور موصوف صفت کی طرف مضاف ہے، جو تقدیری طور پر "ھذا الکتاب منزل ....." ہے۔

ہے جو کہکشاں کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس طرح سے وہ اپنی بے انتہا مسافرت میں سرگرم عمل ہے۔ لیکن ان تمام حرکات کے باوجود اس قدر پُرسکون ہے کہ انسانی آسائش و آرام کا گہوارہ اور تمام موجودات کے لیے باعث سکون و اطمینان ہے اور کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ اس میں ذرہ بھر بھی حرکت ہے۔

نہ تو اس قدر سخت اور ٹھوس ہے کہ اس میں زراعت نہ کی جا سکے اور گھر نہ بنائے جا سکیں۔ اور نہ ہی اس قدر نرم اور ملائم ہے کہ اس میں رہائش اختیار نہ کی جا سکے اور بقاء کے تسلسل کو آگے نہ بڑھایا جا سکے۔

گذشتہ، موجودہ اور آئندہ اربوں کھربوں انسانوں کے لیے ذخائر، معدنیات اور وسائل زندگی اس میں فراہم کر دیئے گئے ہیں اور پھر اس قدر جاذب نظر اور زیبا ہے کہ انسان کو اپنا مسحور بنا لیتی ہے۔ اس میں موجود پہاڑ ہوں یا دریا اور فضا غرض ہر چیز خدا کی اسرار آمیز آیت اور نشانی ہے، لیکن توحید اور عظمتِ خالق کی نشانیوں کو صرف صاحبان ایمان یعنی راہ خدا پر گامزن اور حق کے طلبگار سمجھتے ہیں اور بے خبر دل کے اندھے اور مغرور لوگ ان کے ادراک سے محروم ہیں۔

پھر ان "آفاقی" آیات کے بعد "انفسی" آیات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اور تمہاری تخلیق میں بھی اور زمین میں پھیلے ہوئے جانوروں کی خلقت میں بھی یقین کرنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں (وفی خلقکم ومایبث من دابۃ آیات لقوم یوقنون)۔

امیر المومنین علیہ السلام کی طرف منسوب ایک مشہور عبارت میں یہ جملہ ملتا ہے۔

"یہ انسان ایک چھوٹا سا جرم (جسم) ہے جس میں ایک بہت بڑا عالم سمایا ہوا ہے۔"

یعنی درحقیقت جو کچھ ایک عالم کبیر میں موجود ہے، اس کا ایک نمونہ انسان ہی کے جسم و جان میں موجود ہے۔

اس کے خصائل و صفات تمام ذی روح اور متحرک مخلوق کی صفات و خصائل کا مرکب ہیں اور اس کی تنوع پر مبنی تخلیق اس عظیم کائنات کے مجموعی امور کا نچوڑ ہے۔

اس کے ایک خلیئے کی ساخت ایک اسرار آمیز عظیم صنعتی شہر جیسی ہے۔ اس کے ایک بال کی تخلیق اپنی مختلف خصوصیات کے ساتھ کہ جو علم و دانش اور سائنس کے ذریعے دریافت ہوئی ہیں، آیاتِ الٰہی میں سے خود ایک عظیم آیت ہے۔

اس کے بدن میں ہزاروں کلومیٹر چھوٹی بڑی نہایت باریک، نازک اور لطیف رگیں ہیں اور ہزار کلومیٹر سلسلہ اعصاب کی کمیونیکل اور اطلاعاتی تاریں ہیں اور ان کا دماغ کی کمانڈ کے مرکز کے ساتھ طاقت ور، اسرار آمیز اور پیچیدہ رابطہ موجود ہے۔ بدن کی ہر ایک داخلی مشینری کا طریقہ کار اور ناگہانی واقعات کے موقع پر ان کی عجیب و غریب ہم آہنگی اور خارجی عوامل کی یورش کے وقت بدن کی محافظ طاقتوں کا زبردست دفاع، ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے مقام پر خدا کی قدرت کاملہ کی ایک نشانی ہیں۔

پھر انسان کے علاوہ زمین پر چلنے والے حیوانوں کی لاکھوں قسمیں ہیں، خواہ وہ خوردبین سے دیکھی جانے والی ہوں یا دیو ہیکل، ہر ایک خدا کی ایک آیت ہیں۔ ان کی اپنی خصوصیات اور ساخت ہوتی ہے، جو بالکل متنوع اور ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے، حتی کہ بعض قسمیں ایسی بھی ہیں جن میں سے کسی ایک قسم کے مطالعہ پر سائنس دانوں اور دانش وروں کی ایک

جماعت اپنی تمام عمریں صرف کردے یا ان کے تخلیقی اسرار پر ہزاروں کتابیں لکھی جائیں پھر بھی ان کے بارے میں ہماری معلومات کا دائرہ مجہولات کی نسبت بہت کم ہوگا۔ ان میں سے ہر ایک اپنے مقام پر مبدائے آفرینش کی حکمت اور اس کے بے پایاں علم کی ایک آیت اور نشانی ہے۔

تو پھر کیا وجہ ہے کہ کچھ لوگ بیسیوں سال ان آیات میں اپنی زندگی گزار دیتے ہیں لیکن ان میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی ذرہ برابر معلومات حاصل نہیں کر سکتے ؟ تو اس کی وجہ صرف وہی ہے، جس کی قرآن مجید نے ان الفاظ میں نشاندہی کردی ہے کہ " یہ آیات ان لوگوں کے ساتھ مخصوص ہیں، جو صاحبانِ ایمان و یقین ہیں اور غور و فکر کے مالک ہیں۔" ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو اپنے دل کے دریچے باز کرتے ہیں اور اپنے تمام وجود کے ساتھ علم و دانش اور یقین کے طلب گار ہوتے ہیں، حتیٰ کہ کسی تھوڑی سے تھوڑی حرکت اور چھوٹے سے چھوٹے موجود کو بھی نظر انداز نہیں کرتے بلکہ کئی کئی گھنٹے اس کے بارے میں سوچنے پر صرف کر دیتے ہیں۔ " ذاتِ خدا تک رسائی" کے لیے اس سے زینے کا کام لیتے ہیں اور " معرفت کردگار" کے لیے اسے ذریعہ بناتے ہیں۔ پھر اس سے راز و نیاز کرتے ہیں اور اپنے جامِ دل کو اس کے بادۂ عشق سے لبریز کرتے ہیں۔

اگلی آیت میں تین عظیم نعمتوں کا تذکرہ ہے جو انسان اور دوسری مخلوقات کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتی ہیں اور ہر ایک آیاتِ خداوندی میں سے ایک آیت ہے، اور وہ نعمتیں ہیں نور، پانی، اور ہوا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: رات اور دن کے آنے جانے میں اور اس نے آسمان سے جو رزق نازل فرمایا ہے اور اس کے ذریعے زمین کو مرنے کے بعد زندہ کیا ہے، اس میں بھی اور ہواؤں کے چلنے میں بھی عقل سے کام لینے والوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں (واختلاف اللیل و النھار وما انزل اللہ من السماء من رزق فاحیا بہ الارض بعد موتھا وتصریف الریاح آیات لقوم یعقلون)۔

"نور و ظلمت" اور رات دن کے آنے جانے کا مسئلہ جو ایک خاص نظم کے ساتھ ایک دوسرے کے خلیفہ اور جانشین ہوتے رہتے ہیں، حساب شدہ اور تعجب آور ہے۔ اگر ہمیشہ دن رہتا یا بے انتہا لمبا ہوتا تو اس کا درجہ حرارت اس قدر اوپر چلا جاتا کہ تمام زندہ مخلوق جل کر راکھ ہو جاتی اور اگر رات ہمیشہ رہتی یا حد سے زیادہ طولانی ہوتی تو سردی کی شدت سے ہر چیز منجمد ہو جاتی۔

آیت کی تفسیر میں ایک احتمال یہ بھی ہے کہ اختلاف کا معنی ایک دوسرے کی جانشینی نہ ہو بلکہ اس فرق کی طرف اشارہ ہو جو سال بھر کے مختلف موسموں میں رات اور دن کے درمیان پیدا ہوتا رہتا ہے، جس کے نتیجے میں انسان کو مختلف فوائد یعنی مختلف فصلیں، درخت، پھل، برف و باراں کا نزول اور دوسری برکتیں حاصل ہوتی ہیں۔

یہ بات بھی بڑی دلچسپ ہے کہ سائنسدان کہتے ہیں روئے زمین کے مختلف خطوں میں شب و روز کی لمبائی میں جو فرق ہوتا ہے اگر سال بھر کے تمام دنوں کا حساب کیا جائے اور اسی حساب سے سورج کی روشنی کو تقسیم کیا جائے تو بالکل ٹھیک صورت میں ہر ایک خطہ دوسرے خطے کے برابر اس روشنی سے استفادہ کرتا ہے۔ [1]

---

[1] "رات اور دن کے اختلاف" کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد اول سورۂ بقرہ کی آیت ۱۶۴ کے ذیل میں، جلد سوم سورۂ آل عمران (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱۲ پر)

دوسرے مرحلے میں زندگی عطا کرنے والے آسمانی رزق یعنی بارش کا تذکرہ ہے کہ نہ تو جس کی لطافت طبع میں کوئی حرف ہے اور نہ ہی اس کی زندگی عطا کرنے والی قدرت میں کوئی کلام۔ ہر جگہ زندگی، تر و تازگی اور زیبائی کی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔

ایسا کیوں نہ ہو؟ جب کہ انسانوں اور بہت سے دوسرے جانوروں اور نباتات کے بدن کا اصل حصہ اسی پانی سے تشکیل پاتا ہے۔

تیسرے مرحلے پر ہواؤں کے چلنے کی بات ہو رہی ہے۔ ایسی ہوائیں جو آکسیجن ایک سے دوسری جگہ پہنچاتی رہتی اور جانداروں کی ضرورت پوری کرتی رہتی ہیں۔ کاربن ڈائی آکسائیڈ سے آلودہ ہواؤں کو صاف کرنے کے لیے دشت و جنگل اور صحراؤں کی طرف بھیجتی رہتی ہیں اور صاف ہونے کے بعد انھیں دوبارہ شہروں اور آبادیوں کی طرف لے آتی ہیں۔ عجیب بات ہے کہ زندہ موجود کے یہ دونوں گروہ یعنی "حیوانات" اور "نباتات" بالکل ایک دوسرے کے برعکس عمل کرتے ہیں، حیوانات آکسیجن گیس حاصل کرتے ہیں اور کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کرتے ہیں جبکہ نباتات کاربن ڈائی آکسائیڈ حاصل کرتے ہیں اور آکسیجن خارج کرتے ہیں تاکہ نظام زندگی میں توازن برقرار رہے اور مرور ایام کے ساتھ زمین پر موجود مفید ہواؤں کے ذخائر ختم نہ ہونے پائیں۔

اس کے علاوہ یہی ہوائیں ہوتی ہیں جو نباتات میں نسل کشی کا کام دیتی ہیں، انہیں ثمر آور بناتی ہیں، مختلف زمینوں میں مختلف قسم کی تخم پاشی کرتی ہیں۔ قدرتی چراگاہوں اور جنگلوں کو پروان چڑھاتی ہیں۔ سمندروں کے دل میں موجیں ابھارتی ہیں، جن سے سمندروں کی حیات اور حرکت کا پتہ چلتا ہے، پانی کو بدبودار اور خراب ہونے سے بچاتی ہیں اور یہی ہوائیں ہیں جو سفینوں کو سمندروں کے سینوں پر رواں دواں رکھے ہوئے ہیں۔[1]

یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں پہلے تو آسمانوں اور زمین کے آیات ہونے کی بات ہوئی ہے اور آخر میں فرمایا گیا ہے کہ اس میں "اہل یقین" کے لیے نشانیاں ہیں پھر دوسری زندہ مخلوق کی تخلیق کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ اس میں "اہل یقین" کے لیے نشانیاں ہیں اور نور و ظلمت اور باد و باراں کے نظام کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے کہ اس میں "عقل سے کام لینے والوں" کے لیے نشانیاں ہیں۔

تعبیرات کے اس اختلاف کی وجہ شاید یہ ہو کہ انسان "معرفۃ اللہ" کی راہوں کو تین مراحل میں طے کرتا ہے پھر کہیں جا کر منزل مقصود تک پہنچتا ہے۔ پہلا مرحلہ "فکر" کا ہے دوسرا "یقین و علم" کا اور تیسرا مرحلہ "ایمان" کا ہے، جسے اصطلاح میں قلبی عقیدہ کہتے ہیں۔

اگرچہ مرتبے کے لحاظ سے ایمان پہلے مرحلہ پر، یقین دوسرے مرحلے پر اور فکر تیسرے مرحلے پر ہوتے ہیں اور آیات مذکورہ میں بھی اسی ترتیب سے ذکر کیے گئے ہیں لیکن خارجی وجود کے اعتبار سے فکر پہلے مرحلے پر، یقین دوسرے اور ایمان تیسرے مرحلے پر ہیں۔ بالفاظ دیگر جو اہل ایمان ہوتے ہیں وہ آیات الٰہی کے مشاہدے ہی سے اس اعلیٰ ترین مرحلے تک پہنچتے ہیں اور جو اہل ایمان نہیں ہیں وہ کم از کم یقین یا فکر کے مرحلے تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱۳ کا) کی آیت ۱۶۴ کے ذیل میں، جلد ہشتم، سورۂ یونس کی آیت ۲۲ کے ذیل میں اور جلد ۱۶، سورۂ قصص کی آیت ۷۱ کے ذیل تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔

[1] "باد و باراں" کے آثار کے سلسلے میں تفسیر نمونہ کی سولہویں جلد میں سورۂ روم کی آیات ۴۶ تا ۵۰ کے ذیل میں تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔

مفسرین نے اس بارے میں اور بھی وجوہات کو ذکر کیا ہے لیکن جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے وہ زیادہ مناسب ہے۔ اسی سلسلے کی آخری آیت میں گزشتہ آیات کا مجموعی طور پر نتیجہ نکالتے ہوئے قرآنی آیات کی عظمت و اہمیت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: یہ خدا کی آیات ہیں، جن کو ہم ٹھیک ٹھیک تمہارے سامنے پڑھتے ہیں (تلك آيات الله نتلوها عليك بالحق)۔

آیا "تلك" کا کلمہ قرآنی آیات کی طرف اشارہ ہے یا آفاق و انفس میں خدا کی آیات کی طرف جو گذشتہ آیات میں مذکور ہو چکی ہیں؟ اس بارے میں مفسرین نے دونوں قسم کی آیات کا احتمال ذکر ہے۔ لیکن "نتلو" کے قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے قرآنی آیات مراد ہیں، البتہ یہی قرآنی آیات ساری کائنات میں خدا کی نشانیوں کو بیان کر رہی ہیں تو اس طرح سے دونوں قسم کی تعبیریں یکجا ہونے کے قابل ہیں۔ (غور کیجیے گا)

بہر حال تلاوت "تلو" (بروزن فکر) کے مادہ سے ہے، جس کا معنی بات کو مسلسل بیان کرنا ہے۔ اسی لیے قرآنی آیات کی تلاوت کا معنی ان کا مسلسل اور پے در پے پڑھنا ہے۔

"حق" کی تعبیر ان آیات کے مضامین و مندرجات کی طرف بھی اشارہ ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت اور خدا کی وحی کی حقانیت کی طرف بھی۔ بالفاظ دیگر "یہ آیات اس حد تک واضح و آشکار اور استدلال پر مبنی ہیں کہ بذات خود اپنی اور اپنے بھیجنے والے کی حقانیت کی دلیل بھی انہی میں مضمر ہے۔

سچ مچ اگر یہ لوگ ان آیات پر ایمان نہیں لائیں گے تو پھر کس چیز پر ایمان لائیں گے؟ اسی لیے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: تو خدا اور اس کی آیتوں کے بعد کونسی بات ہوگی جس پر یہ کافر لوگ ایمان لائیں گے۔ (فبای حديث بعد الله وآياته يؤمنون)[1]۔

مرحوم طبرسی "مجمع البیان" میں فرماتے ہیں کہ کلمہ "حدیث" سے گذشتہ اقوام اور ان کی عبرت آموز داستانوں کی طرف اشارہ ہے، جبکہ "آیات" ان دلائل کو کہا جاتا ہے جو صحیح کو باطل سے جدا کرتی ہیں اور قرآن مجید کی آیات دونوں چیزوں کو بیان کر رہی ہیں۔

سچ مچ قرآن مجید توحید کے استدلال اور برہان و وعظ و نصیحت کے لحاظ سے اس قدر مضامین کا حامل ہے کہ جس دل میں ذرہ بھر بھی آمادگی اور جس سر میں تھوڑی سی حق کی قبولیت کی آمادگی موجود ہے اسے خدا، طہارت اور تقویٰ کی دعوت دیتے ہیں۔ اگر یہ آیات بینات کسی پر اثر انداز نہیں ہوتیں تو ان کی ہدایت کی امید بھی نہیں رکھنی چاہیئے۔

---

[1] "بعد الله" کی تعبیر میں ایک محذوف پایا جاتا ہے جس کی تقدیر یوں ہے:
"فبای حديث بعد حديث الله"۔

۷۔ وَيْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ۙ
۸۔ يَّسْمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتْلٰى عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝
۹۔ وَاِذَا عَلِمَ مِنْ اٰيٰتِنَا شَيْـًٔا اتَّخَذَهَا هُزُوًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝
۱۰۔ مِنْ وَّرَآئِهِمْ جَهَنَّمُ ۚ وَلَا يُغْنِىْ عَنْهُمْ مَّا كَسَبُوْا شَيْـًٔا وَّلَا مَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝

ترجمہ

۷۔ جھوٹے گناہ گار کے لیے افسوس ہے۔
۸۔ کہ اس پر خدا کی آیات مسلسل پڑھی جاتی ہیں اور انھیں سُنتا رہتا ہے پھر بھی غرور سے مخالفت پر اڑا رہتا ہے۔ گویا اس نے ان کو سُنا ہی نہیں، تو ایسے شخص کو دردناک عذاب کی خوش خبری دے دے۔
۹۔ اور جب اِسے ہماری آیتوں میں سے کسی آیت سے آگاہ کیا جاتا ہے تو اس کی ہنسی اڑاتا ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے ذلیل و خوار کرنے والا عذاب ہے۔
۱۰۔ اور جہنم ان کے پیچھے ہی پیچھے ہے اور جو کچھ وہ کما چکے ہیں وہ انھیں نجات

نہیں دلائے گا اور نہ ہی وہ کہ جن کو انھوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے سرپرست بنایا تھا اور ان کے لیے بڑا دردناک عذاب ہے۔

تفسیر

گناہگار جھوٹے پر پھٹکار

گزشتہ آیات سے معلوم ہوتا تھا کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو خدا کے کلام کو مختلف توحیدی دلائل اور وعظ و نصیحت کے ساتھ سنتے تو ہیں لیکن ان کے دل پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

زیر تفسیر آیات میں ایسے لوگوں سے متعلق اور ان کے انجام کے بارے میں تفصیلی گفتگو ہو رہی ہے۔ سب سے پہلے ارشاد ہوتا ہے: ہر جھوٹے گناہگار پر افسوس ہے۔ (ویل لکل افاک اثیم)۔

"افاک" مبالغے کا صیغہ ہے اور ایسے شخص کے معنی میں ہے جو بہت جھوٹ بولتا ہے اور کبھی بڑے جھوٹ کے معنی میں بھی آتا ہے ہر چند کہ زیادہ نہ ہو۔

"اثیم" "اثم" کے مادہ سے ہے، جس کا معنی ہے مجرم اور گناہگار۔ یہ لفظ بھی مبالغے کا معنی دیتا ہے۔

ان آیات سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ آیاتِ الٰہی کے مقابلے میں معاندانہ ردِ عمل ان لوگوں کا کام ہوتا ہے جو سر سے پاؤں تک گناہوں میں غرق اور جھوٹ سے آلودہ ہوتے ہیں نہ کہ پاک طینت اور نیک سیرت لوگوں کا۔

پھر ان کی معاندانہ روش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: اس پر خدا کی آیات مسلسل پڑھی جاتی ہیں اور وہ انھیں سنتا رہتا ہے پھر وہ غرور کے باعث مخالفت پر اڑا رہتا ہے گویا اس نے ان کو سنا ہی نہیں (یسمع آیات اللہ تتلیٰ علیہ ثم یصر مستکبرًا کان لم یسمعھا)۔[1]

اس طرح سے گناہ، جھوٹ، تکبر اور خود پسندی اس بات کا سبب بن جاتی ہے کہ وہ ان آیات کو ان سنا کر دے اور خود کو بہرا بنا دے۔ جیسا کہ سورۂ لقمان کی آیت ۷ میں بھی بیان ہوا ہے۔ کہ:

"واذا تتلیٰ علیہ آیاتنا ولّی مستکبرًا کان لم یسمعھا کان فی اذنیہ وقرًا۔"

"جب اسے ہماری آیات سنائی جاتی ہیں مستکبر بن کر اُن سے روگردانی کر لیتا ہے گویا اس نے

---

[1] "یسمع آیات اللہ" ممکن ہے کہ "جملہ مستانفہ" ہو یا "ھیر" کل" کی دوسری "صفت" ہو۔

کچھ نہیں سُنا، گویا اس کے کان بالکل بہرے ہیں۔"

زیرِ تفسیر آیت کے آخر میں انھیں زبردست تہدید کرتے ہُوئے فرمایا گیا ہے: ایسے شخص کو دردناک عذاب کی خوشخبری دے دے (فبشرہ بعذاب الیم)۔

جس طرح اس نے رسُول اللہؐ اور مومنین کے دلوں کو دکھایا ہے اسی طرح ہم بھی اسے دردناک عذاب میں مبتلا کریں گے، کیونکہ قیامت کا عذاب دُنیا میں انسان کے اعمال کا تجسّم ہے، یعنی دُنیا میں انجام دیئے ہُوئے اعمال آخرت میں مجسّم ہو کر سامنے آجائیں گے۔

اگرچہ بعض مفسرین نے اس آیت اور اس کے بعد کی آیت کی شانِ نزُول ذکر کرتے ہُوئے انھیں ابوجہل یا نضر بن حارث کی طرف اشارہ سمجھا ہے جو عجمیوں کے افسانوں اور داستانوں کو اکٹھا کر کے لوگوں کو سنایا کرتے تھے تاکہ اس طرح سے وہ انھیں ایسے ہی قصّے کہانیوں کے ساتھ بہلائے پھسلائے رہیں اور آئینِ حق سے منحرف کیے رکھیں، لیکن ظاہری بات ہے کہ یہ صرف انہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ ہر دور کے تمام جھُوٹے مجرمین اور مستکبرین کے بارے میں ہے۔ وہ لوگ جو آیاتِ الٰہی، خدائی انبیاء اور عظیم پیشواؤں سے سُنی ہوئی باتوں کو ان سُنی کر دیتے ہیں کیونکہ ایسی باتیں انکی نفسانی خواہشات اور میلانات سے میل نہیں کھاتیں اور ان کے شیطانی افکار ان کی تائید نہیں کرتے، ان کی غلط رسُوم و عادات اور اندھی تقلید کے موافق نہیں ہیں۔ جی ہاں! ایسے سب لوگوں کو دردناک عذاب کی خوشخبری سُنا دیجئے۔

اگرچہ "عذاب" کی "بشارت" (خوشخبری) سے مناسبت نہیں ہے، لیکن یہ تعبیر ایسے لوگوں کی توہین، تحقیر اور تمسخر کیلئے استعمال ہوتی ہے۔

پھر فرمایا گیا ہے: جب یہ ہٹ دھرم متکبر ہماری آیات میں سے کسی آیت سے واقف ہو جاتا ہے اور اسے جان لیتا ہے تو اس کی ہنسی اڑاتا ہے (واذا علم من ایاتنا شیئا اتخذھا ھزوا)۔[1]

درحقیقت ان خودغرض جاہلوں کی دو حالتیں ہوا کرتی ہیں، پہلی تو یہ کہ وہ زیادہ خدا کی آیات کو سُنتے ہیں لیکن سُنی ان سُنی کر دیتے ہیں، بڑی بے پرواہی سے گزر جاتے ہیں گویا انھوں نے کچھ سُنا ہی نہیں، دوسری یہ کہ اگر سنتے بھی ہیں اور ان کی طرف توجہ بھی دیتے ہیں اور اس پر اپنے ردِّ عمل کا اظہار بھی کرتے ہیں تو یہی کہ ان کا مذاق اڑاتے ہیں اور مسخرہ بازی سے کام لیتے ہیں۔ وہ سب لوگ ان دونوں کاموں میں شریک ہیں۔ کبھی وہ اور کبھی یہ۔ (اسی لیے اس آیت میں اور اس سے پہلی آیت میں کسی قسم کا تضاد نہیں پایا جاتا)۔

پھر اہم بات یہ ہے کہ پہلے تو فرمایا گیا ہے کہ "اگر ہماری آیات میں سے کسی سے واقف ہو جاتا ہے" لیکن بعد میں یہ نہیں فرمایا کہ جسے جان چکا ہے اس کا استہزاء کرتا ہے، بلکہ فرمایا گیا ہے کہ ہماری سب آیات کا (خواہ انہیں جان چکا ہے یا نہیں) مذاق اڑاتا ہے۔

---

[1] توجہ رہے کہ "اتخذھا" میں موجود ضمیر "شیئا" کی طرف نہیں بلکہ "ایاتنا" کی طرف لوٹ رہی ہے۔

جبکہ یہ جہالت اور بے علمی کی انتہا ہے کہ انسان کسی ایسی چیز کا انکار کرے یا اس کا مذاق اڑائے جسے وہ سرے سے نہیں سمجھتا اور یہ ان کی ہٹ دھرمی اور عناد کی بہت بڑی دلیل ہے۔

آیت کے آخر میں ایسے لوگوں کی سزا کو ان لفظوں میں بیان فرمایا گیا ہے، ان کے لیے ذلیل و خوار کرنے والا عذاب ہے (اولئك لهم عذاب مهين)۔

ایسا کیوں نہ ہو جبکہ وہ آیاتِ الٰہی کا مذاق اڑا کر اپنی شخصیت اور مقام و منزلت بنانا چاہتے ہیں، لیکن خدا تعالیٰ انھیں اس کام کی سزا دے کر انھیں ذلیل و خوار اور پست و بے قیمت کر دے گا۔ انہیں ایسے رسوا کن اور تحقیر آمیز طریقے پر عذاب قیامت میں گرفتار کرے گا کہ انھیں منہ کے بل زمین پر گھسیٹا جائے گا اور عذاب کے فرشتے طوق و زنجیر پہنا کر اور ملامت و سرزنش کرتے ہوئے جہنم میں لے جائیں گے۔

یہیں پر یہ بات بھی اچھی طرح سے واضح ہو جاتی ہے کہ گزشتہ آیت میں عذاب کی صفت "الیم" اور اس آیت میں "مهین" اور بعد کی آیت میں "عظیم" کیوں بیان کی گئی ہے؟ درحقیقت ان میں سے ہر صفت ان کے گناہوں کی کیفیت سے مناسبت رکھتی ہے۔

بعد کی آیت اس "عذاب مهین" کی یوں تشریح کرتی ہے: اور جہنم ان کے پیچھے ہی پیچھے ہے (من ورائهم جهنم)۔

"پیچھے ہی پیچھے" کی تعبیر کیوں اختیار کی گئی ہے حالانکہ جہنم تو ان کے آگے آگے ہوگی اور وہ آگے جا کر ہی وہاں پہنچیں گے؟ ممکن ہے یہ اس لحاظ سے ہو کہ وہ دنیا کی طرف منہ کر کے آخرت اور خدا کے عذاب کو پسِ پشت ڈال چکے ہیں۔ ایسے موقع پر اس قسم کی تعبیر عام طور پر استعمال ہوا کرتی ہے۔ جب انسان کسی چیز سے بے اعتنائی کرتا ہے تو کہتے ہیں وہ اسے پسِ پشت ڈال چکا ہے، قرآن مجید بھی سورۂ دہر کی آیت ۲۷ میں فرماتا ہے:

"ان هؤلاء يحبون العاجلة ويذرون وراءهم يوما ثقيلا"

"وہ لوگ دنیا کی زود گزر زندگی کو پسند کرتے ہیں اور اس سنگین دن کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں"

کچھ مفسرین کہتے ہیں کہ "وراء" کا کلمہ "موارات" سے لیا گیا ہے اور "موارات" ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو انسان سے پوشیدہ ہو۔ پسِ پشت کو بھی "وراء" کہا جاتا ہے اور سامنے کی چیز کو بھی جو دور اور پوشیدہ ہو۔ اس طرح سے کلمہ "وراء" کا ایک جامع مفہوم ہے جو دو متضاد مصداقوں پر بولا جاتا ہے۔[1]

یہ تفسیر بھی بعید معلوم نہیں ہوتی کہ ہم کہیں کہ "وراء" کی تعبیر سے "علت و معلول" کے مسئلہ کی طرف اشارہ ہے، مثلاً ہم کہتے ہیں کہ "اگر تم نے یہ مضر غذا استعمال کی تو اس کے پیچھے پیچھے بیماری ہے" یعنی مضر غذا کھانا اس بیماری کی علت ہے

---

[1] بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اگر "وراء" کو فاعل کی طرف مضاف کیا جائے تو اس کا معنی پسِ پشت ہوتا ہے اور اگر مفعول کی طرف مضاف ہو تو سامنے کے معنی دیتا ہے۔ (دیکھو تفسیر روح البیان جلد ۸ صفحہ ۲۲۹) لیکن اس کی کوئی دلیل نہیں ملتی۔

اور بیماری اس کی معلول۔ اسی طرح یہاں پر بھی ان کے اعمال بھی دوزخ کے رسوا کن عذاب کا سبب اور عامل ہیں۔

بہر صورت، آیت کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ اگر ان کا یہ گمان ہو کہ بے پناہ مال و دولت، بت اور مصنوعی خدا انھیں عذاب سے نجات دلائیں گے تو یہ ان کی بھول ہے، کیونکہ جو کچھ وہ کما چکے ہیں وہ انھیں عذاب سے نجات نہیں دلائے گا اور نہ ہی وہ کہ جنہیں انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنا سرپرست بنایا تھا" (ولا یغنی عنھم ما کسبوا شیئاً ولا ما اتخذوا من دون اللہ اولیاء)۔

چونکہ فرار اور نجات کی کوئی راہ نہیں ہوگی لہٰذا انھیں خدا کے قہر و غضب کی آگ میں ہمیشہ جلنا ہوگا" اور ان کے لیے بڑا دردناک عذاب ہے" (ولھم عذاب عظیم)۔

ان لوگوں نے دنیا میں خدائی آیات کو معمولی سمجھا لہٰذا خدا نے ان کے عذاب کو بڑا کر دیا۔ وہ بڑائی کا اظہار کرتے تھے لہٰذا خدا بھی ان کو عذاب عظیم دے گا۔

ایسا عذاب ہر لحاظ سے عظیم بھی ہوگا اور جاودانی بھی، شدید بھی ہوگا اور رسوا کن بھی اور گناہگاروں کے دل کی گہرائیوں اور ہڈیوں کے جوڑوں تک جا پہنچے گا۔ جی ہاں! خداوندِ عظیم کے سامنے گناہ عظیم کی سزا بھی عذابِ عظیم ہوگی۔

۱۱۔ هٰذَا هُدًى ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ۝

۱۲۔ اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ فِيْهِ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

۱۳۔ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝

۱۴۔ قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًۢا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝

۱۵۔ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَاۗءَ فَعَلَيْهَا ۣ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ۝

ترجمہ

۱۱۔ یہ (قرآن) سبب ہدایت ہے اور جن لوگوں نے اپنے پروردگار کی آیتوں کا انکار کیا، ان کے لیے سخت اور دردناک عذاب ہے۔

۱۲۔ خدا ہی تو ہے جس نے دریا کو تمہارے مسخر کر دیا تاکہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں چلیں اور تاکہ اس کے فضل سے اپنا حصّہ حاصل کرو اور شاید کہ اس کی نعمتوں کا

شکر بجالاؤ۔

۱۳۔ اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو اپنی طرف سے تمہارا مسخر کیا ہے اس میں اہلِ فکر کے لیے اہم نشانیاں ہیں۔

۱۴۔ مؤمنین سے کہہ دیجیے، جو لوگ خدا کے دنوں (روزِ قیامت) کی توقع نہیں رکھتے ان سے درگزر کریں تاکہ خدا اس دن ہر قوم کو اس کے ان اعمال کی جزا دے جو وہ انجام دیتی رہی ہے۔

۱۵۔ جو شخص نیک کام کرتا ہے اپنے لیے ہی انجام دیتا ہے اور جو بُرا کام کرے گا، اس کا وبال اسی پر ہوگا۔ پھر تم اپنے پروردگار کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

تفسیر

سب تیرے لیے سرگرداں اور تیرے زیرِ فرمان ہیں

گزشتہ آیات میں آیاتِ الٰہی کی عظمت کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ زیرِ تفسیر آیات بھی اس موضوع پر گفتگو کر رہی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: یہ قرآن مجید سببِ ہدایت ہے۔ (ھٰذا ھدًی)۔

حق کو باطل سے جدا کرتا ہے، انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اُجاگر کرتا ہے۔ راہِ حق کے راہیوں کا ہاتھ پکڑ کر انہیں منزلِ مقصود تک پہنچاتا ہے، لیکن جن لوگوں نے اپنے پیروکار کی آیتوں کا انکار کیا ہے، ان کے لیے سخت اور دردناک عذاب ہے (والذین کفروا بآیات ربھم لھم عذابٌ من رجزٍ الیم)۔

کتاب مفردات میں راغب کے بقول "رجز" (بروزنِ "حرص") کا اصلی معنی اضطراب، لرزہ اور بدنظمی ہے، خاص کر جب اُونٹ بیمار ہوتا ہے تو زبردست کمزوری کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے اور غیر منظم قدم اٹھاتا ہے، ایسی حالت کو عرب اپنی زبان میں "رجز" کہتے ہیں۔

طاعون کی بیماری سخت مصیبت یا زبردست برف باری اور ژالہ باری کو "رجز" کہتے ہیں۔ اسی طرح شیطانی وسوسوں وغیرہ پر بھی اس کلمہ کا اطلاق ہوتا ہے، کیونکہ یہ سب اضطراب و بے چینی، تزلزل اور بدنظمی کا باعث ہوتے ہیں اور اگر جنگی اشعار کو

"رجز" (بروزن "عرض") کہتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان اشعار کے مقطع چھوٹے اور قریب ہوتے ہیں (یا پھر دشمن کے پیکر میں تزلزل اور اضطراب پیدا ہونے کی وجہ سے کہتے ہیں)۔

پھر سلسلۂ گفتگو کو توحید کی بحث کی جانب موڑ دیا گیا ہے۔ اس سورت کی ابتدائی آیات میں بھی اس ضمن میں گفتگو موجود ہے مشرکین کو توحید اور خداشناسی کے موثر درس دیئے گئے ہیں۔

کبھی قرآن ان کے احساسات کو جھنجھوڑتے ہوئے کہتا ہے: خدا ہی تو ہے جس نے دریا کو تمھارے لیے مسخر کر دیا تاکہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں چلیں اور اس کے فضل سے تم اپنا حصہ حاصل کرو، شاید کہ اس کی نعمتوں کا شکر بجالاؤ (اللہ الذی سخر لکم البحر لتجری الفلک فیہ بامرہ ولتبتغوا من فضلہ ولعلکم تشکرون)۔

کس ذات نے بحری جہازوں اور کشتیوں میں یہ خاصیت خلق فرمائی ہے کہ وہ پانی میں ڈوبتی نہیں ہیں اور کس نے ان کی حرکت کے لیے پانی کو ایسا نرم بنایا ہے کہ وہ آرام سے اس پر چلتی رہتی ہیں اور کس نے ہواؤں کو حکم دیا ہے کہ وہ منظم صورت میں سمندروں کی سطح پر چلتی رہیں اور کشتیوں کو اس پر رواں دواں رکھیں (یا کس نے بخارات کی طاقت کو ہواؤں کا جانشین بنایا ہے تاکہ وہ ان عظیم جہازوں کو بڑی تیزی کے ساتھ جاری و ساری رکھیں؟

ہم جانتے ہیں کہ گزشتہ اور موجودہ دور میں انسان کے وسائل کی حمل و نقل کا عظیم ترین اور اہم ترین ذریعہ چھوٹی، بڑی اور غول پیکر کشتیاں اور بحری جہاز ہیں جو سال بھر لاکھوں انسانوں اور ان سے زیادہ تجارتی مال کو دنیا کے دور دراز ترین علاقوں سے دوسری جگہ منتقل کرتے رہتے ہیں۔ بلکہ بعض بحری جہاز تو ایسے بھی ہیں جو ایک چھوٹے سے شہر جتنی وسعت اور آبادی کے حامل ہوتے ہیں اور تمام قسم کے وسائل اور ہر قسم کی چیزیں اُن میں موجود ہوتی ہیں۔

یقیناً اگر یہ تینوں طاقتیں موجود نہ ہوتیں تو انسان اپنی دوسری معمول کی سواریوں کے ذریعے حمل و نقل کی مشکلات کو کس طرح حل کر سکتا؟ ہر چند کہ دوسرے ذرائع آمد و رفت بھی اس کی نعمت ہیں اور اپنی اپنی جگہ پر مفید ہیں۔

پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ سورۂ ابراہیمؑ کی بتیسویں آیت میں فرمایا گیا ہے:

"وسخر لکم الفلک لتجری فی البحر بامرہ"

"کشتیوں کو تمھارے تابع فرمان کر دیا ہے تاکہ اس کے حکم کے مطابق دریا میں چلتی رہیں۔"

لیکن یہاں پر فرمایا گیا ہے: "دریا کو تمھارے تابع فرمان بنا دیا ہے تاکہ اس میں کشتیاں چلتی رہیں۔" کیونکہ وہاں پر زیادہ نظر تسخیر پر ہے۔ لہٰذا اس کے فوراً بعد فرمایا گیا ہے:

"وسخر لکم الانہار"

"اور اس نے نہروں کو بھی تمھارے لیے مسخر کر دیا ہے۔"

لیکن یہاں پر کشتیوں کی تسخیر پیش نظر ہے۔ صورت حال خواہ کچھ ہو دونوں چیزیں حکم خدا کے مطابق انسان کے لیے مسخر اور اس کے تابع ہیں اور اس کی خدمت کے لیے کمربستہ ہیں۔

اس تسخیر کا مقصد یہ ہے کہ تم" فضل خداوندی سے اپنا حصہ پاؤ" کیونکہ اس قسم کی تعبیر عام طور پر تجارت اور اقتصادی سرگرمیوں کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ البتہ مسافرین کی نقل و حرکت اور انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کی تعبیر بھی اس میں پائی جاتی ہے۔

اور خداوند تعالیٰ کے فضل سے بہرہ برداری کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان کے احساس شکر گزاری کو متحرک کیا جا سکے اور اس کے تمام احساسات کو ایک جگہ مرتکز کیا جا سکے تاکہ اس طرح سے انسان" معرفۃ اللہ" کی راہوں کو طے کر سکے۔

لفظ" فلک" (کشتی) جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں مفرد اور جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

دریاؤں، کشتیوں اور ان کے فائدوں اور برکتوں کی بیشتر وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی گیارہویں جلد میں سورۂ نحل کی ۱۴ ویں آیت کی تفسیر کا مطالعہ فرمائیں۔

کشتیاں اور بحری جہاز ایسی نعمت ہیں جو انسان کی روزمرہ کی زندگی سے زیادہ قریب کا تعلق رکھتی ہے۔ اس کے ذکر کے بعد تمام مخلوق کی تسخیر کو کلی طور پر بیان فرماتے ہوئے کہتا ہے: اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے سب کو اپنی طرف سے تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے۔ (و سخر لکم ما فی السماوات و ما فی الارض جمیعاً منہ)۔

اس نے تمہیں کس قدر حیثیت، قدر و قیمت اور عظمت عطا فرمائی ہے کہ کائنات کی تمام چیزیں تمہارے لیے مسخر کر دی ہیں اور وہ تمہارے مفادات کی نگرانی کر رہی ہیں۔ آفتاب اور ماہتاب باد اور باران، پہاڑ اور دریا، جنگل اور صحرا، درخت اور حیوان، معدنیات اور زیر زمین ذخائر غرض اس کائنات کی تمام چیزوں کو اس نے تمہاری خدمت کے لیے وقف کر رکھا ہے اور ہر چیز کو تمہارے زیر فرمان کر دیا ہے تاکہ تم اس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ اور غفلت کا شکار نہ ہو جاؤ۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ وہ فرماتا ہے:" جمیعاً منہ" یہ تمام چیزیں اپنی خصوصیات اور اختلاف کے باوجود اسی ذات کی پیدا کردہ ہیں اور اسی کے زیر فرمان تمہاری خدمت کے لیے حاضر ہیں۔

جب تمام نعمتیں اس کی جانب سے ہیں اور ساری کائنات کی خالق، مدبر اور پروردگار اسی کی ذات پاک ہے تو پھر انسان دوسروں کے پیچھے کیوں جائے اور اپنا سر ضعیف مخلوق کے آستانے پر کیوں جھکائے اور منعم حقیقی کی معرفت سے کیوں غافل ہو؟

اسی لیے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: اس میں اہل فکر کے لیے اہم نشانیاں ہیں (ان فی ذلک لآیات لقوم یتفکرون)۔

پہلی آیت میں انسانی احساسات سے استفادہ کیا گیا ہے اور اس آیت میں ان کے عقول و افکار سے کام لیا گیا ہے۔

لہ" جمیعاً منہ" کے اعراب اور اس کی ترکیب میں متعدد احتمال ملتے ہیں۔ زمخشری نے اپنی تفسیر کشاف میں دو احتمال ذکر کیے ہیں، پہلا یہ کہ" جمیعاً منہ" ما فی السماوات و ما فی الارض" کا حال واقع ہو رہا ہے۔ یعنی یہ سب کچھ تمہارے لیے مسخر ہے، حالانکہ اسی کی طرف سے ہے۔ دوسرا یہ کہ مبتدا محذوف کی خبر ہے جو تقدیری صورت میں یوں ہے:" ھی منہ جمیعاً"۔

بعض مفسرین نے ایک اور احتمال بھی ذکر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ جملہ" ما فی السماوات و ما فی الارض" کی تاکید ہے۔

کیونکہ خداوند مہربان ہر ممکنہ زبان کے ذریعے اپنے بندوں کے ساتھ باتیں کرتا ہے، کبھی تو دل کی زبان کے ساتھ اور کبھی عقل و فکر کی زبان کے ساتھ۔ ان سب میں سوائے ایک ہدف کے اور کچھ بھی مطلوب و مقصود نہیں اور وہ ہے غافل انسانوں کی بیداری اور انہیں خدائی راستے پر گامزن کرنا۔

کائنات کی مختلف موجودات کی تسخیر کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد دہم میں سورۂ ابراہیم کی آیات ۳۱ تا ۳۴ کی تفسیر میں تفصیل کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے۔

پھر کفار کے ساتھ میل جول کے موقع پر مومنین کو ایک اخلاقی سبق دیا جارہا ہے تاکہ سابق منطقی بحثوں کو اس کے ذریعے سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے۔ اسی لیے روئے سخن پیغمبر اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، مومنین سے کہہ دے کہ جو لوگ خدا کے دنوں (روزِ قیامت) کی توقع نہیں رکھتے، ان سے درگزر کریں اور سخت گیری سے کام نہ لیں۔ (قل للذین امنوا یغفروا للذین لا یرجون ایام اللہ)۔

ممکن ہے کہ وہ ایمان اور خدائی تربیت کی مبادیات سے دور ہونے کی وجہ سے سخت اور نامناسب روش اپنائے ہوئے ہوں اس لیے غلط الفاظ استعمال کرتے ہوں، لہٰذا تمہارا فرض بنتا ہے کہ تم اپنی طرف سے عظمت کا ثبوت دو اور کھلے دل کے ساتھ ایسے لوگوں سے ملاپ رکھو، مبادا ان کی ہٹ دھرمی میں اضافہ ہو اور حق سے ان کا فاصلہ بڑھتا جائے۔ تمہاری طرف سے حسن خلق اور کھلے دل کے ساتھ میل ملاپ کا مظاہرہ ایک تو ان کے دباؤ میں کمی کردے گا اور دوسرے ممکن ہے کہ ان کی ایمان کی طرف کشش کا موجب بن جائے۔

اس طرح کا حکم قرآن مجید میں کئی مرتبہ آیا ہے۔ مثلاً سورۂ زخرف آیت ۸۹ میں ہے۔

"فاصفح عنھم وقل سلام فسوف یعلمون؛

ان سے چشم پوشی کیجیے اور کہہ دیجیے" سلام ہو تم پر، لیکن بہت جلد وہ اپنا انجام جان لیں گے"۔

اصولی طور پر بے سمجھ لوگوں کے ساتھ سختی کا برتاؤ اور سزا پر اصرار، عام طور پر کسی خاطر خواہ نتیجے کا باعث نہیں بن سکتا اور ان سے بے پرواہی اور عظمت کا مظاہرہ ہی انہیں بیدار کرنے کا ذریعہ اور ہدایت کا عامل بنتا ہے۔

البتہ یہ کوئی کلیہ قاعدہ نہیں ہے، کیوں کہ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کچھ مقام ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں پر سختی اور سزا کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہیں ہوتا، لیکن ایسا اتفاق کم ہوتا ہے۔

ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ ویسے تو تمام دن خدا کے دن ہوتے ہیں لیکن "ایام اللہ" کا اطلاق خاص دنوں پر ہوتا ہے، کیونکہ یہ ان کی اہمیت اور عظمت کی علامت ہے۔

اس قسم کی تعبیر قرآن مجید میں دو مقام پر آئی ہے، ایک تو اسی آیت میں اور دوسرے سورۂ ابراہیم میں، جہاں اس کے وسیع معانی ہیں۔

احادیث میں "ایام اللہ" کی تفسیر میں مختلف دنوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ان میں سے علی بن ابراہیم کی تفسیر میں مذکور ہے کہ "ایام اللہ" سے تین روز مراد ہیں۔

حضرت امام مہدی علیہ السلام کے ظہور کا دن، موت کا دن اور قیامت کا دن۔[1]

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔

"ایام اللہ نعمائہ وبلائہ سبحانہ"

"ایام اللہ" خدا کی نعمتوں کے دن ہیں اور اس کی طرف سے آزمائش ابتلاؤں کے ذریعے ہوتی ہے۔[2]

بہر حال یہ تعبیر روزِ قیامت کی اہمیت کی علامت ہے، خداوند عالم کی آشکار اور واضح صورت میں ہر چیز اور ہر شخص پر حاکمیت کا دن، عظیم عدل وانصاف کا دن۔

تاکہ اس قسم کے لوگ اس عظمت اور عفو ودرگزر سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائیں، اس لیے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: تاکہ خداوند عالم اس دن ہر قوم کو اس کے ان اعمال کی جزا دے جو وہ انجام دیتی رہی ہے۔ (لیجزی قوما بما کانوا یکسبون)۔

کچھ مفسرین نے اس جملے کو کفار اور مجرمین کے لیے ایک قسم کی دھمکی مراد لیا ہے جبکہ بعض نے اسے مومنین کے عفو ودرگزر کی جزا کے معنوں میں لیا ہے۔

لیکن اس بات سے کوئی چیز مانع نہیں ہے کہ یہ کفار کے لیے دھمکی اور مومنین کے لیے خوشخبری ہو، جیسا کہ بعد کی آیت میں بھی اسی چیز کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

ارشاد فرمایا گیا ہے: جو شخص نیک کام کرتا ہے وہ اپنے ہی فائدہ کے لیے کرتا ہے اور برا کام کرتا ہے تو اس کا وبال اسی پر ہوگا، پھر تم سب اپنے پروردگار کی طرف لوٹائے جاؤ گے اور اپنے اعمال کا نتیجہ پالو گے۔ (من عمل صالحا فلنفسہ ومن اساء فعلیہا ثم الی ربکم ترجعون)۔

یہ تعبیر جو قرآنی آیات میں کئی بار ذکر ہوئی ہے اور مختلف عبارتوں کے ساتھ بیان ہوئی ہے اُن لوگوں کا جواب ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ہماری اطاعت یا نافرمانی خدا کو کیا نفع یا نقصان پہنچا سکتی ہے اور اس کی اطاعت یا معصیت سے نبی پر اصرار کے کیا معنی ہیں؟

یہ آیت کہتی ہے کہ یہ سب نفع یا نقصان تمہارے ہی لیے ہے اور تم ہی اپنے اعمال صالحہ کے پرتو میں ارتقائی مراحل طے کرو گے اور قربِ الٰہی کے آسمان تک پرواز کرو گے یا جرم وگناہ کے نتیجے میں پستی میں جا گرو گے اور غضبِ الٰہی کے گڑھوں اور رحمتِ خداوندی کے بعد اس کی ابدی لعنت کی اتھاہ گہرائیوں میں جا گرو گے۔

ادائے فرض کے تمام پروگرام، انبیاء کی بعثت اور کتابوں کا نزول بھی اسی لیے ہے۔ اسی لیے قرآن مجید ایک جگہ پر فرماتا ہے۔

"ومن یشکر فانما یشکر لنفسہ ومن کفر فان اللہ غنی حمید"

"جو شخص شکر بجا لاتا ہے اپنے فائدہ ہی کے لیے شکر گزاری کرتا ہے اور جو شخص کفر کرتا ہے تو خدا

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ صفحہ ۵۳۶۔

غنی و حمید ہے۔ (لقمان/۱۲)

ایک اور جگہ پر فرمایا گیا ہے:

"فمن اهتدی فلنفسه ومن ضل فانما یضل علیها"

"جو شخص ہدایت حاصل کرتا ہے اپنے ہی فائدہ کے لیے کرتا ہے اور جو گمراہی اختیار کرتا ہے، اس کا نقصان بھی اسے ہی ہوگا۔" (زمر/۴۱)

ایک اور مقام پر ہے:

"ومن تزکّی فانما یتزکّی لنفسه والی الله المصیر"

"جو شخص پاکیزگی اپناتا ہے اپنے ہی فائدے کے لیے اپناتا ہے اور سب لوگوں کی بازگشت خدا ہی کی طرف ہے۔" (فاطر/۱۸)

خلاصہ یہ کہ اس قسم کی تعبیریں اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ "خدا کی طرف بلانے والے افراد" کی دعوت، ہر پہلو سے انسانیت کی ایک عظیم خدمت ہے نہ کہ خدا کی، جو ہر چیز سے بے نیاز ہے اور نہ ہی خود انبیاء کی خدمت ہوتی ہے، کیونکہ ان کا اجر تو صرف خدا کے پاس ہے۔

اس حقیقت کی طرف توجہ، اطاعت الٰہی کی طرف اقدام اور گناہوں سے پرہیز کا ایک نہایت مؤثر عامل ہے۔

۱۶۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۚ

۱۷۔ وَاٰتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۙ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ

۱۸۔ ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰي شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاۗءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ

۱۹۔ اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا ۭ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ ۚ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ

۲۰۔ هٰذَا بَصَاۗىِٕرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ

ترجمہ

۱۶۔ اور ہم نے بنی اسرائیل کو آسمانی کتاب، حکومت اور نبوّت عطا کی اور انہیں پاکیزہ رزق دیا اور انھیں (اپنے زمانے کے) تمام لوگوں پر فضیلت عطا کی۔

۱۷۔ اور ان کو نبوّت و شریعت کے روشن دلائل عطا کیے، تو ان لوگوں نے علم آ چکنے کے بعد بس ظلم اور برتری کی خواہش کی بنا پر ایک دوسرے سے اختلاف کیا۔ لیکن یہ

لوگ جن باتوں میں اختلاف کر رہے ہیں، قیامت کے دن تیرا پروردگار ان میں فیصلہ کر دے گا۔

۱۸۔ پھر ہم نے تجھے برحق شریعت اور دین پر برقرار رکھا پس اسی کی پیروی کرتا رہ اور نادان سرکشوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرنا۔

۱۹۔ یہ لوگ خدا کے مقابلے میں ہرگز تجھے بے نیاز نہیں کر سکتے اور نہ ہی عذاب سے بچا سکتے ہیں، اور ظالم لوگ ایک دوسرے کے مددگار ہیں، جبکہ خداوندِ عالم پرہیزگاروں کا مددگار ہے۔

۲۰۔ یہ (قرآن اور آسمانی شریعت) ان لوگوں کے لیے بینائی کے وسائل اور ہدایت و رحمت کے ذرائع ہیں جو ان پر یقین رکھتے ہیں۔

تفسیر

بنی اسرائیل کی ناشکری

گذشتہ آیات میں خداوندِ عالم کی مختلف نعمتوں، شکرگزاری اور اعمالِ صالحہ سے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ ان آیات میں ان بعض گذشتہ اقوام کا تذکرہ ہے جن کو خدا کی نعمتیں ملیں، لیکن انہوں نے ان کی قدردانی نہیں کی۔

ارشاد ہوتا ہے: ہم نے بنی اسرائیل کو آسمانی کتاب، حکومت اور نبوت عطا کی اور انہیں پاکیزہ رزق دیا اور انہیں (اپنے) زمانے کے تمام لوگوں پر فضیلت عطا کی (ولقد آتینا بنی اسرائیل الکتاب والحکم والنبوة ورزقناهم من الطیبات وفضلناهم علی العالمین)۔

اس آیت میں ان پانچ نعمتوں کا تذکرہ ہے جو خداوندِ عالم نے بنی اسرائیل کو عطا کی تھیں۔ بعد میں ذکر ہونے والی نعمت کو ملا کر یہ چھ عظیم نعمتیں بن جاتی ہیں۔

سب سے پہلی نعمت تو آسمانی کتاب یعنی تورات ہے جو دینی معارف، حلال و حرام اور ہدایت و سعادت کی راہیں

بیان کرتی تھی۔

دوسری نعمت حکومت اور منصب ہے، کیونکہ ہم جانتے ہیں بنی اسرائیل ایک طویل عرصے تک نہایت ہی طاقت ور اور وسیع و عریض حکومت کے مالک رہے ہیں، نہ صرف حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام منصب حکومت پر فائز رہے ہیں، بلکہ بنی اسرائیل کے دوسرے بہت سے افراد بھی اپنے دور کے طاقت ور حکمران رہے ہیں۔

قرآنی تعبیر میں "حکم" عام طور پر فیصلہ کرنے کو کہتے ہیں، لیکن چونکہ عدل و انصاف کا محکمہ ہمیشہ حکومت ہی کا ایک اہم حصہ ہوتا ہے اور حکومت کی امداد اور طاقت کے بغیر "قاضی" کے فیصلوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی لہٰذا التزامی دلالت کے طور پر اس کا اطلاق حکمرانی پر بھی ہوتا ہے۔

تورات کے بارے میں سورۂ مائدہ کی ۴۴ ویں آیت میں ہے کہ:

"یحکم بھا النبیون الذین اسلموا"

"جو انبیاء حکم خدا کے سامنے سر جھکا چکے تھے وہ تورات ہی کے ذریعے لوگوں کے درمیان فیصلے کرتے تھے۔"

ان پر خدا کی طرف سے تیسری نعمت "نبوت" کی تھی، کیونکہ خداوند عالم نے بنی اسرائیل میں سے بہت انبیاء منتخب کئے تھے۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے:

بنی اسرائیل میں سے برگزیدہ انبیاء کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ تھی۔ [1]

ایک اور روایت میں ہے کہ بنی اسرائیل کے انبیاء کی تعداد چار ہزار افراد تھی۔ [2]

یہ سب ان پر خدا کی نعمتیں تھیں۔

چوتھے مرحلے پر مادی نعمتوں کا تذکرہ ہوتا ہے، نہایت ہی جامع اور مانع تذکرہ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے انہیں پاک و پاکیزہ روزی عطا فرمائی (ورزقناھم من الطیبات)

پانچویں نعمت بلا شرکت غیرے فضیلت و برتری اور قدرت و طاقت تھی، جیسا کہ اسی آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا گیا ہے: اور انھیں اپنے زمانے کے تمام لوگوں پر فضیلت عطا کی (وفضلناھم علی العالمین)

اس میں شک نہیں ہے کہ یہاں پر "عالمین" سے مراد اس زمانے ہی کے لوگ ہیں، کیونکہ سورۂ آل عمران کی ۱۱۰ ویں آیت کہتی ہے:

"کنتم خیر امۃ اخرجت للناس"

"تم مسلمان ایک بہترین امت تھے، جنہوں نے انسانوں کے فائدہ کے لیے عالم وجود میں قدم رکھا۔"

---

[1] مجمع البیان جلد ۹ صفحہ ۔

[2] بحار الانوار طبع جدید جلد ۱۱ صفحہ ۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ حضرت رسالت مآب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم افضل الانبیاء ہیں اسی طرح آپ کی اُمت بھی افضل ترین امت ہوگی، جیسا کہ سُورۂ نحل کی ۸۹ ویں آیت میں ہے:۔

"ویوم نبعث فی کل امۃ شھیدًا علیھم من انفسھم وجئنا بک شھیدًا علیٰ ھٰؤلاء"

"اس دن کا سوچیئے جب ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ خُود انہی میں سے مبعُوث کریں گے اور آپ کو ان سب پر گواہ ٹھہرائیں گے"

بعد کی آیت میں خداوندعالم اس چھٹی نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے فرماتا ہے جو اس قدر ناشناس قوم کو عطا کی گئی، فرماتا ہے: اور ہم نے ان کو نبوت اور شریعت کے روشن دلائل عطا کیئے (واٰتیناھم بینات من الامر)۔

ممکن ہے "بینات" سے ان روشن معجزات کی طرف اشارہ ہو جو خداوندِ عالم نے جناب مُوسیٰ بن عمران اور بنی اسرائیل کے دوسرے انبیاء کو عطا فرمائے، یا پھر منطقی اور آشکار دلائل دبراہین، قوانین اور محکم اور پختہ احکام کی طرف اشارہ ہو۔

بعض مفسرین کا احتمال ہے کہ یہ تعبیر ان روشن علامات و آیات کی طرف اشارہ ہے جو خداوندِ عالم نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں انہیں عطا کی تھیں کہ جن کے ذریعے وہ پیغمبرِ خاتم الانبیاؐ کو اپنی اولاد کی طرح پہچان سکتے تھے، جیسا کہ سُورۂ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے:

"الذین اٰتیناھم الکتاب یعرفونہ کما یعرفون ابنائھم"

"جنہیں ہم نے کتاب عطا کی وہ اُسے (رسُول اسلام کو) یوں پہچانتے ہیں جیسے اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں" (بقرہ - ۱۴۶)

لیکن اگر یہ تمام معانی آیت میں جمع کرلیے جائیں تو بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

بہر حال ان تمام عظیم نعمتوں اور روشن دلیلوں کے ہوتے ہُوئے اختلاف کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی، لیکن ان ناشکروں نے بہت جلد آپس میں اختلاف کھڑے کر دیئے، جیسا کہ اسی آیت کے ضمن میں قرآن فرماتا ہے: انہوں نے اختلاف نہیں کیا مگر اپنے پاس علم و معرفت کے آجانے کے بعد اور اس اختلاف کا منشاء وہی جاہ طلبی اور بالادستی کی خواہش تھی (وما اختلفوا الا من بعد ما جاءھم العلم بغیًا بینھم)۔

جی ہاں! انہوں نے سرکشی کے جھنڈے بلند کر دیئے اور ایک گروہ دوسرے کی جان کے درپے ہوگیا، یہاں تک کہ اتحاد و اتفاق کے ذرائع کو اختلاف اور تفرقہ بازی کے اسباب بنالیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی طاقت کمزوری میں بدل گئی، ان کی عظمت کے ستارے ڈوب گئے، ان کی حکومت دگرگوں ہوگئی اور خود دربدر کی ٹھوکریں کھانے لگے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد وہ اختلاف ہیں جو انھوں نے پیغمبر اسلامؐ کی صفات جاننے کے بعد اُن کے بارے میں ظاہر کیے۔

قرآن مجید اسی آیت کے آخر میں انہیں خبردار کرتے ہُوئے کہتا ہے: لیکن یہ لوگ جن باتوں میں اختلاف کر رہے ہیں، قیامت

کے دن تمہارا پروردگار ان کے بارے میں فیصلہ کردے گا۔ (انّ ربّك یقضی بینھم یوم القیامۃ فیما کانوا فیہ یختلفون)۔

تو گویا آپس میں اختلاف کرکے ایک توانہوں نے دنیا میں اپنی عظمت اور طاقت کو کھو دیا اور دوسرے اپنے لیے آخرت کا عذاب مول لے لیا۔

خداوندِ عالم نے بنی اسرائیل کو جو نعمتیں عطا کی تھیں اور انہوں نے کفرانِ نعمت کیا، اس کے ذکر کے بعد اس عظیم نعمت کا بیان ہے جو خالق کائنات نے پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دوسرے مسلمانوں کو عطا فرمائی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: پھر ہم نے تجھے برحق شریعت اور دین پر برقرار رکھا (ثمّ جعلناك علیٰ شریعۃ من الامر)۔

"شریعت" کا معنی ایسا راستہ ہے جو پانی تک پہنچنے کے لیے دریا وغیرہ کے کنارے پر بنایا جاتا ہے کہ جہاں پر پانی کی سطح دریا کے ساحل سے نیچے ہوتی ہے۔ بعد ازاں اس کا اطلاق ہر اس راستے پر ہونے لگا جو انسان کو منزل مقصود تک پہنچاتا ہے اور دینِ حق کے بارے میں اس کے استعمال کی وجہ یہ ہے کہ وہ دینِ حق انسان کو وحی کے سرچشمہ اور خدا کی رضا اور سعادت ابدی تک پہنچاتا ہے جو آبِ حیات کے مانند ہے۔ یہ لفظ قرآن مجید میں صرف ایک بار استعمال ہوا ہے اور وہ بھی صرف اسلام کے بارے میں۔

یہاں پر "الامر" سے مراد دین حق ہی ہے، جس کی طرف گزشتہ آیت میں ارشارہ ہو چکا ہے، جہاں پر کہا گیا ہے:

"بینات من الامر"

چونکہ یہ راستہ، نجات اور کامیابی کا ضامن ہوتا ہے، لہٰذا اس کے فوراً بعد فرمایا گیا ہے۔ "اے میرے رسول! بس تو اس کی پیروی کرتا رہ (فاتبعھا)۔

اور چونکہ اس کے برعکس جاہلوں کی خواہشات کی پیروی ہی ہوتی ہے لہٰذا آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: اور نادان سرکشوں کی خواہشاتِ نفسانی کی پیروی نہ کرنا۔ (ولا تتبع اھواء الذین لا یعلمون)۔

حقیقت یہ ہے کہ دو راستوں کے علاوہ تیسرا راستہ نہیں ہے ایک تو انبیاء اور وحی کا راستہ اور دوسرے جاہلوں کی خواہشاتِ نفسانی کا راستہ۔ اگر کوئی شخص پہلے راستے سے منہ موڑے گا تو دوسرے راستے پر چل پڑے گا اور اگر جاہلوں کے راستے سے روگردانی کرے گا تو انبیاء کی راہوں پر چل نکلے گا۔ اسی لیے تو قرآن مجید نے ہدایت کے ہر اس طرزِ عمل پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا ہے جو سرچشمہ وحی سے مدد حاصل نہیں کرتا۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ رؤسائے قریش پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آکر عرض کرنے لگے: آیئے! آپ اپنے بزرگوں کے دین کی طرف پلٹ آیئے، کیونکہ وہ ایک تو آپ سے افضل تھے اور دوسرے صحت مند۔

اس زمانے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابھی مکہ میں ہی تھے کہ اس موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی[1] اس میں ان قریشیوں کو جواب دیا گیا ہے کہ حق تک پہنچنے کا راستہ آسمانی وحی ہے جو تجھ پر نازل ہوئی ہے، نہ کہ جن خواہشات کا

---

[1] تفسیر کبیر فخر الدین رازی جلد ۲۷ صفحہ ۲۶۵۔

یہ قریشی جاہل تقاضا کرتے ہیں۔

ہمیشہ سچے دینی رہبروں نے جب بھی کوئی تازہ اور پاک دین پیش کیا، انہیں جہلاء کے ایسے ہی وسوسوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ کہتے کہ کیا تم بہتر سمجھتے ہو یا تمہارے وہ بزرگ اور آباؤ اجداد جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں؟ ان کا اصرار ہوتا کہ وہ اسی خرافاتی روش کو اپنائیں جس پر وہ لوگ خود گامزن ہیں۔ اگر ان کی اس قسم کی تجویز پر عمل درآمد کیا جاتا تو انسان ارتقاء کی طرف ایک قدم بھی نہ اُٹھا سکتا۔

بعد کی آیت درحقیقت مشرکین کے آگے جھکنے کی نہی کی ایک دلیل اور علت ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: یہ لوگ خدا کے مقابلے میں تو تجھے بے نیاز کر سکتے ہیں اور نہ عذاب سے بچا سکتے ہیں (انھم لن یغنوا عنك من اللہ شیئا)۔

اگر کوئی شخص ان کے باطل دین کی پیروی کرے گا اور عذاب الٰہی اس کے دامن گیر ہوگا تو یہ لوگ ہرگز ہرگز اس کی امداد نہیں کر سکیں گے اور اگر خداوند عالم کوئی نعمت اس سے سلب کر لے تو وہ لوگ اس کی تلافی نہیں کر سکتے۔ اس آیت میں اگرچہ رُخِ سخن پیغمبر اسلام کی ذات کی طرف ہے، لیکن مراد تمام مومنین ہیں۔

پھر فرمایا گیا ہے: ظالم لوگ ایک دوسرے کے مددگار ہیں (وان الظالمین بعضھم اولیاء بعض)۔

یہ سب ایک قماش کے لوگ ہیں اور ایک ہی راستے کے راہی ہیں، سب کمزور و ناتواں ہیں۔

لیکن یہ باور بھی آپ ہرگز نہ کریں کہ آپ اور دوسرے باایمان افراد اس وقت اگر اقلیت میں ہیں تو آپ لوگوں کا کوئی یار و مددگار نہیں ہے، کیونکہ "اللہ پرہیزگاروں کا مددگار ہے" (واللہ ولی المتقین)۔

یہ ٹھیک ہے کہ بظاہر وہ لوگ بہت بڑی تعداد میں ہیں اور بڑی طاقت و دولت کے مالک بھی ہیں، لیکن حق کی بے انتہا قدرت کے سامنے تو وہ ایک ناچیز ذرّے سے زیادہ قیمت نہیں رکھتے۔

زیر تفسیر سلسلے کی آخری آیت میں گزشتہ مضامین اور دین الٰہی کی پیروی کی طرف انبیاء کی دعوت پر تاکید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ قرآن اور شریعت ان لوگوں کے لیے بینائی کے وسائل اور ہدایت و رحمت کے ذرائع ہیں جو ان پر یقین رکھتے ہیں۔ (ھٰذا بصائر للناس وھدًی ورحمۃ لقوم یوقنون)۔

"بصائر" جمع ہے "بصیرت" کی جس کے معنی ہیں بینائی۔ ہر چند کہ یہ لفظ زیادہ تر عقلی اور فکری بینش کے بارے میں بولا جاتا ہے، لیکن کبھی ان سب امور پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو مطلب کے ادراک اور فہم کا سبب ہوتے ہیں۔

پھر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ "یہ قرآن اور شریعت بینائیاں ہیں" یعنی یہ خود عین بینائی ہیں۔ وہ بھی نہ صرف ایک بینائی بلکہ کئی بینائیاں جو نہ صرف ایک پہلو کے لحاظ سے بلکہ تمام پہلوؤں کی رُو سے زندگی میں انسان کو صحیح بینش عطا کرتی ہیں۔

اس قسم کی تعبیرات قرآن مجید کی کئی اور آیات میں بھی ہیں، جن میں سے ایک سورہ انعام کی آیت ۱۰۴ بھی ہے، جس میں ارشاد ہوتا ہے:

"قد جاءکم بصائر من ربکم"

"تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس بینائیاں آچکی ہیں"

یہاں پر آیت میں تین موضوع بیان ہوئے ہیں، ایک "بصائر" دوسرے "ہدایت" اور تیسرے "رحمت" کہ بالترتیب

تینوں ایک دوسرے کے علت و معلول بن رہے ہیں۔ روشنی عطا کرنے والی آیات اور بینائی عطا کرنے والی شریعت انسان کو ہدایت کی طرف لے جاتی ہیں اور ہدایت بھی رحمت الٰہی کا ذریعہ ہے۔

یہ بات بھی دل چسپ ہے کہ "بصائر" کو عامۃ الناس کے لیے بیان کیا گیا ہے، لیکن "ہدایت" اور "رحمت" کو ان لوگوں سے مخصوص کیا گیا ہے جو صاحبان یقین ہیں اور ایسا ہونا بھی چاہیئے کیونکہ قرآنی آیات کسی قوم اور قبیلے سے مخصوص نہیں ہیں، بلکہ جو لوگ بھی "الناس" کے مفہوم میں آتے ہیں، اس میں شریک ہیں۔ اس میں زمان و مکان کی کوئی قید نہیں ہے۔ لیکن یہ ایک فطری امر ہے کہ ہدایت یقین کی ایک شاخ ہے اور رحمتِ خداوندی بھی اسی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ لہٰذا ہر ایک کے شامل حال نہیں ہو سکتی۔

بہر حال یہ جو فرمایا گیا ہے کہ قرآن میں عین بصیرت اور عین ہدایت و رحمت ہے، یہ ایک نہایت ہی خوبصورت تعبیر ہے، جو اس آسمانی کتاب کی عظمت و تاثیر اور گہرائی و گیرائی پر دلالت کرتی ہے۔ لیکن ان لوگوں کے لیے جو ہر منزل اور متلاشی حق ہیں۔

۲۱۔ اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْیَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ؕ سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ ۝
۲۲۔ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ۝
۲۳۔ اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰی سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ یَّهْدِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝

ترجمہ

۲۱۔ جو لوگ بُرے کاموں کے مرتکب ہُوئے ہیں، کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کو ان لوگوں کے برابر کر دیں گے جو ایمان لائے اور اچھے اچھے کام بھی کرتے رہے کہ ان سب کا جینا مرنا یکساں ہوگا؟ یہ لوگ کیا بُرا فیصلہ کرتے ہیں؟
۲۲۔ اور خدا نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے تاکہ ہر شخص کو اس کے کئے کا بدلہ دیا جائے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔
۲۳۔ کیا تو نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا معبود بنا رکھا ہے؟ اور خدا نے سمجھ بوجھ کر اسے گمراہی میں چھوڑ دیا ہے (کیونکہ وہ ہدایت کے لائق نہیں) اور اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی ہے اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا ہے، تو پھر

ایسی حالت میں خدا کے سوا اسے اور کون ہدایت کر سکتا ہے؟ کیا تم غور نہیں کرتے ہو؟

تفسیر

ان لوگوں کا مرنا جینا ایک سا نہیں ہے

گزشتہ آیات میں دو مختلف اور متضاد گروہوں کا ذکر تھا، ایک مومنین کا گروہ اور دوسرا کافروں کا یا ایک پرہیزگاروں کا اور دوسرا مجرمین کا۔ اس کے بعد زیر نظر آیات میں ان دونوں گروہوں کو آمنے سامنے رکھ کر ان کا باہمی تقابل کیا گیا ہے۔

پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے، جو لوگ بُرے کاموں کے مرتکب ہوئے ہیں کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم انکو اُن لوگوں کے برابر کر دیں گے جو ایمان لائے اور اچھے اچھے کام بھی کرتے رہے کہ ان کا مرنا جینا یکساں ہوگا (ام حسب الذین اجترحوا السیئات ان نجعلھم کالذین امنوا وعملوا الصالحات سواء محیاھم ومماتھم)۔

یہ لوگ کیا بُرا فیصلہ کرتے ہیں (ساء ما یحکمون)۔

کیا یہ بات ممکن ہے کہ نور اور ظلمت، علم اور جہل، نیک اور بد اور ایمان اور کفر یکساں ہوں؟ آیا یہ بات ممکن ہے کہ نابرابر اُمور کا نتیجہ اور پھل مساوی ہو؟ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ نیک عمل مومنین، بے ایمان مجرمین سے ہر جگہ علیحدہ ہیں۔ ایمان ہو یا کفر، نیک اعمال ہوں یا بُرے، ان میں سے ہر ایک کو ان کی زندگی اور موت دونوں حالتوں میں اپنے رنگ میں رنگ لیتے ہیں۔

یہ آیت سورۂ ص کی ۲۸ ویں آیت کے مانند ہے، جس میں فرمایا گیا ہے:

"ام نجعل الذین امنوا وعملوا الصالحات کالمفسدون فی الارض ام نجعل المتقین کالفجار"

"کیا جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل انجام دیئے ہم ان کو "مفسدین فی الارض" جیسا بنا دیں؟ یا پرہیزگاروں کو فاجروں کے مانند؟

سورۂ قلم کی ۳۵ و ۳۶ ویں آیت میں بھی فرمایا گیا ہے۔

"افنجعل المسلمین کالمجرمین مالکم کیف تحکمون"

آیا ہم مسلمانوں کو گناہگاروں جیسا بنا دیں؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ کیسے فیصلے کرتے ہو؟

"اجترحوا" "جرح" کے مادہ سے ہے، جس کا معنی وہ زخم یا اثر ہے جو بیماری یا کسی اور تکلیف کی وجہ سے انسان کے بدن پر ہوتا ہے۔ چونکہ گناہ کا ارتکاب بھی گویا انسانی رُوح کو مجروح کر دیتا ہے اسی لیے "اجتراح" کا مادہ گناہوں کی انجام دہی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، بلکہ بعض اوقات اس سے بھی وسیع تر معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے، یعنی ہر قسم کا اکتساب اور ارتکاب۔

نیز انسانی اعضاء کو اس لئے "جوارح" کہتے ہیں کہ ان کے ذریعے انسان اپنے مقاصد انجام دیتا ہے اور جو کچھ چاہتا ہے حاصل کرتا ہے اور کماتا ہے۔

بہرحال یہ آیت کہتی ہے کہ یہ ایک غلط سوچ ہے کہ کوئی شخص یہ تصور کرلے کہ ایمان یا گناہ اور کفر کا انسانی زندگی میں کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ ایسا بالکل نہیں ہے، ان دونوں قسم کے لوگوں کی زندگی اور موت مکمل طور پر مختلف ہے۔

مومنین کرام ایمان اور عمل صالح کے پرتو میں ایک مخصوص قسم کے اطمینان کے حامل ہوتے ہیں، حتیٰ کہ حوادثاتِ زمانہ کے سخت سے سخت ادوار بھی ان کی روح پر ذرہ برابر اثر انداز نہیں ہوسکتے۔ جب کہ بے ایمان اور گناہوں میں لتھڑے ہوئے لوگ ہمیشہ مضطرب، بے چین اور پریشان خیالی کا شکار رہتے ہیں اگرچہ وہ نعمتوں میں سرمست ہوں، پھر بھی انہیں ہمیشہ ان کے زوال کا خطرہ رہتا ہے اور اگر مصیبت اور تکالیف میں مبتلا ہوں، تو بھی ان کے مقابلے کی تاب نہیں رکھتے، جیسا کہ سورۂ انعام کی ۸۲ ویں آیت میں ہے۔

"الذین آمنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم اولئک لھم الأمن و ھم مھتدون"

"جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے اپنے ایمان کو شرک سے آلودہ نہیں کیا ان کے لیے اطمینان خاطر ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں"

صاحب ایمان افراد خدا کے وعدوں پر مطمئن ہیں اور اس کی خاص عنایتوں کے زیرِ سایہ ہیں، جیسا کہ سورۂ مومن کی ۵۱ ویں آیت میں ہے۔

"انا لننصر رسلنا والذین آمنوا فی الحیٰوۃ الدنیا و یوم یقوم الاشھاد"

"ہم اپنے رسولوں کی اور ان لوگوں کی جو ایمان لے آئے ہیں، دنیاوی زندگی میں بھی یقیناً مدد کرتے ہیں اور جس دن گواہ کھڑے ہوں گے، اس دن (بروز قیامت) بھی۔

نورِ ہدایت، پہلے گروہ کے لوگوں کے دل کو منور کرتا ہے اور وہ اپنی مقدس منزلِ مقصود کی جانب استوار اور مضبوط قدموں کے ساتھ رواں دواں ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے:

"اللہ ولی الذین آمنوا یخرجھم من الظلمات الی النور"

"اللہ ایمان داروں کا ولی ہے، انہیں ظلمت سے نور کی طرف ہدایت کرتا ہے"

(بقرہ/۲۵۷)

لیکن دوسرا گروہ جس کی زندگی کا نہ تو کوئی واضح مقصد ہوتا ہے اور نہ ہی واضح پروگرام ہوتا ہے وہ ظلمات کی لہروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتا پھرتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

"والذین کفروا اولیائھم الطاغوت یخرجونھم من النور الی

الظلمات:

"جو لوگ کافر ہو گئے ہیں ان کے ولی طاغوت اور شیطان ہوتے ہیں کہ جو انہیں نور سے نکال کر ظلمت کی طرف لے جاتے ہیں۔" (بقرہ/۲۵۷)

مؤمنین کی یہ حالت تو اس جہان کی دُنیاوی زندگی کی ہے، لیکن بوقت وفات جو ان کے لیے عالم بقا کی جانب ایک دریچہ اور آخرت کے لیے ایک دروازہ ہوتا ہے، قرآن کی زبان میں ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ:

"الذین تتوفاھم الملائکۃ طیبین یقولون سلام علیکم ادخلوا الجنۃ بما کنتم تعملون۔"

"پرہیز گاروں کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب فرشتے ان کی رُوح کو قبض کرتے ہیں تو وہ پاک و پاکیزہ ہوتے ہیں۔ فرشتے انہیں کہتے ہیں تم پر سلام، بہشت میں داخل ہو جاؤ، یہ ان اعمال کا نتیجہ ہے جو تم انجام دیتے رہے ہو۔" (نحل/۳۲)

جب کہ بے ایمان مجرمین کے ساتھ دوسرے لفظوں میں بات کرتا ہے، جیسا کہ اسی سورت (نحل) کی ۲۸ویں اور ۲۹ ویں آیات میں ہے کہ:

"الذین تتوفاھم الملائکۃ ظالمی انفسھم فالقوا السلم ما کنا نعمل من سوء بلی ان اللہ علیم بما کنتم تعملون، فادخلوا ابواب جھنم خالدین فیھا فلبئس مثوی المتکبرین۔"

"ظالم کافروں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ جب فرشتے ان کی رُوح قبض کرتے ہیں تو وہ بے بسی کی حالت میں سر جھکا کر یہی کہتے ہیں کہ ہم بُرے کام نہیں کیا کرتے تھے، بلکہ جو کچھ تم کیا کرتے تھے خدا اس سے اچھی طرح آگاہ ہے۔ اب تم دوزخ کے دروازوں سے داخل ہو جاؤ اور اس میں ہمیشہ رہو۔ یہ متکبرین کے لیے کیسا بُرا ٹھکانا ہے۔"

خلاصہ کلام یہ کہ ان دونوں گروہوں کے درمیان دنیاوی زندگی کے تمام شعبوں، بوقت مرگ، عالم برزخ اور قیامت میں واضح فرق موجود ہے۔[1]

---

[1] مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں مفسرین نے کئی اور احتمالات بھی ذکر کیے ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ "سواء محیاھم ومماتھم" کے جملے سے مراد یہ ہے کہ بے ایمان مجرمین کی زندگی اور موت برابر ہیں، نہ تو زندگی میں ان سے خیر و برکت اور اطاعت الٰہی کی امید ہوتی ہے اور نہ ہی مرنے کے بعد، وہ زندہ تو ہیں، لیکن مردوں کے مانند۔ تو ایسی صورت میں دونوں ضمیریں مجرمین کی لوٹ رہی ہیں۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ حیات سے مراد، قیامت کے دن کی زندگی ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہو سکتا کہ مومنین اور بے ایمان لوگوں کا موت کے وقت اور قیامت کے دن زندہ ہونے کے موقع پر ایک جیسا انجام ہو، لیکن آیت کا ظاہری اعتبار سے وہی معنی صحیح ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔

بعد کی آیت درحقیقت گزشتہ آیت کی تفسیر اور توجیہ ہے پروردگار فرماتا ہے: اور خداوند عالم نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے (وخلق اللہ السماوات والارض بالحق)۔

تاکہ ہر شخص کو اس کے کیے کا بدلہ دیا جائے اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہیں کیا جائے گا۔ (ولتجزی کل نفس بما کسبت وھم لا یظلمون)۔

ساری کائنات اس بات کی غمازی کر رہی ہے کہ اس کائنات کے پیدا کرنے والے نے اسے محور حق پر ٹھہرایا ہے اور ہر مقام پر حق و عدالت حکم فرما ہے۔

جب صورت حال یہ ہے تو پھر یہ بات کیونکر ممکن ہے کہ وہ صالح العمل مومنین اور بے ایمان مجرمین کو ایک جیسا قرار دے اور یہ بات قانون خلقت میں ایک استثنائی صورت حال اختیار کرلے۔؟

فطری بات ہے کہ جو لوگ حق و عدالت کے اس قانون کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں وہ کائنات کی برکتوں اور خدا کی مہربانیوں سے بھی بہرہ مند ہوتے ہیں اور جو لوگ اس کے برخلاف قدم اٹھاتے ہیں انھیں غضب الٰہی کی آگ کا ایندھن ہی بننا چاہیئے اور عدالت کا بھی یہی تقاضا ہے۔

یہیں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ "عدالت" کا معنی "مساوات" یا "برابری" نہیں بلکہ عدالت اس بات کا نام ہے کہ ہر شخص اپنی لیاقت اور اہلیت کی بنا پر نعمات الٰہی سے بہرہ مند ہو۔

زیر تفسیر آیات میں سے آخری آیت کافروں اور مومنوں کی عدم مساوات پر ایک اور دلیل ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: بھلا تو نے اس شخص کو بھی دیکھا ہے جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا معبود بنا رکھا ہے (افرءیت من اتخذ الھہ ھواہ)۔

اور چونکہ خدا جانتا تھا کہ وہ ہدایت کے لائق ہی نہیں، لہٰذا اُس نے اسے گمراہی میں ہی چھوڑ دیا ہے (واضلہ اللہ علیٰ علم)۔

"اور اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی ہے اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا ہے" تاکہ وہ گمراہی کی وادی میں بھٹکتا پھرے (وختم علیٰ سمعہ وقلبہ وجعل علیٰ بصرہ غشاوۃ)۔

تو پھر ایسی حالت میں خدا کے سوا اسے کون ہدایت کر سکتا ہے (فمن یھدیہ من بعد اللہ)۔

"تو کیا اب بھی تم لوگ غور و فکر نہیں کرتے ہو؟" اور ایسے شخص کے اور اس شخص کے درمیان فرق نہیں سمجھتے ہو جو راہ حق کو پا چکا ہے۔ (افلا تذکرون)۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ انسان اپنی خواہشات کو اپنا معبود بنا لے؟

تو یہ بات صاف ظاہر ہے کہ جب انسان خدائی فرمان کو پس پشت ڈال دے اور اپنے دل اور ہوائے نفس کا مطیع و فرمانبردار بن جائے اور ہوائے نفس کی اطاعت کو حق کی اطاعت پر مقدم کرے تو یہی ہوائے نفس کی پرستش ہے، کیونکہ عبادت اور پرستش کا ایک معنی اطاعت بھی تو ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں بارہا شیطان یا علماء اور احبار یہود کے

بارے میں آیا ہے:

کہ کچھ لوگ شیطان کی عبادت کرتے ہیں۔" (یٰس/ ۶۰)

اور یہود کے متعلق ہے کہ:

"انہوں نے اپنے علماء کو اپنا رب اور پروردگار بنالیا ہے۔ (توبہ/ ۳۱)

اور حدیث میں ہے کہ امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام فرماتے ہیں کہ:

اما واللہ ما صاموا لھم ولا صلوا، ولکنھم احلوا لھم حراما وحرموا علیھم حلالا، فاتبعوھم وعبدوھم من حیث لا یشعرون۔"

"خدا کی قسم ان لوگوں (یہود و نصاریٰ) نے اپنے پیشواؤں کے لیے نماز اور روزے بجا نہیں لائے، لیکن ان کے پیشواؤں نے حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دے دیا اور انھوں نے اس کو تسلیم کر لیا اور ان کی پیروی کی اور بغیر توجہ کیے، ان کی عبادت اور پرستش شروع کر دی۔"[1]

لیکن بعض مفسرین نے اس تعبیر کو قریش کے بت پرستوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے کہ جس چیز کے متعلق ان کا جی چاہتا تھا اس کا بت بنا دیتے تھے اور اس کی عبادت کرنا شروع کر دیتے تھے، اور جب کسی دوسری جاذب نظر چیز کو دیکھتے تو پہلے بت کو چھوڑ کر اس کا بت بنا کر اس کی عبادت میں لگ جاتے تھے۔ اس طرح سے ان کا معبود وہ چیز ہوتی جسے ان کی نفسانی خواہشات پسند کرتیں۔[2]

لیکن "من اتخذ الھہ ھواہ" (جس شخص نے اپنا معبود اپنی خواہشات نفسانی کو بنالیا ہے) کی تعبیر پہلی تفسیر سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔

"اضلہ اللہ علی علم" کے بارے میں مشہور تفسیر تو وہی ہے جو سطور بالا میں بیان ہو چکی ہے اور جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انہوں نے اپنے ہی ہاتھوں سے چراغ ہدایت گل کر دیا ہے اور نجات کے دروازے اپنے اوپر بند کر لیے ہیں اور واپسی کے راستے برباد کر چکے ہیں تو ایسی صورت میں اللہ نے اپنے لطف و کرم اور رحمت و مہربانی کو ان سے سلب کر لیا ہے، نیک و بد کی پہچان کی صلاحیت ان سے واپس لے لی ہے، گویا ان کے دل اور کانوں کو محفوظ مقام پر بند کر دیا ہے اور اس پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر دبیز پردے ڈال دیئے ہیں۔

درحقیقت یہ سب کچھ اس چیز کے آثار ہیں جو انہوں نے اپنے لیے منتخب کی ہے اور ایسے بدبخت معبود کا نتیجہ ہے جسے انہوں نے اپنے لیے منتخب کیا ہے۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۶۹۔

[2] تفسیر در منثور جلد ۶ ص ۳۵

سچ مچ نفس پرستی کس قدر خطرناک بُت ہے، جو رحمت اور نجات کے تمام دروازوں کو انسان پر بند کر دیتا ہے اور اس بارے میں رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث کس قدر ناطق اور واضح ہے کہ:

"ما عبد تحت السماء الٰہ ابغض الی اللہ من الھوٰی"

"آسمان کے زیر سایہ ہرگز کسی معبود کی عبادت نفس پرستی جیسی عبادت سے زیادہ ناپسندیدہ نہیں ہے"۔[1]

لیکن بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ نفس پرست اور خود سر ہٹ دھرم افراد جان بوجھ کر ہدایت کی راہوں سے ہٹ کر گمراہیوں کو اختیار کرتے ہیں، کیونکہ نہ تو علم و دانش ہمیشہ ہدایت کے ہمراہ ہوتے ہیں اور نہ ہی گمراہی ہمیشہ جہالت کے ہم رکاب ہوتی ہے۔

علم اس وقت سبب ہدایت بنتا ہے جب انسان اس کے لوازمات کو اپنائے اور اس کے ساتھ ساتھ قدم اٹھائے، تب کہیں جا کر منزل مقصود تک پہنچاتا ہے، جیسا کہ قرآن مجید کچھ ہٹ دھرم کافر لوگوں کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے۔

"وجحدوا بھا واستیقنتھا انفسھم"

"انہوں نے خدا کی آیات کا انکار کر دیا، حالانکہ ان کے دل اس کی حقانیت پر یقین رکھتے تھے"۔[2]

(نمل / ۱۴)

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ آیت میں موجود ضمیروں کا مرجع خدا تعالیٰ ہے پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے، کیونکہ قرآن فرماتا ہے کہ خدا نے اسے گمراہی میں چھوڑ دیا ہے اور اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی ہے۔

ہمارے اس بیان سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ آیت میں عقیدۂ جبری کے بارے میں کوئی علامت نہیں ملتی، بلکہ اختیار کے اصول اور انسان کے اپنے ہاتھوں سے اپنی تقدیر سنوارنے پر تاکید کی گئی ہے۔

خداوند عالم کے انسان کے دل اور کانوں پر مہر لگانے اور آنکھوں پر پردہ ڈالنے کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد اوّل میں سورۂ بقرہ کی ساتویں آیت کی تفسیر میں ہم تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ **خواہشات نفسانی سب سے زیادہ خطرناک بُت ہے**: ہم ابھی حدیث میں پڑھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب بتوں سے ناپسندیدہ ترین بُت کہ جس کی عبادت کی جاتی ہے نفس پرستی کا بت ہے۔

اس بات میں ذرہ بھر مبالغہ نہیں ہے۔ کیونکہ عام قسم کے بُت ایسی چیزیں ہیں جن کی اپنی کوئی خاصیت اور خصوصیت نہیں

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۹ ص ۵۹۸۰، تفسیر روح البیان اور تفسیر مراغی اسی آیت کے ذیل میں۔

[2] تفسیر المیزان جلد ۱۸ ص ۱۸۷۔

ہوتی، لیکن خواہشاتِ نفسانی کا بُت گمراہ کُن ہے اور مختلف گناہوں اور گمراہیوں اور بے راہروی کی جانب لے جاتا ہے۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اِس بُت میں وہ خصوصیات پائی جاتی ہیں جنہوں نے اسے سب سے زیادہ قابلِ نفرت بُت کے نام کا مستحق بنا دیا ہے۔

یہ بُت برائیوں کو انسان کی نگاہ میں اتنا مزین کر دیتا ہے کہ وہ اپنے بُرے کارناموں پر فخر کرتا دکھائی دیتا ہے اور،

"وھم یحسبون انھم یحسنون صنعًا" (کہف/۱۰۴)

کے مصداق، انسان اسے صالح العمل سمجھ کر فخر کرتا ہے۔

۲۔ **شیطان کے لیے مؤثر ترین راستہ:** شیطان کے عمل دخل کا مؤثر ترین راستہ خواہشات کی اطاعت ہے، کیونکہ جب تک انسان کے اندرونی وجود میں شیطان کا ٹھکانا نہ ہو اس وقت تک وہ دلوں میں وسوسے پیدا نہیں کر سکتا اور وہ ٹھکانا نفس پرستی کے سوا اور کچھ نہیں۔ وہی چیز کہ خود شیطان جس کی وجہ سے اپنے مقام سے گر گیا اور فرشتوں کی صف اور قربِ الٰہی سے راندہ گیا۔

۳۔ **نفس پرستی ہدایت سے محرومی کا سبب:** نفس پرستی حقائق کے صحیح ادراک جیسے ہدایت کے اہم ترین ذریعے کو انسان سے سلب کر لیتی ہے اور انسان کی آنکھوں اور عقل پر پردے ڈال دیتی ہے۔ جیسا کہ زیرِ تفسیر آیات میں نفس پرستی کے مسئلے کو بیان کرنے کے بعد صاف طور پر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور قرآن کی بہت سی دوسری آیات بھی اس حقیقت کی گواہ ہیں۔

۴۔ **خدا کے مقابل:** نفس پرستی انسان کو (نعوذ باللہ) خدا سے مقابلے کے مرحلے تک لے جاتی ہے۔ جیسا کہ خواہش پرستوں کا پیشوا یعنی شیطان اس منحوس انجام سے دوچار ہوا اور آدمؑ کو سجدہ کرنے کے مسئلے پر اُس نے حکمتِ خداوندی پر اعتراض کیا، اور اسے غیر حکیمانہ سمجھا۔

۵۔ **ہوس پرستی کا انجام:** اس حد تک منحوس اور دردناک اور خطرناک ہوتا ہے کہ کبھی ایک لمحہ کی نفس پرستی انسان کو زندگی بھر کی پشیمانی اور ندامت سے دوچار کر دیتی ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک لمحے کی نفس پرستی انسان کی ساری زندگی کے نتائج اور اس کے اعمالِ صالحہ کو تباہ و برباد اور ملیامیٹ کر دیتی ہے۔ اسی لیے قرآنی آیات اور اسلامی روایات میں اس بات کو زور دے کر بیان کیا گیا ہے اور اس سے خبردار کیا گیا ہے، جیسا کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک مشہور حدیث میں آیا ہے:

"ان اخوف ما اخاف علی اُمتی الھوٰی وطول الامل اما الھوٰی فانہ یصد عن الحق، واما طول الامل فینسی الاٰخرۃ"

"دو چیزیں ایسی خطرناک ہیں، جن سے مجھے اپنی اُمت کے بارے میں خوف آتا ہے، ایک تو خواہشاتِ نفسانی کی پیروی اور دوسری لمبی چوڑی امیدیں کیونکہ نفس پرستی انسان کو حق سے باز رکھتی ہے اور لمبی چوڑی آرزوئیں آخرت کو بھلا دیتی ہیں"[1]

---

[1] بحار الانوار جلد ۷۰، صفحہ ۷۵ تا ۷۷۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ:

"ای سلطان اغلب واقوٰی"

"کون سی طاقت زیادہ غالب اور طاقت ور ہے؟"

تو آپؑ نے فرمایا:

"الھوٰی"

"خواہشاتِ نفسانی" [1]

ایک اور روایت میں ہے کہ امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے:

"وعزّتی وعظمتی وجلالی وبھائی وعلوی وارتفاع مکانی، لا یؤثر عبد ھوای علی ھواہ الا جعلت ھمہ فی آخرتہ، وغناہ فی قلبہ، وکففت عنہ ضیعتہ، وضمنت السماوات والارض رزقہ، واتتہ الدنیا وھی راغمۃ"

"مجھے اپنی عزت، عظمت، جلال، نورانیت اور بلند مقام اور مرتبے کی قسم کوئی بندہ بھی میری خواہشات کو اپنی خواہشات پر مقدم نہیں کرتا مگر یہ کہ میں اس کی تمام تر توجہات کو آخرت کی طرف مبذول کر دیتا ہوں، مخلوق سے بے نیازی کو اس کے دل میں جاگزیں کر دیتا ہوں، معاشی مسائل کو اس کے لیے آسان کر دیتا ہوں، آسمان اور زمین کو اس کی روزی کا ضامن بنا دیتا ہوں اور دُنیاوی نعمتیں سر جھکائے اس کے حضور پہنچ جاتی ہیں۔" [2]

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"احذروا اھوائکم کما تحذرون اعدائکم، فلیس شیء اعدی للرجال من اتباع اھوائھم وحصائد السنتھم"

"خواہشات نفسانی سے ویسے بچو، جیسے اپنے دشمنوں سے بچتے ہو، کیونکہ انسان کے لیے خواہشات نفسانی کی پیروی اور زبان پر جاری ہونے والے کلمات سے بڑھ کر اس کا کوئی اور دُشمن نہیں ہے۔" [3]

آخر میں ایک اور حدیث جو امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے، پیشِ خدمت ہے:

---

[1] بحار الانوار جلد ۷۰، صفحہ ۵۰ تا ۷۷۔

[2] بحار الانوار جلد ۷۰، صفحہ ۵۰ تا ۷۷۔

[3] اصول کافی جلد ۲ باب اتباع الہوٰی حدیث ۱۔

"انی لارجو النجاۃ لھذہ الامۃ لمن عرف حقنا منھم الا لاحد ثلاثۃ صاحب سلطان جائر، وصاحب ھوی والفاسق المعلن"

"اس امت سے جن لوگوں نے ہمارے حق کو پہچانا ہے میں ان کی نجات کی امید رکھتا ہوں سوائے تین قسم کے لوگوں کے۔ ایک ظالم بادشاہوں کے ساتھی، دوسرے نفس پرست اور تیسرے جو کھلم کھلا گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں (اور کسی قسم کا خوف محسوس نہیں کرتے)"۔ [1]

اس بارے میں بہت سی آیات اور روایات موجود ہیں۔

ہم اپنی اس گفتگو کو ایک بامعنی جملے کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچاتے ہیں، جو شانِ نزول کی صورت میں بیان کیا گیا ہے اور ہمارے مدعا پر زندہ گواہ ہے۔ ایک مفسر کہتے ہیں۔

ایک رات کا واقعہ ہے کہ ابوجہل ولید بن مغیرہ کے ہمراہ خانہ کعبہ کے طواف میں مشغول تھا۔ طواف کے دوران اس نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں بات شروع کر دی۔ ابوجہل نے کہا: واللہ انی لاعلم انہ صادق (خدا کی قسم میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ سچا ہے)۔

"ولید نے کہا: "چپ رہو تم کہاں سے جانتے ہو کہ وہ سچا ہے؟"

ابوجہل نے کہا: ہم اسے بچپن اور لڑکپن میں "صادق اور امین" کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ اب جبکہ اس کی عقل کامل ہو چکی ہے اور وہ شعور کے درجہ کمال تک پہنچ چکا ہے تو پھر اسے ہم کذاب اور خائن کیونکر کہہ سکتے ہیں؟ میں ایک بار پھر کہتا کہ "وہ سچ کہتا ہے"۔

ولید نے کہا: تو پھر تم اس کی تصدیق کیوں نہیں کرتے اور اس پر ایمان کیوں نہیں لاتے؟

ابوجہل نے کہا: تم چاہتے ہو کہ قریشی عورتیں آپس میں بیٹھ کر یہ کہیں کہ شکست کے خوف سے ابوطالب کے بھتیجے کے سامنے جھک گیا ہوں۔ لات وعزیٰ کی قسم میں ہرگز اس کی اتباع نہیں کروں گا اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی:۔ وختم علی سمعہ وقلبہ [2]

---

[1] بحار الانوار جلد ۔ ص ۔

[2] تفسیر مراغی جلد ۲۵ ص ۔

۲۴- وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُمْ بِذَٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۖ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ○

۲۵- وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ مَا كَانَ حُجَّتَهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا ائْتُوا بِآبَائِنَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ○

ترجمہ

۲۴- اور ان لوگوں نے کہا کہ ہماری زندگی تو بس دنیا ہی کی ہے۔ کچھ لوگ ہم میں سے مرتے ہیں اور کچھ لوگ ان کی جگہ لے لیتے ہیں اور ہم کو بس فطرت اور زمانہ ہی ہلاک کرتا ہے اور وہ اپنی ان باتوں پر یقین بھی نہیں رکھتے، بلکہ بے بنیاد گمان ہی کرتے ہیں۔

۲۵- اور جب ان کے سامنے ہماری کھلی اور روشن آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو ان کے مقابلے میں ان کے پاس کوئی دلیل تو ہوتی نہیں، سوائے اس کے کہ وہ کہیں اگر تم سچے ہو تو ہمارے باپ دادا کو زندہ کر کے لے آؤ (تاکہ وہ گواہی دیں)۔

تفسیر

دھریوں کے عقائد

ان آیات میں منکرین توحید کے بارے میں ایک اور بحث کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ البتہ یہاں پر منکرین کے ایک

خاص گروہ یعنی "دہریوں" کا نام لیا گیا ہے جو عالم ہستی اور اس کائنات میں صانع حکیم کے وجود کا مطلقاً انکار کرتے تھے، جبکہ اکثر و بیشتر مشرکین عام طور پر ظاہر میں خدا پر ایمان رکھتے تھے اور بتوں کو اس کی بارگاہ تک رسائی کے لیے اپنا شفیع سمجھتے تھے، خداوند عالم فرماتا ہے: انہوں نے کہا ہماری زندگی تو بس دُنیا ہی کی ہے، ہم میں سے کچھ لوگ مرتے ہیں اور کچھ پیدا ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ اور اس طرح سے انسانی نسل کا سلسلہ جاری ہے۔ (وقالوا ما ھی الّا حیاتنا الدنیا نموت ونحیا)۔

اور ہمیں تو زمانہ ہی ہلاک کرتا ہے (وما یھلکنا الّا الدھر)۔

اس طرح وہ ایک تو "معاد" کا انکار کرتے تھے اور دوسرے "مبداء" کا۔ پہلا جُملہ ان کے معاد کے انکار کی غمازی کرتا ہے، جبکہ دوسرا جُملہ مبداء کے انکار کی۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ اس جیسی آیات قرآن مجید کے دو اور مقامات پر بھی موجود ہیں۔ ایک سُورۂ انعام کی ۲۹ ویں آیت ہے، جس میں ہے:

"وقالوا ان ھی الّا حیاتنا الدُنیا وما نحن بمبعوثین"

"اور انہوں نے کہا کہ ہماری زندگی فقط اسی دُنیا کی ہے اور ہم پھر نہیں اُٹھائے جائیں گے"

اور دوسری سُورۂ مؤمنون کی ۳۷ ویں آیت ہے، جس میں ہے:

"ان ھی الّا حیاتنا الدنیا نموت ونحیا وما نحن بمبعوثین"

"ہماری زندگی اسی دُنیا کی ہے۔ نہیں مرتے جیتے ہیں اور ہم پھر نہیں اُٹھائے جائیں گے"

لیکن ان دونوں آیتوں میں صرف معاد کے انکار کی جھلک ملتی ہے، جبکہ زیرِ تفسیر آیت میں مبداء اور معاد دونوں کا انکار کیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ان کا زیادہ زور معاد کے انکار پر تھا، اس لیے کہ وہ اس سے زیادہ خائف اور وحشت زدہ تھے! اس کے اقرار سے ان کی زندگی میں جو تبدیلی ممکن تھی وہ اس سے بھی پریشان تھے۔

"نموت ونحیا" (ہم مرتے اور زندہ ہوتے ہیں) کی مفسرین نے کئی تفسیریں بیان کی ہیں۔ پہلی تفسیر تو وہی ہے جو ہم سطورِ بالا میں بیان کر چکے ہیں، یعنی بڑے اور عمر رسیدہ لوگ چلے جاتے ہیں اور نومولود عرصۂ زندگی میں قدم رکھتے اور ان کی جگہ لیتے ہیں۔

دوسری یہ ہے کہ یہاں پر یہ جُملہ تقدیم اور تاخر کی صُورت میں ہے، جس کا اصل معنی یہ ہے کہ ہم زندہ ہوتے اور مرتے رہتے ہیں اور اس زندگی اور موت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

تیسری یہ کہ بعض لوگ مر جاتے ہیں اور بعض زندہ رہ جاتے ہیں (ہر چند کہ انجام سب کا موت ہی ہے)

چوتھی یہ کہ ہم ابتداء میں مُردہ اور بے جان تھے، پھر ہمیں حیات و زندگی کا لباس پہنایا گیا۔ لیکن سب سے مناسب وہی پہلی تفسیر ہے۔

بہرحال یہ عقیدہ کہ اس کائنات کا فاعل حوادث دہر اور زمانہ ہے یا کچھ دوسرے لوگوں کی تعبیر کے مطابق افلاک کی گردش

اور ستاروں کی کیفیت ہے۔ گزشتہ زمانے میں یہ کچھ مادہ پرستوں کا عقیدہ تھا۔ وہ واقعات روزگار کے سلسلے کی کڑی کو افلاک تک جا ملاتے تھے۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ کائنات میں جو کچھ رونما ہوتا ہے وہ سب انہی کی بدولت ہے۔[1]

حتیٰ کہ دہریے فلسفی وغیرہ بھی افلاک کے لیے عقل کے قائل تھے اور اس کائنات کے نظم و نسق کا ذمہ دار انہیں جانتے تھے۔

اس قسم کے خرافاتی عقائد مرور ایام کے ساتھ آہستہ آہستہ ختم ہوتے گئے۔ خاص کر "علم ہیئت" کی ترقی سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ "افلاک" (بلوریں پیاز کے تہ تہ چھلکے کے مانند) نام کی کسی چیز کا خارجی اور ظاہری وجود بالکل نہیں ہے عالم بالا کے ستاروں کی بھی کرۂ زمین جیسی ساخت ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں سے کچھ بجھے ہوئے ہیں اور دوسرے کروں سے نور حاصل کرتے ہیں اور کچھ جل رہے ہیں اور نور افشانی کر رہے ہیں۔

دہریئے جب کبھی تلخ اور ناخوشگوار حوادث کا شکار ہو جاتے تو زمانے کو برا بھلا کہتے تھے، اور تعجب کی بات ہے کہ اس قسم کے عقائد کے آثار آج کی ادبیات میں بھی پائے جاتے ہیں کہ جن میں خدا پرست شعرا نے "دھوکے باز زمانے" اور "فلک کج رفتار" کو برا بھلا کہا ہے اور زمانے پر نفرین کی ہے کہ اس نے ان کے ساتھ ایسا کیوں کیا ہے؟ ایک مشہور شعر ہے:

فلک بہ مردم نادان دہد زمام مراد تو اہل دانش و فضلی ہمیں گناہت بس

"فلک تو نادان اور ان پڑھ لوگوں کی مرادیں برلاتا ہے، تم چونکہ اہل علم و فضل ہو یہی تمہارا بہت بڑا گناہ ہے۔"

ایک اور شاعر کہتا ہے:

روزگار است ایکہ گہ عزت دہد گہ خوار دارد چرخ بازیگر از ایں بازیچہ ہا بسیار دارد

(یہ زمانہ ہے کبھی عزت عطا کرتا ہے اور کبھی ذلیل و خوار کرتا ہے، بازیگر فلک اس قسم کے کھیل روزانہ کھیلتا رہتا ہے)۔

"دھر" (زمانہ) کے بارے میں بھی شعرا کا کلام ملتا ہے۔

دہر چون نیرنگ دارد چرخ چون دستان کند مغز را آشفتہ سازد عقل را حیران کند

(زمانے کی نیرنگیاں اور فلک کی کج رفتاریاں ہی ذہن کو پریشان اور عقل کو حیران کر دیتی ہیں۔

لیکن احادیث میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس بارے منقول ہے کہ:

"لاتسبوا الدھر فان اللہ ھو الدھر"

---

[1] بعض مفسرین نے ایک پانچواں احتمال بھی ذکر کیا ہے اور وہ یہ کہ یہ تناسخ (آواگون) کے عقیدہ کی طرف اشارہ ہے، جس کے کئی بت پرست معتقد تھے۔ اور وہ کہتے تھے کہ ہم ہمیشہ مرتے رہتے ہیں اور اسی دنیا میں دوسرے دھانچوں اور جسموں میں منتقل ہوتے رہتے ہیں اور یہیں پر زندہ رہتے ہیں۔ لیکن یہ تفسیر "وما یھلکنا الا الدھر" سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ کیونکہ اس جملے میں صرف ہلاکت کی بات ہو رہی ہے۔ (غور کیجیے گا)

"زمانے کو گالیاں نہ دو کیونکہ خدا ہی زمانہ ہے۔"[1]

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ زمانہ تو صرف ایک لفظ ہے، لیکن اس جہان اور عالم کا مدبر اور اس کا نظم و نسق چلانے والا تو خداوند تعالیٰ ہی ہے۔ اگر تم نے اس کائنات اور عالم کے مدبر کو بُرا بھلا کہا تو بے سوچے سمجھے خداوند قادر متعال کو برا بھلا کہو گے۔

اس بات پر شاہد ناطق ایک اور حدیث ہے، جسے حدیث قدسی کے طور پر نقل کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"یؤذینی ابن آدم یسب الدھر، وانا الدھر، بیدی الامر اقلب اللیل والنھار۔"

"فرزند آدمؑ جب زمانے کو گالیاں دیتا ہے تو اس کی یہ بات مجھے تکلیف پہنچاتی ہے کیونکہ زمانہ میں خود ہوں، ساری چیزیں میرے ہاتھ میں ہیں اور شب و روز کو میں ہی اُلٹ پھیر کرتا ہوں۔"[2]

البتہ بعض جگہ "دہر" کا معنی "زمانے والے" اور "افرادِ زمانہ" کیا گیا ہے جن کی بے وفائی کا شکوہ بزرگوں نے بھی کیا ہے۔ جیسے وہ مشہور شعر ہے جو حضرت امام حسین علیہ السلام سے نقل کیا گیا ہے کہ آپؑ نے شب عاشور فرمایا۔

یا دھر اف لک من خلیل کم لک بالاشراق والاصیل
من صاحب وطالب قتیل والدھر لا یقنع بالبدیل!

"اے زمانے! تجھ پر افسوس ہے کہ تو اچھا دوست ثابت نہیں ہوا، کتنی صبحیں اور شامیں یوں گزرتی رہیں کہ تو نے ہمارے دوستوں اور چاہنے والوں کو قتل کیا اور زمانہ بدلہ لے کر بھی راضی نہیں ہوتا۔"

اس طرح سے "دہر" کے گویا دو معنی ہوئے۔ ایک تو "زمانہ اور افلاک" جو ہمیشہ دہریوں کی توجہ کا مرکز رہا ہے اور وہ اسے آفاقی اور انسانی زندگی پر حکمران سمجھتے تھے، اور دوسرے "اہل زمانہ اور ابنائے روزگار۔"

یقینی بات ہے کہ پہلے معنی کے لحاظ سے "دھر" صرف ایک خیالی چیز ہی ہے اور اگر کوئی چیز ہے بھی تو پھر اس کی تعبیر میں غلطی کی جاتی ہے اور تمام عالم وجود پر خداوندِ عالم کی حکمرانی ہے۔ اسی لیے اسے "دھر" کا نام دیتے ہیں، لیکن دوسرے معنی کے لحاظ سے "دہر" وہ چیز ہے، جس کی دینی پیشواؤں اور بزرگوں نے بھی مذمت کی ہے۔

بہر حال قرآن مجید نے ان لوگوں کی فضول باتوں کا جواب ایک مختصر لیکن جامع جملے میں دے دیا ہے، اور قرآن مجید کے اور بھی بہت سے مقامات پر یہی جواب ملتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: وہ جو یہ کہتے ہیں کہ کوئی معاد نہیں ہے اور جہان کا مبدا بھی زمانہ ہی ہے، اپنی ان باتوں پر یقین

---

[1] تفسیر مجمع البیان جلد ۹ ص۔

[2] تفسیر قرطبی جلد ۹ ص ۵۹۹۱

نہیں رکھتے، بلکہ بے بنیاد گمان ہی کرتے ہیں۔ (وما لھم بذالك من علم ان ھم الا یظنون)۔

اس سے ملتی جلتی گفتگو سورۂ نجم کی ۲۸ ویں آیت میں ان لوگوں کے بارے میں ہے جو فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھتے تھے، ارشاد ہوتا ہے:

"وما لھم بہ من علم ان یتبعون الا الظن وان الظن لا یغنی من الحق شیئاً"

"وہ جو یہ بات کہتے ہیں اس پر انہیں خود کو یقین نہیں ہے وہ تو صرف بے بنیاد گمان کی پیروی کرتے ہیں اور گمان تو حق سے کبھی بھی بے نیاز نہیں کرتا"

یہی تعبیر حضرت عیسیٰؑ کے قتل کی نسبت کے بارے میں (نساء/ ۱۵۷) اور مشرکین عرب کے بتوں کے بارے میں عقیدے سے متعلق (یونس/ ۶۶) بھی بیان کی گئی ہے۔

یہ آسان ترین دلیل ہے جو اس قسم کے لوگوں کے سامنے پیش کی جاتی ہے کہ تمہارے پاس اپنے دعا کے ثبوت میں کوئی منطقی دلیل اور ناطق گواہ موجود نہیں ہے، صرف اٹکل پچو باتوں اور تخمینوں سے کام چلاتے رہتے ہو۔

بعد کی آیت میں معاد کے بارے میں ان لوگوں کے عقیدے کے سلسلے میں بہانہ تراشیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اور جب ان کے سامنے ہماری کھلی اور روشن آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو ان کے مقابلے میں ان کے پاس کوئی دلیل تو ہوتی نہیں، سوائے اس کے کہ وہ کہیں کہ اگر تم سچے ہو تو ہمارے باپ دادا کو زندہ کر کے لے آؤ تاکہ وہ تمہاری صداقت کی گواہی دیں۔ (واذا تتلیٰ علیھم ایاتنا بینات ما کان حجتھم الا ان قالوا ائتوا بآبائنا ان کنتم صادقین)۔[1]

وہ اس بات کے مدعی تھے کہ اگر مردوں کو زندہ کرنا حق ہے تو نمونے کے طور پر ہمارے بزرگوں اور آباؤ اجداد کو زندہ کر دو تاکہ ہم اپنی آنکھوں سے انہیں دیکھیں اور یقین کریں اور ان سے پوچھیں کہ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے؟ دیکھتے ہیں، کہ کیا وہ تمہاری تصدیق کرتے ہیں۔

جی ہاں! ان کی صرف یہی دلیل تھی اور کس قدر بودی اور بے بنیاد دلیل۔ کیونکہ خداوند تعالیٰ نے تو مردوں کے زندہ کرنے پر اپنی قدرت کی مختلف دلیلیں پیش کی ہیں مثلاً سب سے پہلے انسان کی مٹی سے پیدائش، رحم میں نطفہ کی مختلف تبدیلیاں وسیع و عریض زمین و آسمان کی آفرینش، نزولِ باراں کے بعد زمینوں کا زندہ ہونا جو کہ قرآنی آیات میں قیامت کے قیام پر منہ بولتی دلیل ہے، اب ان دلائل کے باوجود پھر کس بات کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟

---

[1] مندرجہ بالا آیت میں "حجتھم" "کان" کی خبر ہے اور "ان قالوا ....." "کان" کا اسم ہے۔

اس کے علاوہ وہ عملی طور پر ثابت کر چکے تھے کہ بہانہ تراشی کے علاوہ ان کا کوئی اور مقصد ہے ہی نہیں اور بالفرض اگر یہ سب کچھ ان کی آنکھوں کے سامنے مجسم ہو بھی جاتا تو وہ فوراً کہہ اٹھتے کہ یہ تو جادو ہے۔ جیسا کہ اس قسم کے مواقع پر انہوں نے ایسا کہا بھی ہے۔

ان کی بے بنیاد گفتگو کو "حجت" سے تعبیر کرنا درحقیقت اس بات سے کنایہ ہے کہ ان کے پاس کٹ حجتی کے علاوہ اور کوئی دلیل نہیں ہے۔

۲۶- قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ إِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝

۲۷- وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَخْسَرُ الْمُبْطِلُونَ ۝

۲۸- وَتَرٰى كُلَّ أُمَّةٍ جَاثِيَةً ۖ كُلُّ أُمَّةٍ تُدْعٰى إِلٰى كِتٰبِهَا ۚ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝

۲۹- هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ۚ إِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝

۳۰- فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِي رَحْمَتِهِ ۚ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِينُ ۝

۳۱- وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا ۖ أَفَلَمْ تَكُنْ آيٰتِي تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَكُنْتُمْ قَوْمًا مُجْرِمِينَ ۝

ترجمہ

۲۶- کہہ دیجئے کہ خدا تم کو زندہ کرتا ہے، پھر وہی تمھیں مارتا ہے، پھر قیامت کے دن کہ جس میں کسی طرح کا شک نہیں تمھیں جمع کرے گا، مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔

۲۷- اور آسمانوں اور زمین کی مالکیت اور حاکمیت خاص خدا ہی کی ہے اور جس دن

قیامت برپا ہوگی اُس دن اہل باطل خسارے میں ہوں گے۔

۲۸۔ اُس دن تم ہر اُمت کو دیکھو گے کہ (خوف اور وحشت کی شدت سے) گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوگی، اور ہر امت اپنے نامۂ اعمال کی طرف بلائی جائے گی (اور اس سے کہا جائے گا) جو کچھ تم لوگ کیا کرتے تھے، آج اُس کا تم کو بدلہ دیا جائے گا۔

۲۹۔ یہ ہماری کتاب ہے جو تم سے حق بات کہہ رہی ہے (اور تمھیں تمھارے اعمال بتا رہی ہے) جو کچھ تم انجام دیتے تھے، ہم لکھتے جاتے تھے۔

۳۰۔ لیکن جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کیے، اُنھیں ان کا پروردگار اپنی رحمت میں داخل کرے گا، یہ بہت واضح کامیابی ہے۔

۳۱۔ لیکن جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان سے کہا جائے گا تو کیا تمھارے سامنے ہماری آیتیں نہیں پڑھی جاتی تھیں؟ تم نے تو تکبر کیا اور تم لوگ تو تھے ہی مجرم۔

تفسیر

سب گھٹنے ٹیک دیں گے

یہ آیتیں درحقیقت ان دہریوں کا ایک اور جواب ہیں جو مبداء اور معاد کے منکر تھے اور گزشتہ آیات میں ان کی باتوں کی طرف اشارہ بھی ہو چکا ہے۔

چنانچہ ان آیات میں سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: کہہ دے کہ خدا ہی تم کو زندہ کرتا ہے، پھر وہی تمھیں مارتا ہے پھر تمھیں قیامت کے دن حساب و کتاب کے لیے جمع کرے گا، وہی دن کہ جس کے بارے میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ (قل اللہ یحییکم ثم یمیتکم ثم یجمعکم الی یوم القیامۃ

لاریب فیہ)۔

وہ نہ تو خدا کو مانتے تھے اور نہ ہی روزِ جزا کو اور اس آیت کے مضامین درحقیقت ان دونوں قسموں کے لیے استدلال ہیں، کیونکہ پہلے تو "حیات" کے مسئلے پر زور دیا گیا ہے، بالفاظ دیگر وہ پہلی زندگی کے وجود اور بے جان چیزوں سے زندہ چیزوں کی پیدائش کا انکار نہیں کرسکتے تھے اور یہ بات بذاتِ خود اس امر کی دلیل ہے کہ کوئی علمِ کل اور عقلِ کل موجود ہے۔ کیا یہ بات ممکن ہے کہ زندگی کا محیر العقول نظام، کائنات کے پیچیدہ اسرار اور گوناگوں صورتیں کہ جس کے بارے میں تمام دانشوروں کی عقلیں مات، مبہوت اور حیران و سرگرداں ہیں، صاحب قدرت اور صاحب علم خدا کے وجود کے بغیر منصۂ شہود پر آسکتے ہیں؟

اسی لیے تو قرآن مجید کی مختلف آیات میں حیات کے مسئلے کو توحید کی ایک علامت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ جو ذات پہلی مرتبہ زندگی عطا کرنے پر قادر ہے وہ دوبارہ زندگی عطا کرنے پر کیونکر قدرت نہیں رکھتی؟

"لاریب فیہ" (اس میں کسی قسم کا شک نہیں)، یہ عبارت جو قیامت کے بارے میں ہے اور اس کے "واقع" ہونے کی خبر دے رہی ہے نہ کہ اس کے "امکان" کی، ممکن ہے کہ پروردگارِ عالم کے "قانونِ عدالت" کی طرف اشارہ ہو، کیونکہ یہ بات تو یقینی ہے کہ اس دُنیا میں تمام حق داروں کو صحیح معنوں میں ان کا حق نہیں مل پاتا اور نہ ہی تمام ظالموں کو ان کے کیے کی صحیح معنوں میں سزا ملتی ہے اور اگر قیامت کی عدالت بھی نہ ہو تو پھر پروردگار کی عدالت اپنا مفہوم کھو دے گی۔

نیز چونکہ بہت سے لوگ ان آیات میں غور و فکر سے کام نہیں لیتے اس لیے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے (ولکن اکثر الناس لا یعلمون)۔

قیامت کا ایک نام کہ جس کی طرف مندرجہ بالا آیت میں اشارہ ہوا ہے "یوم الجمع" بھی ہے، کیونکہ تمام اوّلین و آخرین اور انسانوں کی تمام قسمیں اس روز ایک جگہ پر جمع ہوں گی۔ یہ تعبیر قرآن کی چند دیگر آیات میں بھی بیان ہوئی ہے، جن میں سے سورۂ شوریٰ کی آیت ۷، اور سورۂ تغابن کی آیت ۹ بھی ہے)۔

بعد کی آیت معاد کے مسئلے پر ایک اور دلیل ہے اور اس طرح کی گفتگو ہم قرآن کی اور بھی آیات میں پڑھ چکے ہیں۔ ارشاد فرمایا گیا ہے: اور سارے آسمانوں اور زمین کی مالکیت اور حاکمیت خاص خدا کے لیے ہے۔ (وللہ ملک السماوات والارض)۔

جو ذات تمام کائنات کی مالک اور حاکم ہے وہ یقیناً مُردوں کو زندہ کرنے پر بھی قدرت رکھتی ہے اور ایسا کام اس کی قدرت کے لیے قطعاً مشکل نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دُنیا کو آخرت کی کھیتی اور مرنے کے بعد کے جہان کے لیے نفع بخش تجارت کا مرکز قرار دیا ہے۔ لہٰذا آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: جس دن قیامت برپا ہوگی، اس دن اہلِ باطل خسارے میں رہیں گے (ویوم تقوم الساعۃ یومئذ یخسر المبطلون)۔

کیونکہ وہ زندگی کا سرمایہ کھو بیٹھے ہوں گے اور اس سے کوئی تجارت بھی نہیں کی ہوگی اور انہوں نے حسرت و غم کے سوا کوئی مال نہیں خریدا ہوگا۔

اس تجارتی منڈی میں حیات، عقل و ہوش اور دنیاوی نعمتیں انسان کا سرمایہ ہوتی ہیں۔ باطل پرست افراد اسے یہیں پر جلد ختم ہو جانے والے مال کے بدلے میں بیچ ڈالتے ہیں جب کہ روزِ قیامت صرف قلبِ سلیم، ایمان اور عمل صالح ہی کام آئیں گے۔ لیکن وہ لوگ اپنے خسارے کو اپنی ہی آنکھوں سے مشاہدہ کریں گے۔

"یخسر" "خسران" کے مادہ سے ہے، جس کا معنی ہے "سرمائے کو ضائع کر دینا" اور مفردات میں راغب کے بقول کبھی تو اس کی نسبت خود انسان کی طرف دی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے "خسر فلان" یعنی فلاں شخص نے نقصان اُٹھایا اور کبھی تجارت کی طرف دی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے "خسرت تجارتہ" یعنی اس کی تجارت نے نقصان اُٹھایا۔ اگرچہ دنیا پرست لوگ اس لفظ کو مال، مقام، منصب اور مادی نعمتوں کے بارے میں استعمال کرتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مادی خسارے سے زیادہ اہم نقصان عقل و ایمان کے سرمائے اور ثواب کو کھو دینا ہوتا ہے۔

"مبطل" "البطال" کے مادہ سے ہے، جس کے لغت میں بہت سے معانی ہیں، مثلاً کسی چیز کو باطل کر دینا، جھوٹ بولنا، ہنسی مذاق کرنا اور باطل چیز پیش کرنا وغیرہ۔ مذکورہ تمام معانی کا اطلاق مندرجہ بالا آیت پر ہو سکتا ہے۔

جن لوگوں نے حق کو باطل کر دیا، جنہوں نے باطل عقائد کا پرچار کیا، جنہوں نے انبیائے کرام علیہم السلام کے سامنے جھوٹ بولا اور ان کی باتوں کا تمسخر اڑایا، غرض سب اس دن اپنا نقصان اور خسارہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔

بعد کی آیت قیامت کے منظر کی نہایت واضح الفاظ میں تصویر کشی کر رہی ہے اور کہتی ہے: اس دن تم ہر اُمت کو دیکھو گے کہ گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوگی (وترٰی کل امۃ جاثیۃ)۔

بعض عظیم مفسرین کے اقوال سے استفادہ ہوتا ہے کہ گزشتہ زمانے میں مدعی اور مدعیٰ علیہ قاضیوں اور حکام کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھا کرتے تھے تاکہ اس طرح سے وہ دوسروں سے الگ نظر آئیں۔ قیامت کے دن بھی وہ خدا کی عظیم عدالت میں اسی طرح گھٹنے ٹیک کر بیٹھیں گے تاکہ ان پر مقدمہ چلایا جائے نیز یہ بات بھی ممکن ہے کہ یہ تعبیر ان کی خدا کے ہر قسم کے احکام و فرمان کی بجا آوری کے لیے مکمل آمادگی کی طرف اشارہ ہو، کیونکہ جو لوگ بالکل تیاری کی حالت میں ہوتے ہیں وہ گھٹنوں کے بل بیٹھا کرتے ہیں۔ یا پھر ہو سکتا ہے ان کی کمزوری، ناتوانی، خوف و ہراس کی طرف اشارہ ہو جو انہیں لاحق ہوگا (یہ تمام معانی آیت کے مفہوم میں جمع ہو سکتے ہیں)۔

"جاثیہ" کے کئی اور معانی بھی ہیں جن میں سے "لوگوں کا جمِ غفیر" اور "ٹولے ٹولے" ہونا بھی ہے۔ جو اس بات کی طرف اشارہ ہو سکتے ہیں کہ اللہ کی عدالت میں لوگوں کا جمِ غفیر ہوگا یا ہر اُمت اور ہر ٹولہ علیحدہ علیحدہ ہوں گے۔ لیکن پہلا معنی زیادہ مشہور اور مناسب ہے۔

پھر قیامت کے ایک اور منظر کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: اور ہر اُمت اپنے نامۂ اعمال کی طرف بلائی جائے گی اور اس سے کہا جائے گا جو کچھ تم لوگ کیا کرتے تھے آج اس کا تم کو بدلہ دیا جائے گا۔ (کل امۃ تدعیٰ الیٰ کتابھا

الیوم تجزون ما کنتم تعملون)۔

"یہ کتاب" نامۂ اعمال ہی ہے کہ جس میں انسان کی تمام نیکی، برائی، رفتار، گفتار اور کردار درج ہوں گے اور قرآنی الفاظ میں "لا یغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الا احصاھا" یعنی کوئی بھی چھوٹا اور بڑا کام ایسا نہیں ہوگا جو اس میں درج نہ ہو۔ (کہف: ۴۹)

"کل امۃ تدعی الی کتابھا" کی تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان کے انفرادی اعمال نامے کے علاوہ ہر اُمت اور گروہ کے اجتماعی اعمال نامے بھی ان کے سامنے پیش کیے جائیں گے۔ انسان کے دو قسم کے اعمال نامے ہوں گے۔ اگر اس معنی پر توجہ کی جائے تو بات عجیب سی معلوم ہوتی ہے، لیکن اگر غور سے کام لیا جائے تو دو طرح کے اعمال ناموں کا ہونا ایک فطری بات ہے۔[1]

"تدعی" کی تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اپنا نامۂ اعمال پڑھنے کی دعوت دی جائے گی۔ یہ معاملہ بعینہٖ سورۂ بنی اسرائیل کی چودھویں آیت سے ملتا جلتا ہے، جس میں کہا گیا ہے:

"اقرأ کتابک کفٰی بنفسک الیوم علیک حسیبًا"

"اپنے نامۂ اعمال کو پڑھو، آج یہ بات کافی ہے کہ تم اپنا حساب خود ہی کرو"

ایک بار پھر انھیں خدا کی طرف سے خطاب ہوگا اور تاکید کے طور پر ان سے کہا جائے گا:

یہ ہماری کتاب ہے جو تم سے حق کہہ رہی ہے اور تمھیں تمھارے اعمال بتا رہی ہے (ھٰذا کتابنا ینطق علیکم بالحق)۔

اس دن تم جو چاہتے تھے انجام دیتے تھے اور اس بات کا ہرگز گمان تک نہیں کرتے تھے کہ تمھارے اعمال کہیں درج بھی ہو رہے ہیں۔ لیکن ہم نے حکم دے دیا تھا کہ جو کچھ بھی تم انجام دو گے لکھتے رہیں" (انا کنا نستنسخ ما کنتم تعملون)۔

"نستنسخ" "استنساخ" کے مادہ سے ہے۔ یہ دراصل "نسخ" سے لیا گیا ہے۔ اس کا معنی کسی چیز کو کسی دوسری چیز کے ذریعے زائل کرنا ہے، مثلاً کہا جاتا ہے:

"نسخت الشمس الظل"

"سورج نے سایے کو زایل کر دیا"

بعد ازاں اس کا استعمال ایک کتاب سے دیکھ کر دوسری کتاب پر اس طرح سے لکھنے کے لیے بھی ہوا ہے کہ اصل اور پہلی کتاب بھی محفوظ رہے۔

---

[1] بعض مفسرین کا احتمال ہے کہ مذکورہ آیت میں "کتاب" سے مراد "آسمانی کتاب" ہے، جو اس امت پر نازل ہوئی ہے لیکن بظاہر آیت کا اپنا معنی اور بعد کی آیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے، کتاب کا معنی نامۂ اعمال ہے اور اکثر مفسرین اسی کے قائل ہیں۔

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اگر خدا نے حکم دیا ہے کہ انسان کے اعمال کو "استنساخ" کریں تو اس سے پہلے کوئی کتاب ہونی چاہیئے، جس سے دیکھ کر اس کے نامۂ اعمال لکھے جائیں۔ اسی لیے تو بعض مفسرین اس بات کے معتقد ہیں کہ تمام لوگوں کے اعمال پہلے سے ہی "لوح محفوظ" میں لکھے جا چکے ہیں اور اور انسانی اعمال کے محافظ فرشتے انہیں لوح محفوظ سے نقل کر کے نامۂ اعمال میں لکھتے رہتے ہیں۔

لیکن یہ معنی زیر تفسیر آیت سے چنداں مناسب نہیں ہے، جو معنی مناسب معلوم ہوتا ہے وہ ان دونوں معانی میں سے ایک ہے، پہلا یہ کہ یہاں پر "استنساخ" سے مراد خود "لکھنا" ہے۔ (جیسا کہ بعض مفسرین کہتے ہیں) اور دوسرا یہ کہ انسان کے اپنے اعمال بذات خود ایک تکوینی کتاب کے مانند ہیں جسے دیکھ کر فرشتے نسخۂ کتاب تیار کرتے ہیں اور اس کی کاپی تیار کرتے ہیں، اسی لیے قرآن کی دوسری آیات میں اس لفظ کے بجائے "کتابت" کا کلمہ استعمال ہوا ہے، جیسا کہ سورۂ یٰس کی بارہویں آیت میں ہے۔

"انا نحن نحی الموتیٰ ونکتب ما قدموا وآثارھم"

"ہم مُردوں کو زندہ کریں گے اور جو کچھ وہ پہلے بھیج چکے ہیں اسے اور ان کے باقی ماندہ آثار کو لکھتے رہتے ہیں"[1]

اعمال کے اندراج کے بارے میں کتابوں کا ذکر سورۂ یٰس کی آیت ۱۲ کے تحت تفسیر نمونہ کی جلد ۱۸ میں تفصیل سے کیا گیا ہے، جس میں انسان کے ذاتی نامۂ اعمال، امتوں کے نامۂ اعمال اور تمام انسانوں کی جامع اور عمومی کتاب کے بارے میں بڑی تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔

بعد کی آیت میں قیامت کی عدالت کے آخری مرحلے کا ذکر کیا گیا ہے، جب کہ ہر گروہ اپنے اعمال کا نتیجہ پالے گا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: لیکن جو لوگ ایمان لائے اور وہ اچھے اعمال بجا لائے، تو ان کو ان کا پروردگار اپنی رحمت میں داخل کرے گا (فاما الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات فیدخلھم ربھم فی رحمتہ)۔

یہاں پر "فاء تفریعیہ" کا آنا اس بات کی دلیل ہے کہ اعمال کی حفاظت اور عدالت الٰہی کا نتیجہ یہی ہے کہ مومنین

---

[1] امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے منقول ایک روایت میں ہے:

"ان اللہ ملائکۃ ینزلون فی کل یوم یکتبون فیہ اعمال بنی آدم"

"خدا کی طرف سے کچھ فرشتے ہیں جو روزانہ آسمان سے نازل ہوتے ہیں اور بنی آدم کے اعمال لکھتے رہتے ہیں"

شیخ طوسیؒ تفسیر "تبیان" میں مذکورہ آیت کے ذیل میں اس روایت کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

"نستنسخ" سے مراد یہ ہے کہ ہم انسانی اعمال کے محافظ فرشتوں کو حکم دیتے ہیں کہ جو اعمال ثواب یا عذاب کا موجب ہوتے ہیں وہ اس گروہ سے لے کر درج کریں اور بقیہ اعمال پر خط تنسیخ کھینچ دیں، کیونکہ پہلا گروہ انسان کے تمام اعمال کو لکھ دیتا ہے (ملاحظہ ہو تفسیر تبیان جلد ۹ صفحہ ۲۶۰)

رحمت الٰہی میں داخل ہوں گے۔

اس آیت کی رُو سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ صرف ایمان کافی نہیں ہے، بلکہ عمل صالح کی بجا آوری بھی اس کے ساتھ شرط ہے۔

"ربھم" (ان کا پروردگار) کی تعبیر خداوند کریم کے خاص لطف و کرم کی غمازی کر رہی ہے اور "بہشت" کے بجائے "رحمت" کی تعبیر اس لطف و کرم کے کمال کو ظاہر کر رہی ہے۔

آیت کے آخری جملے میں فرمایا گیا ہے: یہ بہت واضح کامیابی ہے (ذالک ھو الفوز المبین) یہ جملہ اس لطف و کرم کو اوج کمال پر پہنچا رہا ہے۔

"رحمت الٰہی" کا وسیع مفہوم ہے جو دُنیا اور آخرت دونوں پر محیط ہے۔ قرآنی آیات میں بہت سے معانی پر اس کا اطلاق ہوا ہے۔ کبھی ہدایت پر، کبھی دُشمن کے چنگل سے چھٹکارا حاصل کرنے پر، کبھی بابرکت بارش پر اور کبھی نور و ظلمت جیسی دُوسری نعمتوں پر اور بہت سے مقامات پر بہشت اور قیامت میں خدا کی نعمتوں پر بھی اس کا اطلاق ہوا ہے۔

"ذالک الفوز المبین" کا جملہ ایک مرتبہ سُورۂ انعام کی آیت ۱۶ میں بھی آیا ہے، لیکن وہاں پر "فوز مبین" (واضح کامیابی) کا ان لوگوں کے بارے میں ذکر ہوا ہے جو عذاب الٰہی سے بچ جائیں گے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

"من یصرف عنہ یومئذٍ فقد رحمہ وذالک الفوز المبین"

لیکن یہاں پر ان لوگوں کے بارے میں ہے جو بہشت اور رحمت خداوندی میں داخل ہوں گے اور حقیقت میں یہ دونوں بڑی کامیابیاں ہیں، عذاب الٰہی سے نجات اور رحمت حق کے سایے میں داخلہ۔

یہاں پر ممکن ہے یہ سوال پیش ہو کہ جو مومنین عمل صالح سے عاری ہیں آیا وہ بہشت میں نہیں جائیں گے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ضرور جائیں گے، لیکن قبل ازیں وہ جہنم میں اپنی بداعمالیوں کی سزا پائیں گے اور پاک صاف ہو کر داخل جنت ہوں گے۔ حساب و کتاب کے بعد وہی لوگ براہ راست رحمت الٰہی میں داخلہ حاصل کر سکیں گے جو ایمان کے علاوہ عمل صالح کے سرمائے کے بھی حامل ہوں گے۔

"فوز" کا لفظ جس طرح کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے اس "کامیابی" کے معنی میں ہے جس کے ساتھ "صحت و سلامتی" بھی ہو۔ یہ کلمہ قرآنی آیات میں ۱۹ مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ کہیں پر تو اس کی "مبین" کے لفظ کے ساتھ صفت بیان کی گئی ہے اور کہیں پر "کبیر" کے لفظ کے ساتھ، لیکن اکثر آیات میں "عظیم" کے لفظ کے ساتھ اس کی توصیف کی گئی ہے اور عام طور پر بہشت ہی کے سلسلے میں ہے۔ لیکن بعض مقامات پر اطاعت الٰہی اور گناہوں کی بخشش وغیرہ کے بارے میں بھی استعمال ہوا ہے۔

بعد کی آیت میں ایک اور ٹولے کے انجام کا ذکر ہے، جو ٹھیک اس گروہ کا مدمقابل ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: لیکن جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان سے کہا جائے گا: کیا تمہارے سامنے ہماری آیتیں نہیں پڑھی جاتی تھیں؟ تم نے تکبر کیا اور حق کے سامنے سر نہیں جھکایا اور تم لوگ تو گناہگار تھے (واما الذین کفروا افلم تکن ایاتی تتلی علیکم فاستکبرتم

وکنتم قومًا مجرمین)۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ یہ آیت صرف کفر کے متعلق گفتگو کر رہی ہے۔ لیکن اس میں بُرے اعمال کا تذکرہ نہیں ہے جو عذاب الٰہی میں داخل ہونے کا سبب ہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ مسئلہ کفر ہی بذاتِ خود عذاب کا موجب ہوتا ہے، یا پھر اس لیے کہ آیت کے ذیل میں "مجرمین" کی تعبیر ہی اس معنی کو ذکر کرنے کے لیے کافی ہے۔

ایک اور نکتہ یہ بھی ہے کہ یہاں پر دوزخ کی سزاؤں کا ذکر نہیں ہوا۔ دراصل پروردگار عالم کی سرزنش کا ذکر ہی بہت بڑی سزا محسوب ہوتی ہے، جس کے مقابلہ میں دوزخ کی اہمیت بہت کم ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ اس آیت سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انبیاء کی بعثت، رسولوں کے بھیجنے اور آیاتِ الٰہی کے نزول (جسے اصطلاح میں احکام عقل کی احکام شریعت کے ساتھ تاکید کا نام دیا جاتا ہے) کے بغیر خداوند رحمان کی جانب سے سزا نہیں ملے گی اور یہ اس کا انتہائی لطف و کرم ہے۔

آخری نکتہ یہ ہے کہ اس ٹولے کے لیے سب سے بڑی مصیبت ایک تو آیاتِ الٰہی کے مقابلے میں "استکبار" کا مظاہرہ ہے اور دوسری "جرم و گناہ کا دوام" ہے۔ جو "کنتم قومًا مجرمین" کے جملے سے سمجھی جاتی ہے۔

۳۲- وَاِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ ○

۳۳- وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ○

۳۴- وَقِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا وَمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ○

۳۵- ذٰلِكُمْ بِاَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّغَرَّتْكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ○

۳۶- فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

۳۷- وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○

ترجمہ

۳۲- اور جب کہا جاتا تھا کہ خدا کا وعدہ حق ہے اور قیامت میں کچھ شک نہیں ہے تو تم کہتے تھے کہ ہم نہیں جانتے کہ قیامت کیا چیز ہے؟ ہم تو اس بارے میں صرف گمان رکھتے ہیں اور اس پر یقین ہرگز نہیں رکھتے۔

۳۳۔ اور ان کے کرتوتوں کی برائیاں ان پر ظاہر ہو جائیں گی اور جس کی یہ ہنسی اڑایا کرتے تھے ان پر واقع ہو کر رہے گا۔

۳۴۔ اور ان سے کہا جائے گا، آج ہم بھی تمھیں اس طرح بھلا دیں گے، جس طرح تم نے آج کے دن کی ملاقات کو بھلا دیا تھا اور تمھارا ٹھکانا جہنّم ہے اور کوئی تمھارا مددگار نہیں۔

۳۵۔ یہ اس لیے ہے کہ تم لوگوں نے خدا کی آیتوں کو ہنسی مذاق بنا رکھا تھا اور دنیاوی زندگی نے تمھیں غرور میں مبتلا کر رکھا تھا۔ آج کے دن یہ لوگ نہ تو دوزخ سے نکالے جائیں گے اور نہ ہی ان سے کوئی عذر قبول کیا جائے گا۔

۳۶۔ بنا بریں حمد و ستائش خدا ہی کے لیے سزاوار ہے جو آسمانوں اور زمین کا پروردگار اور سارے جہانوں کا مالک ہے۔

۳۷۔ اور آسمانوں اور زمین میں اس کے لیے عظمت اور بڑائی ہے اور وہی غالب حکمت والا ہے۔

تفسیر

جس دن انسان کے بُرے اعمال ظاہر ہو جائیں گے

زیر تفسیر آیات میں سب سے پہلی آیت درحقیقت ان امور کی وضاحت ہے جو گزشتہ آیات میں اجمالی صورت میں بیان ہوئے ہیں اور خدا کی آیات اور انبیاء کی دعوت کے مقابلے میں کفار کے استکبار کی تشریح ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جب کہا جاتا تھا کہ خدا کا وعدہ سچا ہے اور قیامت میں کچھ شک نہیں ہے تو تم کہتے تھے کہ ہم نہیں جانتے کہ قیامت کیا چیز ہے، ہم تو اس بارے میں صرف گمان رکھتے ہیں اور اس پر ہرگز یقین نہیں رکھتے (و اذا قیل ان وعد اللہ حق و

الساعة لاریب فیھا قلتم ماندری ما الساعة ان نظن الا ظنا وما نحن بمستیقنین)۔

"ماندری ما الساعة" (ہم نہیں جانتے قیامت کیا چیز ہے) کی تعبیر کیوں بیان کی گئی ہے؟ جب کہ قیامت کا مفہوم ان کے لیے کوئی پیچیدہ بات نہیں تھی اور اگر انھیں کوئی شک تھا بھی تو صرف اس کے وجود کے بارے میں تھا۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ تکبر کا شکار تھے اور بالکل بے اعتنائی سے کام لیتے تھے۔ اگر ان میں حق طلبی کی تڑپ ہوتی تو روز قیامت کی حقیقت بھی ان کے لیے روز روشن کی طرح ظاہر تھی اور اس کے وجود کے دلائل بھی بہت تھے۔

یہیں سے اس سوال کا جواب بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اگر وہ قیامت کے بارے میں واقعاً شک و شبہ میں پڑے ہوئے تھے تو اس بارے میں نہ تو ان پر کسی قسم کا گناہ تھا اور نہ ہی ان پر کوئی ذمہ داری بنتی تھی، کیونکہ ان کا یہ شک و شبہ تو حق کے واضح نہ ہونے کی وجہ سے نہیں تھا، بلکہ تکبر، غرور، ہٹ دھرمی اور معاندانہ رویے کی وجہ سے تھا۔

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ ان کی اس تضاد بیانی کا مقصد مذاق اور تمسخر اڑانا تھا۔[1]

بعد والی آیت ان کی سزا اور عذاب کی بات کر رہی ہے۔ یہ سزا ہماری دنیاوی مقرر کردہ سزاؤں جیسی نہیں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وہاں پر ان کے کرتوتوں کی برائیاں ظاہر ہو جائیں گی۔ (وبدا لھم سیئات ما عملوا)۔

تمام برائیاں مجسم ہو کر سامنے آ جائیں گی اور ان کے رُوبرو واضح اور آشکار صورت میں پیش ہوں گی، ان کی ہم دم اور ہم نشین ہو کر انہیں ہمیشہ دُکھ پہنچاتی رہیں گی۔

آخر کار جس چیز کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے وہ ان پر واقع ہو کر رہے گی (وحاق بھم ما کانوا بہ یستھزؤن)۔[1]

سب سے دردناک بات یہ ہے کہ خداوند رحمان و رحیم کی جانب سے انہیں خطاب ہوگا۔ "اور کہا جائے گا آج ہم بھی تمھیں اسی طرح بھلا دیں گے، جس طرح تم آج کے دن کی ملاقات کو بھلا چکے تھے"۔ (وقیل الیوم ننساکم کما نسیتم لقاء یومکم ھذا)۔

یہ ایک ایسی تعبیر ہے جو مختلف صورتوں میں قرآن پاک میں کئی مرتبہ آئی ہے، جیسا کہ سورۂ اعراف کی ۵۱ ویں آیت میں ہے۔

"فالیوم ننساھم کما نسوا لقاء یومھم ھذا"

"آج ہم بھی انھیں بھلا دیں گے، جس طرح کہ انھوں نے آج کے دن کی ملاقات کو فراموش کر دیا تھا"۔

یہی چیز سورہ "الم سجدہ" کی ۱۴ ویں آیت میں ایک اور انداز میں ذکر کی گئی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ خداوند عالم کی ذات پاک کے لیے فراموشی ایک بے معنی سی بات ہے، کیونکہ اس کا علم تو تمام کائنات

---

[1] "حاق" "حوق" کے مادہ سے ہے جس کا معنی داخل ہونا، نازل ہونا، جا لگنا، پہنچ جانا اور گھیر لینا ہے۔ بعض حضرات کے نزدیک یہ کلمہ دراصل "حق" ہے (جس کا معنی ثابت ہونا ہے) پہلی قاف کو واؤ میں تبدیل کر کے پھر اسے الف میں بدل دیا گیا ہے۔

پر حاوی ہے۔ دراصل یہ ایک لطیف کنایہ ہے ایک مجرم اور گناہگار انسان سے بے پروائی اور بے نیازی کے لیے۔ حتی کہ ہمارے روزمرہ میں بھی یہی بات دیکھنے میں آتی ہے کہ ہم کہتے ہیں۔" تم فلاں بے وفا دوست کو ہمیشہ کے لیے بھلا دو" یعنی ایک بھولے بسرے انسان کے مانند اس سے سلوک کرو، اس کے ساتھ مہر و محبت، دیدار و ملاقات، دل جوئی اور حال احوال پوچھنا ترک کر دو اور کبھی اس کا نام تک نہ لو۔

ضمنی طور پر یہ تعبیر "اعمال کے مجسم ہونے" اور "جرم و سزا کی مناسبت" کے مسئلے پر ایک اور تاکید ہے، کیونکہ ان کا قیامت کو فراموش کر دینا اس بات کا سبب بن جائے گا کہ خداوند تعالیٰ بھی انہیں فراموشی کے خانے میں ڈال دے اور کس قدر جانکاہ اور دردناک ہو گی یہ عظیم مصیبت کہ خداوند رحیم اور مہربان کسی شخص کو گوشۂ فراموشی میں ڈال کر اسے ہر قسم کے لطف و کرم سے محروم کر دے۔

مفسرین نے یہاں پر اس نسیان کی مختلف تفسیریں بیان کی ہیں، جن سب کی رُوح تقریباً وہی مذکورہ بالا جامع معنی بن جاتی ہے، لہٰذا ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ساتھ ہی یہ بات بھی بتاتے چلیں کہ روزِ قیامت کی فراموشی سے مراد اس روز واقع ہونے والے تمام واقعات کی فراموشی ہے، خواہ وہ حساب و کتاب ہو یا کوئی اور معاملہ کہ قیامت کے انکار کے ضمن میں وہ ان سب کا انکار کر جاتے تھے۔

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ اس سے مراد قیامت کے دن لقاء الٰہی (خدا کی ملاقات) کی فراموشی ہے۔ کیونکہ قیامت کے دن کو قرآن مجید میں "یوم لقاء اللہ" (خدا کی ملاقات کا دن) کہا گیا ہے۔ البتہ یہ ملاقات اور مشاہدہ ظاہری اعظاء اور آنکھوں سے نہیں، بلکہ باطنی اعضاء اور دل کی آنکھوں سے ہوگا۔

آیت کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ان سے کہا جائے گا " تمہارا ٹھکانا جہنم ہے" (ومأواکم النار)۔

اور اگر تمہارا یہ گمان ہو کہ کوئی شخص تمہاری مدد کو پہنچے گا تو یہ بھی دو ٹوک الفاظ میں سُن لو کہ " تمہارا کوئی مددگار نہیں ہوگا" (وما لکم من ناصرین)۔

لیکن تم کیوں اور کس لیے اس مصیبت میں گرفتار ہوئے ہو؟ تو سن لو کہ " یہ اس لیے ہے کہ تم لوگوں نے خدا کی آیتوں کو ہنسی مذاق بنا رکھا تھا اور دُنیاوی زندگی نے تمہیں غرور میں مبتلا کر رکھا تھا" (ذالکم بانکم اتخذتم آیات اللہ ھزوًا وغرتکم الحیوۃ الدنیا)۔

اصولی طور پر یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں ایک "غرور" اور دوسرے "استہزاء" مغرور اور خود پسند افراد دوسروں کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور عام طور پر ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ان کے غرور کا اصل سبب بھی دنیاوی زندگی کا مال و متاع، قدرت و طاقت، مال و دولت اور عارضی کامیابی ہوتی ہے جو کم ظرف لوگوں کو اس قدر غافل کر دیتی ہے کہ وہ انبیائے الٰہی کی دعوت تک کو ذرہ بھر اہمیت نہیں دیتے، بلکہ اپنے آپ کو ان کی دعوت کے مطالعے تک کی زحمت دینا گوارا نہیں کرتے۔

آیت کے آخر میں ایک مرتبہ پھر اسی چیز کو دوسرے لفظوں میں دہرایا گیا ہے اور اس کی تاکید کی گئی ہے جو گزشتہ آیت میں بیان ہو چکی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: آج کے دن وہ نہ تو دوزخ سے نکالے جائیں گے اور نہ ہی ان سے کوئی عذر قبول کیا جائے گا (فالیوم لایخرجون منھا ولاھم یستعتبون)۔ [1]

وہاں پر ان کے ٹھکانے اور مستقل جگہ کی بات ہو رہی تھی اور یہاں پر ان کے دوزخ سے نہ نکلنے کی گفتگو ہو رہی ہے۔ وہاں پر بتایا گیا تھا کہ ان کا کوئی مددگار نہیں ہوگا اور یہاں پر فرمایا گیا ہے کہ ان کا کوئی عذر قابل قبول نہیں ہوگا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے لیے کوئی راہِ نجات نہیں ہے۔

اس سورت کے آخر میں توحید اور معاد کی بحث کو تکمیل کے لیے دو آیتوں میں ربوبیت کی وحدت اور خداوندِ عالم کی عظمت، قدرت اور حکمت کو بیان کیا جا رہا ہے اور اس حصے میں خداوندِ عالم کی پانچ صفات کو منعکس کیا جا رہا ہے اور یہی اس سورت کا اہم ترین حصہ ہے۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: بنابریں تمام حمد و ستائش خدا ہی کے سزاوار ہے۔ (فللّٰہ الحمد)۔

کیونکہ وہی ہے "جو سارے آسمانوں کا پروردگار، زمین کا رب اور سارے جہانوں کا مالک ہے" (رب السماوات ورب الارض رب العالمین)۔

"رب" کا معنی مالک، مدبر، حاکم اور اصلاح کرنے والا ہے۔ اسی لیے جو بھی خیر اور برکت ہے، اسی کی ذات پاک کی جانب سے ہے۔ اسی لیے تمام تعریفیں اسی کی ذات کی طرف لوٹ جاتی ہیں، حتی کہ پھول کی تعریف، چمن کی لطافت، نسیم سحر کی دلربائی اور ستاروں کی زیبائی کا ذکر اسی پاک ذات کی ستائش ہے، کیونکہ ان کا سب کچھ ذاتِ کردگار کی جانب سے اور اسی کے لطف و کرم سے ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ایک مرتبہ فرماتا ہے کہ سارے آسمانوں کا پروردگار، پھر کہتا ہے زمین کا رب اور آخر میں فرماتا ہے کہ تمام کائنات اور کائنات والوں کا مالک، یہ سب کچھ اس لیے ہے تاکہ ارباب النوع اور مختلف خداؤں کے عقیدے کی نفی کی جائے، جس کے بہت سے لوگ معتقد تھے اور ان سب کو ربوبیت کی توحید کی جانب متوجہ کیا جائے۔

ذاتِ کردگار کی "حمد" و "ربوبیت" کے ساتھ توصیف کرنے کے بعد تیسری صفت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے: سارے آسمانوں اور زمین میں اس کے لیے بڑائی، عظمت، سربلندی اور بلند و بالا مرتبہ ہے (وله الکبریاء فی السماوات والارض)۔

کیونکہ اس کی عظمت کے آثار آسمانوں کی وسعتوں اور زمین کی پہنائیوں، بلکہ سراسر کائنات میں پائے جاتے ہیں۔

اس سے پہلی آیت میں اس کی ربوبیت یعنی کائنات کی مالکیت اور تدبیر کی بات ہو رہی تھی اور یہاں پر اس کی

---

[1] "یستعتبون" کے معنی اور اس کے اصل مادہ کے بارے میں تفسیر نمونہ کی سولہویں جلد میں سورۂ روم کی ۵۷ ویں آیت کی تفسیر میں ضروری وضاحت کی جا چکی ہے۔

عظمت کا تذکرہ ہے کہ ہم جس قدر زمین و آسمان کی آفرینش کے بارے میں غور و فکر کرتے جائیں اسی قدر اس سے زیادہ آشنا اور آگاہ ہوتے جائیں گے۔

آخر میں چوتھی اور پانچویں صفت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہی غالب اور ناقابل تسخیر قادر اور مطلق صورت میں حکمت والا ہے (وھو العزیز الحکیم)۔

اس طرح سے "علم" "قدرت" "عظمت" "ربوبیت" اور "محمودیت" کی مجموعی صورت مکمل ہو جاتی ہے اور یہ اس کی اہم ترین صفات اور اسماء حسنیٰ کا مجموعہ ہے۔

اور گویا یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ:

"لہ الحمد فاحمدوہ، وھو الرب فاشکروا لہ، ولہ الکبریاء فکبروہ، وھو العزیز الحکیم فاطیعوہ"

"حمد اسی کی ذات کے لیے مخصوص ہے، لہٰذا اسی کی حمد بجالاؤ، وہی پروردگار ہے۔ لہٰذا اسی کا شکر ادا کرو، عظمت اسی کی ذات کو زیبا ہے، لہٰذا اس کی تکبیر بجالاؤ اور وہ عزیز و حکیم ہے لہٰذا اسی کی اطاعت کرو۔"

اس طرح سے سورۂ "جاثیہ" جو خداوند عالم کی "عزیز و حکیم" صفات کے ساتھ شروع ہوئی تھی، انہی اوصاف کے ساتھ اپنے اختتام کو پہنچتی ہے، اس سورت کے سارے مندرجات بھی اس کی بے انتہا عزت و حکمت کے گواہ ہیں۔

پروردگارا! تجھے اپنی عظمت و کبریائی کی قسم، تجھے اپنے مقام ربوبیت، عزت و حکمت کی سوگند، ہمیں اپنے فرمان کی بجا آوری کے رستوں پر ثابت قدم رکھ!

خداوندا! ہر قسم کی حمد و ستائش تیری ذات کے لیے مخصوص ہے اور ہر قسم کی توفیق کہ جو ہمارے نصیب میں ہے، تیرے بے پناہ الطاف و اکرام کی وجہ سے ہے، اِن نعمتوں کو ہمارے لیے قائم و دائم اور روز افزوں فرما!

بارالٰہا! ہم سب تیرے احسانوں میں مستغرق ہیں، تو ہمیں اپنے شکر کی بجا آوری کی توفیق عنایت فرما!

آمین یارب العالمین

تفسیر سورۂ جاثیہ تمام ہوئی

۱۴ شعبان ۱۴۰۵ھ

چھبیسویں پارے کا آغاز

سُورۂ احقاف

مکہ میں نازل ہوئی
اس کی ۳۵ آیات ہیں

تاریخ آغاز
۱۴ شعبان ۱۴۰۵ھ

سُورۂ احقاف

کے

مضامین

یہ سُورت مکی سُورتوں میں سے ہے۔ البتہ کچھ مفسرین کی رائے میں اس کی چند آیات مدینہ میں نازل ہوئی ہیں۔ اس کی تشریح ہم انہی آیات کے ضمن میں کریں گے۔ زمان و مکان کے پیشِ نظر اس کا نزُول اس زمانے میں ہوا جب شرک کے خلاف جدّوجہد جاری تھی، توحید، معاد اور اسلام کے بنیادی مسائل کی طرف دعوت دی جارہی تھی، لہٰذا یہ سُورت بھی اسی تناظر میں گفتگو کررہی ہے۔ مجموعی طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس سُورت کے پیشِ نظر مندرجہ ذیل امور ہیں:۔

① — قرآن کی عظمت کا بیان۔
② — ہر طرح کے شرک اور بُت پرستی کے خلاف دو ٹوک موقف۔
③ — لوگوں کو معاد اور پروردگار کی عدالت کے مفہوم کی فہمائش۔
④ — ضمنی طور پر مشرکین اور مجرمین کے لیے تنبیہ کے طور پر قوم عاد کی داستان کا ایک حصّہ بھی بیان کیا گیا ہے جو سرزمینِ احقاف میں سکونت پذیر تھی (سُورت کا نام بھی یہیں سے لیا گیا ہے)۔
⑤ — پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کے عمومی اور وسیع ہونے کا تذکرہ، اس حوالے سے کہ یہ انسانوں کے علاوہ جنات کے لیے بھی ہے۔
⑥ — مومنین کے لیے تشویق اور کفار کے لیے انذار بھی اس سُورت میں موجُود ہے اور امید و خوف کے مبادی بھی اس میں موجود ہیں۔
⑦ — پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صبر و استقامت کی تلقین کی گئی ہے اور گزشتہ عظیم پیغمبروں کے نقشِ قدم پر زیادہ سے زیادہ چلنے کی دعوت دی گئی ہے۔

اس سُورت کے فضائل

ایک حدیث کہ جو رسُولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے، اس میں اس سُورت کی فضیلت یوں وارد ہوئی ہے:۔

"من قرأ سورة الاحقاف اعطی من الاجر بعدد کل رمل فی الدنیا عشر حسنات، ومحی عنه عشر سیئات ورفع له عشر درجات۔

"جو شخص سورہ احقاف کی تلاوت کرے گا اسے دُنیا میں موجود ریت کے ہر ذرّے کے بدلے دس نیکیاں دی جائیں گی اور دس برائیاں مٹائی جائیں گی اور دس درجے بلند کیے جائیں گے۔[1]

"احقاف" جمع ہے "حقف" (بروزن رزق) کی، جس کا معنی ایسی چلنے والی ریت ہے جو جنگل اور بیابان میں ہواؤں کے چلنے سے مستطیل اور ٹیڑھی ٹیڑھی شکل میں ایک دوسرے پر جمع ہوتی رہتی ہے۔ قومِ عاد کی سرزمین کو بھی اسی وجہ سے "احقاف" کہتے تھے کہ وہ اس نوعیت کا ایک ریگستان تھی۔ مندرجہ حدیث کی تعبیر بھی اسی چیز کی طرف اشارہ ہے۔

ظاہر سی بات ہے کہ اس قسم کے حسنات اور درجات صرف الفاظ کی تلاوت سے حاصل نہیں ہو جاتے، بلکہ ایسی تلاوت مراد ہے جو تعبیر ہی، بیدار کرنے والی اور ایمان و تقویٰ کے راہ پر چلانے والی ہو اور سچ مچ سورۂ احقاف کے مضامین اپنے اندر ایسا اثر رکھتے بھی ہیں، بشرطیکہ انسان طالب حقیقت اور آمادۂ عمل ہو۔

ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"من قرأ کل لیلة او کل جمعة سورة الاحقاف لم یصبه الله عزوجل بروعة فی الحیوة الدنیا، وامنه من فزع یوم القیامة ان شاء الله۔[2]

"جو شخص ہر رات یا ہر جمعہ کو سورۂ احقاف کی تلاوت کرتا ہے، خداوند بزرگ و برتر اس سے دُنیا کی وحشت اور خوف اُٹھا لیتا ہے اور قیامت کے دن کی وحشت سے بھی وہ اس کی امان میں آجاتا ہے۔"

---

[1] تفسیر مجمع البیان، سورہ احقاف کا آغاز۔

[2] تفسیر مجمع البیان اور تفسیر نور الثقلین سورہ احقاف کا آغاز۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱۔ حٰمٓ ۚ
۲۔ تَنۡزِیۡلُ الۡکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَکِیۡمِ
۳۔ مَا خَلَقۡنَا السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَ مَا بَیۡنَہُمَاۤ اِلَّا بِالۡحَقِّ وَ اَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا عَمَّاۤ اُنۡذِرُوۡا مُعۡرِضُوۡنَ

ترجمہ

خداوند رحمان و رحیم کے نام سے۔

۱۔ حٰم۔
۲۔ یہ کتاب عزیز اور حکیم خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔
۳۔ ہم نے سارے آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے اُسے صرف حق کے ساتھ ایک خاص معین وقت تک کے لیے پیدا کیا ہے، لیکن کافروں کو جن چیزوں سے ڈرایا جاتا ہے وہ ان سے مُنہ پھیر لیتے ہیں۔

تفسیر

اس کائنات کی تخلیق حق کی بنیاد پر ہے

یہ سُورہ "حوامیم" کے خاندان کی سات سُورتوں میں سے ایک ہے، جن کے اوائل میں "حٰم" کا کلمہ مذکور ہے

حروفِ مقطعات کی تفسیر میں عموماً اور "حٰمٓ" کی تفسیر میں خصوصاً سورۂ بقرہ، آلِ عمران، اعراف اور گزشتہ "حٰمٓ" سورتوں کے آغاز میں بہت سے مطالب بیان ہو چکے ہیں، یہاں پر ان کے دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ صرف اسی حد تک اکتفا کرتے ہیں کہ یہ جھنجھوڑ کر رکھ دینے والی، تحرک انگیز اور معانی و مطالب سے معمور قرآنی آیات "حا" اور "میم" وغیرہ، جیسے سادہ — حروف تہجی سے مرکب ہیں۔ خدا کی عظمت کے لیے یہی بات کافی ہے کہ وہ اس قدر عظیم چیز کو اس حد تک سادہ حرفوں سے وجود میں لایا ہے کہ اگر لوگ قیامت تک بھی اس کے اسرار و رموز میں غور و فکر سے کام لیتے رہیں تو بھی نت نئے مطالب حاصل کرتے رہیں گے۔

شاید اسی لیے فوراً ہی فرمایا گیا ہے: "یہ کتاب خداوندِ عزیز و حکیم (قادر و توانا) کی طرف سے نازل ہوئی ہے"۔ (تنزیل الکتاب من اللہ العزیز الحکیم)۔

یہ وہی تعبیر ہے جو ان تین سورتوں کے آغاز میں بیان ہو چکی ہے، جن کے اوّل میں "حٰمٓ" ہے (سورہ مومن حاشیہ اور احقاف)۔

یقینی بات ہے کہ ایک ناقابلِ تسخیر قدرت اور بے کراں حکمت ضروری ہے کہ جو اس قسم کی کتاب نازل کرے۔

"تدوینی کتاب" کے بعد "تکوینی کتاب" کا ذکر فرمایا گیا ہے اور آسمانوں اور زمین کی عظمت اور حقانیت کی بات کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے تو سارے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، کو صرف حق کی اساس پر پیدا کیا ہے (ما خلقنا السماوات والارض وما بینھما الّا بالحق)۔

نہ تو اس کی آسمانی کتاب میں کوئی خلاف حق کلمہ موجود ہے اور نہ ہی اس کی کائنات میں غیر موزوں اور حق کے مخالف کوئی چیز موجود ہے، سب کچھ موزوں، نپا تلا اور حق کے ہم گام اور ہم آہنگ ہے۔

لیکن جس طرح اس تخلیق کا آغاز ہے اسی طرح اس کا انجام بھی ہے۔ لہٰذا آیت کے اگلے حصے میں فرمایا گیا ہے: ہم نے اس کے لیے ایک خاص وقت معین کر دیا ہے (واجل مسمّٰی)۔

جس کے پہنچتے ہی دُنیا فنا ہو جائے گی۔ چونکہ یہ کائنات حق پر استوار ہے اور کسی مقصد کے تحت تخلیق ہوئی ہے لہٰذا فطری طور پر اس کے بعد ایک اور جہان ہونا چاہیئے، جس میں اعمال کے نتائج کی چھان پھٹک کی جائے۔ بنا بریں اس کائنات کی حقانیت ہی بذاتِ خود معاد کے وجود پر ایک دلیل ہے، وگرنہ یہ کائنات کھوکھلی، بے بنیاد اور بے انداز ظلم کی حامل ہوتی۔

باوجودیکہ قرآن حق ہے اور تخلیق کائنات بھی برحق، ہٹ دھرم کفار جن چیزوں سے ڈرائے جاتے ہیں، ان سے منہ پھیر لیتے ہیں" (والذین کفروا عما انذروا معرضون)۔

ایک طرف تو قرآنی آیات پے در پے انہیں اس بات کا خوف دلا رہی ہیں کہ تمہیں ایک عظیم عدالت کا سامنا

کرتا ہے، دوسری طرف اپنے خاص نظام کے تحت تخلیق کائنات بذات خود متنبہ کر رہی ہے کہ حساب وکتاب ہوگا لیکن یہ بے پرواہ غافل نہ تو اس پر توجہ کرتے ہیں اور نہ ہی اُس پر۔

"معرضون" "اعراض" کے مادہ سے ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر وہ تکوینی اور تدوینی آیات کا سامنا کریں تو حقائق کا ادراک کرلیں گے، لیکن وہ تو اپنا مُنہ ہی پھیرے ہُوئے حق سے گریز پا ہیں تاکہ ان کی تقلیدی، تخیلات پر مبنی اور خواہشات نفسانی کے تحت عمل میں آنے والی رفتار میں کوئی تبدیلی نہ آجائے۔

۴۔ قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ائْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○

۵۔ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ ○

۶۔ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ○

ترجمہ

۴۔ ان سے کہہ دیجیے کہ مجھے بتاؤ کہ خدا کو چھوڑ کر جن کی تم عبادت کرتے ہو، کیا تم نے ان کو دیکھا ہے کہ انہوں نے زمین میں کچھ پیدا کیا ہو یا آسمانوں کے بنانے میں ان کی کچھ شرکت ہو؟ اگر تم سچ کہتے ہو تو اس سے پہلے کوئی آسمانی کتاب یا گذشتہ لوگوں کے علم کے آثار میں سے کچھ ہو تو میرے سامنے پیش کرو (تاکہ تمہاری بات کی سچائی کی دلیل بن سکے)۔

۵۔ اور اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہو سکتا ہے جو خدا کے بجائے ایسے کو پکارے جو اسے قیامت تک جواب ہی نہ دے، بلکہ بالکل ان کی آواز ہی نہیں سنتے۔

۶۔ اور جب لوگ عرصۂ قیامت میں جمع کیے جائیں گے، تو وہ معبود ان کے دشمن ہو

جائیں گے، حتی کہ ان کی عبادت کا انکار کریں گے۔

تفسیر

گمراہ ترین لوگ

گذشتہ آیات میں زمین و آسمان کی تخلیق کی بات ہو رہی تھی کہ یہ سب کچھ خداوند عزیز و حکیم کی طرف سے ہے۔ اس بات کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کائنات میں اس کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے، کیونکہ وہی ذات عبادت کے لائق ہے جو کائنات کی خالق اور مدبر ہے اور یہ دونوں صفات اس کی ذات پاک میں موجود ہیں۔

اس بحث کی تکمیل کے لیے زیر تفسیر آیات میں روئے سخن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کر کے فرمایا گیا ہے: ان مشرکین سے کہہ دے کہ مجھے بتاؤ کہ خدا کو چھوڑ کر جن کی تم عبادت کرتے ہو کیا تم نے دیکھا ہے انہوں نے زمین میں کیا چیز پیدا کی ہے؟ (قل ارءیتم ما تدعون من دون اللہ ارونی ماذا خلقوا من الارض)۔

" یا آسمانوں کی تخلیق، مالکیت اور ان کے چلانے میں ان کی کچھ شرکت ہے؟ (ام لھم شرک فی السماوات)۔

جب تمہیں یہ بات تسلیم ہے کہ بتوں کا نہ تو ارضی موجودات کی تخلیق میں کوئی عمل دخل ہے اور نہ ہی آفتاب و ماہتاب، ستاروں اور عالم بالا کی مخلوق کی آفرینش میں اور تم خود علی الاعلان اس بات کا اعتراف کرتے ہو کہ ان سب کا خالق اللہ ہے[1] تو پھر اپنی مشکلات کے حل اور برکتوں کے حصول کے لیے بے خاصیت اور عقل و شعور سے عاری مخلوق یعنی بتوں کے دامن سے کیوں وابستہ ہو؟

اگر فرض کیجیے تم یہ کہتے ہو کہ تخلیق و آفرینش کے معاملے میں ان کی شرکت ہے تو پھر اگر تم سچ کہتے ہو تو اس سے پہلے کوئی آسمانی کتاب جو تمہاری باتوں کی تصدیق کرے یا گذشتہ لوگوں کے علم کے آثار جو اس بات کی گواہی دیں میرے سامنے پیش کرو (ایتونی بکتاب من قبل ھذا او اثارۃ من علم ان کنتم صادقین)۔

قصہ مختصر یہ کہ دلیل یا تو نقلی پہلو کی حامل ہوگی اور آسمانی وحی کے ذریعے پیش ہوگی یا عقلی اور منطقی ہوگی یا پھر دانش وروں کی گواہی کے ذریعے ہوگی، جب کہ تم لوگ بتوں کے متعلق دعووں کے سلسلے میں نہ تو وحی الٰہی اور آسمانی کتاب سے ثبوت پیش

---

[1] یہ معنی قرآن مجید کی چار آیتوں میں ذکر ہوا ہے اور اس بارے میں تفسیر نمونہ کی اسی جلد میں سورۂ زخرف کی ۸۷ ویں آیت میں مزید تفصیل کا مطالعہ فرمائیں۔

کر سکتے ہو اور نہ ہی زمین و آسمان کی تخلیق کے بارے میں ان کی شرکت کو ثابت کر سکتے ہو تاکہ اس عقلی دلیل کے ذریعے تم ان کی خدائی کو منوا سکو اور نہ ہی گزشتہ لوگوں کے علوم کے آثار تمہاری باتوں کی تصدیق کرتے ہیں۔ لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا دین اور مسلک خرافات اور جھوٹے توہمات اور خیالات کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

اسی لیے "ارونی ماذا خلقوا من الارض" کا جملہ عقلی دلیل کی طرف اشارہ ہے اور "ایتونی بکتاب من قبل ھذا" آسمانی وحی کی طرف اشارہ ہے اور "اثارۃ من علم" کی تعبیر گزشتہ انبیاء اور ان کے اوصیاء کی سنت یا سابقہ دانشوروں کے آثار ہیں[1]

"اثارۃ" (بروزن حلاوۃ) کے بارے میں علمائے لغت اور ارباب تفسیر نے چند ایک معانی ذکر کیے ہیں "کسی چیز سے باقی رہ جانے والا حصہ" "روایت" اور "علامت" لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ سب معانی ایک ہی مطلب کی طرف لوٹ رہے ہیں اور وہ کسی چیز کا اثر ہوتا ہے جو باقی رہ جاتا ہے اور اس کے وجود کی دلیل ہوتا ہے۔

اس سے ملتی جلتی گفتگو اور بت پرستوں کے مقدمے اور ان کے مواخذے کے بارے میں سورہ فاطر کی چالیسویں آیت میں یوں بیان ہوا ہے۔

"قل ارءیتم شرکاءکم الذین تدعون من دون اللہ ارونی ماذا خلقوا من الارض ام لھم شرک فی السماوات ام اٰتینٰھم کتٰبا فھم علٰی بینٰت منہ بل ان یعد الظٰلمون بعضھم بعضا الا غرورا"

یہ بات قابل توجہ ہے کہ زمین کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

"ماذا خلقوا من الارض"

"زمین میں سے کیا چیز خلق کی ہے؟"

اور آسمانوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

"ام لھم شرک فی السماوات"

"یا آسمانوں کی تخلیق میں ان کی کوئی شرکت ہے؟"

یعنی دونوں جگہوں پر شرکت کی بات ہو رہی ہے کیونکہ شرک در عبادت کا اصل سرچشمہ خالقیت اور تدبیر میں شرک ہی ہوتا ہے۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مشرکین عام طور پر خلقت کے معاملے کو ذاتِ خدا ہی سے مخصوص سمجھتے تھے تو پھر ان تین دلائل میں سے کسی ایک کا مطالبہ کس لیے کیا گیا ہے؟

جواباً گذارش ہے کہ اس قسم کا مطالبہ مشرکین میں سے مختصر تعداد کے لوگوں سے ہے جو بت پرستوں میں موجود تھے اور بتوں کو تخلیقی امور میں حصہ دار سمجھتے تھے۔ یا پھر یہ مسئلہ فرض کی صورت میں ذکر کیا گیا ہے، یعنی بالفرض اگر تم یہ دعویٰ کرتے ہو کہ کائنات

---

[1] اصول کافی میں ایک روایت میں امام محمد باقرؑ سے منقول ہے جو آپ نے اس جملے کی تفسیر میں ارشاد فرمائی ہے کہ "انما عنی بذالک علم اوصیاء الانبیاء" یعنی گزشتہ انبیاءؑ کے اوصیاء کا باقی ماندہ علم مراد ہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر نور الثقلین جلد ۴ صفحہ۔

کی تخلیق میں بُت بھی شریک ہیں تو تمھیں یاد رکھنا چاہیئے کہ تمھارے پاس اس دعوٰی کی نہ تو کوئی عقلی دلیل ہے اور نہ ہی نقلی اور نہ عقلاء کی کوئی گواہی تمھارے پاس موجود ہے۔

اس سے اگلی آیت میں ان مشرکین کی گمراہی کی گہرائیوں کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس سے بڑھ کر اور کون گمراہ ہوسکتا ہے جو خدا کو چھوڑ کر کسی ایسی چیز کی پرستش کرے جو اس کی پکار کا قیامت تک جواب ہی نہ دے سکے (ومن اضل ممن یدعوا من دون اللہ من لا یستجیب لہ الی یوم القیامۃ)۔

نہ صرف ان کے بلاوے کا جواب نہیں دیتے بلکہ ان کی باتوں کو بھی بالکل نہیں سُن پاتے۔" اور وہ ان کی دُعا اور ندا سے بھی بالکل غافل ہیں" (وھم عن دعائھم غافلون)۔

بعض مفسرین نے اس آیت میں ضمیر کا مرجع بے جان بتوں کو جانا ہے اس نسبت سے کہ مشرکین عرب کے اکثر و بیشتر معبود یہی بُت تھے اور بعض نے ان فرشتوں اور انسانوں کو ضمیر کا مرجع جانا ہے جو معبود بنائے گئے تھے، کیونکہ جنات اور فرشتوں کے عبادت گزار بھی عربوں میں کم نہیں تھے۔ اس آیت کی تمام تعبیریں چونکہ ذوی العقول سے مناسبت رکھتی ہیں لہٰذا اسی معنی کی زیادہ تائید کرتی ہیں۔

لیکن اس بات سے بھی کوئی امر مانع نہیں ہے کہ ہم آیت کے مفہوم کی وسیع معنوں میں تفسیر کریں اور اس طرح کے تمام معبود آیت میں جمع ہوں خواہ جاندار ہوں یا بے جان، صاحبان عقل ہوں یا بے عقل چیزیں۔ البتہ ذوی العقول سے مناسبت رکھنے والی تعبیریں اصطلاحی طور پر "غلبہ" کے باب سے ہوں۔

اگر آیت یہ کہتی ہے کہ وہ معبود انہیں تا قیامت جواب نہیں دیں گے تو اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ قیامت کے دن انہیں جواب دیں گے، جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے، بلکہ یہ ایک مروجہ تعبیر ہے کہ جو ابدی اور ہمیشہ کی نفی کے لیے استعمال ہوتی ہے، جس طرح ہم عام طور پر کہتے ہیں کہ اگر تم اس سے قیامت تک بھی مانگتے رہو تو وہ تمھیں ہرگز قرضہ نہیں دے گا۔ یعنی وہ یہ کام بالکل نہیں کرے گا، نہ یہ کہ قیامت کے دن تمھاری درخواست قبول کرے گا۔

یہ بھی معلوم ہے کہ ہر قسم کی سعی و کوشش جستجو اور دعاؤں کی قبولیت صرف اسی دُنیا میں سُود مند ہے، جب یہ دُنیا ختم ہو جائے گی تو یہ ساری باتیں بھی از خود ختم ہو جائیں گی۔

اس سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہوگی کہ "جب مشرک لوگ قیامت کے دن جمع کیے جائیں گے تو وہ معبود ان کے دشمن ہو جائیں گے، حتی کہ ان کی عبادت کا بھی انکار کریں گے" (واذا حشر الناس کانوا لھم اعداء وکانوا بعبادتھم کافرین)۔

جو معبود صاحبانِ عقل ہیں وہ تو باقاعدہ طور پر ان سے دشمنی کریں گے۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام اپنے عبادت گزاروں سے برات کا اظہار کریں گے اور فرشتے بھی اسی طرح کریں گے، حتی کہ شیاطین اور جنات بھی ان سے نفرت اور بیزاری کا اظہار کریں گے۔ اور جو بے عقل چیزیں ہیں خدا تعالیٰ انہیں بھی زندگی اور عقل عطا فرمائے گا تاکہ وہ لب کشائی کر کے اپنے عابدوں سے دشمنی اور نفرت کا اظہار کریں۔

اس سے ملتا جلتا معنی قرآن مجید کی دیگر آیات میں بھی ذکر ہوا ہے، جن میں سے ایک سورہ فاطر کی چودھویں آیت ہے۔ اس میں مشرکین سے خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

"ان تدعوھم لا یسمعوا دعاءکم ولو سمعوا ما استجابوا لکم ویوم القیامۃ یکفرون بشرککم ولا ینبئک مثل خبیر۔"

"اگر تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری پکار کو نہیں سنتے، اگر سن بھی لیں تو اس کو قبول نہیں کر سکتے اور قیامت کے دن بھی تمہارے شرک اور عبادت کا انکار کر دیں گے اور خدا جیسی آگاہ ذات کے مانند تمہیں اور کوئی مطلع نہیں کر سکتا۔"

اس آیت میں وہ تمام باتیں موجود ہیں جو زیر تفسیر آیت میں ہیں۔ البتہ تھوڑے سے فرق کے ساتھ، لیکن معبود اپنے عابدوں کی عبادت سے کیسے انکار کریں گے، جب کہ وہاں پر تو انکار کی جگہ بھی نہیں ہوگی؟

ممکن ہے کہ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ وہ درحقیقت اپنی خواہشات نفسانی کی عبادت کیا کرتے تھے نہ کہ معبودوں کی کیونکہ بت پرستی کا اصل سرچشمہ خواہش پرستی ہی ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ قیامت کے دن معبودین کی اپنے عبادت گزاروں سے عداوت اور دشمنی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کا ذکر صرف یہیں پر کیا گیا ہو بلکہ انسانیت کے بطل جلیل حضرت ابراہیمؑ بت شکن کا ایک قول سورۂ عنکبوت کی ۲۵ ویں آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ:

"وقال انما اتخذتم من دون اللہ اوثانا مودۃ بینکم فی الحیوۃ الدنیا ثم یوم القیامۃ یکفر بعضکم ببعض ویلعن بعضکم بعضا۔"

"ابراہیمؑ نے کہا تم نے تو خدا کو چھوڑ کر بتوں کو اپنے لیے خدا بنا لیا ہے، جو اس دنیاوی زندگی میں ہی تمہاری دوستی کا ذریعہ ہیں، لیکن قیامت کے دن ایک دوسرے سے کافر ہو جاؤ گے اور ایک دوسرے کو لعنت کرو گے۔"

سورۂ مریم کی ۸۲ ویں آیت میں ہے:

"کلا سیکفرون بعبادتھم ویکونون علیھم ضدا۔"

"وہ بہت جلد عبادت کرنے والوں کی عبادت کا انکار کریں گے اور ان کی مخالفت کریں گے۔"

۷۔ وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۝

۸۔ اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ اِنِ افْتَرَیْتُهٗ فَلَا تَمْلِكُوْنَ لِیْ مِنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَا تُفِیْضُوْنَ فِیْهِ ؕ كَفٰى بِهٖ شَهِیْدًۢا بَیْنِیْ وَبَیْنَكُمْ ؕ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ۝

۹۔ قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَاۤ اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِكُمْ ؕ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤى اِلَیَّ وَمَاۤ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۝

۱۰۔ قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَكَفَرْتُمْ بِهٖ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ عَلٰى مِثْلِهٖ فَاٰمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۝

ترجمہ

۷۔ جب ہماری واضح آیتیں ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو کفار اس حق کے بارے میں جو ان کے لیے آچکا ہے، کہتے ہیں یہ تو کھلم کھلا جادو ہے۔

۸۔ بلکہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس نے ان آیات کی خدا کی طرف جھوٹ نسبت دی ہے، تو کہہ دے کہ اگر میں نے ان کی خدا کی طرف جھوٹ نسبت دی ہے تو (ضروری

ہے کہ وہ مجھے ذلیل وخوار کرے اور) تم خدا کے سامنے میرا دفاع نہیں کر سکو گے۔ وہ ان کاموں کو بہتر جانتا ہے جن میں تم داخل ہوتے ہو، یہی بات کافی ہے کہ اللہ میرے اور تمھارے درمیان گواہ ہے اور وہی بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

۹۔ کہہ دے کہ میں نیا رسول نہیں ہوں، اور میں نہیں جانتا کہ خدا میرے ساتھ اور تمھارے ساتھ کیا کرے گا؟ میں تو صرف اسی بات کی پیروی کروں گا جو مجھ پر وحی ہوتی ہے، اور میں تو بس علانیہ طور پر ڈرانے والا ہوں۔

۱۰۔ یہ بھی کہہ دے کہ مجھے یہ بتاؤ کہ اگر یہ قرآن خدا کی طرف سے ہو اور تم اس کا انکار کر بیٹھو، حالانکہ بنی اسرائیل میں سے ایک گواہ اس کی گواہی بھی دے دے اور ایمان بھی لے آئے اور تم تکبر کر بیٹھے (تو تم سے بڑھ کر کون گمراہ ہوگا؟) خداوند عالم قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔

تفسیر

کہہ دیجئے میں کوئی نیا رسول نہیں ہوں

یہ آیات بھی حسب سابق مشرکین کی کیفیت بیان کر رہی ہیں اور آیاتِ خداوندی کے ساتھ ان کے برتاؤ کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: جب ہماری واضح آیتیں ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو کفار اس حق کے بارے میں جو ان کے لیے آچکا ہے، کہتے ہیں یہ تو کھلم کھلا جادو ہے (واذا تتلی علیھم اٰیاتنا بینات قال الذین کفروا للحق لما جاءھم ھٰذا سحر مبین)۔

وہ ایک طرف تو قرآن مجید کی دلوں میں زود رس اور عجیب گہری تاثیر کا انکار بھی نہیں کر سکتے تھے اور دوسری طرف قرآن مجید کی حقانیت اور عظمت کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے لیے تیار بھی نہیں تھے، لہذا قرآن پاک کی اس تاثیر کو گمراہ کن تفسیر کے ساتھ کھلم کھلا جادو کا نام دیتے تھے، جو بذاتِ خود ان کا درپردہ ایک قسم کا یہ اعتراف تھا کہ قرآن انسانی قلوب

میں انتہائی زیادہ تاثیر رکھتا ہے۔

بنابریں مندرجہ بالا آیت میں لفظ "حق" "انہی قرآنی آیات" کی طرف اشارہ ہے، اگرچہ بعض مفسرین نے اس کا معنی "نبوت" یا "اسلام" یا "پیغمبر اسلام" کے دوسرے معجزات، کیا ہے، لیکن آیت کے آغاز کو پیش نظر رکھتے ہوئے پہلی تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

لیکن انہوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھ گئے اور کھلے بندوں "کہتے ہیں، اس نے ان آیات کو خدا کی طرف جھوٹی نسبت دی ہے "(ام یقولون افتراہ)۔

اس موقع پر خداوند عالم اپنے پیغمبر کو حکم دیتا ہے کہ وہ ایسے لوگوں کا منہ توڑ جواب دیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: ان سے کہہ دے اگر ایسا ہی ہے، جیسے تم سمجھتے ہو اور میں نے اس قرآن کو خدا کی طرف جھوٹ منسوب کر دیا ہے، تو لازم ہے کہ وہ مجھے رسوا کرے اور تم لوگ خدا کے سامنے میرا دفاع نہیں کر سکو گے۔ (قل ان افتریتہ فلا تملکون لی من اللہ شیئا)۔[1]

یہ بات کیسے ہو سکتی ہے کہ خداوند عالم ان "آیات بینات" اور اس جاودانی معجزے کو کسی جھوٹے شخص کے ہاتھوں پر ظاہر کرے؟ یہ بات خدا کی حکمت اور اس کے لطف سے بعید ہے۔

جیسا کہ سورۂ حاقہ کی آیا ۴۴ تا ۴۷ میں ہے:

"ولو تقوّل علینا بعض الاقاویل، لاخذنا منہ بالیمین، ثم لقطعنا منہ الوتین، فما منکم من احد عنہ حاجزین"

"وہ (پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہماری طرف ناروا باتوں کی نسبت دیتا ہے، تو ہم اسے اپنی طاقت کے ذریعے پکڑیں گے اور اس کے دل کی رگ کو کاٹ ڈالیں گے۔ اور تم میں سے ایک شخص بھی ہمیں اس کام سے نہیں روک سکتا اور نہ ہی اس کا دفاع کر سکتا ہے۔

اس لیے یہ بات کیسے ممکن ہے کہ میں تمہاری خاطر اس خطرناک کام میں ہاتھ ڈالوں اور تم کیونکر باور کر سکتے ہو کہ میں اس قسم کا جھوٹ بولنے لگوں اور خدا بھی مجھے ایسے ہی چھوڑ دے، بلکہ بڑے بڑے معجزات میرے اختیار میں دے دے؟

پھر ان کی تنبیہ کے طور پر فرمایا گیا ہے: لیکن خدا ان کاموں کو دوسرے لوگوں سے بہتر جانتا ہے جن میں تم داخل ہوتے ہو اور وقت آنے پر تمہیں سخت سے سخت سزا دے گا (ھو اعلم بما تفیضون فیہ)۔[2]

---

[1] "ان افتریتہ" کا جملہ جملہ شرطیہ ہے کہ جس کی جزاء محذوف ہے اور تقدیری طور پر یوں ہے۔

"ان افتریتہ اخذنی وعاجلنی بالعقوبۃ۔

[2] "ما تفیضون فیہ" میں "ما" کا کلمہ ممکن ہے کہ موصولہ ہو اور ناروا تہمتوں کے معنی میں ہو جو پیغمبرؐ پر لگائی جاتی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جی ہاں! وہ ان سب تہمتوں کو جانتا ہے جو تم مجھ پر لگاتے ہو، اس کے بھیجے ہوئے کے مقابلے میں کھڑے ہو چکے ہو، اسے بھی جانتا ہے اور زہریلے پروپیگنڈے کے ذریعے لوگوں کو راہِ حق سے منحرف کر رہے ہو، اس سے بھی باخبر ہے۔

بعد کے جملے میں اس بات کو مزید زور دے کر بیان کیا جا رہا ہے، لیکن کچھ اور لہجے میں، یہی بات کافی ہے کہ خدا میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے (کفیٰ بہ شھیداً بینی وبینکم)۔

وہ رسالت کی دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں میرے صدق و صفا، میری سعی و کوشش اور میری تگ و دو کو بھی جانتا ہے اور تمہارے کذب و افترا، تمہاری ریشہ دوانیوں اور دسیسہ کاریوں کو بھی دیکھ رہا ہے اور یہی چیز میرے اور تمہارے لیے کافی ہے۔

البتہ انہیں توبہ اور راہ راست پر آجانے کی رہنمائی کے طور پر فرمایا گیا ہے: "وہ غفور بھی ہے اور رحیم بھی" بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے (وھو الغفور الرحیم)۔

وہ توبہ کرنے والوں کو بخش دیتا ہے اور انہیں اپنی رحمت واسعہ میں شامل فرما لیتا ہے۔

اگلی آیت میں فرمایا گیا ہے: کہہ دے کہ میں کوئی نیا رسول نہیں ہوں جو دوسرے رسولوں سے مختلف ہو (قل ما کنت بدعاً من الرسل)۔

اور کیا میں نہیں جانتا کہ خدا میرے ساتھ کیا کرے گا اور تمہارے ساتھ کیا کرے گا؟ (وما ادری مایفعل بی ولا بکم)۔

میں تو صرف اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں، جو مجھ پر وحی کی جاتی ہے (ان اتبع الا ما یوحیٰ الیّ)۔

"اور میں تو بس اعلانیہ طور پر ڈرانے والا ہوں" (وما انا الا نذیر مبین)۔

یہ مختصر لیکن جامع اور معنی خیز جملے مشرکین کے بہت سے اعتراضات کے جواب ہیں۔ کبھی تو وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت پر تعجب کرتے تھے کہ ایک بشر کیونکر خدا سے تعلق پیدا کر سکتا ہے؟

کبھی کہتے کہ کھانا کیوں کھاتا ہے اور بازار میں کیوں چلتا پھرتا ہے؟

کبھی وہ عجیب و غریب معجزات کا تقاضا کرتے اور ہر ایک کی اپنی اپنی تمنا ہوتی۔

کبھی انھیں یہ توقع ہوتی کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غیب کا دروازہ کھولا ہوا ہے اور انھیں آئندہ کے تمام واقعات سے مطلع فرما دیں گے۔

اور کبھی تو وہ توحید کی دعوت اور معبود کے وحدہٗ لاشریک ہونے پر بھی تعجب کرتے تھے۔

(باقی حاشیہ صفحہ نمبر سے) تھیں۔ اس لحاظ سے "فیہ" کی ضمیر اسی کی طرف لوٹ رہی ہے اور اگر یہ "ما" مصدریہ ہو تو "فیہ" کی ضمیر یا "قرآن" کی طرف لوٹے گی یا پھر "حق" کی طرف۔ تو ایسی صورت میں "تفیضون" کا معنی کسی کام میں فساد ڈالنے کی غرض سے داخل ہونا" ہوگا۔

یہ آیت ایک اجمالی جواب ہے ان تمام باتوں اور حیلہ سازیوں کا۔

رسول اللہؐ فرماتے ہیں کہ میں کوئی نیا تازہ پیغمبر نہیں ہوں کہ جس نے توحید کی دعوت کی ہے، مجھ سے پہلے کئی انبیاء ہو گزرے ہیں جو سب کے سب نوعِ بشر میں سے تھے۔ وہ لباس بھی پہنتے تھے اور کھانا بھی کھاتے تھے، ان میں سے کوئی بھی مطلق غیب جاننے کا دعوے دار نہیں تھا۔ بلکہ ہر ایک یہی کہتا کہ ہم غیب کے بارے میں وہی کچھ جانتے ہیں جو کچھ خدا نے ہمیں بتایا ہے۔

ان میں سے کوئی بھی لوگوں کی قدم قدم پر معجزوں کی فرمائش اور نفسانی آرزو کے سامنے نہیں جھکا۔

یہ اس لیے ہے کہ سب لوگوں کو پتہ چل جائے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی خدا کے بندوں میں سے ایک بندہ ہیں۔ ان کی قدرت اور ان کا علم بھی خدا کے علم و قدرت کے مقابلے میں محدود ہے، قدرت مطلقہ اور علم مطلق صرف اور صرف ذاتِ کردگار کے ساتھ مخصوص ہے اور یہ ایسے حقائق ہیں جن سے لوگوں کو باخبر رہنا چاہیئے اور اپنے ناروا اعتراضات کا سلسلہ بند کر دینا چاہیئے۔

یہ سب جوابات اس گفتگو کے بعد ذکر ہوئے ہیں جو گزشتہ آیات میں بیان ہو چکی ہے کہ کبھی تو رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جادوگری کی تہمت سے متہم کرتے اور کبھی ان پر افترا اور کذب کی تہمت لگاتے۔ ان سب ناجائز تہمتوں کا اصل سبب وہ توہمات تھے جن کا اس آیت میں جواب دیا گیا ہے۔

یہاں سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اس آیت کا مفہوم ان دوسری آیات کے منافی نہیں ہے، جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غیب سے باخبر ہیں، جیسا کہ سورۂ فتح میں مکہ کی فتح اور مسجد الحرام میں داخلے کے بارے میں ہے (ملاحظہ ہو سورۂ فتح آیت ۲۷) یا جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں سورۂ آلِ عمران آیت ۴۹ میں ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

"انبئکم بما تأکلون وما تدخرون فی بیوتکم"

"میں تمہیں ان چیزوں سے باخبر کرتا ہوں جو تم کھاتے ہو یا جمع کرتے ہو"

یہ اور اس قسم کی دوسری آیات کیونکہ جس آیت کی ہم تفسیر کر رہے ہیں وہ "مطلق علم غیب" کی نفی کر رہی ہے نہ کہ مطلقاً "علم غیب" کی بالفاظ دیگر یہ آیت استقلالی اور ذاتی علم غیب کی نفی کر رہی ہے، لیکن وہ آیات اس علم غیب کی بات کر رہی ہیں جو خدا کی طرف سے عطا کیا گیا ہے۔

ہماری اس گفتار پر شاہد سورۂ جن کی ۲۶ ویں اور ۲۷ ویں آیات ہیں، جن میں کہا گیا ہے:

"عالم الغیب فلا یظهر علی غیبه احدًا الا من ارتضی من رسول"

"خدا ہی عالم غیب ہے اور کسی بھی شخص کو اپنے مخفی علم سے آگاہ نہیں کرتا، مگر جن رسولوں کے لیے وہ چاہے"

بعض مفسرین نے زیر تفسیر آیت کی شانِ نزول یوں بیان کی ہے۔

"جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ پر مکہ میں مشکلات بہت بڑھ گئیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ آپؐ ایک ایسی سرزمین کی طرف ہجرت کر رہے ہیں جس میں نخلستان ہیں، درختوں اور پانی کی فراوانی ہے۔ چنانچہ آپؐ نے یہ خواب اپنے دوستوں سے بیان کیا تو وہ سب بہت خوش ہوئے اور سمجھ گئے کہ بہت جلد مشرکین کے آزار اور اذیت سے چھٹکارا ملنے والا ہے۔ ایک عرصے تک صبر کیے رکھا، لیکن ایسی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کرنے لگے یا رسول اللہ! آپؐ نے جو فرمایا تھا اس کا تو کوئی نشان دکھائی نہیں دیتا۔ آپؐ نے جس سرزمین کا خواب دیکھا تھا، ہم کب وہاں کو ہجرت کر جائیں گے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاموش ہو گئے اور اس ہنگام میں مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی کہ" وما ادری ما یفعل بی ولابکم" (میں نہیں جانتا کہ خدا میرے ساتھ کیا کرے گا اور تمہارے ساتھ کیا کرے گا۔)۔

لیکن اس آیت کے لیے یہ شانِ نزول بعید معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اس آیت میں مخاطب پیغمبر کے دشمن ہیں نہ کہ دوست، لیکن یہ بات ممکن معلوم ہوتی ہے کہ تطبیق کے طور پر آپؐ نے یہ فرمایا ہو۔ یعنی جب دوستوں کی طرف سے مذکورہ سوال کیا گیا ہو تو آپؐ نے اسی آیت سے استفادہ کرتے ہوئے انہیں جواب دیا ہو۔

اسی سلسلے کی آخری آیت میں گذشتہ آیات میں مذکور گفتگو کی تکمیل کے طور پر فرمایا گیا ہے:

یہ بھی کہہ دے کہ مجھے یہ تو بتاؤ کہ اگر یہ قرآن خدا کی طرف سے ہو اور تم اس کا انکار بیٹھو، حالانکہ بنی اسرائیل میں سے ایک گواہ اس کی گواہی بھی دے دے اور ایمان بھی لے آئے اور تم تکبر کرتے ہوئے اس کے آگے نہ جھکے تو تم سے بڑھ کر اور کون شخص گمراہ ہوگا؟ یقینی بات ہے کہ خدا ظالم قوم کو ہدایت نہیں کرتا (قل ارءیتم ان کان من عند اللہ وکفرتم بہ وشھد شاھد من بنی اسرائیل علی مثلہ فاٰمن واستکبرتم ان اللہ لا یھدی القوم الظالمین)۔ [1]

اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کہ وہ گواہ کون تھا جس نے قرآن کی حقانیت اور صداقت پر گواہی دی؟

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے مراد جناب موسیٰ بن عمران علیہ السلام ہیں جنہوں نے اپنے زمانے میں پیغمبر اسلامؐ کے ظہور کی خبر دی اور اس کی علامات بتائیں۔

لیکن یہ احتمال" فاٰمن واستکبرتم" کے جملے سے ہم آہنگ نہیں ہے کیونکہ اس جملے سے معلوم ہوتا ہے، کہ بنی اسرائیل میں سے یہ شاہد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لے آیا جبکہ مشرکین نے تکبر کا مظاہرہ کیا، کیونکہ

---

[1] جملہ شرطیہ" ان کان من عند اللہ" کی جزا محذوف ہے۔ جو تقدیری طور پر" من اضل منکم" ہے۔

جُملے کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گواہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں تھا اور آنحضرت پر ایمان بھی لا چکا تھا جب کہ دوسرے لوگ تکبر کی راہوں پر گامزن رہے۔

کئی اور مفسر کہتے ہیں کہ یہ شخص اہل کتاب کے عُلما میں سے تھا اور مکّہ میں رہتا تھا اگرچہ یہود اور نصاریٰ کے مذہب کے پیروکار مکہ میں بہت کم تھے، لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے کہ وہاں ان میں سے کوئی ایک بھی نہ رہتا ہو۔ لیکن پھر بھی یہ معلوم نہیں کہ بنی اسرائیل کا یہ عالم کون تھا اور اس کا کیا نام تھا؟

اس بات کے پیشِ نظر کہ اہل کتاب کا کوئی مشہور و معروف عالم ظہور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وقت موجود نہیں تھا اور نہ ہی کسی تاریخ نے اس کا نام ذکر کیا ہے، یہ تفسیر بھی مناسب معلوم نہیں ہوتی۔[1]

البتہ یہ تفسیر اور گذشتہ تفسیر اس بات کی مظہر ضرور ہیں کہ سورۂ احقاف مکّی ہے۔

تیسری تفسیر جو اکثر مفسرین کے لیے بھی قابلِ قبول ہے وہ یہ ہے کہ یہ گواہ یہود کا مشہور عالم عبداللہ بن سلام تھا جو مدینہ میں اسلام لایا اور مسلمین کی صف میں شامل ہو گیا۔

ایک روایت میں ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ منوّرہ میں یہودیوں کی کسی عید کے موقع پر ان کے کنیسہ (عبادت گاہ) میں گئے۔ یہودی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وہاں آنے پر خوش نہیں تھے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اے یہود! تم اپنے میں سے بارہ شخص میرے سامنے لاؤ تاکہ وہ خدا کی وحدانیت اور محمدؐ کی نبوّت کی گواہی دیں، اس طرح سے اللہ تعالیٰ تمام دُنیا کے یہودیوں سے اپنا غضب اُٹھا لے گا۔"

وہ سب خاموش رہے اور کسی نے بھی جواب نہیں دیا، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس جُملے کو تین بار دہرایا لیکن تینوں مرتبہ کسی نے کوئی جواب نہیں دیا، پھر آپؐ نے فرمایا:

"تم نے بیان حق سے انکار کیا ہے، لیکن خدا کی قسم "حاشر" اور "عاقب" (تورات میں پیغمبر اسلامؐ کے القاب) میں ہوں، خواہ تم ایمان لے آؤ یا میری تکذیب کرو۔"

یہ کہہ کر آنحضرتؐ پلٹنے لگے۔ لیکن ابھی ایک قدم باہر نہیں نکالا تھا کہ ایک شخص پیچھے سے آیا اور آواز دی "اے محمدؐ! ٹھہر جاؤ!" پیغمبر اکرمؐ رُک گئے۔ اس نے یہودیوں کی طرف مُنہ کر کے کہا: "مجھے کیسا آدمی پاتے ہو؟"

انہوں نے کہا: "خدا کی قسم ہمارے درمیان تم سے زیادہ عالم کوئی اور شخص نہیں ہے اور تمہارے باپ دادا سے بڑھ کر ہماری آسمانی کتابوں کا کوئی اور عالم نہیں ہے۔"

اس نے کہا: "میں خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ یہ وہی پیغمبرؐ ہے جس کا ذکر تورات اور انجیل میں آچکا ہے۔"

---

[1] "شاھد" کو یہاں نکرہ اس لیے لایا گیا ہے تاکہ عظمت کا اظہار ہو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شاہد مشہور و معروف اور بزرگ شخصیت تھی۔

جب یہودیوں نے یہ دیکھا تو کہا: "تم جھوٹ کہتے ہو" یہ کہہ کر اسے خوب جی بھر کے گالیاں دیں۔

رسول پاکؐ نے فرمایا:

"تم سب جھوٹ بولتے ہو، اقرار کے بعد تمہارا انکار ہرگز قابل قبول نہیں ہے"۔

یہ شخص عبداللہ بن سلام کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا اور اسی موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔ قل ارءیتم ان کان....

اس تفسیر کے مطابق یہ آیت مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔ ہر چند کہ یہ سورت مکی ہے، اور یہ بات اسی آیت میں منحصر نہیں ہے، قرآن مجید کی دوسری سورتوں میں بھی بعض مقامات پر ہم مکی آیتوں کو مدنی سورتوں میں یا مکی سورتوں میں مدنی آیتوں کو ملا ہوا پاتے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات پیغمبر اسلامؐ کے حکم سے کسی آیت کو جو سورت کے مفہوم سے ہم آہنگ ہوتی تھی اس کی تاریخ نزول سے قطع نظر اسے اس سورت میں ملا دیا جاتا تھا۔

یہ تفسیر کئی لحاظ سے مناسب تر معلوم ہوتی ہے۔

لہ تفسیر مراغی جلد ۲۶ صفحہ

۱۱۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ ۭ وَاِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَآ اِفْكٌ قَدِيْمٌ ○

۱۲۔ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ۭ وَهٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا لِّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۠ وَبُشْرٰى لِلْمُحْسِنِيْنَ ○

۱۳۔ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○

۱۴۔ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ جَزَاۗءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○

ترجمہ

۱۱۔ اور کافر لوگ مومنوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ اگر (دینِ اسلام) بہتر چیز ہوتا تو یہ لوگ اس کی طرف ہم سے سبقت حاصل نہ کر جاتے اور جب خود وہ اس کے ذریعے سے ہدایت نہیں پاتے تو کہتے ہیں کہ یہ تو ایک پُرانا جھوٹ ہے۔

۱۲۔ اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب پیشوا اور رحمت تھی (اس نے اس کی نشانیوں کو بیان کیا ہے) اور یہ وہ کتاب ہے جو تورات کی نشانیوں سے ہم آہنگ ہے فصیح اور واضح عربی زبان میں ہے تاکہ ظالموں کو ڈرانے اور نیکوکاروں کو

خوش خبری دے۔

۱۳۔ بے شک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے، پھر وہ اس پر قائم رہے تو ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

۱۴۔ وہی تو اہلِ جنت ہیں کہ جو اس میں ہمیشہ رہیں گے، یہ ان اعمال کا صلہ ہے جو وہ انجام دیتے رہے۔

شانِ نزول

مفسرین نے زیرِ تفسیر آیات میں سے پہلی آیت کی متعدد شانِ نزول بیان کی ہیں۔

(۱) یہ آیت ابوذر غفاری کے بارے میں ہے، جو مکہ میں اسلام لائے اور ان کا قبیلہ بنی غفار بھی ان کے بعد اسلام لے آیا چونکہ بنی غفار ایک بادیہ نشین اور غریب قبیلہ تھا، لہٰذا کفارِ قریش کے دولت مند اور شہری لوگوں نے کہا کہ اگر اسلام بہتر چیز ہوتا تو یہ بے وقعت اور حقیر لوگ ہم سے سبقت حاصل نہ کر جاتے۔ اسی موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور انہیں جواب دیا گیا۔

(۲) ایک رُومی کنیز مکہ میں رہتی تھی۔ اس کا نام "ذی النیرۃ"[1] تھا، اس نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اسلام قبول کر لیا۔ اس کے ردِّ عمل میں بڑے بڑے قریشی کہنے لگے "جو چیز محمدؐ لے کر آیا ہے اگر وہ اچھی اور بہتر ہوتی تو "ذی النیرۃ" جیسے لوگ ہم پر سبقت نہ لے جاتے۔

(۳) مکہ کے بادیہ نشین قبائل کے کچھ افراد شہر کے لوگوں سے پہلے اسلام لے آئے۔ مکہ کے روساء کہنے لگے کہ "اگر اسلام کوئی اچھی چیز ہوتا تو یہ شتربان اور چرواہے ہم پر سبقت نہ لے جاتے"۔

(۴) کچھ نیک دل لیکن غریب اور تہی دست افراد مثلاً صہیبؓ، بلالؓ اور عمارؓ نے کھلے دل کے ساتھ اسلام کو قبول کیا تو مکہ کے رُوساء کہنے لگے: "آیا یہ بات ممکن ہے کہ محمدؐ کا دین کوئی اچھی چیز ہو اور وہ ہم پر سبقت لے جائیں"۔

(۵) جب عبداللہ بن سلام اور ان کے کچھ دوست ایمان لے آئے تو مغرور یہودی کہنے لگے: "اگر اسلام اچھی

---

[1] "ذی النیرۃ" ان خواتین میں سے تھیں، جنہوں نے بہت جلد اسلام کو قبول کیا، اسی لیے ابوجہل نے ان پر سخت تشدد کیا۔

چیز ہوتا تو وہ ہم سے پیش قدم نہ ہوتے۔"[1]

شانِ نزول کی پہلی چار قسموں کو صرف ایک جملے میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ اسلام کی دعوت غربا، فقرا اور بادیہ نشین لوگوں میں بہت مقبول ہوگئی اور ان لوگوں نے بڑی تیزی سے اس کا کھلے دل سے استقبال کیا کیونکہ ایک تو ان کے ناجائز مفادات نہیں تھے، جن کو کوئی خطرہ لاحق ہوتا۔ دوسرے ان کے دماغ میں تکبر اور غرور کی ہوا نہیں تھی اور تیسرے خوشحال، عیاش اور ہوس پرست طبقے کی نسبت ان کا دل زیادہ پاک اور صاف تھا۔

ایسے غریب غربا کی طرف سے اسلام کا اس قدر گرم جوشی کے ساتھ استقبال اس دین الٰہی کے طاقت ور ہونے کا ایک واضح ثبوت تھا، جسے مغرور اور متکبر لوگوں نے اس کی بہت بڑی کمزوری پر محمول کیا اور کہنے لگے کہ یہ کیسا دین ہے، جس کے پیروکار مٹھی بھر بادیہ نشین، غریب غربا، فقیر فقرا اور کنیز و غلام ہیں، اگر یہ کوئی معقول مکتب فکر ہوتا تو اسے نچلی سطح کے لوگ اور معاشرے کے پست افراد ہرگز نہ اپناتے اور ہم جو کہ بالائی سطح کے افراد اور معاشرے کے چشم و چراغ ہیں کبھی پیچھے نہ رہتے۔

لائق توجہ بات یہ ہے کہ یہ غلط طرز تفکر آج بھی مغرور دولت مندوں اور خوش حال ہوس پرستوں میں مذہب کے بارے میں پایا جاتا ہے اور بڑی حد تک رائج ہے۔ وہ بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ مذہب تو صرف فقرا و مساکین کے ہی کام کا ہے اور یہ دونوں (غربا اور مذہب) ایک دوسرے کے کام کے ہیں اور ہم تو بالا سطح کے لوگ ہیں۔

لیکن قرآن پاک نے زیر تفسیر آیات میں اس طرز تفکر کا کفایت کنندہ جواب دیا ہے۔

رہی پانچویں شانِ نزول کے بارے میں جو سطور بالا میں بیان ہوئی ہے کہ اس سے مراد عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی ہیں اگرچہ طبرسیؒ نے مجمع البیان میں اور قرطبی نے اپنی تفسیر قرطبی میں بھی اکثر مفسرین سے اسی شانِ نزول کو نقل کیا ہے لیکن یہ دو لحاظ سے بعید معلوم ہوتی ہے۔

ایک تو یہ کہ "الذین کفروا" کا جملہ مطلق صورت میں عام طور پر مشرکین کے لیے استعمال ہوتا ہے نہ کہ اہل کتاب یہود اور نصاریٰ کے لیے۔

دوسرے یہ کہ یہودیوں میں "عبداللہ بن سلام" کا مقام و مرتبہ اور عزت و حیثیت کوئی معمولی نہیں تھی کہ وہ ان کے بارے میں یہ کہتے کہ اگر اسلام اچھا دین ہوتا تو وہ اور اس کے ساتھی ہم پر سبقت نہ لے جاتے۔

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۹ ص ۶۶۰۹۔

تفسیر
کامیابی کی دو شرطیں

یہ آیات بھی حسب سابق کفار کے اعمال و گفتار اور ان گمراہی کو زیرِ بحث لاکر ان کی نکوہش کر رہی ہیں۔ پہلے تو ان کی غرور آمیز اور کسی منطق سے عاری گفتگو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اور کافر لوگوں نے مومنوں کے بارے میں کہا ہے کہ اگر ایمان اور اسلام کوئی اچھی چیز ہوتے تو یہ لوگ اس کی طرف ہم سے ہرگز سبقت حاصل نہ کر جاتے (وقال الذین کفروا للذین اٰمنوا لو کان خیرًا ما سبقونا الیہ)۔[1]

یہ مٹھی بھر لوگ یا تو فقیر و بے بضاعت ہیں یا پھر دیہاتی، غلام اور اُجڈ اور یہ بات کیونکر ممکن ہے کہ وہ حق کو سمجھ جائیں اور اس کی طرف متوجہ ہو جائیں اور ہم جو کہ اس معاشرے کے چشم و چراغ ہیں اس بات سے غافل اور بے خبر رہ جائیں۔

لیکن وہ اس بات سے غافل تھے کہ عیب تو در اصل خود انہیں میں پایا جاتا ہے نہ کہ دینِ اسلام میں۔ اگر ان کے دلوں پر تکبّر اور غرور کے پردے نہ پڑے ہوتے، اگر وہ مال و دولت، جاہ و منزلت مقام و منصب اور شہوات و خواہشات میں مست اور مگن نہ ہوتے، اگر خود پسندی اور خود نمائی انہیں تحقیق حق کی اجازت دیتی اور غریبوں کی طرح وہ بھی صاف دل حق خواہ اور حق طلب ہوتے تو یقیناً وہ بھی بہت جلد اسلام کے حلقہ بدامان ہو جاتے۔

لہٰذا آیت کے آخر میں اس لطیف پیرائے میں انھیں جواب دیا گیا ہے: چونکہ وہ خود قرآن کے ذریعے ہدایت نہیں پاتے تو بڑی جلدی کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو ایک پرانا جھوٹ ہے (واذ لم یھتدوا بہ فسیقولون ھٰذا افک قدیم)۔[2]

---

[1] "للذین اٰمنوا" میں "لام" کا کیا معنی ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے کئی اقوال ہیں۔ لیکن سب سے مناسب یہی قول ہے کہ "لام" یہاں "فی" کے معنی میں ہے۔ اسی لیے آیت کے اس جملے کا معنی یوں ہوگا "کفار نے مومنین کے بارے میں یوں کہا ....." اور "سبقونا" میں فعل کے غائب ہونے کی وجہ سے بھی کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی، جبکہ بعض نے اسے "لام تعلیل" سمجھا ہے اور بعض کے نزدیک "الذین اٰمنوا" یہاں پر مخاطب ہیں اور "سبقونا" کا جملہ "سبقتمونا" کے معنی میں ہے۔

[2] اس آیت میں "اذ" ظرفیت کے لیے ہے اور بعض مفسرین اسے "فسیقولون" سے متعلق سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "فا" وجود مانع نہیں ہے، جبکہ بعض دوسرے مفسرین جیسے زمخشری، تفسیر کشاف میں اس بات کے معتقد ہیں کہ اس کے بعد کا فعل ماضی ہے اور فسیقولون فعل مضارع ہے۔ لہٰذا یہ اس کا متعلق نہیں بن سکتا، بلکہ کسی محذوف سے متعلق ہے، جس کی تقدیر یوں ہے:

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

یعنی انہوں نے خود قرآن سے ہدایت حاصل نہیں کی ورنہ قرآن میں تو ہدایت کی قسم کی کمی نہیں ہے۔

"افك قديم" کی تعبیر اس تہمت کے مانند ہے جو ان کی زبانی قرآنی آیات میں نقل ہوئی ہے کہ وہ کہتے تھے "اساطیر الاولین" (گزشتہ لوگوں کے افسانے)۔ (فرقان / ۵)

نیز "سیقولون" کی تعبیر فعل مضارع کی صورت میں، اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ہمیشہ یہ تہمت قرآن پر لگاتے رہتے تھے اور اس تہمت کو اپنے ایمان نہ لانے کا ایک بہانہ قرار دیتے تھے۔

پھر ایک اور دلیل کو بیان کیا جا رہا ہے جو قرآن کی حقانیت کے ثبوت اور مشرکین کی اس تہمت کی نفی کے لیے ہے جو وہ کہتے تھے کہ یہ ایک قدیمی جھوٹ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اس عظیم کتاب کی صداقت کی ایک دلیل یہ ہے کہ اس سے پہلے موسیٰ کی وہ کتاب خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے جو لوگوں کی پیشوا اور رحمت تھی اور اس نے اپنے بعد کے انبیاء کی اوصاف کو بیان کیا ہے، اور یہ قرآن بھی ایسی کتاب ہے جو تورات میں مذکور نشانیوں سے ہم آہنگ ہے۔ (ومن قبله كتاب موسى اماما ورحمة وهذا كتاب مصدق)۔

تو پھر تم یہ کیسے کہتے ہو کہ یہ ایک قدیمی جھوٹ ہے؟

قرآن میں کئی بار اس بات کو زور دے کر بیان کیا گیا ہے کہ قرآن تورات اور انجیل کی تصدیق کرتا ہے۔ یعنی ان نشانیوں سے ہم آہنگ ہے جو ان دو آسمانی کتابوں میں پیغمبر اسلام اور ان کی آسمانی کتاب کے بارے میں بیان ہوئی ہیں اور یہ نشانیاں اس حد تک اپنے معیار پر پوری اتری ہیں کہ قرآن نے بھی (بقرہ / ۱۴۶ میں) ارشاد فرمایا ہے۔

"الذين اتيناهم الكتاب يعرفونه كما يعرفون ابناءهم"۔

"اہل کتاب اسے اس حد تک بخوبی پہچانتے ہیں جس طرح اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں۔

زیر تفسیر آیت سے ملتی جلتی ایک اور آیت ہے جو سورہ ہود میں ہے۔

"افمن كان على بينة من ربه ويتلوه شاهد منه ومن قبله كتاب موسى اماما ورحمة اولئك يؤمنون به"۔

"آیا جو شخص اپنے پروردگار کی واضح دلیل رکھتا ہو اور اس کے پیچھے پیچھے اس کی طرف سے ایک گواہ بھی آئے اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب جو پیشوا اور رحمت ہے، اس پر گواہی دے رہی ہو وہ ایسے شخص کے مانند ہو سکتا ہے جو اس طرح کا نہ ہو؟

(ھود / ۱۷)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۸ کا)

"واذ لم يهتدوا به فسيقولون هذا افك قديم"۔

لیکن پہلا احتمال آیت کے معنی سے بہت ہم آہنگ ہے۔

"اماماً ورحمۃ" کی تعبیر ممکن ہے اس لیے ہو کہ امام اور پیشوا کے ذکر کے بعد کبھی کبھار ذہن میں فرض کی بجا آوری کا مسئلہ تکلیف دہ اور مشکل نظر آتا ہے۔ لیکن "رحمت" کا ذکر اس تصور کی اصلاح کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس امام کی امامت کے ساتھ رحمت بھی ہے، حتی کہ اگر اس امام نے کسی فریضے کی بجا آوری کا حکم بھی دیا ہے تو بھی رحمت ہے اور نفوس کی تربیت سے بڑھ کر اور کیا رحمت ہو سکتی ہے؟

اس کے فوراً بعد فرمایا گیا ہے" یہ اس حالت میں ہے کہ یہ آسمانی کتاب فصیح اور واضح عربی زبان میں ہے "جس سے تمام لوگ بہرہ ور ہوتے ہیں۔ (لساناً عربیاً)۔

آیت کے آخر میں نزول قرآن کے آخری مقصد کو دو مختصر سے جملوں میں اس طرح واضح کرتا ہے: مقصد یہ ہے کہ ظالموں کو ڈرائے اور نیکو کاروں کو خوشخبری دے (لینذر الذین ظلموا وبشریٰ للمحسنین)۔

چونکہ "ینذر" فعل مضارع ہے اور استمرار پر دلالت کرتا ہے، لہٰذا اس بات کو واضح کر رہا ہے کہ قرآن کا ڈرانا بھی اسکی بشارت و خوشخبری کے مانند دائمی اور ہمیشہ کے لیے ہے۔ تاریخ کے ہر دور انئے میں ظالموں اور ستم گاروں کو ڈراتا چلا آرہا ہے اور نیک لوگوں کو خوشخبری سناتا آرہا ہے۔

یہاں پر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ "ظالموں" کے مدمقابل "نیکو کاروں" کو قرار دیا ہے، کیونکہ یہاں پر "ظلم" کے وسیع معنی مراد ہیں جو ہر قسم کی برائی اور خلاف کاری پر محیط ہیں اور ظاہر ہے کہ دوسروں پر ظلم اور اپنے نفس پر ظلم اس میں داخل ہیں۔

بعد کی آیت درحقیقت "محسنین" (نیکو کاروں) کی تفسیر ہے جو گزشتہ آیت میں مذکور ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جنہوں نے کہا ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر وہ اس پر قائم رہے تو نہ ان کو کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے (ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون)۔[1]

درحقیقت ایمان کے تمام مراتب اور ہر قسم کے اعمال صالحہ ان دو جملوں میں یکجا بیان ہوئے ہیں کیونکہ "توحید" تمام صحیح اعتقادیت کی بنیاد ہے تمام اصولِ عقائد کا مرجع توحید ہے۔ اور "استقامت" صبر و شکیبائی تمام اعمالِ صالح کی بنیاد ہے، کیونکہ تمام اعمال کا خلاصہ ان تین قسم کے صبر میں ہے: اطاعت پر صبر، معصیت پر صبر اور مصیبت پر صبر۔

بنا بریں "محسنین" وہ لوگ ہیں جو اعتقادی لحاظ سے "توحید" کے راستے پر اور عملی لحاظ سے "صبر و استقامت" کی بنیادوں پر قائم ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے افراد کو نہ تو آئندہ کے حوادث کا ڈر ہے اور نہ ہی وہ گزشتہ سے خائف ہیں۔

اس سے ملتا جلتا مفہوم سورۂ حٰم سجدہ کی ۳۰ ویں آیت میں زیادہ تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ وہ یوں کہ:

" ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملٰئکۃ الا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون "

---

[1] "الذین قالوا ربنا اللہ ....." مبتدا ہے اور "لا خوف علیھم" اس کی خبر ہے۔ البتہ "فا" خبر پر نہیں آتی سوائے ان مواقع کے کہ جہاں شرط کا مفہوم پایا جاتا ہے، جیسا کہ اسی آیت میں ہے۔

اس آیت میں دو اضافی چیزوں کا تذکرہ ہے: ایک تو یہ کہ انہیں فرشتوں کی طرف سے یہ خوشخبری دی جاتی ہے کہ ان پر نہ تو کسی قسم کا خوف ہے اور نہ ہی حُزن، جبکہ زیرِ تفسیر آیت اس بارے میں خاموش ہے اور دوسرے یہ کہ خوف و حزن کی نفی کے ساتھ ساتھ انہیں بہشت موعود کی بھی خوشخبری دی گئی ہے، جب کہ زیرِ تفسیر آیت میں اس بات کی طرف اشارہ نہیں، بلکہ اس کے بعد کی آیت میں اس قسم کا اشارہ ملتا ہے۔

بہرصورت یہ دونوں آیات ایک ہی مطلب کو بیان کر رہی ہیں ایک میں اجمال ہے اور دوسری میں تفصیل۔

علی بن ابراہیم کی تفسیر میں "ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا" کے جملہ کی تفسیر میں یوں کہا گیا ہے کہ "استقاموا علی ولایۃ علی امیر المؤمنین" یعنی استقامت سے مراد علیؑ بن ابی طالب کی ولایت پر استقامت ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ علم و عمل اور عدالت و تقویٰ اپنانے میں امیر المومنین علیہ السلام کی پیروی خاص کر تاریک اور ظلماتی دور میں نہایت ہی مشکل کام ہوتا ہے جو استقامت و پائیداری کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا، اسی لیے یہ زیرِ تفسیر آیت میں اس کے روشن مصداقوں میں سے ایک ہے نہ یہ کہ آیت کا مفہوم منحصر اسی میں ہے۔ جہاد اور اطاعتِ پروردگار میں صبر نیز خواہشات نفسانی اور شیطان کی چالوں کے مقابلے میں ہر طرح کی پائیداری اس کے مفہوم میں شامل ہے۔

"استقامت" کے سلسلے میں سورۂ حٰم سجدہ کی تیسویں آیت کی تفسیر میں ہم تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں۔

(ملاحظہ ہو تفسیر نمونہ جلد ۲۰)

اسی سلسلے کی آخری آیت میں توحید پرست نیکوکاروں کو اہم ترین بشارت دیتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے: وہی تو اہلِ جنت ہیں کہ جو اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (اولٰئک اصحاب الجنۃ خالدین فیھا)۔

یہ ان اعمال کا صلہ ہے جو وہ انجام دیتے رہے (جزاءً بما کانوا یعملون)۔

جیسا کہ بعض مفسرین نے نتیجہ نکالا ہے کہ آیت کا ظاہری معنی حصر کا مفہوم بتا رہا ہے یعنی صرف اہلِ بہشت ہیں جو توحید اور استقامت کی راہوں پر گامزن ہیں۔ فطری امر ہے کہ دوسرے لوگ جو گناہوں سے آلودہ ہیں اگرچہ اپنے ایمان کی بدولت انجام کار بہشت میں جائیں گے، لیکن ابتدائی طور پر "اصحاب الجنۃ" نہیں ہیں۔

"اصحاب" (ساتھی) کی تعبیر بہشتی نعمتوں سے ان کی ہمیشہ کی ہم نشینی کی طرف اشارہ ہے۔

"جزاءً بما کانوا یعملون" کی تعبیر ایک طرف تو اس بات کی دلیل ہے کہ بہشت قیمت کے بدلے میں ملتی ہے، حیلوں بہانوں سے نہیں اور دوسری طرف اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اصولی طور پر انسان آزاد اور خود مختار ہے۔

۱۵۔ وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا ۖ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۖ وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا ۚ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً ۖ قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي ۖ إِنِّي تُبْتُ إِلَيْكَ وَإِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ ○

۱۶۔ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَنَتَجَاوَزُ عَن سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْحَابِ الْجَنَّةِ ۖ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ ○

ترجمہ

۱۵۔ اور ہم نے انسان کو نصیحت کی کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرے، اس کی ماں تکلیف کی حالت میں اسے پیٹ میں رکھتی ہے اور تکلیف ہی سے اسے جنم دیتی ہے، اس کا پیٹ میں رہنا اور اس کی دودھ بڑھائی کی مدت تیس مہینے ہوئے، یہاں تک کہ جب اپنی پوری جوانی کو اور کمالِ قدرت کو پہنچتا ہے اور چالیس برس کے سن میں داخل ہوتا ہے تو کہتا ہے خداوندا! تو مجھے توفیق عطا فرما کہ تو نے جو احسانات مجھ

پر اور میرے والدین پر کیے ہیں ان کا شکر بجا لاؤں اور ایسا نیک کام کروں جسے تو پسند کرے اور میری اولاد کو صالح بنا، میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں اور میں یقیناً فرمانبرداروں میں سے ہوں۔

۱۶۔ یہی وہ لوگ ہیں کہ جن کے بہترین اعمال ہم قبول کرتے ہیں اور ان کے گناہوں سے درگزر کرتے ہیں اور ان کا مقام اہل بہشت میں ہے۔ اُن سے کیا جانے والا یہ وعدہ سچا ہے۔

تفسیر

اے انسان! اپنے والدین سے نیکی کر:

یہ اور بعد کی آیات درحقیقت وہ وضاحت ہے جس کا گزشتہ آیات میں "ظالموں" اور "محسنین" کے بارے میں اجمالی طور پر تذکرہ ہو چکا ہے۔

سب سے پہلے نیکوکاروں کی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے اور ان کی زحمات کا شکریہ ادا کرنے سے بات شروع کی گئی ہے جو شکر پروردگار کا مقدمہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے انسان کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ سے نیکی کرے۔ (ووصینا الانسان بوالدیہ احسانا)۔[1]

"وصیت" اور "توصیہ" مطلق سفارش کے معنی میں ہے اور اس کا مفہوم مرنے کے بعد کے امور میں منحصر نہیں ہے لہٰذا کچھ لوگوں نے یہاں پر اس کی "امر جزم اور فرمان" کے معنی میں تفسیر کی ہے۔

---

[1] "توصیہ" عام طور پر دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ البتہ دوسرا مفعول یا تو "با" کے ساتھ متعدی ہوتا ہے یا "الی" کے ساتھ، بنا بریں مندرجہ بالا عبارت میں "احسانا" کا کلمہ دوسرا مفعول واقع نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ کہ "وصینا" کو "الزمنا" کے معنی میں لیا جائے، جو دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے اور حرف جارہ کو بھی نہیں چاہتا۔ یا پھر آیت کے لیے کوئی محذوف مانیں، اور کہیں کہ اصل میں یوں ہے۔ "ووصینا الانسان بان یحسن بوالدیہ احسانا"؛ تو ایسی صورت میں "احسانا" فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے۔

پھر ماں کے حقوق کی اوّلیت کو مدنظر رکھتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس کی ماں تکلیف کی حالت میں اسے پیٹ میں رکھتی ہے اور تکلیف ہی سے اسے جنم دیتی ہے اور اس کا پیٹ میں رہنا اور اس کی دودھ بڑھائی کی مدت تیس مہینے ہے۔ (حملتہ امہ کرھا و وضعتہ کرھا وحملہ وفصالہ ثلثون شھرا)۔

اس تیس مہینے کی مدت میں ماں اپنے بچے کے بارے میں بہت بڑی فداکاری اور ایثار کا مظاہرہ کرتی ہے۔

انعقاد نطفہ کے پہلے ہی دن ماں کی حالت تبدیل ہونا شروع ہو جاتی ہے اور اس کے لیے مسلسل تکالیف کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ اروئے[1] کی حالت (VOMITING OF PREGNANCY) جو ماں کے سخت ترین حالات میں سے ایک ہے ظاہر ہونا شروع ہو جاتی ہے اس حالت کے بارے میں ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ:

یہ حالت ماں کے جسم میں اس غذائی قلت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے جو وہ اپنے بچے کے لیے ایثار کرتی ہے۔

جنین (پیٹ میں موجود بچہ) جس قدر نشوونما پاتا رہتا ہے اسی قدر زیادہ سے زیادہ ماں کے جسم سے مواد حاصل کرتا رہتا ہے حتّٰی کہ یہ مواد اُس کی ہڈیوں اور اعصاب پر بھی اثر ڈالتا ہے۔ بسا اوقات یہ بچہ ماں کی نیند، خوراک اور آرام و آسائش تک کو سلب کر لیتا ہے اور حمل کے آخری دنوں میں تو ماں کے لیے قدم اٹھانا، اور نشست و برخاست بھی مشکل ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ ماں کا جگر ہوتا ہے کہ وہ ان تمام مصائب و مشکلات کو بڑے حوصلے اور اس محبت اور امید کے ساتھ برداشت کرتی ہے کہ بہت جلد اس کا بچہ دنیا میں آنکھ کھولے گا اور اس کے سامنے مسکرائے گا۔

وضع حمل ـــــ جو ماں کی زندگی کے سخت ترین لمحات میں ایک ہے، کا زمانہ سر پر آجاتا ہے اور یہ وہ وقت ہوتا ہے کہ بعض اوقات اولاد کے لیے ماں کو اپنی جان کی بازی لگا دینا پڑتی ہے۔

بہرحال ایک سنگین زمانہ تو گزر جاتا ہے اور ایک دوسرا سنگین دورانیہ شروع ہو جاتا ہے، بچہ کی رات دن کی دیکھ بھال کا دورانیہ کہ، جس میں ایسے بچے کی تمام ضروریات پوری کرنا ہوتی ہیں جو اپنی ضروریات کو بیان کرنے کی بھی قدرت نہیں رکھتا۔

اگر اسے کوئی درد ہوتا ہے تو وہ اس کی جگہ تک نہیں بتا سکتا، اگر اسے بھوک یا پیاس اور سردی یا گرمی کی کوئی تکلیف ہوتی ہے تو وہ اسے بیان کرنے کی قدرت نہیں رکھتا، سوائے اس کے کہ وہ رونا شروع کر دے اور ماں کو صحیح اندازہ کر کے صبر اور حوصلے کے ساتھ اس کی ایک ایک ضرورت کا مداوا کرنا پڑتا ہے۔

بچے کی صحت و صفائی اس دوران ایک طاقت فرسا مشکل ہوتی ہے، اسے غذا دینا بھی بہت بڑا ایثار ہے جو ماں ہی کے جسم سے حاصل ہوتی ہے۔

اس دوران بچے کو جو مختلف بیماریاں لاحق ہوتی ہیں وہ ایک اور مشکل ہیں جن کا مقابلہ ماں بڑے صبر اور حوصلے کے ساتھ کرتی ہے۔

---

[1] اس حالت میں حاملہ عورت کو کھٹی اور ترش چیزیں کھانے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ (مترجم)

قرآن مجید نے یہاں صرف ماں کی مشکلات کو بیان کیا ہے اور باپ کا تذکرہ نہیں کیا، اس لیے نہیں کہ باپ کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی، کیونکہ ان میں سے بہت سی مشکلات میں باپ بھی ماں کے ساتھ شریک ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ ماں کا حصہ زیادہ ہوتا ہے لہذا ماں کے تذکرے کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ سورۂ بقرہ کی ۲۳۳ ویں آیت میں رضاعت (دودھ پلانے) کی مدت پورے دو سال ذکر کی گئی ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے۔

"والوالدات یرضعن اولادھن حولین کاملین لمن اراد ان یتم الرضاعۃ"

"مائیں اپنے بچوں کو دو سال مکمل دودھ پلاتی ہیں جو دودھ پلانے کے عرصے کو مکمل کرنا چاہیں"

جب کہ زیر تفسیر آیت میں "حمل اور رضاعت" کی مجموعی مدت صرف تیس ماہ بیان ہوئی ہے، تو کیا حمل کا دورانیہ چھ ماہ ہو سکتا ہے؟

فقہاء اور مفسرین نے اسلامی روایات کی روشنی میں جواب دیا ہے کہ:

جی ہاں! حمل کی کم از کم مدت ۶ ماہ اور مفید رضاعت کا زیادہ سے زیادہ عرصہ ۲۴ ماہ ہو سکتا ہے، حتی کہ "جالینوس" اور "ابن سینا" جیسے قدیم اطباء سے یہ بات نقل کی گئی ہے کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے یہ چیز دیکھی ہے کہ بچہ چھ ماہ کی مدت حمل کے بعد بھی پیدا ہوا ہے۔

حتمی طور پر قرآنی تعبیر سے یہ بات بھی سمجھی جا سکتی ہے کہ حمل کی مدت سے جس قدر عرصہ کم کیا جائے گا بچے کی رضاعت میں اسی قدر اس کا اضافہ کیا جائے گا تاکہ دونوں عرصہ مل کر تیس ماہ بن جائیں۔ ابن عباس سے بھی یہی بات نقل کی گئی ہے کہ اگر عورت کے حمل کی مدت نو ماہ ہو تو اسے اپنے بچے کو اکیس ماہ دودھ پلانا چاہیئے اور اگر چھ ماہ ہو تو چوبیس مہینے۔

قانونِ فطرت بھی اسی بات کا متقاضی ہے کیونکہ دوران حمل کی کمی کی تلافی رضاعت کی مدت کے دوران کی جانا چاہیئے۔

پھر ارشاد ہوتا ہے: انسانی زندگی اسی طرح جاری اور ساری رہتی ہے، یہاں تک کہ وہ زمانہ پہنچ جاتا ہے جس میں وہ جسمانی طاقت کے لحاظ سے اپنے کمال کو پہنچ جاتا ہے اور چالیس برس کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے (حتّٰی اذا بلغ اشدہ و بلغ اربعین سنۃ)۔ [1]

---

[1] "حتّٰی" یہاں پر ایک محذوف جملے کے لیے غایت کے طور پر ہے جس کی تقدیر یوں صورت ہے۔

وعاش الانسان واستمرت حیاتہ حتّٰی اذا بلغ اشدہ۔

بعض مفسرین اسے "وصینا" کی غایت یا "ماں، باپ کی اپنے بچے کی نگرانی" کی غایت سمجھتے ہیں اور یہ دونوں احتمالات بعید معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ نہ تو ماں باپ کے ساتھ نیکی کے بارے میں حکم الٰہی چالیس سال تک ختم ہو جاتا ہے اور نہ ہی بچے کے لیے والدین کی دیکھ بھال چالیس سال تک قائم رہتی ہے۔

بعض مفسرین "بلوغ اشد" (انتہائی مرحلے تک پہنچ جانے) کو چالیس سال کے عرصے تک پہنچ جانے سے ہم آہنگ اور اس کی تاکید سمجھتے ہیں۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ "بلوغِ اشد" اشارہ ہے جسمانی طور پر بالغ ہونے کی طرف اور "بلوغ اربعین سنہ" (چالیس سال تک پہنچ جانا) فکری اور عقلی طور پر بلوغ کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ مشہور ہے کہ انسان عام طور پر چالیس سال کے سن میں عقل کے کامل ہونے کے مرحلے کو پہنچ جاتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اکثر و بیشتر انبیاء چالیس برس کے سن میں نبوت پر مبعوث ہوئے۔

ضمنی طور پر یہ بھی بتاتے چلیں کہ جسمانی لحاظ سے قدرت و طاقت تک پہنچنے کا سن بلوغ کونسا ہے؟ اس بارے میں بھی مفسرین کی مختلف آراء ہیں۔ بعض لوگ تو بلوغ کا وہی مشہور سن جانتے ہیں جو سورۂ بنی اسرائیل کی ۳۴ ویں آیت میں مذکور ہوا ہے۔ یتیموں کے بارے میں جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جب کہ بعض روایات میں اس بات کی تصریح کی گئی ہے کہ یہ سن اٹھارہ سال کا ہے۔

البتہ اس بارے میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ یہ تعبیر مختلف مقامات پر مختلف معانی دے جو قرینے سے ظاہر ہوتے ہیں۔

حدیث میں آیا ہے کہ:

"ان الشیطان یجرید علی وجہ من زاد علی الاربعین ولم یتب، و یقول بابی وجہ لا یفلح۔"

شیطان اپنا ہاتھ ان لوگوں کے چہرے پر پھیرتا ہے جو چالیس سال کی عمر کو تو پہنچ جاتے ہیں لیکن گناہوں سے توبہ نہیں کرتے اور کہتا ہے میرا باپ قربان جائے اس چہرے پر جو کبھی کامیاب نہیں ہوگا (اور اس انسان کی پیشانی پر کامیابی کا نور نہیں چمک رہا)۔[1]

ابن عباس سے منقول ہے:

"من اتی علیہ الاربعون سنۃ فلم یغلب خیرہ شرہ فلیتجھز الی النار۔"

"جس شخص پر چالیس سال گزر جائیں اور اس کی نیکی اس کی برائی پر غالب نہ آئے اسے جہنم کے لیے آمادہ ہونا چاہیئے۔"

بہر حال قرآن مجید سلسلہ گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتا ہے کہ جب یہ لائق اور باایمان شخص چالیس سال کے سن کو پہنچتا ہے تو خدا سے تین چیزوں کی درخواست کرتا ہے: سب سے پہلے تو کہتا ہے۔

خداوندا! مجھے ہدایت عطا فرما اور توفیق دے کہ میں ان نعمتوں کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو عطا فرمائی ہیں۔ (قال رب اوزعنی ان اشکر نعمتک التی انعمت علیّ وعلی والدیّ)[2]

اس سے پتہ چلتا ہے کہ باایمان شخص ایسے سن و سال میں ایک تو خدا کی عطا کردہ نعمتوں کی گہرائی اور گیرائی سے

---

[1] تفسیر روح المعانی جلد ۲۶ صفحہ۔

[2] "اوزعنی" "ایزاع" کے مادہ سے ہے، جس کے کئی معانی ہیں۔ (۱) ہدایت کرنا (۲) بے راہ روی سے روکنا۔ (۳) عشق و محبت پیدا کرنا (۴) توفیق دینا۔

آگاہ ہو جاتا ہے اور دوسرے اپنے والدین کی ان خدمات سے اچھی طرح باخبر ہو جاتا ہے جو وہ اس عرصے تک بجا لائے ہیں اور وہ اس عمر کو پہنچا ہے، کیونکہ ایسے سن و سال میں انسان عام طور پر خود بھی صاحب اولاد ہو جاتا ہے اور اپنے والدین کی طاقت فرسا تکالیف اور ایثار پر مبنی خدمات کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور بے اختیار انھیں یاد کرتے ہوئے خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔

اپنی دوسری درخواست میں رب العزت کی بارگاہ میں عرض کرتا ہے۔ "خداوندا! مجھے توفیق عطا فرما کہ نیک اعمال بجا لاؤں ایسے اعمال جن سے تو راضی ہو" (وان اعمل صالحا ترضاہ)۔

آخر میں تیسری درخواست ان الفاظ میں پیش کرتا ہے: خداوندا! میری اولاد اور میرے خاندان کو اصلاح کے راستے پر دوام عطا فرما۔ (واصلح لی فی ذریتی)۔

"لی" (میرے لیے) کی تعبیر ضمنی طور پر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ میری اولاد کی نیکی اور بہتری اس انداز میں ہو کہ اس کے نتائج مجھے بھی ملیں۔

"فی ذریتی" (میری اولاد میں) کی تعبیر مطلق صورت میں بیان ہوئی ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نیکی اور بہتری کی بیٹگی اس کے تمام خاندان میں ہو۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ پہلی دعا میں والدین کو شریک کرتا ہے، تیسری میں اولاد کو، لیکن دوسری دعا میں اپنے آپ کو اور صالح انسان کو ایسا ہی ہونا چاہیئے کہ اگر ایک آنکھ کے ساتھ خود کو دیکھتا ہے تو دوسری کے ساتھ ان لوگوں کو دیکھتا ہے جو اس پر حق رکھتے ہیں۔

اور آیت کے آخر میں ان دو مطالب کو بیان کر رہا ہے جو ایک دوسرے کے لیے مؤثر اور عملی امور ہیں۔ کہتا ہے: پروردگارا! میں اس عمر میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں۔ (انی تبت الیک)۔

میں ایسے مرحلہ پر پہنچ چکا ہوں کہ جس میں میری زندگی کے خطوط کو متعین ہونا چاہیئے اور آخر العمر تک مجھے اسی طرح برقرار رہنا چاہیئے۔ جی ہاں! میں چالیس سال تک پہنچ چکا ہوں اور میرے جیسے بندے کے لیے کتنی بری بات ہے کہ تیری طرف رجوع نہ کروں اور اب توبہ سے اپنے تئیں گناہوں سے پاک نہ کروں۔

اور یہ بھی کہتا ہے کہ: میں یقیناً فرمانبرداروں میں ہوں (وانی من المسلمین)۔

درحقیقت یہ دونوں جملے ان تین دعاؤں کی پشت پناہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ملا کر ان سب کا مفہوم یوں بنتا ہے کہ: جب میں نے توبہ کر لی ہے اور تیرے حکم کے سامنے غیر مشروط طور پر جھک گیا ہوں تو تُو بھی بزرگواری فرما اور ان نعمتوں سے مجھے سرفراز فرما۔

بعد کی آیت میں اس مؤمن، شکر گزار، صالح العمل اور توبہ کرنے والے گروہ کے اجر اور جزا کا واضح ذکر ہے۔ اس میں تین اہم جزاؤں کا ذکر کیا گیا ہے۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: یہی تو وہ لوگ ہیں، جن کے بہترین اعمال ہم قبول فرمائیں گے (اولئک الذین نتقبل عنھم احسن ما عملوا)۔

اس سے بڑھ کر اور کیا خوش خبری ہو سکتی ہے کہ خداوند بزرگ و قادر و منان ایک کمزور اور ناچیز بندے کے اعمال قبول فرمائے جو دوسرے اعزازات کے علاوہ بذاتِ خود ایک عظیم اعزاز اور بلند مرتبہ اور روحانی نعمت ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب خداوندِ عالم تمام نیک اعمال کو قبول فرماتا ہے تو پھر کیوں کہتا ہے کہ "ان کے بہترین اعمال قبول کریں گے"۔

اس سوال کا جواب کچھ مفسرین نے یوں دیا ہے کہ بہترین اعمال سے مراد واجبات اور مستحبات ہیں جو مباحات کے مقابلے میں ہیں اگرچہ وہ نیک اعمال تو ہیں لیکن ان میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ مقبول بھی قرار پائیں اور ان کے ساتھ اجر اور ثواب کا تعلق ہو۔[1]

دوسرا جواب یہ ہے کہ خداوندِ عالم ان کے بہترین اعمال کو قبولیت کا معیار قرار دیتا ہے حتی کہ دوسرے درجے اور کم اہمیت کے اعمال کو بھی اپنی رحمت اور اپنے فضل و کرم سے پہلے درجے کے اعمال میں شمار کرتا ہے اور یہ بالکل ایسے ہی ہوگا جیسے کوئی خریدار بیچنے والے کی طرف سے مختلف اجناس کو اپنے فضل و کرم سے اعلیٰ جنس کے حساب سے خریدے اور خداوندِ عالم کے فضل اور اس کے لطف و کرم کے بارے میں جو کچھ بھی کہا جائے عجیب نہیں ہے۔

خدا کی دوسری مہربانی ان کے گناہوں سے صرفِ نظر ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے: ہم ان کے گناہوں سے درگزر کریں گے۔ (و نتجاوز عن سیئاتھم)۔

جبکہ ان کا مقام اہلِ بہشت میں ہے (فی اصحاب الجنۃ)[2]

خدا کی تیسری مہربانی ان کے ساتھ یہ ہوگی کہ باوجود ان کی لغزشوں کے اللہ تعالیٰ انہیں پاک و صاف کر کے نیک اور پاک لوگوں میں انہیں جگہ دے گا، جو مقربانِ بارگاہِ رب العزت ہوں گے۔

ضمنی طور پر یہاں اس تعبیر سے یہ استفادہ بھی ہوتا ہے کہ "اصحاب الجنۃ" سے یہاں مراد وہ مقربانِ بارگاہِ ایزدی ہیں جن کے پاکیزہ دامن گناہ و معصیت کے غبار سے کبھی آلودہ نہیں ہوئے اور توبہ کرنے والے یہ مومن مغفرتِ الٰہی کے بعد ان کے ساتھ اور ان کے زیرِ سایہ مقام پائیں گے۔

آیت کے آخر میں مذکورہ نعمتوں کی تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے: یہ وہ سچا وعدہ ہے جو ان سے کیا جاتا ہے (وعد الصدق الذی کانوا یوعدون)۔[3]

---

[1] طبرسی نے مجمع البیان میں، علامہ طباطبائی نے المیزان میں، فخر رازی نے تفسیر کبیر میں اور دوسرے مفسرین نے اسی آیت کے ذیل میں اسی طرح لکھا ہے۔

[2] "فی اصحاب الجنۃ" ایسے محذوف سے متعلق ہے جو "ھم" ضمیر کا حال واقع ہو رہا ہے اور اس کی تقدیری صورت یوں ہے "حال کونھم موجودین فی اصحاب الجنۃ"۔

[3] "وعد الصدق" ایک فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے جو تقدیری طور پر یوں ہے۔ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۹ پر ملاحظہ فرمائیں)

سچا وعدہ کیوں نہ ہو؟ جب کہ وعدہ خلافی یا تو کسی پشیمانی اور نادانی کی وجہ سے ہوتی ہے یا پھر کمزوری اور ناتوانی کی وجہ سے اور خداوندِ عالم ان سب سے منزہ و مبرّہ ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ **بہشتی انسان کی صفات**: یہ آیات ایک ایسے بہشتی مومن کی تصویر کشی کر رہی ہیں جو پہلے تو اپنے جسمانی نشوونما، پھر عقلی کمال کے مرحلے کو طے کرنے کے بعد پروردگارِ عالم کی نعمتوں کے شکرانے اور والدین کی طاقت فرسا تکالیف کا شکریہ ادا کرنے کے مقام تک جا پہنچتا ہے، اپنی لغزشوں سے برمحل توبہ کرتا ہے، اولاد کی تربیت سمیت نیک اعمال کی بجا آوری کا اہتمام کرتا ہے اور آخرکار فرمان الٰہی کی تعمیل کے لیے اس کے آگے سرِ تسلیم خم کر کے دُنیا و آخرت کی سربلندی حاصل کر لیتا ہے۔

یہی چیز اس بات کا باعث بن جاتی ہے کہ وہ خداوندِ عالم کی گوناگوں نعمتوں اور اس کی رحمت و مغفرت کے دریا میں ہمیشہ مستغرق رہے۔ ایک بہشتی انسان کو انہی صفات سے پہچانا جا سکتا ہے۔

۲۔ **"وصینا الانسان"**: (ہم نے انسان کو حکم دیا) کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ والدین کے ساتھ نیکی انسانی اصولوں میں سے ایک اصول ہے یہاں تک کہ جو لوگ کسی دین و مذہب کے بھی پابند نہیں ہیں وہ بھی فطری ہدایت کے ذریعے اسی اصول کی پابندی کرتے ہیں۔ بنابریں جو لوگ اس عظیم فریضے کو ٹھوکر مارتے ہیں وہ نہ صرف صحیح معنوں میں مسلمان نہیں، بلکہ انہیں انسان کہنا بھی مناسب نہیں ہے۔

۳۔ **"احسانا" کی تعبیر**: اس بات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کہ اس قسم کے مقامات پر نکرہ کا استعمال کسی چیز کی عظمت کو بیان کرنے کے لیے آتا ہے، یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حکم الٰہی کے تحت ماں باپ کی خدمات کے بدلے میں عظیم اور برجستہ نیکی انجام دینی چاہیئے۔

۴۔ **اولاد کی پرورش میں ماں کی تکالیف** کا تفصیلی ذکر ایک تو اس وجہ سے ہے کہ وہ تکالیف نہایت واضح اور نمایاں ہوتی ہیں اور دوسرے اس لیے کہ ماں کی تکالیف، باپ کی نسبت زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ اسی لیے اسلامی روایات میں بھی ماں کے بارے میں زیادہ تاکید کی گئی ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص نے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت حاضر ہو کر عرض کی،

"من ابر؟ قال امك؛ قال ثم من؟ قال امك؛ قال ثم من؟ قال امك؛ قال ثم من؟ قال اباك!"

"یا رسول اللہ! کس شخص کے ساتھ نیکی کروں؟

(باقی حاشیہ ۲۹۸ کا)

"یعدهم وعد الصدق الذی کانوا یوعدون بلسان الانبیاء والرسل"

آپؐ نے ارشاد فرمایا:
اپنی ماں کے ساتھ!
پوچھا! پھر کس کے ساتھ؟
فرمایا:
ماں کے ساتھ!
پوچھا! پھر کس کے ساتھ؟
آپ نے فرمایا:
ماں کے ساتھ!
۔جب اس نے چوتھی بار سوال کیا تو آپؐ نے فرمایا:
اپنے باپ کے ساتھ۔[1]

ایک اور روایت میں ہے کہ ایک شخص نے اپنی بوڑھی ماں کو اپنے کندھوں پر سوار کر کے خانہ کعبہ کا طواف کروایا اور اسی اثنا میں رسالت مآبؐ کی خدمت میں پہنچ کر آپؐ سے عرض کی۔

"ھل ادیت حقھا"

"حضور! کیا اس طرح سے میں نے اپنی والدہ کا حق ادا کر دیا ہے"؟

آپؐ نے ارشاد فرمایا۔

"لا، ولا بزفرۃ واحدۃ"

"ہرگز نہیں، تم نے تو ابھی ایک سانس کا حق بھی ادا نہیں کیا"۔[2]

۵۔ قرآنی آیات میں خاندانی رشتے: والدین کے احترام و اکرام اور اولاد کی تربیت کو زبردست اہمیت دی گئی ہے اور مذکورہ بالا آیات میں ان سب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ اس لیے کہ عظیم انسانی معاشرہ خاندان کی مختلف اور چھوٹی چھوٹی اکائیوں سے تشکیل پاتا ہے، جس طرح ایک عظیم عمارت کئی چھوٹے بڑے کمروں سے اور کمرے مختلف پتھروں اور اینٹوں سے وجود میں آتے ہیں۔

ظاہر سی بات ہے کہ ان چھوٹی اکائیوں میں باہمی وحدت اور استحکام جتنا زیادہ ہوگا اسی قدر معاشرے کی بنیادیں مستحکم تر ہوں گی۔ ہمارے صنعتی دور کے معاشرے کی تباہی کے اسباب میں سے ایک سبب خاندانی نظام کا بگاڑ ہے کیونکہ نہ تو اولاد اپنے والدین کا احترام کرتی ہے، نہ ہی والدین کو اپنی اولاد سے شفقت کا احساس ہے اور نہ ہی میاں بیوی کے مابین مہر و محبت کا حقیقی رابطہ ہے۔

---

[1] تفسیر روح المعانی جلد ۲۶ صفحہ ۱۶۔

[2] فی ظلال القرآن جلد ۷، صفحہ ۴۱۵

آج کے صنعتی معاشرے میں بڑے بوڑھوں کے لیے جداگانہ آرام گاہیں، جن میں ضعیف اور کمزور والدین قیام پذیر ہوتے ہیں، نہایت ہی دردناک مناظر پیش کرتی ہیں کیوں کہ ان قیام گاہوں میں ایسے لوگ اقامت گزیں ہوتے ہیں جو کسی کام کے نہیں رہتے اور خاندان والے انہیں وہیں چھوڑ آتے ہیں۔

وہ زن و مرد جو ایک طویل عرصہ معاشرے کی خدمت انجام دیتے رہتے ہیں اور اپنی اولاد کو معاشرے کی خدمت کے لیے وقف کر چکے ہوتے ہیں جب انہیں اپنی اولاد کی مہر و محبت کی ضرورت ہوتی ہے اور ان کی امداد کے محتاج ہوتے ہیں تو انھیں بُری طرح دھتکار دیا جاتا ہے اور وہ وہیں پر موت کے انتظار میں اپنی زندگی کے باقی دن پُورے کرتے رہتے ہیں۔ ان کی آنکھیں ہمیشہ دروازے پر لگی رہتی ہیں کہ شاید کوئی واقف کار یہاں پر آجاتے اور ایسا اتفاق سال بھر میں شاید ایک یا دو مرتبہ ہی ہوتا ہے کہ کوئی دوست یا واقف شخص بھولے سے وہاں چلا جاتا ہے۔

سچ سچ جب انسان اس قسم کی زندگی کا تصور کرتا ہے تو اسی وقت جینا اس کے لیے دوبھر ہو جاتا ہے اور صرف مادی اور ایمان و مذہب سے عاری "متمدن" دُنیا کے راہ و رسم ایسے ہی ہوتے ہیں۔

۶۔ "ان اعمل صالحًا ترضاہ" کا مفہوم: یہ جُملہ اس حقیقت کو بیان کر رہا ہے کہ نیک اعمال ایسی چیز ہوتے ہیں جو خداوندِ عالم کی رضا اور خوشنودی کا موجب ہوتے اور "احسن ما عملوا" (بہترین کام جو انجام دیئے ہیں) کی تعبیر قرآن مجید کی متعدد آیات میں آچکی ہے اور یہ اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ خداوندِ عالم کا بے حساب فضل و کرم، بندوں کے اجر و ثواب کے موقع پر ان کے بہترین اعمال کو معیار قرار دیتا ہے اور سب اعمال اسی حساب سے قبول کرتا ہے۔

۱۷۔ وَالَّذِیْ قَالَ لِوَالِدَیْهِ اُفٍّ لَّكُمَآ اَتَعِدٰنِنِیْٓ اَنْ اُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِیْ ۚ وَهُمَا یَسْتَغِیْثٰنِ اللّٰهَ وَیْلَكَ اٰمِنْ ۖ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۖ فَیَقُوْلُ مَا هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ○

۱۸۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ حَقَّ عَلَیْهِمُ الْقَوْلُ فِیْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِیْنَ ○

۱۹۔ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ وَلِیُوَفِّیَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ○

ترجمہ

۱۷۔ اور جو شخص اپنے ماں باپ سے کہتا ہے کہ تم پر اُف! کیا تم مجھے وعدہ دیتے ہو کہ میں قیامت کے دن اُٹھایا جاؤں گا؟ حالانکہ بہت سے لوگ مجھ سے پہلے گزر چکے (اور ہرگز نہیں اُٹھائے گئے) اور وہ دونوں ہمیشہ فریاد کرتے اور خدا سے مدد طلب کرتے رہتے ہیں کہ تجھ پر وائے ہو ایمان لے آ۔ کیونکہ خدا کا وعدہ ضرور سچا ہے۔ لیکن وہ ہمیشہ یہی کہتا ہے کہ یہ تو بس اگلے لوگوں کے افسانے ہیں۔

۱۸۔ یہ لوگ بھی جنوں اور انسانوں کی انہی (کافر) امتوں میں شامل ہیں جو ان سے پہلے گذر چکی ہیں اور جن کے بارے میں عذاب کا وعدہ پایہ ثبوت کو پہنچ چکا ہے، کیونکہ یہ سب لوگ گھاٹا اُٹھانے والے تھے۔

۱۹۔ اور لوگوں نے جیسے کام کیے ہوں گے انہی کے مطابق سب کے درجے ہوں گے تاکہ خدا انھیں ان کے اعمال بے کم و کاست سپرد کر دے اور ان پر کچھ بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔

تفسیر

والدین کے حقوق پائمال کرنے والے

گذشتہ آیات میں ان مؤمن لوگوں کا تذکرہ تھا جو ایمان، عمل صالح، حق کی نعمتوں کے شکرانے اور والدین اور اولاد کے حقوق کی ادائیگی کے ذریعے تقرب الٰہی کی راہوں پر گامزن ہوئے ہیں اور اس کے خاص لطف و کرم سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ لیکن زیر تفسیر آیات میں ان لوگوں کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے جو بالکل ان کے برعکس ہیں یعنی بے ایمان، حق ناشناس اور ماں باپ کے نافرمان لوگ۔ ارشاد ہوتا ہے:

اور جو شخص اپنے ماں باپ سے کہتا ہے: تم پر اُف! کیا تم مجھے وعید دیتے ہو کہ میں قیامت کے دن اُٹھایا جاؤں گا حالانکہ مجھ سے پہلے بہت سے لوگ گزر چکے ہیں جو مر گئے، لیکن دوبارہ ہرگز نہیں اُٹھائے گئے۔ (والذی قال لوالدیه اف لکما اتعداننی ان اخرج وقد خلت القرون من قبلی)۔ [1]

لیکن والدین ایسے سرپھرے بیٹے کے آگے سر تسلیم خم نہیں کرتے، اور وہ دونوں ہمیشہ فریاد کرتے ہیں اور خدا سے مدد طلب کرتے ہیں کہ اے بیٹا! تجھ پر افسوس ہے، ایمان لے آ، کیونکہ خدا کا وعدہ ضرور سچا ہے: (وھما یستغیثان اللہ ویلک اٰمن ان وعد اللہ حق)۔

مگر وہ ہے کہ اسی طرح اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہتا ہے اور اپنی سرکشی پر ڈٹا رہتا ہے۔ وہ تکبر اور بڑی بے پروائی

---

[1] "والذی قال ....." مبتدا ہے اور بہت سے مفسرین کے مطابق "اولئک الذین ....." اس کی خبر ہے جو بعد کی آیت میں آئی ہے۔ "مبتدا" کے مفرد اور "اولئک" کے جمع ہونے میں کسی قسم کا تضاد نہیں ہے، کیونکہ اس سے جنس مراد ہے۔ لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ اس کی خبر محذوف ہو، جس کی تقدیری صورت یوں ہو:

"وفی مقابل الذین مضی وصفھم الذی قال لوالدیه"

تو ایسی صورت میں بعد کی آیت مستقل ہے جس طرح کہ "اولئک الذین نتقبل عنھم ....." مستقل ہے۔

سے کہتا ہے، یہ تو بس اگلے لوگوں کے افسانے ہیں" (فیقول ماھذا الا اساطیر الاولین)۔

یہ جو تم کہتے ہو کہ معاد و قیامت ہوگی اور حساب و کتاب ہوگا یہ سب خرافات ہیں اور گئے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں، میں ان کے سامنے کبھی سر نہیں جھکاؤں گا۔

اس آیت میں اس گروہ کے بارے میں جو اوصاف معلوم ہوتے ہیں وہ یہ ہیں:

والدین کے حق میں بے احترامی اور بے ادبی، کیونکہ "اُف" ہر غلیظ اور آلودہ چیز کو کہتے ہیں اور توہین اور حقارت کے اظہار کے موقع پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔[1]

نیز بعض ارباب لغت کے نزدیک "اُف" کا معنی وہ گندگی اور میل کچیل ہے جو ناخن کے نیچے اکٹھی ہو جاتی ہے جو گندی بھی ہوتی ہے اور حقیر بھی۔[2]

دوسری یہ کہ وہ معاد اور روزِ قیامت پر ہی ایمان نہیں رکھتے، بلکہ اس کا مذاق بھی اڑاتے ہیں اور اسے افسانہ اور خرافاتی باتیں سمجھتے ہیں۔

ان کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ ان کے پاس سننے والے کان نہیں ہیں۔ وہ حق کے سامنے سر نہیں جھکاتے بلکہ ان کی رُوح غرور، جہالت اور خود غرضی سے لتھڑی ہوئی ہے۔

یقیناً دل سوز ماں باپ کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اسے جہالت و نادانی کے گرداب سے نکال کر نجات کی راہوں پر لگا دیں تاکہ یہ فرزند دل بند خدا کے دردناک عذاب میں گرفتار نہ ہو، لیکن وہ ہے کہ مسلسل اپنے کفر پر ڈٹا ہوا ہے اور اسی پر مُصر ہے آخر کار ناچار وہ اسے چھوڑ دیتے ہیں۔

جس طرح گزشتہ آیات میں صالح الاعمال مؤمنین کی جزا کا تذکرہ تھا، اسی طرح یہاں پر گستاخ اور عقل کے اندھے کافروں کا انجام مذکور ہے۔ ارشاد ہوتا ہے، یہ لوگ جنوں اور انسانوں کی دوسری کافر امتیں جو ان سے پہلے گزر چکی ہیں، ان ہی میں شامل ہیں۔ ان پر بھی عذاب کا وعدہ پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے اور یہ بھی دردناک عذاب میں گرفتار ہوں گے اور یہ بھی جہنمی ہیں: (اولئک الذین حق علیھم القول فی امم قد خلت من قبلھم من الجن والانس)[3]

کیونکہ وہ سب لوگ گھاٹا اٹھانے والے تھے (انھم کانوا خاسرین)۔

---

[1] مفردات راغب۔

[2] "اُف" کے بارے میں سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۲۳ کے ذیل میں ایک اور بحث بھی موجود ہے۔ (دیکھئے تفسیر نمونہ جلد ۱۲)

[3] "حق علیھم القول" کا جملہ اس گفتگو کی طرف اشارہ ہے، جو خدا نے کافروں اور گناہگاروں کی سزا کے بارے میں فرمائی ہے اور تقدیری طور پر یوں ہے:

"حق علیھم القول بانھم اھل النار.....

اور "فی امم" حال واقع ہوا ہے۔

اس سے بدتر گھاٹا اور کیا ہوگا کہ اپنا تمام سرمایہ حیات ضائع کر کے خدا کے غیظ و غضب کو خرید چکے ہیں۔

ان دونوں، بہشتی اور جہنمی گروہوں کے تقابل کی صورت میں، ان آیات سے ہمیں مندرجہ ذیل نتائج حاصل ہوتے ہیں:

- بہشتی افراد اپنی ہدایت اور ارتقاء کے مراحل طے کرتے ہیں جبکہ اہل جہنم اپنا تمام سرمایہ لٹا کر خسارہ اٹھاتے ہیں۔
- وہ حق شناس اور شکر گزار ہیں حتی کہ اپنے والدین کے بھی، لیکن یہ حق ناشناس، گستاخ اور بے ادب ہیں حتی کہ اپنے والدین کے بھی۔
- وہ بہشت میں "مقربین الٰہی" کے ساتھ ہیں اور یہ دوزخ میں بے ایمان لوگوں کے زمرے میں گویا:

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز

- وہ جب کسی لغزش کا شکار ہوتے ہیں تو فوراً توبہ کر کے حق کے آگے جھک جاتے ہیں لیکن یہ مغرور و سرکش اور خود غرض و متکبر ہوتے ہیں۔
- یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ یہ ہٹ دھرم ٹولہ اپنی بے راہ روی کو گزشتہ اقوام کی کیفیت کا آئینہ دار قرار دیتا ہے۔ لہٰذا دوزخ میں بھی انہی کے ساتھ محشور ہوگا۔

اسی سلسلے کی آخری آیت میں پہلے تو ان دونوں گروہوں کے مختلف درجات اور مراتب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: ان لوگوں نے جیسے کام کیے ہوں گے انہی کے مطابق سب کے درجے ہوں گے۔ (ولکل درجات مما عملوا)[1]

ایسا ہرگز نہیں ہے کہ بہشتی یا جہنمی سب ایک ہی درجے پر فائز ہوں، بلکہ وہ بھی اپنے اعمال کے تفاوت، خلوص نیت کے تناسب اور معرفت کے میزان کے لحاظ سے مختلف مقام رکھتے ہیں اور صحیح معنوں میں عدالت یہیں پر حکم فرما ہے۔

"درجات" "درجہ" کی جمع ہے جو عام طور پر اس زینے کو کہا جاتا ہے جس سے اوپر چڑھا جاتا ہے اور "درکات" "درک" (بروزن "مرگ") کی جمع ہے جو ان سیڑھیوں کو کہا جاتا ہے جن سے نیچے اترا جاتا ہے۔ لہٰذا بہشتیوں کے لیے "درجات" اور جہنمیوں کے لیے "درکات" کے کلمات استعمال ہوئے ہیں۔ لیکن زیر تفسیر آیت میں دونوں کا یکجا تذکرہ ہوا ہے اور اہل بہشت کے مقام کی اہمیت کے پیش نظر دونوں کے لیے "درجات" کا لفظ آیا ہے اور اصطلاحی طور پر "غلبہ" کے باب سے ہے۔[2]

پھر فرمایا گیا ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے "تاکہ خدا انہیں ان کے اعمال بے کم و کاست دے دے"۔ (ولیوفیھم اعمالھم)۔

---

[1] "مما عملوا" میں "من" "تشویہ" ہے یا پھر تعلیل کے معنی میں ہے یعنی "من اجل ما عملوا"۔

[2] "درک" (را کے سکون کے ساتھ) اور "درک" (را پر زبر کے ساتھ) انتہائی گہرائی کے معنی کے لیے آتے ہیں اور کبھی "درک" (زبر کے ساتھ) نقصان کے معنی میں اور "درک" (سکون کے ساتھ) چیز کے سمجھنے اور ادراک کرنے کے معنی میں بھی آتے ہیں (درک کسی چیز کی حقیقت اور گہرائی کی مناسبت سے)

یہ تعبیر "تجسم اعمال" کے مسئلے کی طرف ایک اور اشارہ ہے کہ وہاں پر انسان کے اعمال خود اسی کے ساتھ ہوں گے۔ اس کے نیک اعمال اس کے لیے رحمت اور اطمینان کا موجب بنیں گے اور بُرے عمل بلا، اضطراب، رنج اور عذاب کا سبب۔

آخر میں تاکیدی طور پر فرمایا گیا ہے: اور ان پر کچھ ظلم نہیں کیا جائے گا (وھم لایظلمون)۔

کیونکہ وہ اپنے ہی اعمال کو پالیں گے تو پھر ظلم و ستم کا تصور کیسا؟

اس کے علاوہ ان کے "درجات" اور "درکات" بھی اچھی طرح مقرر کیے جا چکے ہیں اور ان کا چھوٹے سے چھوٹا نیک یا بد عمل بھی ان کی سرنوشت کے لیے مؤثر ہوگا۔ تو پھر ظلم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہ آیت بنی اُمیہ کی طرف کیسے تحریف کی گئی؟

ایک روایت میں ہے کہ معاویہ نے اپنے مدینہ کے گورنر مروان کو خط لکھا کہ لوگوں سے اس کے بیٹے یزید کے لیے بیعت لے۔ عبدالرحمٰن بن ابی بکر بھی اسی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا "معاویہ یہ کام ہرقل اور کسریٰ (روم و ایران کے بادشاہوں) کے مانند انجام دینا چاہتا ہے کہ وہ بھی اپنے بیٹوں کو (خواہ وہ کتنا ہی نااہل اور بدکار ہوتے) اپنا جانشین مقرر کرتے تھے۔

مروان نے منبر سے چلّا کر کہا: خاموش رہو! تم تو وہی ہو جس کے بارے میں یہ آیت اُتری ہے۔ "والذی قال لوالدیہ اف لکما"

حضرت عائشہ بھی وہیں پر موجود تھیں۔ مروان کی طرف مُنہ کر کے بولیں: "تم جھوٹ بکتے ہو، میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ یہ آیت کس کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اگر کہو تو تمہیں اس کے نام و نسب سے بھی آگاہ کر دوں! البتہ رسولؐ اللہ نے تمہارے باپ پر اس وقت لعنت کی ہے جب تم ابھی اس کی پشت میں تھے، اس لیے تم رسولؐ خدا کی لعنت کا نتیجہ ہو۔" [1]

جی ہاں! عبدالرحمٰن کا گناہ ایک تو یہ تھا کہ وہ امیرالمومنین علیہ السلام سے محبت کیا کرتے تھے، جو بنی امیہ کے لیے سخت ناگوار بات تھی۔ دوسرے وہ خلافت کو موروثی بنانے اور اسے ملوکیت میں تبدیل کرنے کے سخت مخالف تھے اور یزید کے لیے بیعت طلبی کو قیصر و کسریٰ کی پالیسی کا نام دیتے تھے۔ اسی لیے اسلام کے قسم خوردہ دشمنوں یعنی بنی اُمیہ کی طرف سے ان پر اس قسم کے شدید حملے کیے گئے اور ان کے بارے میں آیاتِ قرآنی کے معانی کی تحریف کی گئی۔

---

[1] ملاحظہ ہو تفسیر رُوح المعانی ابوالفتوح رازی جلد ۱۰ صفحہ ۱۵۹۔ نیز قرطبی نے بھی اس روایت کو کچھ فرق کے ساتھ اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو جلد ۹ صفحہ ۷۰۱۷۔

حضرت عائشہ نے مروان کو کیا خوب جواب دیا کہ "خدا نے تم پر اس وقت لعنت کی ہے جب تم ابھی پشت پدر میں تھے" اور یہ اشارہ ہے سورۂ بنی اسرائیل کی ۶۰ ویں آیت کی طرف جس میں کہا گیا ہے "والشجرۃ الملعونۃ فی القرآن" [1]

---

[1] اس آیت کی تفسیر کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۱۲ کی طرف رجوع فرمائیں۔ نیز یہ بھی توجہ رہے کہ مروان، حکم کا بیٹا، ابی العاص کا پوتا اور امیہ کا پڑپوتا تھا۔

۲۰۔ وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا ۚ فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُونَ ۝

ترجمہ

۲۰۔ جس دن کافر لوگ جہنم کے سامنے لائے جائیں گے تو ان سے کہا جائے گا، تم تو اپنی دنیاوی زندگی میں مزے لوٹ چکے ہو اور اس سے بہرہ مند ہو چکے ہو، تو آج تمھیں ذلت بار عذاب سے سزا دی جائے گی اس لیے کہ تم زمین میں ناحق تکبر کیا کرتے تھے اور اس لیے بھی کہ تم گناہوں کا ارتکاب کرتے تھے۔

تفسیر

زھد اور آخرت کا ذخیرہ:

کفار و مجرمین کی سزا کے بارے میں یہ آیت بھی گزشتہ آیات کے مانند اسی سلسلے کو مزید وضاحت کے ساتھ بیان کر رہی ہے اور ان کے جسمانی اور روحانی عذاب کے چند گوشوں کو اُجاگر کر رہی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

جس دن کافر لوگ جہنم کے سامنے لائے جائیں گے تو ان سے کہا جائے گا کہ تم اپنی دنیاوی زندگی میں مزے لوٹ چکے ہو اور اس سے بہرہ مند ہو چکے ہو، تو آج تم کو ذلت بار عذاب سے سزا دی جائے گی اس لیے کہ تم زمین میں ناحق تکبر کیا کرتے تھے اور اس لیے بھی کہ تم گناہوں کا ارتکاب کرتے تھے۔ (ویوم یعرض الذین

کفروا علی النار اذھبتم طیّبٰتکم فی حیاتکم الدنیا واستمتعتم بھا فالیوم تجزون عذاب الھون بما کنتم تستکبرون فی الارض بغیر الحق وبما کنتم تفسقون)۔ [1]

جی ہاں! تم لذتوں میں غرق تھے اور اس دُنیا کی مادی نعمتوں سے بہرہ برداری کے علاوہ تم اور کچھ نہیں جانتے تھے۔ اور مادر پدر آزادی کی بناء پر تم معاد کا انکار کرتے تھے تاکہ تمہارے ہاتھ بالکل کھلے رہیں اور دُنیاوی نعمتوں کے حصُول میں تم دوسروں پر ہر طرح کا ظلم وستم روا رکھتے تھے۔ لہٰذا آج تم ان تمام ہوسرانیوں، خواہشات پرستیوں، ظلم وتکبر اور فسق وفجور کی سزا پاؤ۔

چند اہم نکات

۱۔ **کفار کا جہنم کو پیش کیا جانا:** یہ آیت کہتی ہے کہ قیامت کے دن کفار جہنم کو پیش کیے جائیں گے اور اسی سے ملتی جلتی سورۂ مومن کی ۴۶ ویں آیت ہے جو فرعون کے ساتھیوں کے بارے میں کہتی ہے:

"النار یعرضون علیھا غدوًّا وعشیًّا"

"ہر صبح وشام وہ جہنم کو پیش کیے جاتے ہیں"۔

جب کہ قرآن پاک کی بعض دوسری آیات میں ہے کہ جہنم "کفار کو پیش کی جائے گی، جیسا کہ سُورۂ کہف کی آیت ۱۰۰ میں ہے:

"وعرضنا جھنم یومئذ للکافرین عرضًا"

"اس دن ہم جہنم کو کافروں کیلئے پیش کریں گے"۔

لہٰذا بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ پیشی دو طرح کی ہے ایک تو حساب وکتاب سے پہلے پیشی اس وقت جہنم کو کفار کے سامنے لایا جائے گا تاکہ اس طرح سے خوف وہراس ان کے تمام وجود میں سما جائے (جو بجائے خود ایک رُوحانی عذاب ہے) اور دوسری حساب وکتاب اور انہیں جہنم کی طرف بھیجنے کے بعد کی پیشی تو اس وقت وہ خود عذاب جہنم کو پیش کیے جائیں گے۔ [2]

بعض مفسرین یہ بھی کہتے ہیں کہ عبارت میں ایک طرح کا "قلب" پایا جاتا ہے اور کفار کو جہنم کے لیے پیش کرنے سے مراد وہی جہنم کو کفار کے لیے پیش کرنا ہے، کیونکہ آگ میں عقل وشعور تو پایا نہیں جاتا کہ اسے کفار کے لیے پیش کیا جائے

---

[1] "یوم" ظرف ہے اور ایک محذوف فعل سے متعلق ہے جو بعد کے جملے سے سمجھا جاتا ہے اور تقدیری طور پر یُوں ہے:

"ویوم یعرض الذین کفروا علی النار یقال لھم اذھبتم طیّباتکم.....)

[2] تفسیر المیزان جلد ۱۸ صفحہ ۲۲۳ انہی آیات کے ذیل میں۔

اور پیشی کا اطلاق ایسی صورت میں ہوتا ہے جب مدِ مقابل میں شعور پایا جاتا ہو۔

لیکن اس نظریئے کا یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ قرآن کی کچھ آیات میں جہنم کے لیے ایک طرح کے ادراک اور شعور کا تذکرہ ملتا ہے۔ یہاں تک کہ خدا کے اس سے باتیں کرنے کا ثبوت بھی پایا جاتا ہے۔

چنانچہ خدا اس سے پوچھے گا کہ:

"هل امتلأتِ"

"کیا تو بھر گئی ہے؟"

تو وہ جواب دے گی:

"هل من مزيد"

"آیا اور بھی کچھ ہے؟"

(ملاحظہ ہو سورۂ ق/ ۳۰)

حق یہ ہے کہ "پیش کرنے" کی حقیقت یہ ہے کہ دو چیزوں کے درمیان موجود رکاوٹوں کو اس حد تک دُور کیا جائے کہ ایک چیز دوسری چیز کے اختیار میں آجائے۔ کفار اور دوزخ کے بارے میں بھی یہی صورتِ حال ہے کہ ان دونوں کے درمیان موجود رکاوٹیں ہٹادی جائیں گی۔ لہٰذا ایسی صورت میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ انہیں آگ کے سامنے لایا جائے گا اور آگ کو ان کے سامنے لایا جائے گا۔ اور دونوں تعبیریں صحیح ہیں۔

اس صورت میں اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ "پیش کیے جانے" کو جہنم میں داخل ہونے کے معنی میں لایا جائے جیسا کہ طبرسی نے مجمع البیان میں ذکر کیا ہے، بلکہ یہ پیشی بھی بذاتِ خود دردناک اور ہولناک عذاب کی طرح ہے جو کہ جہنم میں داخل ہونے سے قبل اہلِ جہنم اس کے تمام حصوں کو باہر سے بچشمِ خود دیکھ لیں گے اور اپنے منحوس انجام کا مشاہدہ کرلیں گے اور دل ہی دل میں رنج اٹھائیں گے۔

۲۔ **"اذهبتم طيباتكم" کا مفہوم**: یہ جملہ دنیاوی لذتوں کے استفادے کے معنی میں ہے اور "اذهبتم" (تم لے گئے) کی تعبیر اس لیے ہے کہ یہ لذتیں اور نعمتیں استعمال کے ساتھ ختم ہو جاتی ہیں۔

یقیناً اس دُنیا میں خدا کی نعمتوں سے فائدہ اُٹھانا کوئی بُری بات نہیں ہے۔ جو بات بُری ہے وہ یہ ہے کہ انسان ان مادی لذتوں میں مگن ہو کر خدا اور قیامت کو فراموش کر دے یا گناہ آلود اور بے مہار ہو کر ان لذتوں سے بہرہ برداری کی جائے اور دوسروں کے حقوق غصب کیے جائیں۔ یہ سب کچھ اسی زمرے میں آجاتا ہے۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ یہ تعبیر قرآن مجید میں صرف اسی آیت میں دکھائی دیتی ہے۔ جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کبھی انسان دنیاوی لذتوں سے چشم پوشی کر لیتا ہے یا خدائی فرائض کی بجا آوری کے لیے توانائی حاصل کرنے کی حد تک ہی ان سے استفادہ کرتا ہے تو ایسی صورت میں گویا وہ ان "طیبات" کو اپنی آخرت کے لیے ذخیرہ کر لیتا ہے۔

لیکن عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ چوپاؤں کے مانند بے مہار ہو کر ان سے استفادہ کرتا ہے اور سب کو اسی دُنیا ہی

میں ختم کر کے آخرت کی راہ لیتا ہے اور آخرت کے لیے کچھ بھی ذخیرہ نہیں کرتا بلکہ اُلٹا گناہوں کا بوجھ اپنے لیے فراہم کرتا ہے تو اس صورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے قرآنی آیت کا اطلاق یوں ہوگا کہ " اذھبتم طیباتکم فی حیاتکم الدنیا "

لغت کی بعض کتابوں میں منقول ہے کہ اس جملے سے مراد یہ ہے۔

" انفقتم طیبات ما رزقتم فی شھواتکم و فی ملاذ الدنیا ولم تنفقوھا فی مرضات اللہ "

"تمہیں جو پاکیزہ رزق عطا کیا گیا اسے تم نے اپنی خواہشاتِ نفسانی کی راہوں میں خرچ کر ڈالا اور خدا کی خوشنودی کے لیے اسے خرچ نہیں کیا۔" (مجمع البحرین مادہ "ذھب")

۳۔ **"طیبات" کا وسیع مفہوم**: اس کا معنی وسیع ہے اور تمام دُنیاوی نعمتوں پر محیط ہے۔ ہر چند کہ بعض مفسرین نے اسے صرف جوانی کی توانائیوں کے معنی میں تفسیر کیا ہے، لیکن حق یہ ہے کہ جوانی اس کا صرف ایک مصداق ہو سکتا ہے۔

۴۔ **"عذاب الھون"** (حقارت و توہین آمیز عذاب) ردِّ عمل ہے ان کے زمین پر تکبر کرنے کا، کیونکہ خدائی سزا گناہ کی نوعیت سے بالکل ہم آہنگ ہوتی ہے۔ جن لوگوں نے اللہ کی مخلوق ایسا تک کہ اس کے انبیاء کے سامنے غرور و تکبر کا مظاہرہ کیا اور کسی قانون کے سامنے نہ جھکے انہیں ایسا تحقیر آمیز اور رسوا کن عذاب دیکھنا ہی چاہیئے۔

۵۔ **اہلِ جہنم کے دو گناہوں کا تذکرہ**: آیت میں ان کے دو گناہوں کا ذکر ہے۔ ایک تو "زمین میں غرور" اور دوسرے "فسق"۔ ممکن ہے کہ پہلا ان کے آیاتِ الٰہی، بعثت انبیاء اور قیامت پر ایمان نہ لانے کی طرف اشارہ ہو اور دوسرا مختلف گناہوں کی طرف تو گویا ایک اصول دین کے ترک کرنے اور دوسرا فروع دین کے پائمال کرنے کی بات ہے۔

۶۔ **"غیر الحق" کی تعبیر**: یہ اس معنی میں نہیں ہے کہ استکبار کی دو قسمیں ہیں ایک "حق" اور دوسری "ناحق" بلکہ اس قسم کی تعبیر عام طور پر تاکید کے لیے استعمال ہوتی ہے اور اس کی مثالیں عام ہیں۔

۷۔ **عظیم پیشواؤں کا زہد**: حدیث اور تفسیر کے مختلف ذرائع میں اسلام کی عظیم ہستیوں کے بارے میں بہت سی روایات نقل کی گئی ہیں، جن کے ذریعے اسی آیت کے بارے میں استناد کیا گیا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ ایک دن حضرت عمرؓ "مشربہ ام ابراھیم" (مدینہ کے نزدیک ایک مقام) میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دیکھا کہ آنحضرتؐ کھجور کی ایک چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں اور بدن مبارک کا کچھ حصہ زمین پر ہے اور کھجور کے پتوں کا ایک تکیہ سر کے نیچے ہے۔ یہ دیکھ کر آپؐ پر سلام کیا اور بیٹھ گئے عرض کرنے لگے:

"آپ اللہ کے رسول اور اس کی بہترین مخلوق ہیں قیصر و کسریٰ تو طلائی تختوں اور ابریشمی بستروں پر سوئیں اور آپ کی یہ حالت ہو؟

آنحضرتؐ نے فرمایا:

" اولئک قوم اجلت طیباتھم وھی وشیکۃ الانقطاع وانما اخرت لنا طیباتنا "

"وہ ایسے لوگ ہیں کہ جن کے طیبات اسی دنیا میں دے دیئے گئے ہیں جو جلد ختم ہو جائیں گے۔
جبکہ ہمارے طیبات کو آخرت کے لیے ذخیرہ کر لیا گیا ہے۔"[1]

ایک اور روایت میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے بارے میں ہم پڑھتے ہیں کہ ایک دن خاص قسم کا حلوہ آنجناب کی خدمت میں لایا گیا تو آپؑ نے اسے نوش فرمانے سے انکار کر دیا۔ پوچھا گیا "آیا آپ اسے حرام جانتے ہیں؟" فرمایا نہیں۔

"ولکنی اخشی ان تتوق الیہ نفسی فاطلبہ، ثم تلا ھذہ الآیۃ: اذھبتم طیباتکم فی حیاتکم الدنیا واستمتعتم بھا۔"

"مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ میرا نفس اس کا مشتاق ہو جائے اور میں ہمیشہ اس کی طلب میں لگ جاؤں۔ پھر یہ آیت تلاوت فرمائی اذھبتم طیباتکم .....[2]

ایک اور روایت میں ہے کہ:

ان امیر المؤمنین علیہ السلام اشتھی کبدًا مشویۃ علی خبز لینہ فاقام حولا یشتھیھا، ذکر ذلک للحسنؑ وھو صائم یومًا من الایام فصنعھا لہ فلما اراد ان یفطر قربھا الیہ، فوقف سائل بالباب فقال: یا بنی! حملھا الیہ لا تقرأ صحیفتنا غدًا اذھبتم طیباتکم فی حیاتکم الدنیا واستمتعتم بھا۔"

"امیر المومنین علی علیہ السلام کا بھنی ہوئی کلیجی کو نرم روٹی کے ساتھ کھانے کو جی چاہا اور اس خواہش کو ایک سال کا عرصہ گزر گیا۔ ایک دن امام حسین علیہ السلام سے اس خواہش کی تکمیل کا اظہار فرمایا اور اس دن حضرت امیرؑ روزے سے تھے۔ جب مذکورہ کھانا افطار کے وقت تیار ہو گیا تو سائل نے آکر دروازے پر دستک دی، امیر المومنینؑ نے حکم دیا یہ کھانا سائل کو دے دیا جائے مبادا کل بروز قیامت جب ہمارا نامۂ اعمال پڑھا جائے تو ہم سے کہیں "اذھبتم طیباتکم فی حیاتکم الدنیا واستمتعتم بھا۔ (تم تو اپنی طیبات سے دنیا میں بہرہ ور ہو چکے ہو اور ان سے لذت اٹھا چکے ہو)۔[3]

---

[1] مجمع البیان جلد ۹ ص۔

[2] تفسیر برہان جلد ۴ ص۱۱۵ اسی آیت کے ذیل میں۔

[3] سفینۃ البحار جلد ۲ مادہ "کبد"

۲۱۔ وَاذْكُرْ اَخَا عَادٍ ؕ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖۤ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ○

۲۲۔ قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِتَاْفِكَنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○

۲۳۔ قَالَ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۫ وَاُبَلِّغُكُمْ مَّاۤ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَلٰكِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ○

۲۴۔ فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ ۙ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ؕ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ؕ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ○

۲۵۔ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۭ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰۤى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ○

ترجمہ

۲۱۔ قوم عاد کے بھائی (ہود کی داستان) انہیں یاد دلا۔ جب انہوں نے اپنی قوم کو سرزمین احقاف میں ڈرایا، جبکہ ان سے پہلے بہت سے ڈرانے والے انبیاء ماضی قریب

اور لبید میں گزر چکے تھے (ہُود نے قوم سے کہا) خدائے واحد کے سوا کسی کو عبادت نہ کرو، میں تمہارے بارے میں ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

۲۲۔ وہ بولے: کیا تو اس لیے آیا ہے کہ (جھوٹ اور فریب کے ذریعے) ہمیں ہمارے معبودوں سے پھیر دے۔ اگر تو سچ کہتا ہے تو جس عذاب کی ہمیں دھمکی دیتا ہے اُسے لے آ۔

۲۳۔ (ہُود نے) کہا: علم تو بس خدا کے پاس ہے (اور وہی جانتا ہے کہ کب تمہیں سزا دیدے) اور میں جو احکام دے کر بھیجا گیا ہوں وہ تمہیں پہنچائے دیتا ہوں۔ (میرا کام صرف یہی ہے) لیکن میں تمہیں ہمیشہ جہالت میں پڑی رہنے والی قوم دیکھتا ہوں۔

۲۴۔ جب انہوں نے اسے بادل کی صورت میں دیکھا کہ ان کے دروں اور ندی نالوں کی طرف اُمڈا آرہا ہے (تو خوشی خوشی) کہنے لگے یہ تو بارش برسانے والا بادل ہے (لیکن ان سے کہا گیا) یہ وہی چیز ہے جس کے آنے کی تم جلدی مچا رہے تھے۔! (یہ) وحشت ناک آندھی ہے جو دردناک عذاب کی حامل ہے۔

۲۵۔ جو اپنے پروردگار کے حکم سے ہر چیز کو تباہ و برباد کر دے گی۔ تو صبح ہوئی تو ان کی حالت یہ تھی کہ ان کے گھروں کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ ہم گناہگار لوگوں کو یونہی سزا دیا کرتے ہیں۔

تفسیر

قوم عاد اور تباہ کُن آندھی

قرآن مجید کُلی حقائق کو بیان کرنے کے بعد ان کے قابلِ ذکر مصداق بیان کرتا ہے تاکہ وہ کلی حقائق سامنے آجائیں۔ لہذا یہاں پر بھی سرکش مستکبرین اور ہوس پرست متکبرین کے احوال کی وضاحت قوم عاد کی مثال سے لی گئی ہے جو ایک واضح نمونہ ہے، ارشاد ہوتا ہے: مکہ کے ان مشرکین کو قوم عاد کے بھائی (ہود) کی سرگزشت یاد دلا (واذکر اخا عاد)۔

"اخ" (بھائی) کی تعبیر اس عظیم پیغمبر کی اپنی قوم کے ساتھ نہایت ہی دل سوزی اور اس کے ساتھ نہایت ہی محبت کو بیان کر رہی ہے، جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ تعبیر بہت سے عظیم انبیاء کے بارے میں قرآن مجید میں استعمال ہوئی ہے وہ اپنی قوم کے لیے دل سوز اور مہربان بھائی تھے اور انہوں نے ان کے لیے کسی ایثار سے کبھی دریغ نہیں کیا۔

ممکن ہے یہ تعبیر ضمنی طور پر ان کی اپنی قوموں سے رشتہ داری کی طرف بھی اشارہ ہو۔

پھر فرمایا گیا ہے: جب انہوں نے اپنی قوم کو سرزمین احقاف میں ڈرایا، جب کہ ان سے پہلے ماضی قریب اور بعید میں بہت سے انبیاء گزر چکے تھے، جنہوں نے اپنی قوم کو ڈرایا تھا (اذ انذر قومہ بالاحقاف وقد خلت النذر من بین یدیہ ومن خلفہ)۔

"احقاف" کے متعلق ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ اس کا معنی وہ اُڑنے والی ریت ہے جو ہواؤں کے ذریعے جنگلوں اور بیابانوں میں مستطیل اور کج مج صورت میں ڈھیروں کی صورت میں جمع ہوتی رہتی ہے اور اس تعبیر سے واضح ہوتا ہے کہ قوم عاد کا علاقہ ایک بہت بڑا ریگستان تھا۔

بعض لوگ اس کا محل وقوع جزیرہ نمائے عرب کے دل یعنی "نجد"، "احساء" "حضرموت" اور "عمان" کے درمیان کا علاقہ قرار دیتے ہیں۔[1]

لیکن یہ بات بعید معلوم ہوتی ہے، کیونکہ دوسری قرآنی آیات (مثلاً سورۂ شعراء) سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قوم عاد ایسی جگہ رہتی تھی جہاں پانی کی فراوانی تھی اور خوبصورت درخت موجود تھے اور جزیرہ نمائے عرب میں ایسی چیز بہت بعید ہے۔

بعض دوسرے مفسرین نے اسے جزیرہ نمائے عرب کے جنوب میں بتایا ہے جو یمن کے اطراف میں یا بحیرہ

---

[1] اعلام قرآن ص ۹۳

عرب کے ساحلوں پر تھی۔[1]

بعض حضرات کا خیال یہ بھی ہے کہ "احقاف" سرزمین عراق میں کلاہ اور بابل کے علاقوں میں سے ایک علاقہ ہے۔[2]

"طبری" کہتے ہیں کہ شام میں "احقاف" نامی ایک پہاڑ ہے۔[3]

لیکن "احقاف" کے لغوی معنی کی مناسبت اور اس چیز کے پیش نظر کہ ان کی سرزمین پر چلنے والی ریت سے غیر محفوظ ہونے کے باوجود پانی کی دولت سے مالا مال اور درختوں سے سرسبز تھی ان لوگوں کے قول کو زیادہ تقویت حاصل ہوتی ہے کہ یہ سرزمین جزیرہ نمائے عرب کے جنوب اور یمن کے نزدیک تھی۔

"وقد خلت النذر من بین یدیہ ومن خلفہ" (ڈرانے والے انبیاء جو ہود علیہ السلام کے آگے پیچھے آچکے تھے) یہ ان انبیاء کی طرف اشارہ ہے جو ان سے پہلے مبعوث ہو چکے تھے، کچھ تو بہت کم مدت کے فاصلے سے آئے تھے، جن کے بارے میں قرآن نے "من بین یدیہ" کہا ہے اور کچھ بہت زیادہ مدت کے فاصلے سے کہ جنہیں "من خلفہ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

لیکن بعض حضرات نے جو یہ احتمال پیش کیا ہے کہ اس جملے سے مراد وہ انبیاء ہیں جو ہود سے پہلے گزر چکے تھے یا ہودؑ کے بعد آئے تھے، بہت ہی بعید معلوم ہوتا ہے اور "قد خلت" سے بھی ہم آہنگ نہیں ہے جو زمانہ ماضی کا معنی دیتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس عظیم پیغمبر کی نبوت کن امور پر مبنی تھی؟ قرآن کہتا ہے:

(ہود نے اُن سے کہا) خدائے واحد کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو۔ (الا تعبدوا الا اللہ)۔

پھر انھیں متنبہ کرتے ہوئے مزید کہا: میں تمہارے بارے میں ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں (انی اخاف علیکم عذاب یوم عظیم)۔

اگرچہ "یوم عظیم" کے الفاظ عام طور پر قیامت کے دن کے معنی میں آئے ہیں، لیکن قرآنی آیات میں کبھی ان وحشت ناک اور سخت ایام پر بھی اس کا اطلاق کیا گیا ہے جو امتوں پر گزر چکے ہیں۔ اور یہاں پر بھی یہی معنی مراد ہیں، کیونکہ ہم انہی آیات میں آگے چل کر پڑھیں گے کہ آخر کار قوم عاد ایک سخت اور وحشتناک روز خدائی عذاب میں مبتلا ہو کر تباہ و برباد ہو گئی۔

لیکن اس ہٹ دھرم اور سرکش قوم نے خدا کی اس دعوت کے مقابلے کی ٹھان لی اور حضرت ہودؑ سے اس قوم کے افراد بولے: کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں جھوٹ اور فریب کے ذریعے ہمارے خداؤں سے پھیر

---

[1] "فی ظلال القرآن" انہی آیات کے ذیل میں۔

[2] مرحوم شعرانی نے تفسیر ابوالفتوح رازی کے حاشیہ پر نقل کیا ہے ملاحظہ ہو جلد ۱۰ صفحہ ۱۶۵۔

[3] مرحوم شعرانی نے تفسیر ابوالفتوح رازی کے حاشیہ پر نقل کیا ہے ملاحظہ ہو جلد ۱۰ صفحہ ۱۶۵۔

دے (قالوا اجئتنا لتأفکنا عن الھتنا)۔[1]

تُو اگر سچ کہتا ہے، تو جس عذاب کی ہمیں دھمکی دیتا ہے اسے لے آ (فأتنا بما تعدنا ان کنت من الصادقین)۔

یہ دونوں جُملے اس سرکش قوم کی بے راہ روی اور ہٹ دھرمی کو بخوبی واضح کر رہے ہیں کیونکہ پہلے جُملے میں وہ کہہ رہے ہیں کہ تیری یہ دعوت ان معبودوں کے برخلاف ہے جن کے ہم خوگر ہو چکے ہیں اور جو ہم نے اپنے آباؤ اجداد سے ورثے میں پائے ہیں۔ لہٰذا یہ سب کچھ جھوٹ اور فریب ہے۔

دوسرے جُملے میں وہ عذاب کا تقاضا کرتے ہیں، ایسا عذاب کہ اگر نازل ہو جائے تو پھر اس سے خلاصی کی راہیں مسدود ہو جائیں۔ اس قسم کے عذاب کی کون عقل مند شخص تمنا کر سکتا ہے ہر چند کہ اس پر یقین نہ بھی رکھتا ہو؟

لیکن ہُود علیہ السلام نے اس احمقانہ تقاضے کے جواب میں اُن سے کہا: "علم تو صرف خدا کے پاس ہے" (قال انما العلم عند اللہ)۔

وہی بہتر جانتا ہے کہ کب اور کن حالات میں وہ تباہ کن عذاب کو نازل کرے۔ اس سے نہ تو تمہارے تقاضوں کا تعلق ہے اور نہ ہی میرے ارادے اور اختیار کو اس میں کچھ دخل ہے، صرف اتمام حجت کا مقصد پورا ہو جائے کیونکہ اس کی حکمت کا یہی تقاضا ہے

پھر فرماتے ہیں: "میرا کام تو صرف یہ ہے کہ میں جو احکام دے کر بھیجا گیا ہوں وہ تم تک پہنچائے دیتا ہوں" (و ابلغکم ما ارسلت بہ)۔

میرا اصل فریضہ اور ذمہ داری یہی ہے اور اطاعتِ الٰہی کے لیے ارادہ کرنا تمہارا کام ہے اور عذاب کا ارادہ اور مشیت خدا کا کام ہے۔

لیکن میں تمہیں دیکھ رہا ہے کہ تم ہمیشہ جہالت اور نادانی میں پڑی رہنے والی قوم ہو، (و لٰکنی اراکم قوماً تجھلون)۔

تمہاری بدبختی کا اصل سرچشمہ بھی یہی جہالت ہے اور جہالت بھی ایسی جس میں ہٹ دھرمی، تکبر اور غرور پایا جاتا ہے اور وہ تمہیں خدا کے بھیجے ہُوئے بندوں کی دعوت کا مطالعہ کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ ایسی جہالت جو تمہیں عذاب الٰہی کے نزول اور تمہاری نابودی پر اکسا رہی ہے۔ اگر تمہیں کچھ علم ہوتا اور ذرہ بھر سوجھ بوجھ ہوتی تو کم از کم اتنا تو ضرور سوچ لیتے کہ تمام منفی احتمالات کے مقابلے میں کم از کم ایک مثبت احتمال بھی تو موجود ہے کہ اگر متحقق ہو جائے تو تمہارا کچھ نہیں رہے گا۔

سرانجام ہُود علیہ السلام کی تمام نصیحتیں اور برادرانہ شفقت اور رہبری ان سنگدلوں پر کچھ اثر نہ کر سکی اور وہ حق کو قبول

---

[1] "لتأفکنا" "افک" کے مادہ سے ہے جس کا معنی جھوٹ اور حق سے انحراف ہے۔

کرنے کے بجائے اپنے باطل عقیدے پر بڑی ہٹ دھرمی کے ساتھ ڈٹے رہے، حتیٰ کہ نوح علیہ السلام کی بھی لوگ ان الفاظ کے ساتھ تکذیب کرتے تھے کہ "اگر سچ کہتے ہو تو جس عذاب کا وعدہ کیا ہے وہ کیا ہوا؟"

اب جب کہ کافی اتمام حجت ہو چکی اور انہوں نے زندہ رہنے کی عدم اہلیت کا ثبوت فراہم کر دیا تو حکمت الٰہی بھی اس بات پر آمادہ ہو گئی کہ ان پر "استیصالی عذاب" یعنی تباہ کن عذاب نازل کرے۔

انہوں نے اچانک دیکھا تو افق پر ایک ابر ظاہر ہوا اور بہت جلد پورے آسمان پر پھیل گیا۔

جب انہوں نے اسے بادل کی صورت میں دیکھا کہ ان کے دروں اور ندی نالوں کی طرف امڈا آرہا ہے تو خوشی خوشی کہنے لگے یہ تو بارش برسانے والا بادل ہے (فلما رأوہ عارضا مستقبل اودیتھم قالوا ھذا عارض ممطرنا)۔[1]

مفسرین کہتے ہیں کہ ایک عرصے تک قوم عاد کے علاقے میں بارش نہیں برسی تھی۔ موسم بہت گرم اور خشک تھا یہاں تک کہ دم گھٹنے لگ گیا تھا۔ جب قوم عاد کی نگاہ گھنگھور گھٹا پر پڑی جو دور کی افق سے ان کے آسمان کی جانب رواں دواں تھی تو وہ لوگ اسے دیکھ کر بہت مسرور ہو گئے اور بارش کے استقبال میں اسی جانب چل پڑے اور دروں اور پہاڑی نالوں کے راستوں کے کنارے پہنچ گئے تاکہ بابرکت بارش کے برسنے کے منظر سے لطف اندوز ہوں۔

لیکن بہت جلد انہیں بتا دیا گیا کہ یہ بارش برسانے والے بادل نہیں ہیں۔ "یہ تو وہی وحشت ناک عذاب ہے جس کے آنے کی تم جلدی مچا رہے تھے" (بل ھو ما استعجلتم بہ)۔

"یہ وہ وحشت ناک آندھی ہے جو دردناک عذاب کی حامل ہے" (ریح فیھا عذاب الیم)۔

بظاہر یہ بات کہنے والا خود خداوند بزرگ و برتر ہے یا پھر حضرت ہود علیہ السلام ہیں۔ جب ان کی خوشی کے نعرے سنے تو ان سے یہ کہا گیا۔

جی ہاں یہ تباہ کن آندھی ہے "جو اپنے پروردگار کے حکم سے ہر چیز کو تباہ و برباد کر دے گی" (تدمر کل شیء بامر ربھا)۔

بعض مفسرین کے بقول "ہر چیز" سے مراد انسان، چوپائے اور ان کے اموال ہیں کیونکہ بعد کے جملے میں فرمایا گیا ہے، تو ایسے عالم میں ان کی صبح ہوئی کہ ان کے گھروں کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا (فاصبحوا لا یرٰی الا مساکنھم)۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے گھر تو صحیح سالم تھے لیکن وہ خود ہلاک ہو گئے اور ان کے اجسام اور اموال بھی تیز و تند آندھی کے ذریعے دور دراز کے جنگلوں، بیابانوں یا پھر سمندر میں پھینک دیئے گئے۔

---

[1] "عارض" "عرض" کے مادہ سے ہے اور یہاں پر اس بادل کے معنی میں ہے جو آسمان پر پھیل جاتا ہے اور شاید یہ بارش برسانے والے بادلوں کی ایک علامت ہے، جو اس افق پر پھیل کر اوپر بڑھتا جاتا ہے۔ "اودیۃ" "وادی" کی جمع ہے، جس کا معنی درّہ اور پانی بہنے کی جگہ ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ جب وہ پہلی بار متوجہ ہوئے کہ یہ سیاہ بادل تو گرد و غبار سے اٹی آندھی کے ہیں اور یہ وہ وقت تھا جب یہ بادل ان کے علاقے کے بالکل نزدیک پہنچ گئے اور ان کے جانوروں اور چرواہوں کو جو اردگرد کے بیابانوں میں تھے زمین سے اُٹھا اٹھا کر پٹخنے لگے اور خیموں کو اکھاڑ کر اس قدر اوپر لے جانے لگے کہ وہ ایک ٹڈی کے مانند نظر آرہے تھے۔

انہوں نے جب یہ منظر دیکھا تو دوڑے دوڑے اپنے گھروں میں جا گھسے اور دروازے بند کر لیے، لیکن ہوا نے ان کے دروازوں کو بھی اکھاڑ کر زمین پر دے مارا یا پھر اوپر پھینک دیا؛ اور "احقاف" یعنی اڑنے والی ریت کو ان کے جسموں پر ڈال دیا۔

سورۂ حاقہ کی ساتویں آیت میں ہے کہ " یہ آندھی سات راتیں اور آٹھ دن تک مسلسل چلتی رہی" وہ مسلسل ریت کے ٹیلوں کے نیچے سے چیخ و پکار کر رہے تھے، پھر آندھی نے ریت کو ان کے اوپر سے ہٹا دیا اور ان کے بدن ظاہر ہو گئے پھر ان اجسام کو اپنے ساتھ لے جا کر سمندر میں پھینک دیا۔ [1]

آخر میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ یہ انجام اس گمراہ قوم کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ "ہم گناہگار لوگوں کو یونہی سزا دیا کرتے ہیں" (کذالک نجزی القوم المجرمین)۔

یہ ایک تنبیہ ہے کہ تمام مجرموں، گناہگاروں، کافروں، ہٹ دھرم لوگوں اور خود غرض افراد کے لیے کہ اگر تم بھی اس راہ پر چلو گے تو تمہارا انجام بھی ان لوگوں سے قطعاً بہتر نہیں ہوگا۔

کبھی ان ہواؤں کو جو قرآن کے بقول " مبشرات بین یدی رحمتہ " (اس کی باران رحمت کے پیش قدم ہوتی ہیں) اور ان کا کام مردہ زمینوں کو زندہ کرنا ہوتا ہے، ہلاکت کا حکم ملتا ہے۔

کبھی وہ زمین جو انسان کے آرام و سکون کا گہوارہ ہوتی ہے ایک زبردست جھٹکے سے قبرستان میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

کبھی وہ بارش جو تمام موجودات کا سرمایہ حیات ہوتی ہے، سیلاب میں بدل جاتی ہے اور ہر چیز غرق کر دیتی ہے۔

جی ہاں! انسان کی زندگی پر مامور چیزوں کو اس کی موت کا عامل بنا دیا جاتا ہے اور کس قدر دردناک ہے ایسی موت جو زندگی کے عامل سے جنم لے۔ خاص کر جب قوم ہود جیسے افراد کے لیے کہ اوّل تو فرحت اور سرور پیدا کرے پھر عذاب میں مبتلا کر دے تاکہ یہ عذاب زیادہ دردناک ہو۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ فرمایا گیا ہے، یہ ہوا، ہوا کی یہ لطیف موجیں ہی تھیں جنہوں نے پروردگار کے حکم سے تمام چیزوں کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ [2]

---

[1] تفسیر فخر رازی جلد ۲۸ صفحہ ۲ انہی آیات کے ذیل میں اور تفسیر قرطبی جلد ۹ صفحہ ۶۰۲۶ میں بھی یہی معنی ذکر کیا گیا ہے۔

[2] "تدمر" "تدمیر" کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہلاک اور نیست و نابود کرنا ہے

۲۶۔ وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْـِٕدَةً ۖ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝

۲۷۔ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝

۲۸۔ فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً ۭ بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ ۚ وَذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝

ترجمہ

۲۶۔ اور ہم نے ان (قوم عاد کے افراد) کو وہ قدرت دی جو تمہیں نہیں دی اور ان کے لیے کان اور آنکھ اور دل بنائے (لیکن نزول عذاب کے وقت) نہ تو انہیں ان کی آنکھوں، کانوں، اور عقلوں نے کچھ فائدہ دیا، کیونکہ وہ خدائی آیات کا انکار کرتے تھے آخر کار جس چیز کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے، اس نے انہیں ہر طرف سے گھیر لیا۔

۲۷۔ اور ہم نے تمہارے اردگرد کی قوموں کو ہلاک کر دیا اور اپنی نشانیوں کو مختلف صورتوں میں ان کے سامنے بیان کیا تاکہ یہ لوگ باز آجائیں۔

۲۸۔ تو خدا کے سوا جنہیں ان لوگوں نے تقرب خدا کے لیے معبود بنا رکھا تھا

انہوں نے ان کی کیوں نہ مدد کی؟ بلکہ وہ تو ان سے گم ہو گئے، یہ تھا ان کے جھوٹ اور افتراء پردازیوں کا نتیجہ۔

تفسیر

تم قوم عاد سے زیادہ طاقتور نہیں ہو:

یہ آیات درحقیقت گذشتہ آیات کا نتیجہ بیان کر رہی ہیں، جن میں قوم عاد کی دردناک سزا کی گفتگو کی گئی تھی۔

مشرکین مکہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے قوم عاد کو وہ طاقت دی تھی جو تم کو نہیں دی (ولقد مکنّاھم فیما ان مکنّاکم فیہ)۔ [1]

وہ جسمانی لحاظ سے بھی تم سے زیادہ طاقت ور تھے اور مال و دولت اور مادی وسائل کے لحاظ سے بھی۔ اگر جسمانی طاقت مال و دولت اور مادی وسائل ہی لوگوں کو عذاب الٰہی سے نجات دلا سکتے تو قوم عاد کے افراد، آندھیوں میں خس و خاشاک کے مانند فضا میں نہ اڑتے پھرتے کہ چند ٹوٹے پھوٹے گھروں کے سوا ان کی اور کوئی چیز باقی نہیں رہ گئی تھی۔

یہ آیت درحقیقت سورہ فجر کی ان آیات کے مانند ہے جو اسی قوم کے بارے میں نازل ہوئی ہیں کہ:

"الم تر کیف فعل ربّک بعاد ارم ذات العماد التی لم یخلق مثلھا فی البلاد"

"کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے قوم عاد کے ساتھ کیا کیا؟ وہ بلند قامت قوم جن کی اونچی اونچی عمارتیں تھیں، وہ ایسی قوم تھی کہ شہروں میں جس کی مثل پیدا نہیں کی گئی۔

(فجر/ ۶ تا ۸)

یا سورۂ ق کی ۳۶ ویں آیت کے مانند ہے، جس میں کہا گیا ہے:

"وکم اھلکنا قبلھم من قرن ھم اشد منھم بطشًا"

"اور کس قدر ایسی قومیں ہیں جنہیں ہم نے ان سے پہلے ہلاک کر ڈالا جو ان لوگوں سے طاقت کے لحاظ سے بھی زیادہ تھیں اور انفرادی قوت کے لحاظ سے بھی"

---

[1] "ان مکنّاکم فیہ" کے جملہ میں "ان" نافیہ ہے۔ قرآنی آیات سے ہمارے پاس بہت سے دلائل ہیں جو تمن میں بیان ہوئے ہیں۔ لیکن بعض مفسرین نے اس "ان" کو یا شرطیہ مانا ہے یا زائدہ، جو فصیح معلوم نہیں ہوتا۔

خلاصہ کلام یہ کہ جو لوگ تم سے طاقت میں کئی گناہ زیادہ تھے وہ خدا کی سزا کے طوفان کے سامنے نہ ٹھہر سکے تم کس باغ کی مولی ہو؟

پھر فرمایا گیا ہے: ہم نے ان کے لیے کان اور آنکھ اور دل بنائے (وجعلنا لھم سمعًا وابصارًا وافئدۃً)[1] وہ حقائق کے ادراک، نگاہ اور پہچان کے لحاظ سے بھی قوی اور طاقت ور تھے۔

لیکن نزول عذاب کے وقت انہیں ان کی آنکھوں، کانوں اور عقلوں نے کچھ فائدہ نہ دیا، کیونکہ وہ خدائی آیات کا انکار کرتے تھے (فما اغنیٰ عنھم سمعھم ولا ابصارھم ولا افئدتھم من شیء اذ کانوا یجحدون بآیات اللہ)۔[1]

آخر کار جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے اس نے انہیں ہر طرف سے گھیر لیا: (وحاق بھم ما کانوا بہ یستھزءون)۔

جی ہاں وہ مادی وسائل سے بھی لیس تھے اور حقائق کے ادراک کے ذرائع سے بھی۔ لیکن چونکہ خدائی آیات سے ہٹ دھرمی اور تکبر کے ساتھ پیش آتے تھے اور انبیاء کی باتوں کا مذاق اڑاتے تھے، لہٰذا نور حق ان کے دلوں میں داخل نہیں ہوا اور غرور و تکبر اور حق دشمنی اس بات کا سبب بن گئے کہ وہ آنکھ کان اور عقل جیسے ہدایت و معرفت کے آلات و وسائل سے فائدہ نہ اٹھا سکے اور نجات کے راستوں کو تلاش نہ کر سکے۔ آخر کار ایسے انجام سے دوچار ہوئے، جس کا تذکرہ گذشتہ آیات میں ہو چکا ہے۔

جہاں پر اس قدر قدرت اور وسائل کے باوجود ان کا کچھ بس نہ چل سکا اور ان کے بے جان ڈھانچے آندھیوں کی موجودگی میں خس و خاشاک کے مانند بڑی رسوائی سے ادھر اُدھر ٹھوکریں کھاتے پھرتے تھے، تم تو ان سے کہیں کمزور اور ناتواں ہو۔

خدا کے لیے یہ بات مشکل نہیں ہے کہ تمہیں تمہارے اعمال کے جرم میں سخت سے سخت عذاب میں مبتلا کر دے اور تمہاری زندگی کے عوامل کو تمہاری موت اور تباہی کے لیے مامور کر دے، یہ خطاب مکہ کے مشرکین کے لیے بھی ہے اور ہر دور کے مغرور، ظالم اور ہٹ دھرم لوگوں کے لیے بھی۔

یقیناً، جیسا کہ قرآن فرماتا ہے، ہم پہلے انسان نہیں ہیں جنہوں نے روئے زمین پر قدم رکھا ہے۔ ہم سے پہلے بھی بہت سی قومیں گزر چکی ہیں جن کے پاس وسائل بھی تھے اور طاقت بھی، کیا ہی اچھا ہو کہ ان کی تاریخ کو ہم آئینہ عبرت بنائیں اور اس میں اپنے مستقبل اور انجام کو دیکھیں۔

---

[1] یہ بات قابل توجہ ہے کہ "ابصار" (آنکھیں) اور "افئدۃ" (دل اور عقول) جمع کی صورت میں بیان ہوئے ہیں، جب کہ "سمع" مفرد کی صورت میں ہے ممکن ہے کہ یہ فرق اس لیے ہو کہ "سمع" مصدری معنی کا حامل ہے اور مصدر ہمیشہ مفرد کی صورت میں استعمال ہوتا ہے یا اس لیے کہ دیکھی جانے والی اور ادراک کی جانے والی چیزوں کے مقابلے میں مسموعات (سنی جانے والی چیزیں) ہم آہنگ ہوتی ہیں۔

پھر بات کو زیادہ زور دے کر بیان کیا گیا ہے اور نصیحت آمیز انداز میں مشرکین مکہ کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ نہ صرف قوم عاد بلکہ "ہم نے تمہارے اردگرد کی سرکش قوموں کو بھی ہلاک کر ڈالا" (ولقد اھلکنا ما حولکم من القری)۔

جن قوموں کے علاقے تم سے زیادہ دُور نہیں۔ تقریباً جزیرہ نمائے عرب کے اردگرد ہی وہ آباد تھے، اگر قوم عاد "احقاف" میں اس جزیرہ نما کے جنوب میں رہتی تھی تو قوم ثمود اس کے شمال میں "حجر" نامی سرزمین میں رہتی تھی۔ قوم سبا، جو دردناک انجام سے دوچار ہوئی یمن کی سرزمین میں رہتی تھی۔ قوم شعیب تو تمہارے شام جانے کے راستے میں سرزمین مدین میں زندگی بسر کرتی تھی۔ اسی طرح قوم لوط بھی اسی علاقے میں رہائش پذیر تھی اور یہ سب کی سب قومیں گناہوں، نافرمانیوں اور کفر کی وجہ سے مختلف عذابوں میں گرفتار ہوئیں۔

ان میں ہر قوم کا انجام عبرت کا آئینہ ہے اور ہر ایک ناطق گواہ کہ کیونکر وہ بیدار کرنے والے اس قدر وسائل و ذرائع کے باوجود بھی بیدار نہ ہوئیں؟

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: اور ہم نے اپنی نشانیوں کو مختلف صورتوں میں ان سے بیان کیا تاکہ یہ لوگ باز آجائیں (و صرفنا الآیات لعلھم یرجعون)۔

کبھی تو ہم نے انہیں معجزے دکھائے، کبھی نعمت عطا کی، کبھی بلاؤں اور مصیبتوں میں گرفتار کیا، کبھی نیک لوگوں کی تعریف کی، کبھی بُرے لوگوں کی نکوہش کی اور کبھی دوسروں کو آنے والے ہولناک عذاب کے تذکرہ سے انہیں نصیحت کی لیکن تکبر، غرور، خود خواہی اور ہٹ دھرمی نے انھیں ہدایت حاصل کرنے کی اجازت نہیں دی۔

اسی سلسلے کی آخری آیت میں انھیں سرزنش کرتے ہوئے ان الفاظ کے ساتھ ان پر تنقید کی گئی ہے، تو خدا کے سوا جن کو ان لوگوں نے تقرب خدا کے لیے معبود بنا رکھا تھا انہوں نے ان سخت اور حساس لمحات میں ان کی کیوں مدد نہ کی؟ (فلو لا نصرھم الذین اتخذوا من دون اللہ قربانا آلھۃ)۔[1]

سچ تو یہ ہے کہ اگر وہ برحق معبود ہوتے تو اپنے پیروکاروں کی ایسے سخت اور حساس لمحات میں مدد کرتے اور ہولناک عذاب کے چنگل سے انھیں چھٹکارا دلاتے۔ یہی چیز ان کے عقیدہ کے باطل ہونے کی ایک محکم دلیل ہے جو ان بناوٹی معبودوں کو اپنے مصیبت کے دنوں کے لیے اپنی پناہ گاہ سمجھتے تھے۔

پھر فرمایا گیا ہے: نہ صرف ان کی امداد نہیں کی بلکہ ان سے گم بھی ہو گئے (بل ضلوا عنھم)۔

اس طرح کی بے حیثیت اور بے قیمت مخلوق جو نہ تو کسی کام کا مبدا ہے اور نہ ہی کسی قسم کا فائدہ پہنچا سکتی ہے اور

---

[1] "اتخذوا" کا پہلا مفعول محذوف ہے اور دوسرا مفعول "آلھۃ" ہے اور "قربانا" حال ہے اور پورا جملہ تقدیری صورت میں یوں ہے "اتخذوا آلھۃ من دون اللہ حال کونھم متقربا بھم" اور یہ احتمال بھی ہے کہ "قربانا" مفعول لہ ہے۔ البتہ آیت کی ترکیب کے سلسلے میں اور بھی کئی احتمال پائے جاتے ہیں جو زیادہ قابل توجہ نہیں ہیں۔

ہر طرح کے حادثے اور سانحے کے وقت غائب اور گم ہو جاتی ہے وہ کیونکر عبادت کے لائق ہو سکتی ہے؟

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: یہ تھا ان کے جھوٹ اور افتراء پردازیوں کا نتیجہ (وذالک افکھم وما کانوا یفترون)۔

یہ ہلاکت اور بدبختی، یہ دردناک عذاب اور مصیبت کے موقع پر معبودوں کا گم ہو جانا ان کے جھوٹ اور افتراء پردازیوں ہی کا تو نتیجہ ہیں۔[1]

---

[1] بنابریں آیت میں ایک محذوف ہے اور اس کی تقدیری صورت یوں ہے "وذالک نتیجۃ افکھم" اور یہ احتمال بھی ہے کہ آیت میں محذوف ماننے کی ضرورت ہی نہ ہو تو اس صورت میں اس کا معنی یوں ہوگا "یہ تھا ان کا جھوٹ اور افتراء پردازیاں" لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۲۹۔ وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ○

۳۰۔ قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○

۳۱۔ يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ○

۳۲۔ وَمَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ وَلَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءُ ۭ اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○

ترجمہ

۲۹۔ اور اُس وقت کو یاد کر جب ہم نے جنوں میں سے ایک گروہ کو تیری طرف متوجہ کیا کہ قرآن سُنیں، پھر جب وہ حاضر ہُوئے تو ایک دوسرے سے کہنے لگے خاموش ہو کر سُنتے رہو۔ جب تمام ہُوا تو اپنی قوم کی طرف واپس گئے اور اُسے جا کر ڈرایا۔

۳۰۔ انہوں نے کہا: اے قوم! ہم ایک کتاب سُن کر آئے ہیں جو موسیٰ کے بعد نازل ہوئی ہے اور اپنے سے پہلے کی کتابوں کی نشانیوں سے ہم آہنگ حق کی طرف اور سیدھے راستے کی طرف ہدایت کرتی ہے۔

۳۱۔ اے ہماری قوم! خدا کی طرف بلانے والے کی بات مانو اور اس پر ایمان لے آؤ تاکہ تمہارے گناہوں کو بخش دے اور تمہیں دردناک عذاب سے پناہ دے۔

۳۲۔ اور جو شخص خدا کی طرف بلانے والے کی بات نہیں مانے گا وہ ہرگز خدا کے عذاب سے زمین میں فرار نہیں کر سکتا اور خدا کے علاوہ اس کا کوئی سرپرست اور مددگار نہیں ہوگا، اور ایسے لوگ کھلی گمراہی میں ہیں۔

شانِ نزول

ان آیات کی شان نزول میں مختلف روایات ذکر ہوئی ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے:

حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ سے طائف کے بازار عکاظ میں تشریف لے گئے۔ زید بن حارثہ بھی آنحضرتؐ کے ہمراہ تھے۔ اس سفر کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو اسلام کی دعوت دی جائے، لیکن کسی نے بھی آپ کی دعوت قبول نہ کی۔ ناچار مکہ کی طرف واپس آئے، دوران سفر ایسی جگہ پہنچے جسے "وادیٔ جن" کہا جاتا تھا۔ رات کے دوران آپ نے قرآن مجید کی تلاوت فرمائی۔ وہاں سے کچھ جنات کا گزر ہوا۔ جب تلاوت کلام اللہ کی آواز ان کے کانوں میں پہنچی تو اسے غور سے سننے لگے اور ایک دوسرے سے کہنے لگے "خاموش رہو"! جب آپ نے تلاوت مکمل کرلی تو وہ مسلمان ہوگئے اور مبلغ کی حیثیت سے اپنی قوم کی طرف لوٹ آئے اور اسے اسلام لانے کی دعوت دی۔ ان میں سے کچھ لوگ ایمان لے آئے اور مبلغین کے ہمراہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے انہیں اسلام کی تعلیمات یاد کروائیں۔ اسی موقعہ پر مندرجہ بالا آیات اور سورۂ جن نازل ہوئی۔[1]

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ صـ۱۹ میں تفسیر علی بن ابراہیم سے نقل کیا گیا ہے۔ (کچھ تلخیص کے ساتھ)

کچھ اور لوگوں نے ایک اور شانِ نزول ابن عباس سے نقل کی ہے جو گزشتہ شانِ نزول سے ملتی جلتی ہے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ اس کے مطابق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے اور نماز کے دوران قرآن مجید کی تلاوت فرما رہے تھے کہ جنات کے ایک گروہ کا وہاں سے گزر ہوا، جو تحقیق اور جستجو کر رہے تھے اور آسمان سے خبروں کے منقطع ہو جانے نے انہیں پریشان کر رکھا تھا۔ جب انہوں نے پیغمبر اکرمؐ کے قرآن پڑھنے کی آواز سنی تو کہنے لگے کہ ہم سے آسمانی خبروں کے انقطاع کا سبب بھی یہی چیز ہے، یہیں سے وہ اپنی قوم کی طرف لوٹ گئے اور جا کر اسے اسلام کی دعوت دی۔

مرحوم طبرسی نے تفسیر مجمع البیان میں ایک تیسری شانِ نزول بیان کی ہے[1] جس کی داستان آنحضرتؐ کے سفر طائف سے مربوط ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

حضرت ابوطالب کی وفات کے بعد پیغمبر اکرم کے لیے سخت مشکلات کا دور شروع ہو گیا اور آپ نے طائف کا سفر اختیار کیا کہ شاید وہاں پر کوئی دوست مددگار مل جائے۔ لیکن طائف کے سرداروں نے آپ کی زبردست تکذیب کی اور آپؐ کو اس قدر پتھر مارے کہ آپ کے پاؤں مبارک سے خون بہنے لگا۔ آپ تھک کر اور زخموں سے چور ایک باغ کے پاس پہنچے اور وہاں ایک کھجور کے درخت کے سائے کے نیچے بیٹھ گئے۔ خون آپؐ کے پاؤں سے جاری تھا۔

یہ عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ کا باغ تھا جو قریش کے دو دولتمند افراد تھے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب انہیں دیکھا تو سخت پریشان ہو گئے کیونکہ آپؐ ان کی دشمنی سے پہلے ہی باخبر تھے۔

ان دونوں نے انگوروں کا ایک تھال بھر کر اپنے عیسائی غلام "عداس" کے ذریعے آپ کی خدمت میں بھیج دیا۔ آنحضرتؐ نے اس سے پوچھا: تم کہاں کے رہنے والے ہو؟

اس نے کہا: "نینوا کا"۔

فرمایا: خدا کے صالح بندے یونسؑ کے شہر کے۔

عداس نے پوچھا: آپؐ یونسؑ کو کہاں سے پہچانتے ہیں؟

آنحضرتؐ نے فرمایا: میں خدا کا رسول ہوں اور خدا ہی نے مجھے بتایا ہے۔

یہ سُن کر عداس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقانیت کو تسلیم کر لیا۔ خدا کے حضور سجدہ کیا اور آپ کے قدموں کے بوسے لیے۔

جب وہ واپس لوٹ گیا تو عتبہ اور شیبہ نے اسے زبردست سرزنش کی کہ تم نے یہ کام کیوں کیا؟

اس نے کہا: یہ تو خدا کے صالح بندے ہیں، انہوں نے مجھے اس پردیس اور اجنبی ماحول میں ہمارے پیغمبر یونسؑ کے بارے میں بتایا ہے۔

---

[1] یہ روایت ہم نے خلاصہ کے ساتھ بیان کی ہے اور صحیح بخاری، صحیح مسلم اور مسند امام احمد میں تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔
("ظلال القرآن" جلد، صفحہ ۴۲۹)

وہ یہ سُن کر ہنسنے لگے اور کہنے لگے: کہیں ایسا نہ ہو کہ تمھیں وہ تمھارے دین عیسائیت کے بارے میں دھوکا دے، کیونکہ وہ تو ایک دھوکا باز انسان ہے۔ (نعوذ باللہ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ کی جانب واپس آ گئے، (اس سفر کا ماحصل صرف ایک مومن شخص تھا) راستے میں نصف شب کے قریب کھجور کے ایک درخت کے نزدیک پہنچے اور نماز پڑھنا شروع کر دی۔ وہیں سے "نصیبین" یا "یمن" کے جنات کے ایک ٹولے کا گزر ہوا۔ آپ نمازِ صبح پڑھ رہے تھے، انہوں نے نماز میں قرآن مجید کی تلاوت کی آواز پر کان لگائے اور ایمان لے آئے۔[1]

تفسیر

"جنّات" ایمان لاتے ہیں:

اِن آیات میں، جیسا کہ شانِ نزول میں اشارہ ہو چکا ہے، پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آسمانی کتاب پر جنات کے ایمان لانے کا ذکر تفصیل کے ساتھ آیا ہے تاکہ مشرکین مکہ کو اس حقیقت سے آگاہ کیا جائے کہ جنات کا ایک بظاہر دور افتادہ ٹولہ اس پیغمبر پر جو انسان ہے اور تمھارے درمیان رہتا ہے، کس طرح ایمان لے آیا ہے اور تم ہو کہ اپنے کفر پر ڈٹے ہوئے ہو اور اس کی مخالفت پر ہمیشہ کمربستہ رہتے ہو۔

"جنات نامی مخلوق اور ان کی خصوصیات کے بارے میں انشاء اللہ سورۂ جن کی تفسیر میں بحث ہوگی، یہاں پر صرف زیرِ تفسیر آیات کے بارے میں گفتگو ہوگی۔

"قومِ ہُود کی داستان درحقیقت مشرکین مکہ کے لیے ایک زبردست تنبیہ کی حیثیت رکھتی تھی، اور قوم جن کے ایمان لانے کی داستان ایک اور تنبیہ تھی۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے جنوں میں سے ایک گروہ کو تیری طرف متوجہ کیا کہ دل لگا کر قرآن سنیں۔ (واذ صرفنا الیک نفرًا من الجنّ یستمعون القرآن)۔

"صرفنا" "صرف" کے مادہ سے ہے، جس کا معنی کسی چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل کرنا ہے۔ ممکن ہے یہ تعبیر اس معنی کی طرف اشارہ ہو کہ جنوں کا ٹولہ پہلے "استراق سمع" (خبریں چرانے) کے ذریعے آسمانوں کی خبروں کو سُنا کرتا تھا، لیکن جب آنحضرت کا ظہورِ رسالت ہوا تو وہ اس سے روک دیئے گئے اور قرآن کی جانب متوجہ ہوئے۔

---

[1] مجمع البیان جلد ۹ صفحہ ۹۳۔ اس داستان کو ابن ہشام نے اپنی کتاب "السیرۃ النبویہ" میں تھوڑے سے فرق کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ (جلد ۲ صفحہ ۶۳، صفحہ ۶۴)

"نفر" کے بارے میں راغب نے مفردات میں لکھا ہے کہ یہ لوگوں کے ایسے گروہ کو کہتے ہیں جو مل کر سفر کر سکتے ہوں۔ اور ارباب لغت کے درمیان مشہور یہ ہے کہ "نفر" تین سے دس تک مشتمل جماعت کو کہتے ہیں اور بعض لوگوں کے نزدیک تین سے چالیس افراد پر مشتمل جماعت کو کہتے ہیں۔ (ہر چند کہ فارسی زبان میں ایک فرد کو بھی "نفر" کہتے ہیں)۔

پھر فرمایا گیا ہے: جب وہ قرآن کے سامنے حاضر ہوئے اور اس کی روح پرور آیات کو سنا تو ایک دوسرے سے کہنے لگے خاموش ہو کر سنتے رہو (فلما حضروہ قالوا انصتوا)۔

یہ اس وقت تھا جب پیغمبر اکرمؐ نصف شب میں یا نماز صبح کے دوران قرآنی آیات کی تلاوت کر رہے تھے۔

"انصتوا" "انصات" کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے خاموش ہو کر اور دل لگا کر پوری توجہ سے سننا۔

آخر الامر جب نور ایمان ان کے دل میں چمک اٹھا تو انہوں نے آیات قرآنی کی حقانیت کو اپنے اندر محسوس کر لیا۔ لہٰذا "جب قرآن پڑھنا تمام ہوا تو وہ مبلغین کے مانند اپنی قوم کی طرف واپس آگئے اور اسے جا کر ڈرایا اور جو حقیقت ان پر نمایاں ہو گئی تھی اس سے قوم کو آگاہ کیا (فلما قضی ولوا الی قومھم منذرین)۔

ایمان کے طلب گار افراد کا یہی طریقہ ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ ایمان کی تلاش میں رہتے ہیں اور جن حقائق سے خود آگاہ ہوتے ہیں ان سے دوسروں کو بھی آگاہ کرتے ہیں اور ایمان کے منبع سے انہیں بھی مطلع کرتے ہیں۔

بعد کی آیت قوم کی طرف پلٹ جانے کے بعد ان جنوں کی دعوت و تبلیغ کی کیفیت بیان کر رہی ہے، ایسی دعوت جو جامع، جچی تلی، مختصر اور بامعنی ہے: انہوں نے کہا اے قوم! ہم ایک کتاب سن کر آئے ہیں جو موسیٰ کے بعد نازل ہوئی ہے (قالوا یاقومنا انا سمعنا کتابا انزل من بعد موسیٰ)۔

اس کتاب کی کچھ مخصوص صفات ہیں پہلی صفت تو یہ ہے کہ اپنے سے پہلی آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور اس کے مضامین ان کے مضامین سے ہم آہنگ ہیں اور سابقہ کتابوں میں جو نشانیاں بیان کی گئی ہیں وہ اس میں بخوبی دیکھی جا سکتی ہیں۔ (مصدقا لما بین یدیہ)[1]

اس کی دوسری صفت یہ ہے کہ سب کو حق کی طرف ہدایت کرتی ہے۔ (یھدی الی الحق)۔

وہ یوں کہ جو شخص بھی اپنی عقل اور فطرت سے کام لے گا اس میں حقانیت کی علامتیں بخوبی نظر آئیں گی۔

اس کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ "سیدھے راستے کی طرف ہدایت کرتی ہے" (والی طریق مستقیم)۔

حق کی طرف دعوت اور صراط مستقیم کی طرف دعوت میں بھی بظاہر فرق یہ ہے کہ پہلا (حق) صحیح اعتقادات کی طرف اشارہ ہے اور دوسرا (صراط مستقیم) صحیح اور سیدھے عملی نظام کی طرف۔

"انزل من بعد موسیٰ" اور "مصدقا لما بین یدیہ" کے جملے اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ جنات کا یہ گروہ گزشتہ آسمانی کتابوں خصوصاً حضرت موسیٰ کی کتاب پر ایمان رکھتا تھا اور حق کی تلاش میں تھا اور اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ

---

[1] اس جملے کی تفسیر ہم نے تفسیر نمونہ جلد اول سورۂ بقرہ کی ۴۱ ویں آیت کی تفسیر میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔

کی کتاب کا تذکرہ نہیں ہے حالانکہ وہ موسیٰؑ کی کتاب کے بعد نازل ہوئی ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ بقول ابن عباس جنات عیسیٰ علیہ السلام کی کتاب کے نزول سے مطلقاً بے خبر تھے۔ کیونکہ جنات تو آسمانی خبروں سے بھی باخبر تھے وہ زمین کی خبروں سے کس طرح غافل رہ سکتے ہیں؟

بلکہ اس لیے ہے کیونکہ "تورات" بنیادی کتاب تھی، حتیٰ کہ عیسائی حضرات بھی اپنے شرعی احکام اسی سے حاصل کرتے تھے اور کرتے ہیں۔

انہوں نے پھر کہا "اے ہماری قوم! خدا کی طرف بلانے والے کی بات مانو اور اس پر ایمان لے آؤ (یا قومنا اجیبوا داعی اللہ و آمنوا بہ)۔

کہ وہ تمھیں عظیم اجر عطا فرمائے گا۔ تمہارے گناہوں کو معاف کردے گا اور تمھیں دردناک عذاب سے پناہ میں رکھے گا۔ (یغفر لکم من ذنوبکم و یجرکم من عذاب الیم)۔ [1]

"داعی اللہ" (خدا کا دعوت کرنے والا) سے مراد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، کہ جو انہیں "اللہ" کی طرف رہنمائی کرتے تھے اور چونکہ زیادہ تر خوف گناہوں اور قیامت کے دردناک عذاب سے ہوتا ہے، لہٰذا انہوں نے ان دونوں چیزوں سے بچاؤ کی بات کی ہے تاکہ قوم کی زیادہ توجہ اپنی طرف مبذول کرواسکیں۔

کئی مفسرین نے "من ذنوبکم" میں "من" کے کلمہ کو "زائدہ" سمجھا ہے، جو اس بات کی تاکید ہے کہ تمام گناہوں کی بخشش کا ایمان پر دارومدار ہے۔

لیکن بعض اور مفسرین نے اسے من "تبعیضیہ" اور ان گناہوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے کہ وہ معاف کیے جائیں گے جو انہوں نے ایمان لانے سے پہلے انجام دیئے ہیں یا ان گناہوں کی طرف جن میں "حق اللہ" کا پہلو ہے نہ کہ "حق الناس" کا۔

لیکن زیادہ مناسب معنی وہی من کے زائدہ ہونے والا ہے جو تاکید ہے اور آیت مجیدہ تمام گناہوں کے بارے میں ہے۔

اس سلسلے کی آخری آیت میں جن مبلغین کی آخری گفتگو کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا: اور جو شخص خدا کی طرف بلانے والے کی بات نہیں مانے گا وہ ہرگز خدا کے عذاب سے زمین میں قرار نہیں کرسکتا۔ (و من لا یجب داعی اللہ فلیس بمعجز فی الارض)۔

اور خدا کے علاوہ اس کا کوئی یار و مددگار اور سرپرست نہیں ہوگا۔ (ولیس لہ من دونہ اولیاء)۔

اور لہٰذا "یہ لوگ کھلی گمراہی میں ہیں"۔ (اولئک فی ضلال مبین)۔

اس سے بڑھ کر اور کیا بدترین اور واضح ترین گمراہی ہوگی کہ انسان حق اور پیغمبر خدا حتیٰ کہ خود خدا کے مقابلے پر کمربستہ

---

[1] "یجرکم" "ایجار" کے مادہ سے ہے جس کے کئی معانی ہیں، فریاد کو پہنچنا، عذاب سے بچانا، پناہ دینا اور حفاظت کرنا۔

ہو جائے کہ جس کے بغیر پوری کائنات میں نہ تو کوئی پناہ گاہ ہے اور نہ ہی اس کے مُلک سے فرار کر کے کہیں اور جا سکتا ہے۔

ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ لفظ "معجز" (اپنی تمام مشتقات سمیت) ایسے مقامات پر سزا اور تعاقب سے عاجز کرنے کے معنی میں آتا ہے، بالفاظ دیگر سزا کے چنگل سے فرار کرنے کے معنی ہیں۔

" فی الارض" (زمین میں) کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ زمین کے کسی خطے میں چلے جائیے، خدا ہی کی حکومت ہوگی، اور کچھ بھی اس کے احاطۂ قدرت سے باہر نہیں ہے اور اگر آسمان کا ذکر نہیں کیا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جنّات ہوں یا انسان سب کا ٹھکانا بہر حال زمین ہی ہے۔

چند نکات

۱۔ موثر تبلیغ: جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ جنّات، ان کے زندگی کے انداز اور ان سے متعلق دوسرے امور کے بارے میں تو ہم انشاء اللہ سورہ جن کی تفسیر میں تفصیل سے بحث کریں گے، لیکن زیر تفسیر آیات سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ صاحب عقل و شعور مخلوق ہیں اور ان پر خدائی فرائض کی بجا آوری ضروری قرار دی گئی ہے۔ ان کے دو فرقے ہیں ایک مومن اور دوسرا کافر، اور وہ خدا کی دعوت سے کافی آشنا ہیں۔

زیر نظر آیات میں جو چیز زیادہ قابل توجہ ہے وہ ان کی قوم میں اسلامی تبلیغ کا طریقہ کار ہے جو انہوں نے اپنایا۔

انہوں نے پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہونے، قرآنی آیات سننے اور ان کے مطالب سمجھنے کے بعد فوراً ہی اپنی قوم کی اصلاح کی ٹھان لی اور سیدھے اپنے کے پاس پہنچے اور تبلیغ کا سلسلہ شروع کر دیا۔

انہوں نے سب سے پہلے قرآن کی حقانیت اور صداقت کی بات کی اور اسے تین دلائل کے ساتھ ثابت بھی کیا۔ پھر اسے شوق دلایا، اس آسمانی کتاب پر ایمان کے زیر سایہ اسے آخرت کے عذاب سے نجات کی خوشخبری سُنائی، جس سے ایک طرف تو معاد کے مسئلے پر تاکید کرنا تھی اور دوسری طرف ناپائیدار دنیاوی اقدار کے مقابلے میں آخرت کے پائیدار اور اصل اقدار کی طرف متوجہ کرانا تھا۔

تیسرے مرحلے پر انہوں نے ترکِ ایمان کے خطرات سے بھی قوم کو آگاہ کیا اور استدلال اور دل سوزی کے ملے جُلے انداز میں اسے متنبہ بھی کر دیا اور اس راستے سے انحراف کے انجام جو "ضلالِ مبین" یا کھلی گمراہی ہے سے بھی اسے خبردار کیا۔

تبلیغ کا یہ انداز ہر شخص اور جماعت کے لیے مؤثر ہے۔

۲۔ عظمتِ قرآن کی بہترین دلیل: مندرجہ بالا آیات، اسی طرح سورہ جن کی آیات سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ جنّوں کا یہ گروہ قرآنی آیات سنتے ہی اس کا فریفتہ ہو گیا اور اس بات کی کوئی علامت نہیں ملتی کہ انہوں نے پیغمبر اسلامؐ سے کسی اور معجزے کا تقاضا کیا ہو۔

انہوں نے صرف ان امور پر اکتفا کی کہ:

۱۔ قرآن مجید سابقہ آسمانی کتابوں کی نشانیوں سے ہم آہنگ ہے۔
۲۔ حق کی طرف بلاتا ہے۔
۳۔ اس کی منصوبہ بندی سیدھی راہ پر چلنے کے لیے کی گئی ہے۔

ان تینوں چیزوں کے پیش نظر انہوں نے قرآن کی حقانیت کا یقین کر لیا۔

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ قرآنی مضامین اور مطالب میں غور و فکر ہمیں دوسرے تمام دلائل سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

ایسی کتاب جو ایک ایسی شخصیت کی طرف سے پیش کی گئی ہو جس نے دنیا میں کسی سے کوئی درس نہیں پڑھا، اس میں اس قدر عظیم مطالب، پاک معارف و عقاید، خالص توحید، محکم قوانین، طاقت ور دلائل، پختہ اور تعمیری لائحہ عمل، واضح اور اعلیٰ وعظ و نصیحتیں ہوں اور وہ بھی ایسے جاذب اور زیبا انداز میں تو یہ یقیناً اس آسمانی کتاب کی حقانیت و صداقت کی بذات خود بہترین دلیل ہے۔ کیونکہ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔[1]

---

[1] اعجاز قرآن کے بارے میں ہم نے تفسیر نمونہ کی جلد اول کی سورۂ بقرہ کی ۲۳ ویں آیت کی تفسیر میں تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

۳۳۔ اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ یَعْیَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ یُّحْیِۦَ الْمَوْتٰی ؕ بَلٰٓی اِنَّهٗ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝

۳۴۔ وَیَوْمَ یُعْرَضُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا عَلَی النَّارِ ؕ اَلَیْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰی وَرَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا کُنْتُمْ تَکْفُرُوْنَ ۝

۳۵۔ فَاصْبِرْ کَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ؕ کَاَنَّهُمْ یَوْمَ یَرَوْنَ مَا یُوْعَدُوْنَ ۙ لَمْ یَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ؕ بَلٰغٌ ۚ فَهَلْ یُهْلَکُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝

ترجمہ

۳۳۔ کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ جس خدا نے سارے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور ان کے پیدا کرنے سے ذرا بھی عاجز نہیں ہوا وہ اس بات پر قادر ہے کہ مردوں کو زندہ کرے؟ وہ یقیناً ہر چیز پر قادر ہے۔

۳۴۔ اس دن کا سوچ کہ جس دن کفار آگ کے سامنے پیش کیے جائیں گے (تو ان سے کہا جائے گا) کیا یہ برحق نہیں ہے؟ تو وہ لوگ کہیں گے بالکل، ہمارے پروردگار کی قسم (کہ برحق ہے، تو اس وقت) فرمائے گا تو لو اب اپنے انکار و کفر کے بدلے عذاب

کا مزہ چکھو۔

۳۵۔ بنا بریں جس طرح اولوالعزم پیغمبر صبر کرتے رہے تو بھی اس طرح صبر کر اور ان کے (عذاب کے) لئے تعجیل نہ کر، جس دن وہ ان وعدوں کو دیکھیں گے جو ان سے کیے گئے تھے تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ گویا ایک دن میں گھڑی بھر دنیا میں رہے ہیں، یہ ابلاغ ہے سب لوگوں کے لیے، تو کیا فاسق لوگوں کے سوا اور کوئی ہلاک ہو گا؟

تفسیر

اولوالعزم پیغمبروں کی طرح صبر کریں:

یہ آیات جو سورۂ احقاف کی آخری آیتیں ہیں "معاد" کے بارے میں گفتگو کر رہی ہیں۔ کیونکہ ایک تو گزشتہ آخری آیات میں جنوں کے مبلغین کی زبانی معاد کی بات ہوئی تھی اور دوسرے سورۂ احقاف کے ابتدائی حصوں میں توحید عظمت قرآن مجید اور پیغمبر اسلامؐ کی نبوت کے اثبات کے بارے میں گفتگو ہو چکی ہے اور اس سورت کے آخری حصے میں معاد کے مسئلے کو پیش کیا جا رہا ہے۔ اس طرح سے تینوں اعتقادی اصولوں کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ جس خدا نے سارے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور ان کے پیدا کرنے سے ذرا بھی تھکا نہیں اور نہ ہی عاجز ہوا، وہ اس بات پر قادر ہے کہ مردوں کو زندہ کرے، یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے (اولم یروا ان اللہ الذی خلق السماوات والارض ولم یعی بخلقھن بقادر علی ان یحیی الموتی بلی انہ علی کل شیء قدیر)۔

آسمانوں اور زمین کو رنگا رنگ اور مختلف مخلوق سمیت خلق کرنا ہر چیز پر اس کی قدرت کی علامت ہے کیونکہ جو چیز بھی تصور میں آجائے اسے خدا ہی نے اس دنیا میں خلق فرمایا ہے۔ تو پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ انسانوں کو دوبارہ زندگی عطا کرنے سے عاجز ہو؟ یہ امکان معاد پر ایک نہایت دندان شکن دلیل ہے۔

اصولی طور پر ہر چیز کے امکان کی دلیل اس کا خود اپنا وقوع پذیر ہونا ہے۔ ہم جو اس قدر جاندار چیزوں کو بے جان چیزوں سے معرض وجود میں آتا دیکھ رہے ہیں، تو معاد کے مسئلے میں اس کی قدرت مطلقہ کے بارے کس طرح شک کر سکتے ہیں؟

یہ معاد کے متعدد دلائل میں سے ایک ہے جو خداوندِ عالم نے قرآن مجید کی مختلف آیات میں بیان فرمائے ہیں، منجملہ ان کے سورۂ یٰسین کی آیت ۸۱ میں بھی ہے۔[1]

بعد کی آیت میں گناہگاروں اور معاد کے منکروں کے دردناک سزا کے منظر کو مجسم کرکے فرمایا گیا ہے:

اس دن کا سوچ کہ جس دن کفار آگ کے سامنے پیش کیے جائیں گے (ویوم یعرض الذین کفروا علی النار)۔

جی ہاں! کبھی تو دوزخ کو کافروں اور گناہگاروں کے سامنے لایا جائے گا اور کبھی گناہگاروں اور کافروں کو دوزخ کے سامنے پیش کیا جائے گا اور ہر ایک کا اپنا خاص مقصد ہوگا جن کے بارے میں چند آیات پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے۔

جب کفار کو جہنم کے سامنے پیش کیا جائے گا اور وہ جہنم کے جھلسا دینے والے کوہ پیکر اور وحشت ناک شعلوں کو دیکھیں گے تو ان سے کہا جائے گا: کیا یہ برحق نہیں (الیس ھٰذا بالحق)۔

آیا آج بھی قیامت، خدا کی عدالت اور اس کی سزا و جزا کا انکار کر سکتے ہو؟ اب بتاؤ کہ کیا یہ گذشتہ لوگوں کے خرافات پر مبنی قصے کہانیاں ہیں؟

انہیں اعتراف کے سوا کوئی اور صورت نظر نہیں آئے گی لہٰذا: کہیں گے بالکل ہمارے پروردگار کی قسم (برحق ہے اس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں، ہم خود گمراہ تھے کہ اسے ناحق سمجھتے تھے) (قالوا بلیٰ وربنا)۔

تو اس وقت خداوند تعالیٰ یا اس کے فرشتے کہیں گے: تو اب انکار اور کفر کے بدلے عذاب کا مزہ چکھو (قال فذوقوا العذاب بما کنتم تکفرون)۔

تو اس طرح سے وہ تمام حقائق کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور اعتراف کریں گے، اعتراف اور اقرار بھی ایسا کہ جو انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکے گا اور سوائے روحانی اور وجدانی تکلیف و حسرت دائمہ کے اور کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔

اس سلسلے کی آخری آیت میں جو درحقیقت سورۂ احقاف کی بھی آخری آیت ہے، اللہ تعالیٰ گزشتہ آیات میں معاد کے اثبات اور کفار کی سزا کے پیشِ نظر اپنے رسول کو حکم دیتا ہے: "بنابریں! جس طرح اولوا العزم پیغمبر صبر کرتے رہے تو بھی صبر کر (فاصبر کما صبر اولوا العزم من الرسل)۔

صرف آپ ہی کو اس قوم کی عداوت اور مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا تمام اولوا العزم پیغمبروں کو بھی یہی مشکلات درپیش تھیں اور انہوں نے استقامت اور صبر و ضبط کا مظاہرہ کیا۔ عظیم پیغمبر نوحؑ نے ۹۵۰ سال تک تبلیغ دین کی لیکن تھوڑے سے لوگوں کے سوا ان پر کوئی ایمان نہ لایا بلکہ ان کو مسلسل تکلیفیں دیتے رہے اور ان کا مذاق اڑاتے رہے۔

ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالا گیا، موسیٰؑ کو جان سے مار دینے کی دھمکی دی گئی، ان کا دل قوم کی نافرمانیوں اور خلاف ورزیوں کی وجہ سے خون ہو گیا اور عیسیٰؑ کو زبردست تکلیفیں پہنچائی گئیں، انہیں بھی جان سے مار دینے کے منصوبے بنائے گئے، لیکن

---

[1] اس موضوع کے بارے میں اور معاد کے بارے میں مختلف دلائل کے سلسلے میں مزید تفصیل کے لیے سورۂ یٰسین کی آخری آیات کی تفسیر کا مطالعہ فرمائیے۔ (تفسیر نمونہ جلد ۱۷)

خدا نے انہیں بچا لیا، غرض جب سے دُنیا قائم ہے یہی کچھ ہوتا آرہا ہے اور صبر و استقلال کی طاقت کے بغیر ان مشکلات پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔

اولوا العزم پیغمبر کون تھے؟

اولوالعزم پیغمبر کون تھے، اس بارے میں مفسرین کی مختلف آرا ہیں اور اس سلسلے میں تحقیق کرنے سے پہلے "عزم" کے معنی کو اچھی طرح سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ "اولوالعزم" کا معنی "صاحبانِ عزم" ہے۔

"عزم" محکم اور پختہ ارادے کو کہتے ہیں۔ راغب اپنی کتاب مفردات میں کہتے ہیں:

"عزم القلب علی امضاء الامر"

"کسی کام کو کر گزرنے کے بارے میں پختہ ارادہ کر لینا"

قرآن پاک میں "عزم" کبھی تو "صبر" کے معنی میں استعمال ہوا ہے، جیسے:

"ولمن صبر و غفر ان ذالک لمن عزم الامور"

"جو شخص صبر کرے اور معاف کر دے تو یقیناً یہ چیز عزم امور میں سے ہے۔ (شوریٰ/۴۳)

اور کبھی "ایفائے عہد" کے معنی میں، جیسے:

"ولقد عهدنا الیٰ آدم من قبل فنسی ولم نجد له عزماً"

"ہم نے پہلے سے آدم کے ساتھ عہد کر لیا، لیکن وہ فراموش کر گئے اور اپنے عہد پر باقی نہ رہے"

(طٰہٰ/ ۱۱۵)

لیکن اس بات کے پیش نظر کہ جو انبیاء نئی شریعت اور جدید دین لے کر آئے تھے انہیں دوسروں سے زیادہ مصائب و مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا اور ان کا مقابلہ انہوں نے بڑے محکم عزم اور ارادے سے کیا لہٰذا ایسے انبیاءؑ کو "اولوالعزم" کہا جاتا ہے اور زیر تفسیر آیت بھی بظاہر اسی چیز کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

ضمنی طور پر یہ اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی انہی رسولوں میں سے ہیں کیونکہ قرآن کہتا ہے: تو بھی اسی طرح صبر کر جس طرح اولوالعزم رسول صبر کرتے رہے"

یہ جو بعض مفسرین نے "عزم" اور "عزیمت" کی "حکم اور شریعت" کے معنی سے تفسیر کی ہے تو یہ اس کے معنی کی مناسبت سے ہے، وگرنہ لغت میں "عزم" بمعنی "شریعت" نہیں آیا۔

بہر حال اس معنی کے لحاظ سے "من الرسل" میں "من" "تبعیضیہ" اور بزرگ انبیاء کے ایک خاص گروہ کی طرف اشارہ ہے جو صاحبانِ شریعت تھے، جیسا کہ سورۂ احزاب کی ساتویں آیت میں ان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

"واذ اخذنا من النبیین میثاقهم ومنك ومن نوح وابراهیم و

موسیٰ وعیسی ابن مریم واخذنا منهم میثاقاً غلیظاً "

" اس وقت کو یاد کر جب ہم نے انبیاء سے پیمان لیا اور تجھ سے اور نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ بن مریم سے بھی۔ ہم نے ان سب سے محکم اور پختہ پیمان لیا۔ (احزاب/۷)

یہاں پر تمام انبیاء کا جمع کی صورت میں ذکر کرنے کے بعد ان پانچ عظیم پیغمبروں کا نام لیا گیا ہے جو ان کی خصوصیت کی دلیل ہے۔

سورہ شوریٰ کی تیرھویں آیت میں بھی انہی کا ذکر کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

" شرع لکم من الدین ما وصّی به نوحاً والذی اوحینا الیك وما وصینا به ابراهیم وموسیٰ وعیسیٰ "

" اس نے تمہارے لیے اس دین کو مقرر کر دیا ہے جس کی نوح کو سفارش کی اور جس کی ہم نے تیری طرف وحی کی اور ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو بھی اس کی سفارش کی۔"

شیعہ اور سنی کتب میں اس بارے میں بہت سی روایات ملتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اولوالعزم پیغمبر یہی پانچ ہیں جیسا کہ حضرت امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام سے ایک روایت ہے:

" منهم خمسة، اوّلهم نوح ثمّ ابراهیم ثمّ موسیٰ ثمّ عیسیٰ ثمّ محمدٌ "[1]

ایک اور روایت میں جناب امام زین العابدین علیہ السلام سے منقول ہے:

" منهم خمسة اولوا العزم من المرسلین، نوحٌ وابراهیمٌ وموسیٰ وعیسیٰ ومحمدٌ "

راوی نے پوچھا:

" لم سمّوا اولوا العزم؟ "

" انہیں اولوالعزم کیوں کہا جاتا ہے؟ "

تو امام نے فرمایا:

" لانهم بعثوا الی شرقها وغربها وجنها وانسها "

" کیونکہ وہ شرق و غرب اور جن و انس کی طرف مبعوث ہوئے۔"[2]

ایک اور حدیث میں بھی حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

---

[1] مجمع البیان جلد ۹ صفحہ ۹۳ (انہی آیات کے ذیل میں)

[2] بحار الانوار جلد ۱۱ صفحہ ۵۰ (حدیث ۶۱) اسی جلد کے صفحہ ۵۶ پر حدیث نمبر ۵۵ بھی صراحت کے ساتھ یہی کچھ کہتی ہے۔

"سادة النبیین والمرسلین خمسة وهم اولوا العزم من الرسل و علیهم دارة الرحی نوح وابراهیم وموسیٰ وعیسیٰ ومحمد"

انبیاء و مرسلین کے سردار پانچ ہیں اور وہی اولوالعزم رسُول ہیں نبوّت و رسالت کی چکّی ان کے گرد گھومتی ہے اور وہ ہیں حضرات نوح، ابراہیم، مُوسیٰ، عیسیٰ اور محمد علیہم السلام۔ [1]

تفسیر "درمنثور" میں ابن عباس سے بھی یہی چیز منقول ہے کہ اولوالعزم رسُول پانچ ہیں۔ [2]

البتہ بعض مفسرین اولوالعزم رسولوں سے وہ رسُول مراد لیتے ہیں جنہیں دشمنوں سے لڑنے کا حکم ملا۔

بعض مفسرین نے ان کی تعداد تین سو تیرہ بتاتے ہیں۔ [3]

جبکہ بعض دوسرے مفسرین تمام پیغمبروں کو اولوالعزم (قوی ارادے کا مالک) سمجھتے ہیں۔ [4]

اور اس قول کے مطابق "من الرسل" میں "من" بیانیہ ہے تبعیضیہ نہیں ہے۔

لیکن پہلی تفسیر سب سے زیادہ صحیح ہے اور اسلامی روایات بھی اسی کی تائید کرتی ہیں۔

ان سب باتوں کے بعد قرآن فرماتا ہے: اور ان کفّار کے بارے میں عذاب کی تعجیل نہ کر۔ (ولا تستعجل لهم)۔

کیونکہ قیامت جلد آنے والی ہے اور جس چیز کے بارے میں خود ان کو جلدی ہے وہ اسے بہت جلد اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ اس دن انہیں سخت سزا دی جائے گی پھر انہیں اپنی غلطیوں کا پتہ چلے گا۔

دُنیا کی عُمر آخرت کے مقابلے میں اس قدر کوتاہ ہے کہ "جس دن وہ ان وعدوں کو دیکھیں گے جو ان سے کیے گئے تھے تو انہیں معلوم ہوگا کہ گویا دن کی صرف ایک گھڑی وہ اس دُنیا میں ٹھہرے ہیں (کانهم یوم یرون ما یوعدون لم یلبثوا الا ساعة من نهار)۔

آخرت کے مقابلے میں دنیا دی عمر کی کمی کا احساس یا تو اس لیے ہوگا کہ واقعاً یہ زندگی اس حیات جاوید کے مقابلے میں ایک گھڑی سے زیادہ نہیں ہے، یا پھر اس لیے کہ یہ دنیا اس قدر تیزی سے گزر رہی ہے کہ گویا ایک گھڑی سے زیادہ نہیں ہے یا اس لیے کہ انہوں نے اپنی پوری دنیا سے کما حقہ فائدہ اُٹھایا، لہٰذا اس کا ثمرہ ایک گھڑی سے زیادہ نہیں ہے۔

اب حسرت ان کے دلوں پر چھائی ہوگی، لیکن اس کا کیا فائدہ؟ کیونکہ واپسی کی تمام راہیں مسدود ہو چکی ہوں گی۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کہ:

"کم ما بین الدنیا والآخرة؟

"دُنیا اور آخرت کے درمیان کتنا فاصلہ ہے؟"

تو آپ نے فرمایا:

---

[1] کافی جلد اوّل باب طبقات الانبیاء والرسل، حدیث نمبر ۳۔

[2] و [3] و [4] تفسیر درمنثور جلد ۶، صفحہ ۲۵۰

"غمضة عين"
"صرف پلک جھپکنے کا"
پھر فرمایا خداوند تعالیٰ کا ارشاد ہے:
"كانهم يوم يرون ما يوعدون لم يلبثوا الا ساعة من نهار"[1]
اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ "ساعة" کی تعبیر عام گھنٹے یا گھڑی کی مقدار کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ یہ زمانے کے مختصر اور کم ہونے کی طرف اشارہ ہے:
پھر تمام لوگوں کو متنبہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ ابلاغ ہے، سب لوگوں کے لیے (بلاغ)[2]
ان سب لوگوں کے لیے جو پروردگار کی عبودیت کی راہ سے ہٹ گئے ہیں، ان لوگوں کے لیے جو دُنیا کی زود گزر زندگی اور اس کی خواہشات میں مگن ہو چکے ہیں۔ المختصر اس ناپائیدار دُنیا میں رہنے والے تمام لوگوں کے لیے ابلاغ ہے۔
آخری جُملے میں بامعنی اور تہدید آمیز سوال کے طور پر فرمایا گیا ہے: تو کیا فاسق لوگوں کے سوا کوئی اور ہلاک ہوگا؟
فهل يهلك الا القوم الفاسقون۔

آنحضرتؐ صبر و استقامت کا مجسم نمونہ تھے

خدا کے عظیم پیغمبروں خصوصاً پیغمبر اسلامؐ کی زندگی سخت مصائب، زبردست طوفانوں اور طاقت فرسا مشکلات کے مقابلے میں انتہائی صبر و استقامت کی آئینہ دار تھی۔ اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے راہِ حق میں اس قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، راہ حق کے راہیوں کو اس سے سبق لینا چاہیئے۔
ہم عام طور پر تاریخ اسلام کے روشن نقطے سے اس کے ابتدائی تاریک ایام کو دیکھنے کے عادی ہیں، اور مستقبل کے بھروکوں سے ماضی کو دیکھنے کا یہ انداز حقائق و واقعات کو اور طرح سے پیش کرتا ہے۔ لیکن ہمیں ان ایام کو تصور میں لانا چاہیئے جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تن تنہا تھے اور افق زندگی میں کامیابی کی کوئی کرن دکھائی نہیں دیتی تھی۔
ہٹ دھرم دشمن ان کی نابودی پر کمربستہ تھے، حتیٰ کہ ابولہب جیسے نزدیک ترین رشتہ دار بھی صف اوّل کے دشمنوں میں شامل تھے۔
آپ مسلسل قبائل عرب کے پاس جاتے تھے، انہیں اسلام کی دعوت دیتے تھے، لیکن کوئی بھی شخص مثبت جواب

---

[1] روضۃ الواعظین منقول از نور الثقلین جلد ۵ صـ ۲۵۔
[2] "بلاغ" مبتدائے محذوف کی خبر ہے، جس کی تقدیری صورت یہ ہے۔ "هذا القرآن بلاغ" یا "هذا الوعظ والانذار بلاغ"۔

نہیں دیتا تھا۔

آپؐ پر اس قدر پتھر برساتے کہ بدنِ مبارک سے خون بہنے لگ جاتا، لیکن آپ اپنے مشن پر ڈٹے رہے۔

ان کا سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی بائیکاٹ اس حد تک سخت کر دیا گیا تھا کہ ہر طرف کی راہیں آپؐ پر اور آپ کے ساتھیوں پر مسدود ہو گئی تھیں، کچھ تو بھوک کی وجہ سے اور کچھ بیماری کی وجہ سے راہیٔ ملک بقا ہو گئے۔

آپ کے ساتھیوں کو اس قدر ایذائیں پہنچائی گئیں اور شکنجوں میں جکڑا گیا کہ ان کے دل و جان پر اس کا اثر ہوا۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایسے سخت دن بھی گزرے ہیں کہ جن کے ذکر سے زبان و قلم دونوں عاجز ہیں۔ جب آپؐ لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے طائف تشریف لے گئے تو اہلِ طائف نے نہ صرف آپ کی دعوت پر لبیک نہیں کہا بلکہ اس قدر پتھر مارے کہ پاؤں مبارک سے خون جاری ہو گیا۔

بے سمجھ لوگوں کو اکسایا کہ آپ پر آوازے کسیں اور بدکلامی کریں، آپ کو مجبوراً ایک باغ میں پناہ لینا پڑی اور ایک درخت کے سائے میں بیٹھ کر اپنے خدا سے یوں راز و نیاز کرنے لگے۔

" اللّٰھم الیک اشکو ضعف قوتی. وقلة حیلتی، وھوانی علی الناس یاارحم الراحمین ! انت رب المستضعفین، وانت ربی، الی من تکلنی؟ الیٰ بعید یتجھمنی ؟ امر الی عدو ملکته امری؟ ان لم یکن بک علی غضب فلا ابالی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

" خداوندا! میں اپنی کمزوری، ناتوانی، مجبوری کی اور لوگوں کی مجھ سے بے احترامی کی تجھ سے شکایت کرتا ہوں۔ اے سب سے زیادہ رحم کرنے والے تو مستضعفین کا پروردگار ہے، تو میرا پروردگار ہے، تو مجھے کس کے حوالے کرے گا؟ کیا دور دراز کے ان لوگوں کے جو مجھے غصّے سے بھرے درپیش آئے ہیں یا ان دشمنوں کے جو میرے امر کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لیں گے؟ پروردگارا! اگر تو مجھ سے راضی ہو جائے تو میرے لیے یہی کافی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "[1]

کبھی وہ لوگ آپؐ کو جادوگر کہتے تھے اور کبھی دیوانہ کہہ کر بلاتے تھے۔

کبھی آپ کے سر پر گرد و غبار اور کوڑا کرکٹ ڈالا جاتا اور کبھی آپؐ کو شہید کرنے پر ایکا کر لیتے اور آپ کے گھر کا تلواروں سے محاصرہ کر لیتے۔

لیکن ان تمام مصائب و مشکلات کے باوجود آپؐ نے صبر و شکیبائی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

اور آخر کار اس کا شیریں پھل بھی پا لیا۔ آپؐ کا دین نہ صرف جزیرہ نمائے عرب میں بلکہ مشرق سے غرب تک پھیل گیا۔

اور آج ہر صبح و شام چار گوشۂ جہان سے اور دنیا کے پانچوں براعظموں میں اذان سنائی دیتی ہے جو آپ کی فتح اور کامرانی

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۶۱

کی آواز ہے۔ اور یہی ہے معنی " فاصبر کما صبر اولوا العزم من الرسل " کا۔

اور یہ ہے شیاطین اور اہریمنوں کے ساتھ نبرد آزمائی کا طریقہ، ان پر کامیابی حاصل کرنے کا طریقہ کار اور خدا کے عظیم اہداف و مقاصد تک رسائی کا انداز۔

تو پھر آج آرام طلب لوگ صبر و شکیبائی اور رنج و غم اٹھائے بغیر کیونکر اپنے عظیم مقاصد کو حاصل کر سکتے ہیں؟

آج کے مسلمان اس قدر دشمنوں کے مقابلے میں جو ان کی نابودی پر تلے ہوئے ہیں، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحیح اور اصلی مکتب سے ہدایت اور سبق حاصل کئے بغیر کیونکہ کامیاب ہو سکتے ہیں؟

مسلمان راہنما اور لیڈر تو خاص طور پر یہ طرز عمل اپنانے کے پابند ہیں۔ جیسا کہ حضرت امیر علیہ السلام فرماتے ہیں:

" ان الصبر علی ولاۃ الامر مفروض لقول اللہ عز وجل لنبیہ، فاصبر کما صبر اولوا العزم من الرسل، و ایجابہ مثل ذالک علی اولیائہ واھل طاعتہ بقولہ، لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔

" رہبروں اور زمام داروں پر صبر و استقامت فرض ہے کیونکہ خدا نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا ہے۔ " فاصبر کما صبر اولوا العزم من الرسل " اور اسی چیز کو اپنے دوستوں اور اطاعت گزاروں پر بھی فرض قرار دیا ہے کیونکہ اس کا ارشاد ہے کہ رسول اللہ کی ذات تمہارے لیے ایک بہت اچھا نمونہ ہے۔ (تم سب کو ان کی پیروی کرنی چاہیئے)۔ [1]

خداوندا! یہ عظیم نعمت، یہ آسمانی عطیہ اور مصائب و مشکلات کے مقابلے میں یہ صبر و شکیبائی اور استقامت ہمیں بھی عنایت فرما۔

پروردگارا! ہدایت کا یہ چراغ جسے تیرے اولوا العزم رسولوں خصوصاً خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طاقت فرسا تکلیفیں اٹھا کر بشریت کے راستے میں روشن رکھا ہے، ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم اسے روشن ہی رکھیں اور پوری لیاقت کے ساتھ اس کی حفاظت کرتے رہیں۔

بار الٰہا! ہم جانتے ہیں کہ حق کے تمام دشمن متفق اور متحد ہو چکے ہیں اور کسی بھی جرم کے ارتکاب سے دریغ نہیں کرتے تو ان کی کوششوں سے زیادہ ہمیں صبر و شکیبائی کی توفیق عطا فرما تاکہ ان بے حد و حساب مشکلات کے سامنے ہم ہرگز نہ جھکنے پائیں اور طوفانی موجوں سے کامیابی سے گزر جائیں

---

[1] نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۳ بحوالہ احتجاج طبرسی۔

اور تیری امداد اور تیرے بے انتہا لطف و کرم کے بغیر قطعاً ناممکن ہے۔!
آمین یا رب العالمین

سورۂ احقاف
کی
تفسیر ختم ہوئی

جمعہ ۳ رمضان ۱۴۰۵ھ

سُورۂ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

یہ سُورت مدینہ میں نازل ہوئی
اور
اس کی ۳۸، آیتیں ہیں

تاریخ اعجاز
۲، شعبان جمعۃ المبارک ۱۴۰۵ھ

سُورۂ محمدؐ
کے
مضامین

اس سُورت کی دوسری آیت میں چونکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام مذکور ہوا ہے اس لیے اس کا نام "محمدؐ" رکھا گیا ہے اور اس کا دوسرا نام قتال بھی ہے۔ واقع یہ ہے کہ دشمنانِ اسلام کے ساتھ جنگ اور جہاد جو نہایت اہم موضوع ہے اس سُورت پر سایہ فگن ہے جب کہ اس سُورت کی دوسری بہت سی آیات میں کفار اور مومنین کے حالات اور صفات و خصوصیات کا تقابل کیا گیا ہے اسی طرح ان کے اُخروی انجام کو بیان کیا گیا ہے۔ کلی طور پر اس سُورت کے ذیل کے مضامین کو چند حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

① ایمان اور کُفر کا مسئلہ اور اس دُنیا میں اور اس جہان میں مومنین اور کفار کے حالات کا تقابل۔
② دشمنوں کے ساتھ جنگ اور جہاد کے مسئلے پر واضح اور تفصیلی بحث اور جنگی قیدیوں کے متعلق حکم۔
③ اس کا ایک بڑا حصّہ منافقین کے حالات کی تشریح کرتا ہے، جو ان آیات کے نزول کے وقت مدینہ میں تخریبی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔
④ ایک اور حصّے میں "زمین کی سیر" اور گزشتہ اقوام کے انجام کے سلسلے میں تحقیق کی بات کی گئی ہے اور ان کے انجام سے درسِ عبرت حاصل کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔
⑤ کچھ آیات میں جنگ کے مسئلے کی مناسبت سے الٰہی امتحان کا تذکرہ ہے۔
⑥ ایک اور حصّے میں "انفاق" (راہِ خدا میں خرچ کرنے) کی بات کی گئی ہے جو بذاتِ خود جہاد کی ایک قسم ہے اور اس کا نقطہ مقابل "بخل" ہے۔ اس کے بارے میں بھی گفتگو کی گئی ہے۔
⑦ سُورت کی بعض آیات میں اسی مناسبت سے کفار کے ساتھ صُلح (جو شکست اور ذلت کا موجب بنے) کی بات کی گئی ہے اور اس قسم کی صلح سے روکا گیا ہے۔

مجموعی طور پر اس سُورت میں جس اصل مسئلے پر زیادہ زور دیا گیا ہے وہ جنگ کا مسئلہ ہے اور باقی مسائل اسی محور کے گرد گھومتے ہیں، کیونکہ یہ سورۃ مدینہ میں اس وقت نازل ہوئی جب مسلمانوں کی دشمنانِ اسلام کے ساتھ جنگ زوروں پر تھی اور بعض مفسرین کے بقول جنگِ اُحد کے دوران یا اس کے بہت تھوڑے عرصے بعد نازل ہوئی۔ ایسی جنگ جو تقدیر ساز اور مومنین کو کفار اور منافقین کی صفوف سے جدا کر دینے والی ہو، ایسی جنگ جو اسلام کی بنیادوں کو

محکم کر دے اور ان دشمنانِ اسلام کو سبق سیکھائے جو اسلام اور مسلمانوں کی نابودی کا ارادہ رکھتے ہوں۔

سورۂ محمدؐ کی تلاوت کی فضیلت

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

"من قرأ سورة محمد کان حقًا علی اللہ ان یسقیه من انهار الجنة"

"جو شخص سورہ محمد کی تلاوت کرے گا، خدا پر حق بن جاتا ہے کہ اسے بہشت کی نہروں سے سیراب کرے۔[1]

کتاب "ثواب الاعمال" میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی ایک حدیث نقل کی گئی جس میں آپؑ نے فرمایا ہے:

"من قرأ سورة الذین کفروا (سورة محمد) لم یرتب ابدًا، ولم یدخله شك فی دینه ابدًا، ولم یبتله اللہ بفقر ابدًا، ولا خوف سلطان ابدًا، ولم یزل محفوظًا من الشرك والکفر ابدًا حتّٰی یموت، فاذا مات وکّله اللہ به فی قبره الف ملك یصلون فی قبره ویکون ثواب صلاتهم له ویشیعونه حتّٰی یوقفوه موقف الامن عند اللہ عزّ وجلّ ویکون فی امان اللہ وامان محمّد"

"جو شخص سورۂ محمدؐ کی تلاوت کرے، کبھی بھی شک و شبہ اس کے دین میں داخل نہیں ہوگا اور خدا اسے کبھی دین کے فقر میں مبتلا نہیں کرے گا اور اسے ہرگز بادشاہ کا خوف لاحق نہیں ہوگا اور آخر عمر تک شرک و کفر سے محفوظ اور امان میں ہوگا اور جب مرے گا تو خدا ایک ہزار فرشتے کو حکم دے گا کہ اس کی قبر میں جا کر نماز ادا کریں اور اس نماز کا ثواب اس مرنے والے کو ملے گا اور یہ ہزار فرشتے محشر تک اس کے ساتھ رہیں گے اور عرصہ محشر میں اسے امن و امان کے مقام پر لے جا کر کھڑا کریں گے اور وہ ہمیشہ اللہ اور محمدؐ کی امان میں رہے گا۔[2]

ظاہر سی بات ہے کہ جو لوگ ان آیات کے مندرجات کو اپنی ذات پر نافذ کریں گے اور سخت، بے رحم اور بے منطق دشمن کے ساتھ برسرِ پیکار ہوں گے تو ان کے دل میں نہ تو کسی قسم کا شک و شبہ پیدا ہوگا اور نہ ہی ارادہ میں لغزش، ایک تو ان کے دین کی بنیادیں مستحکم ہوں گی اور دوسرے خوف، ذلت اور تنگ دستی کا خاتمہ ہوگا اور ساتھ ہی قیامت میں رحمتِ

---

[1] تفسیر مجمع البیان جلد ۹، سورۂ محمدؐ کا آغاز۔

[2] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۵ بحوالہ ثواب الاعمال۔

الٰہی کے جواہر میں نعمتوں سے بہرہ ور ہوں گے ۔

ایک اور حدیث میں امام علیہ السلام فرماتے ہیں :

" من اراد ان یعرف حالنا وحال اعدائنا فلیقرء سورة محمد فانه یراها اٰیة فینا واٰیة فیهم "

"جو ہمارے اور ہمارے دشمنوں کے حال کو دیکھنا چاہے اسے سورۂ محمدؐ کی تلاوت کرنا چاہیئے کیونکہ اس کی ایک آیت ہمارے حق میں اور ایک آیت ہمارے دشمنوں کے بارے میں ہے"۔[1]

اس حدیث کو "اہل سنت کے مفسر آلوسی نے رُوح المعانی[2] میں اور سیوطی نے درمنثور میں بھی نقل کیا ہے۔[3]

یہ حدیث اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ ایمان کا کامل نمونہ اہل بیت پیغمبر علیہم السلام اور کفر و نفاق کا مجسم نمونہ بنی امیہ ہیں ۔ یہ ٹھیک ہے کہ سورۃ میں اہل بیتؑ کے نام سے تصریح نہیں کی گئی ہے اور نہ ہی بنی امیہ کا نام لیا گیا ہے لیکن چونکہ مومن اور منافق گروہوں کے بارے میں اور ان کی خصوصیات کے سلسلے میں بحث کی گئی ہے ، لہٰذا سب سے پہلے ان دو واضح مصداقوں کی طرف اشارہ کرتی ہے ۔ البتہ تمام مومنین اور تمام منافقین پر اس کے صادق آنے میں کوئی مانع نہیں ہے۔

---

[1] مجمع البیان جلد ۹ ، اسی سورت کا آغاز۔

[2] تفسیر روح المعانی جلد ۲۶ صـ ۳۳ ۔

[3] تفسیر درمنثور جلد ۶ صـ ۲۶

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱۔ اَلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَصَدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَضَلَّ اَعۡمَالَہُمۡ ○

۲۔ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوۡا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّہُوَ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّہِمۡ ۙ کَفَّرَ عَنۡہُمۡ سَیِّاٰتِہِمۡ وَاَصۡلَحَ بَالَہُمۡ ○

۳۔ ذٰلِکَ بِاَنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوا اتَّبَعُوا الۡبَاطِلَ وَاَنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الۡحَقَّ مِنۡ رَّبِّہِمۡ ؕ کَذٰلِکَ یَضۡرِبُ اللّٰہُ لِلنَّاسِ اَمۡثَالَہُمۡ ○

ترجمہ

خداوند رحمان اور رحیم کے نام سے

۱۔ جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور لوگوں کو خدا کے راستے سے روکا وہ ان کے اعمال کو اکارت کر دیتا ہے۔

۲۔ اور جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور اچھے اچھے کام کیے اور جو کچھ محمدؐ پر نازل ہوا اور سب برحق ہے اور پروردگار کی جانب سے ہے، اس پر بھی ایمان لے آئے تو خدا اُن کے گناہوں کو بھی بخش دے گا اور ان کی حالت سنوار دے گا۔

۳۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ کافروں نے باطل کی پیروی کی اور مومنوں نے اس حق کی جو ان کے پروردگار کی طرف سے تھا۔ اللہ اس طرح لوگوں کے لیے ان کی زندگی کو بیان کرتا ہے۔

تفسیر

مؤمن حق کی اور کافر باطل کی اتباع کرتے ہیں:

یہ تین آیات درحقیقت مقدمہ ہیں ایک اہم جنگی حکم کا جو چوتھی آیت میں دیا گیا ہے۔ پہلی آیت میں کفار کا اور دوسری میں مومنین کا حال بیان کرنے کے بعد تیسری آیت میں ان کا آپس میں تقابل کیا گیا ہے تاکہ جب دونوں خطوط اور راستے واضح ہو جائیں تو ظالم اور بے رحم دشمن کے ساتھ عقیدے پر مبنی جنگ کے لیے پوری آمادگی حاصل ہو جائے۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور لوگوں کو خدا کے راستے سے روکا اللہ ان کے اعمال کارت کر دیتا ہے (الذین کفروا وصدوا عن سبیل اللہ اضل اعمالھم)۔

یہ کفار کے سرغنوں اور مکہ کے مشرکین کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے اسلام کے خلاف جنگ کی آگ بھڑکائی تھی۔ وہ خود ہی کافر نہیں تھے بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی مختلف حیلوں اور بہانوں سے خدا کے راستے سے روکتے تھے۔

اگرچہ بعض مفسرین مثلاً کشاف میں زمخشری کے مانند یہاں پر "صد" کی ایمان سے "روگردانی" کے معنی کی تفسیر کی گئی ہے بعد کی آیات کے مقابل میں جن میں ایمان کی بات کی گئی ہے۔ لیکن اس کلمے کے قرآن مجید میں استعمال کے مواقع کے پیش نظر اس کے اصلی معنی کو ہی لیا جائے گا جو "روکنے اور منع کرنے" کے ہیں۔

"اضل اعمالھم" سے مراد یہ ہے کہ ان کے اعمال اکارت کر دے گا، کیونکہ گم کرنا، کنایہ ہے کسی چیز کے بے سرپرست ہونے کے لیے کہ جس کے نتیجے میں وہ چیز ختم ہو جاتی ہے۔

بہرحال بعض مفسرین نے اس جملے کو ان لوگوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے جنہوں نے جنگ بدر کے دن اونٹ نحر کر کے لوگوں میں تقسیم کیے۔ ابوجہل نے دس اونٹ، صفوان نے دس اونٹ، اور سہل بن عمرو نے بھی دس اونٹ اپنے فوجیوں کے لیے نحر کیے تھے۔[1] لیکن چونکہ یہ کام شیطانی مقاصد اور شرک کے لیے تھے لہٰذا سب ضبط ہو گئے۔

لیکن بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت اسی معنی میں محدود نہیں ہے، بلکہ انہوں نے محتاجوں یا مہمانوں کی امداد وغیرہ کے لیے جو بھی ظاہری اعمال انجام دیئے ہیں ان کے خدا پر ایمان نہ ہونے کے سبب سب کے سب اکارت جائیں گے۔

علاوہ ازیں انہوں نے اسلام کو مٹانے اور مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کے لیے جو کام بھی کیے ہیں خدا تعالیٰ نے ان سب کو بھی فنا اور نامراد بنا دیا اور انہیں مقصد تک پہنچنے سے روک دیا۔

---

[1] تفسیر روح المعانی جلد ۲۶ صفحہ ۳۳۔

بعد کی آیت مومنین کی کیفیت بیان کر رہی ہے جو کفار کے مدمقابل ہیں اور ان کفار کی کیفیت گزشتہ آیت میں مذکور ہو چکی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اور جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور انہوں نے اچھے اچھے کام کیے اور جو کچھ محمدؐ پر نازل ہوا اور سب برحق ہے اور پروردگار کی جانب سے ہے، اس پر بھی ایمان لے آئے تو خدا ان کے گناہوں کو بھی بخش دے گا اور ان کی دنیا اور آخرت میں حالت سنوار دے گا۔ (والذین آمنوا وعملوا الصالحات وآمنوا بما نزل علی محمد وھو الحق من ربھم کفر عنھم سیئاتھم واصلح بالھم)۔[1]

مطلق ایمان کا ذکر کرنے کے بعد جو کچھ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا اس پر ایمان کا تذکرہ رسول اعظم کے تمام امور پر ایمان لانے کا تاکیدی بیان ہے گویا یہ عام کے بعد خاص کا ذکر ہے اور اس حقیقت کو واضح کر رہا ہے کہ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کردہ چیزوں پر ایمان نہ لایا جائے اس وقت تک خدا پر ایمان کی تکمیل ناممکن ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ شاید یہ پہلا جملہ خدا پر ایمان کی طرف اشارہ ہو جو اعتقادی پہلو کا حامل ہے اور یہ جملہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات اور اسلام کے پیش کردہ نظام اور احکامات پر ایمان کی طرف اشارہ ہو جو عملی پہلو کا حامل ہے۔

بالفاظ دیگر صرف خدا پر ایمان لانا کافی نہیں ہے۔ "ما نزل علیہ" پر ایمان بھی ضروری ہے، قرآن پر ایمان، جہاد پر ایمان، نماز روزے پر ایمان اور ان اخلاقی اقدار پر ایمان جو آپؐ پر نازل ہوئیں۔

ایسا ایمان جس سے اعمال صالحہ کی بجا آوری کے لیے تحرک پیدا ہو۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اس جملے کے بعد فرمایا گیا ہے:

"وھو الحق من ربھم۔

حالانکہ وہ برحق اور خدا کی طرف سے ہے۔

یعنی ان کا ایمان نہ تو کسی حساب و کتاب کے بغیر ہوتا ہے اور نہ ہی بغیر کسی دلیل و استدلال کے ہے، کیونکہ انہوں نے حق کو پہچانا ہے، لہٰذا اس پر ایمان لے آئے ہیں۔

اور "من ربھم" (ان کے پروردگار کی طرف سے) اس حقیقت کی تاکید ہے کہ حق ہمیشہ پروردگار کی طرف سے ہوتا ہے، اسی سے معرض وجود میں آتا ہے اور اسی کی طرف پلٹ جاتا ہے۔

یہ بات بھی شایان توجہ ہے کہ جس طرح راہ حق سے روکنے والے کفار کے لیے دو سزائیں بیان ہوئی ہیں اسی طرح صالح العمل مومنین کے لیے بھی جزائیں بیان ہوئی ہیں، ان میں سے ایک تو لغزشوں کی معافی اور خطاؤں کی بخشش ہے جن کے ارتکاب سے کوئی بھی غیر معصوم محفوظ نہیں ہے اور دوسرے حالات کی اصلاح اور امور کا سنوارنا جسے "اصلاح بال" کہا گیا ہے۔

"بال" کے مختلف معانی مذکور ہوئے ہیں مثلاً حال، کام اور دل لیکن مفردات میں راغب کے بقول "زبردست اہمیت کے حامل حالات" کے معنی میں ہے۔ بنابریں "اصلاح بال" کا معنی تمام زندگی کے مکمل امور کو سنوارنا اور سدھارنا ہے جو

---

[1] کچھ مفسرین نے "وھو الحق من ربھم" کے جملہ کو جملہ معترضہ سمجھا ہے۔

فطری طور پر دنیا اور آخرت کی کامیابی پر مشتمل ہوتے ہیں کفار کے انجام کے بالکل برعکس کہ "اضل اعمالھم" کے پیش نظر جن کی تمام تگ و دو کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتی اور سوائے شکست کے انہیں کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ گناہوں کی معافی ان کے ایمان کا نتیجہ ہوتی ہے اور "اصلاح بال" ان کے اعمال صالحہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔

مومنین کو ایک تو ذہنی سکون حاصل ہوتا ہے اور دوسرے انہیں عملی پروگراموں میں کامیابی حاصل ہوتی ہے جو وسیع پیمانے پر اصلاح امور کی صورت ہوتی ہے۔ اور اس سے بڑھ کر اور کیا نعمت ہوسکتی ہے کہ انسان کو روحانی سکون اور قلبی اطمینان کے حصول کے علاوہ مفید اور تعمیری پروگراموں پر عمل پیرا ہونا نصیب ہو۔

اس سلسلے کی آخری آیت میں مومنین کی کامیابی اور کفار کی شکست کا اصل نکتہ ایک مختصر لیکن واضح تقابل کی صورت میں بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ اس وجہ سے ہے کہ کافروں نے باطل کی پیروی کی اور مومنوں نے اس حق کی جو ان کے پروردگار کی طرف سے تھا (ذالک بان الذین کفروا اتبعوا الباطل وان الذین امنوا اتبعوا الحق من ربھم)۔

تمام مطالب کی جان یہی ایک نکتہ ہے جس سے "ایمان" اور "کفر" کے دو خطوط بالترتیب "حق" اور "باطل" سے حاصل ہوتے ہیں۔ "حق" یعنی عینی حقیقتیں جن میں سرفہرست پروردگار عالم کی ذات پاک ہے اور اس کے بعد وہ حقائق ہیں جن کا انسانی زندگی سے تعلق ہوتا ہے اور وہ قوانین ہیں جو بندے اور خدا کے درمیان نیز خود بندوں کے درمیان باہمی رابطے کا کام دیتے ہیں۔

"باطل" یعنی اٹکل پچو، خیالات، نیرنگیاں، خرافاتی افسانے اور بے ہودہ اور بے مقصد کام غرض عالم ہستی پر حکم فرما ہر قسم کے گمراہ کن قوانین۔

جی ہاں! مومنین حق کی اس معنی کے ساتھ جو بیان ہوا ہے پیروی کرتے ہیں اور کفار، باطل کی۔ یہی وجہ ہے کہ مومنین کو کامیابی اور کفار کو ناکامی اور شکست کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔

قرآن کہتا ہے:

"وما خلقنا السماء والارض وما بینھما باطلا"

"ہم نے تمام آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اسے باطل پیدا نہیں کیا" (ص ۳۸/۲۷)

بعض مفسرین نے "باطل" کو "شیطان" کے اور بعض نے "بیہودہ اور بے مقصد" کے معانی سے تفسیر کیا ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم ابھی بتا چکے ہیں "باطل" وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے جو ان معنی اور دوسرے معانی پر بھی محیط ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: خدا لوگوں کے لیے ان کی زندگی یوں بیان فرماتا ہے (کذالک یضرب اللہ للناس امثالھم)۔

یعنی جس طرح اللہ نے مومنین اور کفار کی زندگی کے خطوط، ان کے عقائد اور عملی پروگرام اور نتائج کو ان آیات میں بیان

فرمایا ہے اسی طرح وہ ان کی زندگی کے انجام اور عاقبت الامر کو بھی واضح فرماتا ہے۔

راغب اپنی کتاب مفردات میں کہتے ہیں کہ "مثل" کسی چیز کے بارے میں ایسی گفتگو کو کہتے ہیں جیسی اس مطلب کے مشابہ کے بارے میں کی گئی ہے تاکہ یہ ایک دوسرے کو واضح کریں۔

راغب کی دوسری گفتگو سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلمہ کبھی تو "مشابہت" کے معنی میں اور کبھی "توصیف" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

زیرِ تفسیر آیت میں بظاہر دوسرا معنی مراد ہے، یعنی خدا اس طرح لوگوں کے حالات بیان کرتا ہے جیسا کہ سورہ محمد (ص) کی پندرھویں آیت میں ہے:

"مثل الجنة التی وعد المتقون"

"بہشت والوں کی صفت کہ جس بہشت کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا کچھ یوں ہے ....."

بہر حال اس آیت سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ ہم حق کے جتنا نزدیک ہوں گے اسی قدر ایمان کے نزدیک ہوں گے۔ اور ہمارا ایمان و عمل جس قدر باطل کے نزدیک ہوگا اسی قدر ہم ایمان سے دُور ہوں گے، کیوں کہ ایمان و کفر کے خطوط ہی تو حق و باطل کے خطوط ہوتے ہیں۔

۴۔ فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ؕ حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۗ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ۚ ذٰلِكَ ؕ وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ؕ وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ○

۵۔ سَيَهْدِيْهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ ○

۶۔ وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ ○

ترجمہ

۴۔ جب تم میدانِ جنگ میں کافروں کے آمنے سامنے آجاؤ تو ان کی گردنیں مار دو، اور اس کام کو برابر جاری رکھو، یہاں تک کہ کافی حد تک دشمن کا ستیاناس کردو، ایسے میں قیدیوں کو خوب باندھ لو، پھر اس کے بعد یا ان پر احسان کرو (اور انہیں چھوڑ دو) یا رہائی کے بدلے میں ان سے فدیہ لو اور یہ صورتِ حال اسی طرح جاری رہے، یہاں تک کہ جنگ اپنا سنگین بوجھ زمین پر رکھ دے۔ طریقہ کار یہی ہے جب خدا چاہتا تھا تو خود انھیں سزا دیتا تھا، لیکن وہ چاہتا ہے کہ تمھاری آزمائش ایک دوسرے سے کرے، اور جو لوگ خدا کی راہ میں مارے

گئے ہیں، خدا ان کے اعمال ہرگز اکارت نہیں کرے گا۔

۵۔ عنقریب ان کی ہدایت کرے گا اور ان کا کام سنوار دے گا۔

۶۔ اور انھیں (اپنی جاودانی) بہشت میں داخل کرے گا، جس کے اوصاف اس نے اُن سے بیان کر رکھے ہیں۔

تفسیر

میدانِ جنگ میں ارادے کی پختگی ضروری ہے

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں گذشتہ آیات مسلمانوں کو ایک اہم جنگی حکم کے لیے آمادہ کرنے کے لیے مقدمہ تھیں، جس کے بارے میں زیرِ تفسیر آیات میں تفصیل سے گفتگو کی جارہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جب میدانِ جنگ میں کافروں کے آمنے سامنے آجاؤ تو پوری طاقت کے ساتھ ان پر حملہ کرو اور ان کی گردنیں مارو (فاذا لقیتم الذین کفروا فضرب الرقاب)۔ [1]

ظاہر سی بات ہے کہ "گردن مار دینا" قتل کے لیے کنایہ ہے، لہٰذا اس کی ضرورت نہیں ہے کہ مجاہدین اس بات کی کوشش کریں کہ وہ ان کی صرف گردنیں اڑائیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ دشمن کا صفایا کر دیں، لیکن چونکہ گردن اڑانا قتل کا روشن ترین مصداق ہے لہٰذا اس کا ذکر کیا گیا ہے۔

اور ہر حالت میں یہ حکم میدانِ جنگ کے ساتھ مخصوص ہے، کیونکہ "لقیتم" جو "لقاء" کے مادہ سے ہے ایسے مواقع پر "جنگ" کے معنی میں آتا ہے، متعدد قرینے بھی خود آیت میں اسی معنی پر گواہ ہیں، جیسے "قیدیوں کی اسارت"، "حرب" (جنگ) کا لفظ اور "راہِ خدا میں مارا جانا" وغیرہ۔

قصہ مختصر یہ کہ "لقاء" کبھی تو ہر قسم کی ملاقات کے لیے استعمال ہوتا ہے اور کبھی میدانِ جنگ میں دشمن سے مڈبھیڑ کے لیے اور قرآن مجید میں بھی دونوں معانی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اور زیرِ نظر آیات میں دوسرے معنی کے لیے

---

[1] "ضرب" مصدر ہے اور ایک فعل مقدر کا مفعول مطلق ہے، جس کی تقدیر یوں ہے "اضربوا ضرب الرقاب" جیسا کہ سورہ انفال آیت ۱۲ میں اس کی تصریح کی گئی ہے کہ "فاضربوا فوق الاعناق"۔

استعمال ہوا ہے۔

یہیں سے یہ بات بھی بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ جو لوگ اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کی غرض سے آیت کا دوسرے انداز میں معنی کرتے ہیں کہ اسلام کہتا ہے "جب تم کسی کافر کے آمنے سامنے آجاؤ تو اس کی گردن اڑا دو" بدنیتی اور خودغرضی کے سوا اور کچھ نہیں ہے جبکہ یہی آیت صراحت کے ساتھ میدان جنگ میں مڈبھیڑ ہونے کی بات کر رہی ہے۔

ظاہر ہے کہ جب انسان میدان جنگ میں کسی خونخوار کا سامنا کرتا ہے تو اگر پورے عزم اور دو ٹوک انداز میں دشمن پر سخت اور تابڑ توڑ حملے نہ کرے اور اس پر کاری ضربیں نہ لگائے تو خود فنا ہو جائے اور یہ ایک صحیح اور بالکل منطقی حکم ہے۔

پھر فرمایا گیا ہے: یہ کاری ضربیں ان پر برابر جاری رکھو یہاں تک کہ دشمن کا ستیاناس کر دو اور ان کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دو۔ ایسے میں قیدیوں کی گرفتاری کا کام کرو اور انہیں خوب باندھ لو۔ (حتّٰی اذا اثخنتموھم فشدّوا الوثاق)۔

"اثخنتموھم" "ثخن" (بروزن "شکن") ٹھوس اور سخت ہونے کو کہتے ہیں۔ اسی لیے اس کا اطلاق دشمن پر مکمل فتح و کامرانی، واضح غلبہ اور مکمل تسلط حاصل کر لینے پر ہوتا ہے۔

اگرچہ اکثر مفسرین نے اس کو "دشمن کو کثرت اور شدت کے ساتھ قتل کرنے کے معنی میں لیا ہے لیکن جیسا کہ ہم ابھی بتا چکے ہیں یہ اس کا لغوی معنی نہیں ہے۔ لیکن چونکہ بعض اوقات جب تک دشمن کو زبردست اور وسیع پیمانے پر قتل نہ کر دیا جائے اس وقت تک خطرہ ٹلتا نہیں ہے۔

لہٰذا ان حالات میں قتل کرنا اس کا ایک مصداق تو ہو سکتا ہے اس کا اصل مفہوم نہیں ہے۔[1]

بہرحال مندرجہ بالا آیت ایک نہایت حساب شدہ جنگی حکمت عملی بیان کر رہی ہے کہ جب تک دشمن کا زور پوری طرح ٹوٹ نہ جائے اس وقت تک جنگی قیدی بنانے کا اقدام نہ کیا جائے، کیونکہ اس اقدام سے بعض اوقات مسلمانوں کے میدان جنگ میں پاؤں اکھڑ جانے کا احتمال ہوتا ہے اور جنگی قیدیوں کی گرفتاری اور انہیں محاذ سے پیچھے منتقل کرنے کی وجہ سے اصل فرائض کی ادائیگی سے رہ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

"فشدّوا الوثاق" کی تعبیر اس بات کے پیشِ نظر کہ "وثاق" رسی یا ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کو باندھا جائے، جنگی قیدیوں کو اچھی طرح باندھنے کی طرف اشارہ ہے مبادا کوئی قیدی موقع ملنے پر اپنے آپ کو چھڑا لے اور کوئی زبردست نقصان پہنچا دے۔

بعد کے جملے میں جنگی قیدیوں کے بارے میں حکم بیان کیا جا رہا ہے کہ جنگ کے خاتمے کے بعد ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ ارشاد فرمایا گیا ہے: یا تو ان پر احسان کرو اور کسی معاوضے کے بغیر انہیں چھوڑ دو یا پھر ان سے فدیہ اور معاوضہ لے کر رہا کر دو۔ (فاما منّاً بعد و اما فداء)۔

---

[1] "لسان العرب" میں "ابن اعرابی" سے نقل کیا گیا ہے کہ "اثخن اذا غلب و قھر" قہر و غلبہ کے معنی میں ہے۔

اس طرح سے جنگی قیدیوں کو جنگ کے خاتمہ کے بعد قتل نہ کرو۔ بلکہ اسلامی رہنما مصلحت کے پیش نظر یا تو ان سے معاوضہ لے کر انھیں چھوڑ دے یا معاوضہ لیے بغیر انہیں رہا کر دے اور یہ معاوضہ درحقیقت ایک قسم کا جنگی تاوان ہے جو دشمن کو ادا کرنا پڑتا ہے۔

البتہ اس سلسلے میں اسلام کا ایک تیسرا حکم بھی ہے وہ یہ کہ ان قیدیوں کو غلام بنا لیا جائے۔ لیکن یہ ایک لازمی حکم نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے سربراہ کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ خاص حالات اور زمان و مکان کی مصلحت کے پیشِ نظر اس حکم پر عمل درآمد ضروری سمجھتا ہو۔ شاید اسی لیے قرآنی متن میں اس کا صراحت کے ساتھ حکم نہیں آیا، صرف اسلامی روایات میں ذکر کیا گیا ہے۔

ہمارے مشہور فقیہ "فاضل مقداد" "کنز العرفان" میں فرماتے ہیں:

"اگر جنگ کے خاتمے پر کوئی قیدی پکڑا جائے تو مسلمانوں کے امام کو ان تین امور میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کی اجازت ہے:

۱۔ غیر مشروط طور پر اسے چھوڑ دے۔

۲۔ فدیہ اور معاوضہ لے کر اسے رہا کر دے۔

۳۔ اسے غلام بنا لیا جائے اور کسی بھی صورت میں اسے قتل کرنا جائز نہیں۔"[1]

اور ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

غلام بنانے کا مسئلہ روایات سے تو ثابت ہے، لیکن قرآن کی کس آیت سے ثابت نہیں ہے۔[2]

یہ مسئلہ دوسری فقہی کتابوں میں بھی درج ہے۔[3]

"غلامی" کی بحث کے سلسلے میں انہی آیات کے ضمن میں ہم اس بات کی طرف بھی اشارہ کریں گے۔

اسی آیت کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ صورت حال اس وقت تک جاری رہے اور دشمنوں پر اس وقت تک کاری ضربیں لگاتے رہو اور کچھ لوگوں کو جنگی قیدی بنا لو، یہاں تک کہ جنگ اپنا سنگین بوجھ زمین پر رکھ دے (حتّٰی تضع الحرب اوزارھا)۔[4]

جنگ سے صرف اس وقت ہاتھ اٹھاؤ جب دشمن کی تمام توانائیاں ختم ہو جائیں اور جنگ کی آگ بجھ جائے۔

"اوزار" "وزر" کی جمع ہے جس کا معنی "سنگین بوجھ" ہے، اور بعض اوقات اس کا اطلاق "گناہوں" پر بھی ہوتا

---

[1] کنز العرفان جلد ۱ صفحہ ۳۶۵۔

[2] "شرائع الاسلام" کتاب الجہاد۔ "شرح لمعہ" احکام غنیمت۔

[3] "حتّٰی" "فضرب الرقاب" کے لیے غایت ہے۔ اس بارے میں اور بھی بہت سے احتمالات بیان کیے گئے ہیں جو قابل اعتنا نہیں ہیں۔

ہے، کیونکہ وہ بھی تو گناہگاروں کے کندھے کے بوجھ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس آیت میں اس سنگین بوجھ کی نسبت جنگ کی طرف دی گئی ہے۔

فرمایا گیا ہے: جنگ اپنا سنگین بوجھ زمین پر رکھ دے۔ یہ سنگین بوجھ مختلف "اسلحہ جات" اور "مشکلات" کے لیے کنایہ ہے، جسے مجاہدین اپنے کندھے پر لیے ہوتے ہیں یا ان کا انہیں سامنا ہوتا ہے اور جب تک جنگ کا خاتمہ نہ ہو جائے اس وقت تک یہ سنگین بوجھ ان کے کندھوں پر رہتا ہے۔

لیکن اسلام اور کفر کے درمیان جنگ کب ختم ہوگی؟ یہ ایک ایسا سوال ہے، جس کے بارے میں مفسرین نے مختلف جوابات دیئے ہیں۔ ابن عباس اور بعض دوسرے حضرات نے کہا ہے کہ یہ جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک روئے زمین پر ایک بھی بت پرست باقی اور شرک موجود ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اسلام اور کفر کے درمیان جنگ اس وقت تک جاری ہے جب تک مسلمان "دجال" پر غلبہ حاصل نہ کر لیں۔ انہوں نے اس نظریئے کا استدلال پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان سے کیا ہے:

"والجهاد ماض مذ بعثنی الله الی یقاتل اخر امتی الدجال"

جب سے خدا نے مجھے مبعوث فرمایا ہے اس وقت سے لے کر تب تک جہاد جاری رہے گا جب تک میری امت کا آخری شخص دجال سے لڑتا رہے گا۔[1]

دجال کے بارے میں ایک لمبی چوڑی بحث ہے، لیکن اس حد تک ضرور معلوم ہے کہ دجال ایک یا کئی مکار انسان ہیں جو آخری زمانے میں لوگوں کو اصول توحید اور حق و عدالت کی راہوں سے ہٹانے میں سرگرم عمل ہوں گے اور حضرت امام مہدی علیہ السلام اپنی عظیم طاقت کے ذریعے انہیں صفحہ ہستی سے مٹا دیں گے۔

اس طرح جب تک دجال روئے زمین پر موجود ہیں، حق اور باطل کی معرکہ آرائی جاری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی کفر کے ساتھ دو طرح کی معرکہ آرائی جاری ہے، ایک محدود اور قلیل المیعاد جیسے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غزوات جو آپ نے اپنے دشمنوں سے کئے اور ہر جنگ کے بعد تلواریں نیاموں میں چلی جاتیں اور دوسری مسلسل اور طویل المیعاد جو شرک، کفر، ظلم، برائی اور فتنہ و فساد کے خلاف ہے اور یہ سلسلہ حضرت امام مہدیؑ کے ذریعے عالمی سطح پر عدل و انصاف کی حکومت کے قائم ہونے تک جاری رہے گا۔

پھر فرمایا گیا ہے: تمہاری صورتِ حال یہی ہونی چاہیئے (ذالک)۔[2]

اور اگر خدا چاہتا تو ان سے کئی اور طریقے سے انتقام لے لیتا، (ولو یشاء الله لانتصر منهم)۔

---

[1] مجمع البیان جلد ۹ صفحہ ۔

[2] "ذالک" ایک محذوف مبتدا کی خبر ہے جو تقدیری طور پر یوں ہے "الامر ذالک"۔

آسمانی بجلیوں، زلزلوں، آندھیوں اور دوسری آفات کے ذریعے سے، تاہم اس صورت میں آزمائش و امتحان کی بات ختم ہوجاتی، "لیکن خدا چاہتا ہے کہ تمھاری ایک دوسرے کے ذریعہ آزمائش کرے" (ولٰکن لیبلوا بعضکم ببعض)۔

جنگ کا حقیقی فلسفہ اور حق و باطل کی معرکہ آرائی کا اصل نکتہ بھی یہی ہے، جنگوں میں حقیقی مومنین کی صفیں غیر حقیقی مومنین سے جدا ہوجاتی ہیں اور کردار کے غازی گفتار کے غازیوں سے جدا ہوجاتے ہیں۔ صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں، استقامت اور پامردی کا احیا ہوتا ہے اور دنیا میں زندگی بسر کرنے کا اصل مقصد حاصل ہوتا ہے، یعنی قوتِ ایمان کو پرورش ہوتی ہے اور انسانی اقدار کا صحیح معنوں میں احیا ہوتا ہے۔

اگر مومنین ایک گوشے میں بیٹھ کر اپنے معمول کی زندگی بسر کرنے میں لگ جاتے اور جب بھی مشرکین اور ظالموں کا کوئی لشکر مسلمانوں پر حملہ کرتا اور خدا غیب کی راہوں اور معجزے کے ذریعے انہیں تباہ و برباد کر دیتا تو معاشرے کی کوئی قدر و قیمت نہ ہوتی، معاشرے میں ٹھہراؤ، سستی، کمزوری اور کاہلی وجود میں آجاتے اور اسلام و ایمان صرف نام کی حد تک ہوتے۔

خلاصۃ الکلام یہ کہ اللہ کو اپنے مقدس دین کے استقلال کے لیے ہماری جنگ و جدال کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ہم خود، دشمن کے مقابلے میں تربیت پاتے ہیں اور ہمیں اس مقدس جنگ کی ضرورت ہے۔

یہی قرآن مجید کی دوسری آیات میں دیگر صورتوں میں بیان ہوا ہے۔ مثلاً:

"ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ ولما یعلم اللہ الذین جاھدوا منکم ویعلم الصابرین"

"کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم صرف ایمان کے خالی دعووں سے بہشت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی تک خدا نے تم میں سے مجاہدین اور صابرین کو معین نہیں کیا ہے۔

(آل عمران / ۱۴۲)

اس سے پہلی آیت میں ہے ولیمحص اللہ الذین اٰمنوا ویمحق الکافرین" مقصد یہ ہے کہ خدا (ان جنگوں کے سایے میں) مومنین کو خالص کرے اور کفار کو نیست و نابود کرے۔

زیرِ تفسیر آیت کے آخری جملہ میں ان شہیدوں کا تذکرہ ہے جو ایسی جنگوں میں اپنی شیریں زندگی کو قربان کرتے ہیں اور اسلامی معاشرے پر ان کا بہت بڑا حق ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اور جو لوگ خدا کی راہ میں مارے گئے ہیں خدا ان کے اعمال کو ہرگز اکارت نہیں کرے گا (والذین قتلوا فی سبیل اللہ فلن یضل اعمالھم)۔

ان کی زحمتیں، تکلیفیں اور ایثار و فداکاریاں ضائع نہیں ہوں گی، سب خدا کی بارگاہ میں محفوظ ہیں۔ اس دنیا میں بھی ان کی فداکاریوں کے آثار باقی رہ جاتے ہیں، "لا الہ الا اللہ" کی جو بھی صدا سنائی دیتی ہے انہی کی تکلیفوں کا ثمرہ ہے۔ جو مسلمان بھی اللہ کی بارگاہ میں سربسجود ہوتا ہے تو ان کی فداکاریوں کی برکت سے ہے، غلامی کی زنجیریں ان کے مصائب جھیلنے سے ٹوٹتی ہیں اور مسلمانوں کی عزت و آبرو بھی انہی کی مرہونِ منت ہے۔

شہداء پر خدا کی یہ ایک عنایت ہے۔
تین اور عنایتوں کا تذکرہ بعد کی آیات میں ہوتا ہے۔
سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: اللہ انہیں ہدایت کرے گا (سیھدیھم)۔
بلند مرتبہ مقامات، عظیم کامیابی اور رضوان الٰہی کی طرف ہدایت۔
دوسری عنایت یہ کہ "ان کے حالات سنوار دے گا" (ویصلح بالھم)۔
اللہ انھیں تسکین، اطمینانِ خاطر اور روحانی سرور عطا فرماتا ہے۔ فرشتوں کے ہم آہنگ صفائے باطن اور روحانی مدارج سے نوازتا ہے جو ان کے ہمدم ہوتے ہیں۔
اور اپنی رحمت کے جوار میں انہیں اپنی ضیافت میں بلاتا ہے۔
آخری عنایت یہ ہے کہ "انہیں اپنی جاودانی بہشت میں داخل کرے گا جس کے اوصاف انہیں پہلے بتا رکھے ہیں (ویدخلھم الجنۃ عرفھا لھم)۔
بعض مفسرین کہتے ہیں کہ انہیں بہشت بریں اور مقام رضوان کے صرف کلی اوصاف ہی سے آگاہ نہیں کرتا، بلکہ بہشت کے محلات کی علامتوں اور نشانیوں سے بھی مکمل طور پر آگاہ کر دیتا ہے، اس حد تک کہ جب بھی وہ بہشت میں داخل ہوں گے سیدھے اپنے اپنے محلات میں چلے جائیں گے۔[1]
بعض مفسرین نے "عرفھا" کی "عرف" (بروزن فکر) عطر اور خوشبو، کے معنی سے تفسیر کی ہے۔ یعنی خدا انہیں ایسی بہشت میں پہنچائے گا جو مہمانوں کے لیے سراسر معطر ہوگی۔
لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔
بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اگر ان آیات کو "ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا" (آل عمران/ ۱۶۹) کے ساتھ ملا دیں تو یہ نتیجہ نکلے گا کہ "اصلاح بال" سے مراد وہی جاودانی زندگی ہے، جس کے سائے میں شہدائے راہِ خدا پردے اور حجابات ہٹ جانے کے بعد اپنے رب کے حضور شرف یابی کے لیے تیار ہوں گے۔[2]

چند نکات

۱۔ **شہداء کا بلند مقام**: اقوام کی تاریخ میں ایسے دن بھی آجاتے ہیں جن میں بے حد ایثار و قربانی اور فداکاری و جانفشانی کے بغیر خطرات نہیں ٹل سکتے اور عظیم اور مقدس مقاصد نہیں بچ سکتے۔ ایسے مواقع پر مؤمن

---

[1] مجمع البیان جلد ۹ ص ۹۸۔
[2] المیزان جلد ۱۸ ص ۲۴۴۔

اور فداکار لوگوں کو آگے آنا چاہیئے اور اپنے خون کی قربانی دے کر آئین حق کی حفاظت کرنی چاہیئے۔ اسلامی منطق کی رُو سے ایسے افراد کو "شہید" کہا جاتا ہے۔

"شہید" "شہود" کے مادہ سے ہے اور اس کا ان پر اطلاق اس لیے ہوتا ہے کہ:

۱۔ کیونکہ وہ دشمنانِ حق کے مقابلے میں میدان میں حاضر ہوتے ہیں یا

۲۔ بوقتِ شہادت، رحمت کے فرشتوں کا مشاہدہ کرتے ہیں یا

۳۔ خدا کی جو عظیم نعمتیں ان کے لیے فراہم کی جا چکی ہے ان کا مشاہدہ کرتے ہیں یا

۴۔ بارگاہ رب العزت میں پہنچ کر حاضری دیتے ہیں جیسا کہ آیت مجید میں ارشاد ہوتا ہے۔

"ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا بل احیاء عند ربھم یرزقون۔" (آل عمران/ ۱۶۹)

اسلام میں بہت کم لوگ شہداء کے مرتبے کے برابر ہیں، وہی شہدا جو سوچ سمجھ کر اور خلوص قلب کے ساتھ معرکہ حق و باطل میں قدم رکھتے ہیں اور اپنے پاکیزہ خون کے آخری قطرات تک نچھاور کر دیتے ہیں۔

شہداء کے مقام اور مرتبے کے بارے میں اسلامی مآخذ میں بہت سی حیرت انگیز روایات ملتی ہیں جن سے شہدا کے کارناموں کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث ہے:

"ان فوق کل بر برا حتی یقتل الرجل شھیدا فی سبیل اللہ"

"ہر نیکی سے بڑھ کر ایک نیکی ہوتی ہے جب تک انسان راہِ خدا میں شہید نہ کر دیا جائے۔ جب اسے شہادت مل جاتی ہے تو پھر اس سے بڑھ کر کوئی اور نیکی نہیں ہے۔" [1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

"المجاھدون فی اللہ قواد اھل الجنۃ"

"مجاہدینِ راہ خدا بہشت والوں کے قائد ہوں گے۔" [2]

ایک اور حدیث میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"ما من قطرۃ احب الی اللہ من قطرۃ دم فی سبیل اللہ، او قطرۃ من دموع عین فی سواد اللیل من خشیۃ اللہ، وما من قدم احب الی اللہ من خطوۃ الی ذی رحم، او خطوۃ یتم بھا زحفا فی سبیل اللہ۔"

---

[1] بحار الانوار جلد ۱۰۰ ص ۱۵

[2] بحار الانوار جلد ۱۰۰ ص ۱۵

"کوئی قطرہ خدا کو خون کے اس قطرے سے زیادہ محبوب نہیں ہے جو راہِ خدا میں بہجاتا ہے یا آنسو کے اس قطرے سے جو رات کی تاریکی میں خوفِ خدا سے جاری ہوتا ہے۔ اور کوئی قدم خدا کو اس قدم سے زیادہ محبوب نہیں ہے جو صلۂ رحمی کے لیے اُٹھایا جائے یا اس قدم سے جو راہِ خدا میں جنگ کے لیے آگے بڑھتا ہے، جس سے جنگ اپنے انجام کو پہنچتی ہے۔ [1]

اگر تاریخِ اسلام کی ورق گردانی کی جائے تو معلوم ہوگا کہ شہداء راہِ خدا نے ہی اسلام کے بہت سے حصّے کو اعزاز بخشا ہے اور اس طرح سے انہوں نے اسلام کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔

نہ صرف ماضی میں بلکہ آج بھی شہادت ایک تقدیر ساز کلمہ ہے، جس سے دشمنوں پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے اور انہیں اسلام کے قلعوں میں رخنہ ڈالنے سے مایوس کر دیتا ہے اور شہادت کا کلمہ مسلمانوں کے لیے کس قدر مبارک اور دشمنانِ اسلام کے لیے کس قدر خطرناک ہے؟

لیکن اس میں بھی شک نہیں ہے کہ شہادت کوئی مقصد نہیں بلکہ اصل مقصد دشمن پر کامیابی اور آئینِ حق کی حفاظت اور پاسداری ہوتا ہے۔ لیکن یہ محافظین اپنے آپ کو اس حد تک تیار رکھیں کہ اگر اس راہ میں انہیں خون کی قربانی بھی دینا پڑے تو اس سے دریغ نہ کریں اور یہی ہے امت شہید پرور کا معنی نہ یہ کہ شہادت کو ایک مقصد سمجھ لیا جائے۔

اسی لیے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک مفصّل حدیث کے آخر میں ہم پڑھتے ہیں جو آپؐ سے حضرت علی علیہ السلام نے روایت کی ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قسم اٹھا کر فرماتے ہیں:

" والذی نفسی بیده لوکان الانبیاء فی طریقهم لترجلوا لهم لما یرون من بهائهم ویشفع الرجل منهم سبعین الفا من اهل بیته وجیرته۔"

"اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، جب شہداء عرصۂ محشر میں وارد ہوں گے، اگر انبیاء بھی ان کے راستے میں سوار ہوں گے تو ان کے نور اور شان و شوکت کی وجہ سے سواریوں سے اُتر پڑیں گے اور ان میں سے ہر ایک شخص اپنے خاندان اور ہمسایوں میں سے ستر ہزار لوگوں کی شفاعت کرے گا۔ [2]

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ اسلامی ثقافت میں شہادت کے دو مختلف معانی ہیں ایک خاص اور دوسرا عام۔ شہادت کا خاص معنی تو یہ ہے کہ انسان راہ خدا میں میدانِ جنگ میں مارا جائے اور اس کے اسلامی فقہ میں کچھ مخصوص احکام ہیں، مثلاً اسے غسل و کفن کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اسی خون آلودہ لباس میں ہی اسے دفن کیا جائے گا۔

---

[1] بحار الانوار جلد ۱۰۰ صفحہ ۱۴۔

[2] بحار الانوار جلد ۱۰۰ صفحہ ۱۴۔

جب کہ شہادت کا وسیع اور عام معنی یہ ہے کہ انسان خدائی فریضے کی انجام دہی میں مارا جائے یا مر جائے اور جو شخص بھی اس قسم کے فریضے کی ادائیگی کرتا ہوا کسی حالت میں بھی دُنیا سے اُٹھ جائے وہ "شہید" ہے۔

اسی لیے اسلامی روایات میں وارد ہوا ہے کہ چند قسم کے لوگ اس دُنیا سے "شہید" ہو کر جاتے ہیں۔

(i) پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ:

"اذا جاء الموت طالب العلم وھو علی ھذا الحال مات شھیدًا"

"جو شخص حصولِ علم کے راستے میں مر جائے وہ شہید ہو کر مرتا ہے۔ [1]

(ii) امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"من مات منکم علی فراشہ وھو علی معرفۃ حق ربہ وحق رسولہ واھل بیتہ مات شھیدًا"

"جس شخص کو موت آجائے لیکن وہ حق معرفت پروردگار اور حق معرفت رسُول و اہل بیت رکھتا ہو تو وہ شہید ہو کر مرتا ہے۔ [2]

(iii) ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: "من قتل دون مالہ فھو شھید"

اسی طرح کئی اور لوگ ہیں جو راہ حق میں مار دیئے جاتے ہیں یا اپنی طبعی موت مرتے ہیں اور یہیں سے اس اسلامی ثقافت اور اس کی ہمہ گیریت کا پتہ چلتا ہے۔

(iv) اس بحث کو حضرت امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام کی ایک حدیث کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچاتے ہیں، امامؑ نے اپنے آباؤ اجداد کے ذریعے رسُول اللہؐ سے یوں روایت کی ہے۔

"اوّل من یدخل الجنۃ الشھید"

"سب سے پہلے شہید ہی بہشت میں جائے گا۔" [3]

۲۔ اسلام میں جنگ کے مقاصد: اسلام میں جنگ کو کبھی بھی اقدار کی حیثیت حاصل نہیں رہی، بلکہ انسانوں کی تباہی و بربادی اور ذرائع و وسائل کی نابُودی کی وجہ سے اسے "خلاف اقدار" شمار کیا گیا ہے۔ اسی لیے قرآن کی بعض آیات میں اسے عذاب الٰہی کے زمرے میں ذکر کیا گیا ہے، چنانچہ سُورۂ انعام کی ۶۵ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔

"قل ھو القادر علیٰ ان یبعث علیکم عذابًا من فوقکم او من تحت ارجلکم او یلبسکم شیعًا ویذیق بعضکم باس بعض"

---

[1] سفینۃ البحار جلد ۱ مادہ "شہد"

[2] نہج البلاغہ، خطبہ نمبر ۱۹۰ (آخری خطبہ)۔

[3] بحار الانوار جلد ۱، صفحہ ۲۰۲

"کہہ دے کہ خدا اس بات پر قادر ہے کہ تم پر (بجلیوں کے مانند) تمہارے اوپر سے یا (زلزلوں کے مانند) تمہارے پاؤں کے نیچے سے عذاب بھیج دے یا تمہیں ٹولیوں کی صورت میں متفرق کردے، یا تمہیں ایک دوسرے کے خلاف جنگ اور خوں ریزی کا مزہ چکھائے۔

اس آیت میں جنگ کو "صاعقہ" اور "زلزلہ" جیسی ارضی وسماوی آفات کے زمرے میں شمار کیا گیا ہے۔ اسی لیے اسلام میں تا حدّ امکان جنگ سے پرہیز کیا جاتا ہے۔

لیکن جب کسی قوم کے وجود کو خطرہ لاحق ہو، یا اس کے مقدس اور اعلیٰ مقاصد کو تباہی کا اندیشہ ہو تو اس وقت جنگ کو "اقدار" کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے اور جنگ "جہاد فی سبیل اللہ" کا مقام حاصل کر لیتی ہے۔

اسی وجہ سے اسلام میں جہاد کی کئی قسمیں بتائی گئی ہیں:

① آزادی خواہی پر مبنی ابتدائی جہاد۔

② دفاعی جہاد۔

③ فتنہ وفساد، اور شرک وبت پرستی کی آگ بجھانے کا جہاد۔

اس کی تفصیل ہم کسی اور جگہ بیان کر چکے ہیں۔ [1]

بنابریں اسلامی جہاد (جیسا کہ اسلام کے زبردست مخالفین پروپیگنڈا کرتے ہیں) عقیدہ مسلط کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ اصولی طور پر مسلط کردہ عقیدے کی اسلام میں کوئی قدر وقیمت نہیں ہے، بلکہ جہاد ایسے وقت ہوتا ہے جب دشمن جنگ کو اسلامی اُمت پر مسلط کر دیں یا ان سے خداداد آزادی چھیننا چاہیں، یا اس کے حقوق پامال کرنا چاہیں یا ظالم، مظلوم کا گلا دبانا چاہیں تو اس وقت تمام مسلمانوں پر فرض بن جاتا ہے کہ وہ مظلوم کی امداد کریں خواہ انھیں ظالم قوم سے لڑنا پڑے۔

گذشتہ آیات میں ایک مختصر اور لطیف جملے میں یہی بات بیان ہوئی ہے، جہاں فرمایا گیا ہے کہ کفار تو باطل کی پیروی کرتے ہیں اور مومنین حق کی اتباع کرتے ہیں۔ تو اس لحاظ سے وہ جنگ "حق اور باطل کے درمیان جنگ" بھی جائے گی، نہ کہ کشور کشائی، وسعت طلبی، دوسروں کے سرمائے کی لوٹ مار اور قدرت نمائی اور طاقت منوانے کے لیے۔

اسی وجہ سے ہم گذشتہ آیات کی تفسیر میں ایک روایت میں پڑھ چکے ہیں کہ انسانی معاشرے میں جنگ اِس وقت تک جاری رہے گی جب تک دجالوں کے وجود کا خاتمہ نہیں ہو جاتا اور زمین ان کے نجس وجود سے پاک نہیں ہو جاتی۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ اسلام میں دوسرے آسمانی ادیان کے پیروکاروں کے ساتھ پُر امن بقائے باہمی پر بہت زور دیا گیا ہے اور اس کی زبردست تاکید کی گئی ہے۔ قرآنی آیات، اسلامی روایات اور فقہ اسلامی میں

---

[1] تفسیر نمونہ جلد دوم سورۂ بقرہ کی آیت ۱۹۳ کے ذیل میں۔

اس بارے میں "اہل ذمہ کے احکام" کے عنوان سے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اگر اسلام عقائد مسلط کرنے اور اپنی طاقت بزورِ شمشیر منوانے کا حامی ہوتا تو پھر اسے پُرامن بقائے باہمی اور اہل ذمہ کے متعلق قوانین بنانے کی کیا ضرورت تھی؟

۳۔ جنگی قیدیوں کے احکام: ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ میدانِ جنگ میں دشمن کی مکمل شکست سے پہلے مسلمانوں کو کسی بھی صورت میں جنگی قیدی بنانے کا اقدام نہیں کرنا چاہیئے، کیونکہ اس سے ہر حالت میں سنگین خطرات کا احتمال ہے لیکن زیر تفسیر آیات کے لب ولہجہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ دشمن پر کامیابی کے بعد انہیں قتل کرنے کے بجائے قیدی بنا لیا جائے اسی لیے قرآن فرماتا ہے: جب تم دشمن کا سامنا کرو تو اس پر کاری ضربیں لگاؤ۔

پھر فرمایا گیا ہے: یہ کاری ضربیں ان پر برابر جاری رکھو، یہاں تک کہ دشمن کا ستیاناس کر دو اور انہیں گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دو، ایسے میں قیدیوں کی گرفتاری کے لیے اقدام کرو اور انہیں خوب باندھ لو (فاذا لقیتم الذین کفروا فضرب الرقاب حتی اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق)

لہٰذا دشمن پر قابو پانے کے بعد انہیں قتل کرنے کے بجائے اسیر بنا لیا جائے اور یہ ایسا کام ہے جس سے گریز ناممکن ہے، کیونکہ اگر دشمن کو چھوڑ دیا جائے تو ممکن ہے کہ وہ دوبارہ سنبھل کر پھر حملہ کر دے۔

لیکن قیدی بنانے کے بعد حالات یکسر تبدیل ہو جاتے ہیں اور اسیر تمام جرائم کے باوجود مسلمانوں کے ہاتھ میں خدا کی ایک امانت کی صورت میں آجاتا ہے جس کے بہت سے حقوق کی حفاظت مسلمانوں پر فرض ہو جاتی ہے۔

قرآن مجید نے ایسے لوگوں کی زبردست تعریف کی ہے، جنہوں نے ایثار سے کام لیا اور اپنا کھانا اسیر کو دے دیا۔ ارشاد ہوتا ہے:

"ویطعمون الطعام علیٰ حبہ مسکینا ویتیما واسیرا"

"خدا کے نیک بندے کھانے کی خواہش رکھنے کے باوجود اپنا کھانا مسکین، یتیم اور اسیر کو دے دیتے ہیں" (دھر-۸)

مشہور روایت کے مطابق یہ آیت حضرت علی، جناب فاطمہ زہرا اور حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین علیہم السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہوں نے اپنے افطار کا کھانا مسکین، یتیم اور اسیر کو دے دیا۔

حتیٰ کہ بعض استثنائی حالات میں مثلاً ان کے خطرناک ہونے یا خاص قسم کے جرائم کے ارتکاب کی وجہ سے جن قیدیوں کو سزائے موت کا حکم سنایا جاتا ہے، ان کے بارے میں بھی حکم یہی ہے کہ سزا پر عمل درآمد سے پہلے تک ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام کا فرمان ہے:

"اطعام الاسیر والاحسان الیہ حق واجب وان قتلتہ من الغد"

"اسیر کو کھانا کھلانا اور اس سے حسن سلوک کرنا ایک واجب حق ہے، ہر چند کہ یہ طے پا چکا

ہو کہ کل اسے سزائے موت دی جائے گی۔"[1]

اس بارے میں اور بھی بہت سی احادیث موجود ہیں۔[2]

ایک حدیث میں حضرت امام علی بن الحسین زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اذا اخذت اسیرًا فعجز عن المشی ولیس معک محمل فارسله، ولا تقتله، فانک لا تدری ما حکم الامام فیه۔"

"جب تم کسی کو اسیر بنالو اور اپنے ساتھ لے آؤ، لیکن وہ چلنے سے عاجز ہو اور تمہارے پاس اس کے لیے سواری بھی نہ ہو تو اسے چھوڑ دو اور قتل نہ کرو، کیونکہ تم یہ نہیں جانتے کہ جب اسے امام کے پاس لے جاؤ تو وہ اس کے بارے میں کیا فیصلہ کرے۔"[3]

حتیٰ کہ تاریخ میں رہبرانِ اسلام کے حالات میں ملتا ہے کہ جو کھانا وہ خود کھاتے تھے، اسیروں کو بھی وہی کھلاتے تھے۔

لیکن اسیروں کے بارے میں حکم جیسا کہ ہم آیات کی تفسیر میں بتا چکے ہیں، جنگ کے خاتمے کے بعد ان تینوں چیزوں میں سے ایک ہے: یا تو انہیں غیر مشروط طور پر چھوڑ دیا جائے یا فدیہ (تاوان) لے کر انہیں آزاد کر دیا جائے یا پھر انہیں غلام بنا لیا جائے۔ البتہ مذکورہ تینوں صورتوں میں سے کسی ایک کا انتخاب امام مسلمین اور پیشوائے اسلام کی مرضی پر موقوف ہے اور وہ بھی اُسراء کے حالات، داخلی اور خارجی لحاظ سے اسلام اور مسلمانوں کے مفادات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جو بات بھی اسے زیادہ مناسب نظر آئے گی اختیار کرے گا اور اس پر عمل درآمد کا حکم دے گا۔

بنابریں نہ تو تاوان لینا ضروری ہے اور نہ ہی غلام بنانا بلکہ یہ سب کچھ امام المسلمین کی صوابدید پر منحصر ہے کہ اگر مصلحت اس بات میں ہے کہ تاوان لے کر چھوڑ دیا جائے تو وہ ایسا ہی کرے گا اور اگر مصلحت غلام بنانے میں ہے تو غلام بنائے گا اور اگر مصلحت اس بات میں ہو کہ غیر مشروط طور پر چھوڑ دے تو ایسا ہی کرے گا۔

فدیہ اور تاوان کے بارے میں ہم تفسیر نمونہ جلد ۷، سورۂ انفال کی ۷۰ ویں آیت کی تفسیر میں تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں۔

۴۔ **اسلام اور غلامی:** اگرچہ قرآن مجید میں جنگی قیدیوں کے "استرقاق" (غلام بنانے) کا مسئلہ ایک حتمی حکم کے عنوان سے بیان نہیں ہوا لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ قرآن پاک میں غلاموں کے احکام بھی بیان ہوئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ صدرِ اسلام اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں بھی غلام تھے، جیسے غلام کے ساتھ ازدواج، محرم

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۱ صفحہ ۶۹۔

[2] فروع کافی جلد ۵ صفحہ ۳۵ باب الرفق بالاسیر والعامۃ۔

[3] فروع کافی جلد ۵ صفحہ ۳۵ باب الرفق بالاسیر والعامۃ۔

ہونے یا "مکاتبت" (غلاموں کی آزادی کے لیے عہد و پیمان) کے احکام وغیرہ، جو قرآن مجید کی متعدد آیات میں بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً سورۂ نساء، سورۂ نحل، سورۂ مؤمنون، سورۂ نور، سورۂ روم اور سورۂ احزاب کی آیات۔

یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ اسلام پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام نے اپنی تمام اعلیٰ تعلیمات اور انسانی اقدار کو بلند کرنے کے باوجود غلامی کے مسئلے پر بطور کلی خطِ تنسیخ کیوں نہیں کھینچا اور ایک دوٹوک اور عمومی حکم کے ذریعے تمام غلاموں کی آزادی کا اعلان کیوں نہیں کیا؟

یہ ٹھیک ہے کہ اسلام نے غلاموں کے بارے میں بڑی سفارش کی ہے، لیکن سب سے اہم بات ان کی غیر مشروط آزادی ہے۔ آخر ایک انسان دوسرے انسان کا مملوک اور بندہ کیوں ہو اور آزادی جو خدا کی بہترین نعمت اور قدرت کا بہترین عطیہ ہے اس سے وہ کیوں بہرہ مند نہ ہو؟

ایک مختصر جملے میں اس کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے غلاموں کی آزادی کے لیے ایک جچا تلا اور ایک شیڈول پر مبنی پروگرام دیا ہے کہ جس کے مطابق وہ آہستہ آہستہ آزادی کی نعمت سے مالا مال ہو جاتے ہیں اور اسی طرح کی آزادی سے معاشرے پر بھی کوئی ناخوشگوار اثر نہیں پڑتا۔

لیکن اس اسلامی منصوبے کی تشریح اور تفصیل سے پہلے ہم مقدمے کے طور پر یہاں پر قارئین کی توجہ چند نکات کی طرف مبذول کراتے ہیں۔

(ا) اسلام غلامی کا موجد ہرگز نہیں ہے:

یہ بات مسلم ہے کہ غلامی کی ایجاد اسلام نے نہیں کی، بلکہ وہ اس وقت ظہور پذیر ہوا جب ساری دنیا میں غلامی کا دور دورہ تھا اور غلامی انسانی معاشرے میں رچ بس چکی تھی، حتیٰ کہ اسلام کے بعد تک بھی غلامی کا رواج جاری رہا اور آج سے تقریباً ایک صدی قبل اس وقت تک تھا جب غلاموں کی آزادی کی تحریک شروع نہیں ہوئی تھی، کیونکہ انسانی زندگی کے نظام کی تبدیلی سے غلام بنانے کی پرانی روش اب قابلِ قبول نہیں رہی تھی۔

غلامی کے خلاف جدوجہد سب سے پہلے یورپ سے شروع ہوئی، پھر اس کا دائرہ، امریکا اور ایشیائی ملکوں تک بھی پھیل گیا۔

انگلستان میں ۱۸۴۰ء تک، فرانس میں ۱۸۴۸ء تک، ہالینڈ میں ۱۸۶۳ء تک اور امریکہ میں ۱۸۶۵ء تک غلامی کا سلسلہ جاری رہا، آخر کار برسیلز میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ایک مشترکہ اعلامیے کے ذریعے ساری دنیا میں غلامی کے سلسلے کو ختم کرنے کا تہیہ کر لیا گیا اور یہ ۱۸۹۰ء کی بات ہے (یعنی تقریباً سو سال سے بھی کم عرصہ گزرا ہے)

(ب) اس دور میں غلامی کے انداز بدل گئے ہیں:

یہ ٹھیک ہے کہ اہلِ یورپ غلامی کے خاتمے کے لیے پیش قدم ثابت ہوئے، لیکن جب اس مسئلے پر ذرا غور و فکر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ غلامی کا نہ صرف خاتمہ ہی نہیں ہوا، بلکہ یہ پہلے سے زیادہ خطرناک اور وحشت ناک صورت میں ظاہر ہوئی ہے، یعنی قوموں کے استعمار اور ملکوں پر سامراجیت کی صورت میں، وہ اس طرح سے

کہ انفرادی غلامی جتنا جتنا کمزور ہوتی گئی اجتماعی غلامی اور سامراجیت اسی قدر افزوں تر اور قوی تر ہوتی گئی، برطانوی شہنشاہیت اگر انفرادی غلامی کے خاتمے کے لیے پیش قدم ہے تو استعمار اور سامراجیت کے لیے بھی پیش گام دکھائی دیتی ہے۔

مغربی سامراجیوں نے اپنے سامراجی تسلط کے دوران جن جرائم کا ارتکاب کیا ہے وہ نہ صرف غلامی کے دورانیئے کے جرائم سے کم نہیں بلکہ وسعت اور شدّت کے لحاظ سے اس سے چار قدم آگے دکھائی دیتے ہیں۔

حتیٰ کہ سامراج کے چنگل سے آزاد ہونے والے ملکوں میں قوموں کی غلامی کا سلسلہ پھر بھی جاری رہا۔ غلامی سے یہ آزادی ایک نام نہاد سیاسی آزادی تھی، جب کہ آج بھی سامراج کے چنگل سے آزاد ہونے والے ملکوں اور دوسرے کئی ملکوں میں بھی اقتصادی اور ثقافتی غلامی اور استعمار کی حکمرانی ہے۔

یہ صورت حال کمیونسٹ ملکوں میں تو خصوصیت کے ساتھ جاری ہے، آزادی کا دم بھرتے اور غلامی کے خاتمہ کے لیے دوسروں سے زیادہ شور مچاتے ہیں حالانکہ وہ خود ایک شرمناک قسم کی بردہ داری میں گرفتار ہیں۔

جو لوگ ان ملکوں میں رہتے ہیں وہ غلاموں کے مانند بالکل بے اختیار ہیں اور ان ملکوں کے باشندوں کے تمام اختیار کمیونسٹ پارٹی کے لیڈروں کے ہاتھ میں ہیں۔ اگر کوئی شخص اختلاف رائے کا اظہار کرتا ہے تو اسے یا تو جبری کام کے مراکز میں بھیج دیا جاتا ہے یا پھر زندان کی کال کوٹھڑیوں میں بند کر دیا جاتا ہے اور اگر اس کا شمار دانشوروں میں ہو تو اسے نفساتی مریض قرار دے کر پاگل خانے میں بھیج دیا جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ غلامی نام کے تابع نہیں ہے، جو چیز ناپسندیدہ اور بری ہے وہ ہے اصل غلامی اور اس کا حقیقی مفہوم اور ہر ایک کو معلوم ہے کہ یہ مفہوم سامراجی تسلط میں موجود اور کمیونسٹ ممالک میں بدترین صورت میں موجود اور معمول ہے۔

خلاصۃ الکلام یہ کہ آج کی دنیا میں غلامی کے خاتمے کی ایک ظاہری صورت تھی جس نے حقیقت میں ایک نئی صورت اختیار کر لی ہے۔

(iii) ماضی میں غلاموں کا دردناک انجام:

تاریخی لحاظ سے غلاموں کی ایک نہایت دردناک تاریخ ہے اور وہ ساری زندگی اندوہناک انجام سے دوچار ہوتے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر (SPARTA) کے غلاموں کی تاریخ کو لے لیجیے جو کہ بذات خود ایک متمدن قوم تھی، کتاب "روح القوانین" کے مصنف کے بقول (SPARTA) کے غلام اس قدر مصیبت زدہ تھے کہ ان میں سے کوئی بھی غلام کسی فرد واحد کا غلام نہیں ہوتا تھا بلکہ تمام معاشرے کا غلام ہوتا تھا اور ہر شخص کسی بھی قانونی خوف کے بغیر اپنے یا کسی دوسرے کے غلام کو جتنا چاہتا دکھ اور ایذائیں پہنچاتا۔ درحقیقت اس معاشرے کے غلاموں کی زندگی حیوانات سے بھی بدتر تھی۔

جب کسی پسماندہ ملک سے غلاموں کا شکار کیا جاتا تھا، شکار کے وقت سے لے کر منڈیوں تک لانے کے عرصے میں بہت سے غلام مر جایا کرتے تھے، جو بچ جاتے تھے وہ لالچی بردہ فروشوں کی کمائی کا ذریعہ بنتے تھے، انہیں

کھانے کو صرف اس حد تک دیا جاتا کہ جس سے وہ جسم اور رُوح کا رشتہ بحال رکھ سکتے اور کام بجا لاتے تھے۔ جب وہ بوڑھے ہو جاتے یا کسی جان لیوا بیماری کا شکار ہو جاتے تو انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جاتا اور وہ تڑپ تڑپ کر مر جاتے۔

لہٰذا تاریخی طور پر غلامی کا نام اپنے ساتھ ہولناک جرائم کی ایک تفصیلی داستان رکھتا ہے۔

یہ چند موٹے موٹے نکات اجمالی طور پر بیان کرنے کے بعد ہم اسلام کے غلاموں کو بالتدریج آزاد کرنے کے منصوبے پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں۔

(۱۷) غلاموں کی آزادی کے لیے اسلام کا منصوبہ:

جس چیز پر عام طور سے زیادہ توجہ نہیں دی جاتی وہ یہ ہے کہ اگر کوئی غلط نظام کسی معاشرے میں رواج پا جائے تو اسے ختم کرنے کے لیے ایک مدت درکار ہوتی ہے اور اس سلسلے میں کوئی بھی اقدام جو سوچے سمجھے منصوبے کے بغیر کیا جائے اس کا نتیجہ اُلٹا نکلتا ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے کوئی شخص کسی خطرناک بیماری میں مبتلا ہو جائے اور اس کی یہ بیماری اپنی انتہا تک پہنچ چکی ہو، یا جیسے کوئی شخص کسی بُری عادت کا شکار ہو جائے اور اس کی یہ عادت سالہا سال سے اس میں راسخ ہو چکی ہو تو ایسے حالات میں ایک تدریجی شیڈول کی ضرورت ہوتی ہے، جس کے تحت اس کا علاج کیا جاتا ہے، تب کہیں جا کر کامیابی حاصل ہوتی ہے۔

زیادہ واضح الفاظ میں یوں کہیں کہ اگر اسلام ایک عمومی حکم کے ذریعہ اس زمانے کے تمام غلاموں کی آزادی کا حکم دے دیتا ہے تو قوی امکان تھا کہ ان میں سے اکثر و بیشتر غلام تباہی و بربادی کا شکار ہو جاتے، کیونکہ بعض مقامات پر تو نصف سے زیادہ آبادی غلاموں کی تھی، جن کا نہ تو کوئی مستقل ذریعۂ معاش تھا، نہ سر چھپانے کے لیے اپنا گھر اور نہ ہی پیٹ پالنے اور زندہ رہنے کے لیے کوئی اور ذریعہ۔

اگر ایک مقررہ دن اور مقررہ وقت پر وہ سب آزاد ہو جاتے تو معاشرے کا ایک بہت بڑا حصہ بے کار اور بے روزگار ہو جاتا، جس سے ایک تو ان کی اپنی زندگی خطرے میں پڑ جاتی اور دوسرے ممکن تھا کہ معاشرے کے نظم و نسق میں خلل پڑ جاتا اور جب ہر طرف سے انہیں مایوسیوں اور محرومیوں کا سامنا کرنا پڑتا تو وہ ہر ایک پر حملہ آور ہوتے جس سے خانہ جنگی اور خوں ریزی کا زبردست اندیشہ تھا۔

اسی لیے ضروری معلوم ہوا ہے کہ غلاموں کو تدریجی طور پر آزاد کیا جائے تاکہ وہ ماحول اور معاشرے میں رچ بس جائیں جس سے نہ تو انہیں خود کو کسی قسم کا خطرہ ہو اور نہ ہی معاشرے کے لیے امن و امان کا مسئلہ کھڑا ہو۔ لہٰذا اسلام نے بھی ٹھیک اسی سوچے سمجھے منصوبے کو اپنایا ہے۔

اس قسم کے منصوبے کو کئی طرح سے عملی جامہ پہنانے کا حکم دیا گیا ہے، جس کے اہم پہلوؤں کو ہم دفعات کی صورت میں فہرست وار بیان کرتے ہیں۔ البتہ اس کی تفصیل کے لیے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔

دفعہ "غلامی کی بیخ کنی": تاریخی لحاظ سے غلامی کے کئی مختلف اسباب ملتے ہیں۔ صرف جنگ ہی میں گرفتار ہونے

والے قیدیوں کو غلام نہیں بنایا جاتا تھا، بلکہ جو مقروض اپنا قرض ادا نہیں کر سکتے تھے انہیں بھی غلام بنا لیا جاتا تھا۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ زور، غلبہ اور طاقت بھی غلام بنانے کے اسباب تھے۔ طاقت ور ملک مختلف اسلحہ سے مسلح کر کے اپنے افراد افریقہ اور اس جیسے دوسرے پسماندہ ملکوں میں بھیجتے تھے اور وہ وہاں پر جا کر ٹولیوں اور گروہوں کی صورت میں انسانوں کا شکار کرتے تھے اور انہیں قیدی بنا کر کشتیوں کے ذریعے ایشیائی اور یورپی ممالک کی منڈیوں میں جا کر بیچ ڈالتے تھے۔

اسلام نے ان تمام مسائل کی روک تھام کی ہے اور صرف ایک موقعہ پر غلام بنانے کی اجازت دی ہے اور وہ ہے، جنگی قیدیوں کے بارے میں اور وہ بھی ضروری طور پر نہیں بلکہ جیسا کہ ہم مندرجہ بالا آیات کی تفسیر میں بتا چکے ہیں، اس بات کی اجازت بھی دے دی تھی کہ یا تو انہیں غیر مشروط طور پر رہا کر دیں یا فدیہ لے کر چھوڑ دیں۔

اس زمانے میں قید خانے نہیں ہوتے تھے کہ جنگی قیدیوں کو ان کا انجام واضح ہونے تک قید خانوں میں رکھا جاتا۔ لہٰذا اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ انہیں مختلف کنبوں میں تقسیم کر کے، غلاموں کی صورت میں ان کی نگہداشت کی جاتی۔

ظاہر ہے کہ جب مذکورہ صورت تبدیل ہو جائے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اسیروں کے بارے میں امام المسلمین غلامی کا حکم صادر کرے وہ "منّ" اور "فداء" کے ذریعے سے انہیں آزاد کر سکتا ہے، کیونکہ اسلام نے مسلمانوں کو اس بارے میں اجازت دے رکھی ہے کہ وہ مصلحت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مذکورہ صورتوں میں سے کوئی ایک اپنا لیں۔ اس طرح اسلام میں غلامی کا راستہ تقریباً بند ہو جاتا ہے۔

دقعہ ۲ "آزادی کی راہیں": اسلام نے غلاموں کو آزاد کرنے کا ایسا وسیع منصوبہ تشکیل دیا ہے کہ اگر مسلمان اس پر عمل کرتے تو سب کے سب غلام تدریجاً اور نہایت ہی قلیل مدت میں آزاد ہو جاتے اور اسلامی معاشرے میں گھل مل کر اس کا جزو بن جاتے۔ اس منصوبے کے چیدہ چیدہ اصول یہ ہیں:۔

(ا) اسلام میں زکوٰۃ کے آٹھ مصرف ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس سے غلاموں کو خرید کر آزاد کر دیا جائے۔ (ملاحظہ ہو سورۂ توبہ/۶۰)

اس طرح سے اسلامی بیت المال میں ایک مستقل اور دائمی حصہ مقرر کیا گیا ہے تاکہ غلاموں کی مکمل آزادی کا سلسلہ جاری رہے۔

(ب) اس مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اسلام میں کچھ قوانین وضع کیے گئے ہیں جن کی رُو سے غلام اپنے آقا سے ایک طرح کا سمجھوتہ کرتا ہے اور عہد و پیمان باندھتا ہے جس کی رُو سے وہ اپنی محنت و مشقت سے حاصل کی ہوئی رقم سے آزاد ہو جاتا ہے۔ (اس بارے میں اسلامی فقہ میں "مکاتبۃ" کے عنوان سے ایک مستقل فصل موجود ہے)۔[1]

(ج) اسلام میں غلاموں کی آزادی کو بہترین عبادات میں سے اور عمل خیر قرار دیا گیا ہے اور اس بارے میں پیشوایان اسلام پیش پیش نظر آتے ہیں جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام کے حالات میں مؤرخین نے لکھا ہے کہ:

---

[1] "مکاتبۃ" کے بارے میں اور اس کے دلچسپ احکام کے متعلق ہم نے تفسیر نمونہ چودھویں جلد میں تفصیل سے بحث کی ہے۔

"اعتق الف من کدیدۃ"

"آپ نے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے ایک ہزار غلام آزاد کیے"۔[1]

(د)۔ اسلام کے عظیم رہبر اور آئمہ اطہار علیہم السلام بہانے بہانے سے غلاموں کو آزاد کر دیا کرتے تھے تاکہ اس طرح وہ غلاموں کی آزادی کے لیے دوسرے لوگوں کے لیے نمونہ قرار پائیں۔ چنانچہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے ایک غلام نے ایک معمولی سا اچھا کام انجام دیا تو امامؑ نے اسے فرمایا:

"اذھب فانت حر فانی اکرہ ان استخدم رجلاً من اھل الجنۃ"

"جاؤ! تم آزاد ہو، کیونکہ مجھے یہ بات اچھی نہیں لگتی کہ اہل بہشت میں سے کسی سے خدمت لوں"۔[2]

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے حالات میں ملتا ہے کہ:

"آپ کا غلام آپؑ کے سر پہ پانی ڈال رہا تھا کہ پانی کا برتن اس کے ہاتھ سے گرا جس سے آپ مجروح ہو گئے۔ امام نے اپنا سر اوپر اٹھایا تو اس نے یہ قرآنی آیت پڑھی "والکاظمین الغیظ" حضرت نے فرمایا "میں نے اپنا غصہ پی لیا" اس نے کہا "والعافین عن الناس" امام نے فرمایا میں نے تجھے معاف کیا، خدا بھی تجھے معاف کرے"۔ اس نے فوراً کہا "واللہ یحب المحسنین" تو امامؑ نے فرمایا "جاؤ! راہِ خدا میں تم آزاد ہو"۔[3]

(ھ) بعض اسلامی روایات میں ہے کہ سات سال کے بعد غلام خود بخود آزاد ہو جاتا ہے، جیسا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"من کان مؤمناً فقد عتق بعد سبع سنین، اعتقہ صاحبہ ام لم یعتقہ ولا یحل خدمۃ من کان مؤمناً بعد سبعۃ سنین"

"مومن غلام سات سال کے بعد خود بخود آزاد ہو جاتا ہے، خواہ اس کا مالک اسے آزاد کرے یا نہ کرے اور سات سال کے بعد مومن غلام سے خدمت لینا جائز اور حلال نہیں ہے"۔[4]

---

[1] بحار الانوار جلد ۴۱ صفحہ ۴۳۔

[2] وسائل الشیعہ جلد ۱۶ صفحہ ۳۲۔

[3] تفسیر نور الثقلین جلد ۱ صفحہ ۳۹۰۔

[4] وسائل الشیعہ جلد ۱۶ صفحہ ۳۶۔

اسی باب میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث بھی درج کی گئی ہے، آپ فرماتے ہیں:

"مازال جبرئیل یوصینی بالمملوک حتیٰ ظننت انہ سیضرب لہ اجلا یعتق فیہ"

"مجھے غلاموں کے بارے میں جبرائیل بار بار سفارش کرتے رہے ہیں، جس سے میں یہ سمجھنے لگا کہ بہت جلد ان کی آزادی کی تاریخ مقرر کر دیں گے کہ جس میں وہ آزاد کر دیئے جائیں گے"۔[1]

(و)۔ جو شخص کسی مشترک غلام کو اپنے حصے کی نسبت آزاد کر دے، اس پر فرض بن جاتا ہے کہ بقیہ حصے کی خریداری کر کے اسے آزاد کرے۔[2]

جو شخص اپنے تمام غلام کے کچھ حصے کو آزاد کر دے تو یہ آزادی اس کے تمام حصوں میں سرایت کر جاتی ہے اور وہ خود بخود مکمل طور پر آزاد ہو جاتا ہے۔[3]

(ز) جو شخص اپنے والد یا والدہ یا نانا یا نانی یا دادا یا دادی یا اولاد یا چچا یا پھوپھی، ماموں یا خالہ یا بھائی یا بہن یا بھتیجے یا بھانجے یا بھتیجی یا بھانجی کا مالک بن جائے تو وہ فوراً آزاد ہو جاتے ہیں۔

(ح) جب آقا کی اپنی کنیز سے کوئی اولاد ہو جائے تو اس کنیز کا فروخت کرنا جائز نہیں ہے اور اپنی اولاد کے حصے سے وہ فوراً آزاد کر دی جائے۔

یہ صورت حال بہت سی کنیزوں کی آزادی کا سبب بن جاتی تھی کیونکہ وہ اپنے آقاؤں کی بیوی کی حیثیت سے ہوتی تھیں اور ان سے صاحب اولاد ہو جاتی تھیں۔

(ط) اسلام میں بہت سی خلاف ورزیوں کا کفارہ غلاموں کی آزادی مقرر کیا گیا ہے (مثال کے طور پر قتل خطأ، روزے کو جان بوجھ کر نہ رکھنا اور قسم وغیرہ کے کفارے)۔

(ی) کئی ایسی سخت سزائیں ہیں کہ اگر آقا اپنے غلام کو وہ سزائیں دے تو غلام خود بخود آزاد ہو جاتا ہے۔[4]

دفعہ ۳: "غلاموں کی شخصیت کا احیاء": اسلام نے اس درمیانی مدت کے لیے غلاموں کے حقوق کے احیار کے لیے وسیع اقدامات کیے ہیں جو وہ اسلامی منصوبے کے تحت آزادی کے لیے طے کر رہے ہوتے ہیں ایسے اقدامات کے تحت جہاں ان کے حقوق کا احیار مقصود ہوتا ہے وہاں ان کی انسانی شخصیت کے احیار کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے تاکہ

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۶ صفحہ ۔

[2] شرائع الاسلام کتاب العتق۔ وسائل الشیعہ جلد ۱۶ صفحہ ۔

[3] شرائع الاسلام کتاب العتق۔

[4] وسائل الشیعہ جلد ۱۶ صفحہ

انسانی شخصیت کے لحاظ سے آزاد اور غلام کا فرق مٹ جائے۔ اسی لیے اسلام نے انسانی شخصیت کا معیار "تقوٰے" قرار دیا ہے، اسی لیے غلاموں کو بھی اجازت دی گئی کہ ہر قسم کے اہم معاشرتی مناصب حتی کہ قاضی جیسے نہایت اہم عہدے پر بھی فائز ہو سکتے ہیں۔[1]

عصر رسالت مآبؐ میں لشکر کی سپہ سالاری سے لے کر دوسرے اہم ترین اور حساس ترین عہدوں پر غلام یا آزاد کردہ غلام فائز رہے ہیں۔

رسولِ اعظمؐ کے بہت سے دوست اور صحابی یا تو غلام تھے یا آزاد غلام تھے اور ان میں سے بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو بزرگانِ اسلام کے معاون و مددگار کی حیثیت سے کام کرتے تھے اور اس بارے میں سلمان فارسیؓ، عمار یاسرؓ اور قنبرؓ جیسے صحابیوں کا نام لیا جا سکتا ہے۔

"غزوہ بنی مصطلق" کے بعد رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس قبیلے کی ایک آزاد شدہ کنیز سے ازدواج فرمایا اور یہ بات اس قبیلے کے تمام گرفتار شدہ قیدیوں کی آزادی کا بہانہ بن گئی۔

دفعہ ۴ "غلاموں سے انسانی سلوک": اسلام میں غلاموں کے ساتھ نرمی برتنے اور ان کے ساتھ مدارات اور حسنِ سلوک کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے، حتی کہ انہیں اپنے آقاؤں کے ساتھ زندگی میں حصے دار بھی بنایا گیا ہے، جیسا کہ رسول اللہ فرماتے ہیں:

> "جس شخص کا بھائی اس کے زیرِ دست ہے، اسے چاہیئے کہ جو کچھ وہ خود کھاتا ہے ویسا ہی اسے کھلائے، جو خود پہنتا ہے اسے بھی ویسا پہنائے اور اس کی طاقت سے زیادہ اس سے کام نہ لے۔[2]

حضرت علی علیہ السلام اپنے غلام قنبر سے فرمایا کرتے تھے:

> "مجھے خدا سے شرم آتی ہے کہ میں تجھ سے اچھا لباس پہنوں، کیونکہ رسولِ خدا فرمایا کرتے تھے جو کچھ تم خود پہنتے ہو ویسا ہی انہیں پہناؤ اور جو تم خود کھاتے ہو، ویسا ہی انہیں کھلاؤ۔"[3]

امام جعفر صادق علیہ السلام فرمایا کرتے تھے:

> "میرے والد جب کسی غلام کو کسی کام کے بجالانے کا حکم دیتے تو اگر وہ کام مشکل ہوتا تو پہلے خود بسم اللہ کہہ کر اسے انجام دیتے اور اس کی امداد کیا کرتے تھے۔"[4]

---

[1] شرائع الاسلام "کتاب القضاء"۔

[2] بحار الانوار جلد ۴، صفحہ ۱۴۱ (حدیث ۱۱)

[3] بحار الانوار جلد ۴، صفحہ ۱۴۲ (حدیث ۱۹)

[4] بحار الانوار جلد ۴، صفحہ ۱۴۲ (حدیث ۱۳)

اس تدریجی اور عبوری عرصے کے دوران غلاموں کے بارے میں اسلام کے حسن سلوک کا حکم اس حد تک ہے کہ اسلام سے اجنبی افراد بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے اور اس کی تعریف کی ہے۔

مثال کے طور پر جرجی زیدان (عیسائی مؤرخ) اپنی کتاب تاریخ تمدن میں لکھتے ہیں:

"اسلام، غلاموں کے ساتھ حد سے زیادہ مہربان ہے، پیغمبر اسلام نے غلاموں کے بارے میں بڑی تاکید کی ہے، یہاں تک کہ پیغمبر اسلام کا کہنا ہے: جن کاموں کی بجاآوری غلاموں کے بس کی بات نہیں وہ ان کے ذمے نہ لگائے جائیں، جو کچھ تم کھاتے ہو ویسا ہی غلاموں کو کھلاؤ" ایک اور موقع پر فرماتے ہیں: "اپنے غلاموں کو کنیز یا غلام نہ کہو، بلکہ انہیں میرا بیٹا اور میری بیٹی کہہ کر بلایا کرو۔"

قرآن نے بھی غلاموں کے بارے میں بڑی عمدہ سفارشات پیش کی ہیں، چنانچہ کہتا ہے:

"خدا کی عبادت کرو، اس کا شریک مت ٹھہراؤ، ماں باپ، قریبی رشتہ داروں، یتیموں، بے نواؤں، نزدیک اور دور کے ہمسایوں، دوستوں، بے خانمان لوگوں اور غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کیا کرو، خدا خود پسند لوگوں سے بیزار ہے۔" [1]

دفعہ ۵۔ "آدم فروشی کو بدترین فعل بتایا گیا ہے": اصولی طور پر اسلام میں غلاموں کی خرید و فروخت کو بدترین اور سب سے زیادہ قابل نفرت کاروبار قرار دیا گیا ہے، حتی کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں آیا ہے کہ:

"شر الناس من باع الناس۔"

"بدترین لوگ وہ ہیں جو غلاموں کو بیچتے ہیں۔" [2]

غلاموں کے بارے میں اسلام کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لیے یہی بات کافی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی منصوبوں کا رُخ کس طرف کو ہے۔

اس سے بڑھ کر دلچسپ اور جاذب توجہ یہ امر ہے کہ اسلام میں جو گناہ ناقابل معافی شمار کیے گئے ہیں ان میں سے ایک گناہ یہ بھی ہے کہ انسان کی آزادی اور حریت کو سلب کر لیا جائے اور اسے ایک سودے کی صورت میں تبدیل کر دیا جائے۔ جیسا کہ آنحضرتؐ کا ارشاد گرامی ہے:

"ان اللہ تعالیٰ غافر کل ذنب الا من جحد مهرا، او اغتصب اجیرا اجره، او باع رجلا حرا۔"

"خدا تین گناہوں کے علاوہ دوسرے سب گناہ معاف کر دے گا، جو شخص اپنی زوجہ کے

---

[1] تاریخ تمدن اسلام جلد ۴ صفحہ ۵۴۔

[2] مستدرک الوسائل جلد ۲ کتاب التجارۃ باب ۱ حدیث ۱۔

مہر کا انکار کر دے ۲۔ مزدور کی مزدوری غصب کر لے ۳۔ کسی انسان کو بیچ ڈالے[1]۔"

اس حدیث کی رُو سے عورتوں کے حقوق کا غصب کرنا، مزدور کی مزدوری کا غصب کرنا اور انسانی آزادی کا چھین لینا تین ناقابل معافی گناہ ہیں۔

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ اسلام نے صرف ایک موقع پر غلام بنانے کی اجازت دی ہے اور وہ بھی جنگی قیدیوں کو اور وہ بھی ہرگز لازمی نہیں ہے، جبکہ ظہور اسلام کے زمانے میں اور اس کے کئی صدیاں بعد تک طاقت کے ذریعے اور سیاہ فام لوگوں کے ملکوں پر حملہ کر کے آزاد انسانوں کو گرفتار کر کے انہیں غلام بنانے کا طریقہ کار عام تھا اور بعض اوقات تو وحشت ناک تعداد میں اس قسم کے غلاموں کا سُودا کیا جاتا یہاں تک کہ ۱۸ ویں صدی عیسوی کے آخر میں حکومت برطانیہ سالانہ دو لاکھ انسانوں کو غلاموں کی صُورت میں فروخت کیا کرتی تھی اور ہر سال ایک لاکھ انسانوں کو افریقہ سے پکڑ کر غلاموں کی صورت میں انہیں امریکہ لے جایا جاتا تھا۔[2]

مختصر یہ کہ جو لوگ غلاموں کے بارے میں اسلام کی حکمت عملی پر اعتراض کرتے ہیں انہوں نے دُور ہی سے اس بارے میں کُچھ سُن رکھا ہے اور اس پروگرام کے اصولوں اور اسلام کے ہدف سے قطعاً ناآشنا رہیں، کیونکہ اسلام کا اصولی پروگرام غلاموں کی تلفی کے بغیر تدریجی آزادی ہے۔ یا وہ لوگ پھر ان مفاد پرستوں کی باتوں میں آ کر ایسی باتیں کرتے ہیں جنہوں نے اپنے خیال میں اسے اسلام کا زبردست کمزور نقطہ سمجھ لیا ہے اور اسی چیز کو لے کر اسلام کے خلاف پروپیگنڈے میں مصروف ہیں۔

---

[1] بحار الانوار جلد ۱۰۳ صفحہ ۱۶۸ (حدیث ۱)

[2] تفسیر المیزان جلد ۶ صفحہ ۳۶۵۔

۷۔ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْكُمْ وَ یُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ○

۸۔ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ○

۹۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ○

۱۰۔ اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ ۫ وَ لِلْكٰفِرِیْنَ اَمْثَالُهَا ○

۱۱۔ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ اَنَّ الْكٰفِرِیْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ع ○

ترجمہ

۷۔ اے وہ لوگو جو ایمان لے آئے ہو! اگر تم خدا کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں ثابت قدم رکھے گا۔

۸۔ اور جو لوگ کافر ہیں وہ مر جائیں اور ان کے اعمال اکارت ہوں۔

۹۔ یہ اس لیے کہ خدا نے جو چیز نازل فرمائی انہوں نے اسے ناپسند کیا تو خدا نے ان کے اعمال کو حبط کر دیا۔

۱۰۔ تو کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں تاکہ دیکھتے کہ جو لوگ ان سے پہلے تھے ان کا انجام کیا ہوا؟ خدا نے انہیں ہلاک کر دیا اور کافروں کے لیے اسی طرح کی سزا ہو گی۔

۱۱۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ خدا ایمان داروں کا مولا اور سرپرست ہے، لیکن کافروں کا کوئی سرپرست نہیں۔

تفسیر

تم خدا کی مدد کروگے تو وہ بھی تمہاری مدد کریگا

یہ آیات مثل سابق مؤمنین کو دشمنان حق کے خلاف قیام کی ترغیب دے رہی ہیں اور دلکش تعبیر کے ساتھ انہیں جہاد پر آمادہ کر رہی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: "اے وہ لوگو جو ایمان لے آئے ہو! اگر تم خدا کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمہاری مدد کریگا اور تمہیں ثابت قدم رکھے گا۔ (یا ایھا الذین امنوا ان تنصروا اللہ ینصرکم ویثبت اقدامکم)۔

"ایمان کے مسئلے پر تاکید اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سچے دل سے ایمان کی ایک علامت دشمنانِ دین کے ساتھ جنگ ہے۔

خدا کی مدد کرنے کا مطلب واضح ہے کہ اس کے دین کی مدد کی جائے، اس کے پیغمبرؐ کی نصرت کی جائے، پیغمبرؐ کی شریعت اور تعلیمات کی نصرت کی جائے۔ اسی لیے قرآن مجید کی دوسری آیات میں خدا اور رسول کی نصرت ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ مذکور ہوئی ہیں، جیسا کہ سورہ حشر کی آٹھویں آیت میں ہے:

"وینصرون اللہ ورسولہ اولئک ھم الصادقون"۔

باوجودیکہ خدا کی قدرت بے انتہا ہے اور مخلوق کی قدرت اس کے مقابلے میں بالکل ہی ناچیز ہے، لیکن پھر بھی "خدا کی مدد" کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں تاکہ جہاد اور آئین حق کے دفاع کی اہمیت واضح کی جائے اور اس سے بڑھ کر اس موضوع کے لیے کوئی اور باعظمت تعبیر نہیں مل سکتی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ خدا نے اپنے دین کے دفاع کے بدلے جو وعدہ مجاہدین سے کیا ہے وہ کیا ہے؟ ارشاد ہوتا ہے: "خدا تمہاری مدد کرے گا"۔ لیکن کس طریقے سے؟ بہت سے طریقے ہیں! تمہارے دل میں نور ایمان، تمہاری روح میں تقوے، تمہارے ارادوں میں قوت اور تمہارے افکار میں اطمینان ڈال کر۔

پھر یہ بھی کہ فرشتے تمہاری امداد کے لیے بھیجتا ہے، حالات کا دھارا تمہارے حق میں موڑ دیتا ہے، لوگوں کے دلوں کو تمہاری طرف پھیر دیتا ہے، تمہاری باتوں میں تاثیر بخشتا ہے، تمہاری سرگرمیوں کو مفید اور نتیجہ خیز بناتا ہے، غرض خدا کی مدد تمہارے جسم و جان اور تمہارے ظاہر و باطن پر چھا جاتی ہے۔

لیکن امداد کی مذکورہ تمام صورتوں میں "ثبات قدم" کے مسئلے پر زیادہ زور دیا گیا ہے، کیونکہ دشمن کے مقابلے میں

استقامت اور پامردی میں کامیابی کا سب سے زیادہ اور اہم راز پوشیدہ ہے اور میدانِ جنگ میں انہیں کامیابی حاصل ہوتی ہے جو ثباتِ قدم اور استقامت کا زیادہ ثبوت پیش کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ بنی اسرائیل کے عظیم سپہ سالار حضرت طالوت کی ایک ستم گار، خونخوار اور طاقت ور بادشاہ جالوت کے ساتھ جنگ کے واقعے میں ہے کہ جب مومنین کی مختصر سی تعداد جو طالوت کے ساتھ تھی، طاقتور دشمن کے مقابلے میں آئی تو کہا:

"ربنا افرغ علینا صبرًا وثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکافرین"

"خداوندا! تو ہمارے لیے صبر و استقامت کی فراوانی کر دے اور ہمارے قدموں میں ثبات عطا فرما اور کافر قوم کے مقابلے میں ہماری مدد فرما" (بقرہ۔ ۲۵۰)

چنانچہ اس کے بعد کی آیت میں ہے:

"فھزموھم باذن اللہ"

"طالوت کے ساتھیوں نے جالوت کے طاقت ور لشکر کو حکم الٰہی سے شکست دے دی"

یقیناً! ثباتِ قدم کا نتیجہ دشمن پر مکمل فتح اور کامرانی ہوتا ہے۔

چونکہ بعض اوقات دشمن کا جم غفیر اور ان کی انفرادی قوت اور مختلف قسم کے اسلحہ جات مجاہدین راہ حق کے افکار کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں، لہٰذا بعد کی آیت میں فرمایا گیا ہے: اور جو لوگ کافر ہیں وہ ہلاک ہوں اور ان کے اعمال برباد ہوں (والذین کفروا فتعسًا لھم واضل اعمالھم)[1]

"تعس" (بروزن "نحس") کا معنی ڈگمگانا اور منہ کے بل گرنا ہے، بعض لوگوں نے اس کا معنی ہلاکت، انحطاط اور پستی بیان کیا ہے۔ انہوں نے درحقیقت اس کے نتیجے کو بیان کیا ہے۔

بہرصورت ان دونوں گروہوں کے درمیان تقابل بڑی حد تک بامعنی ہے۔ پہلے مومنین کے بارے میں فرمایا گیا ہے: "انہیں ثابت قدم رکھے گا" لیکن کافروں کے متعلق فرمایا گیا ہے: "انہیں سقوط و لغزش نصیب ہو" اور وہ بھی نفرین کی صورت میں کہ جس کی گہرائی اور گیرائی واضح ہے۔

جی ہاں! جب بے ایمان لوگ لغزش کرتے ہیں تو کوئی بھی انہیں سہارا نہیں دے سکتا، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بڑی آسانی کے ساتھ شکست کھا جاتے ہیں، لیکن مومنین کی امداد کے لیے فرشتے موجود ہوتے ہیں جو انہیں بڑھ کر تھام لیتے ہیں اور انہیں لغزش اور ڈگمگاہٹ سے فوراً بچا لیتے ہیں۔ جیسا کہ ایک اور جگہ پر خدا تعالیٰ فرماتا ہے:

---

[1] "تعسًا" ایک فعل مقدر کا مفعول مطلق ہے جس کی تقدیر یوں ہے "تعسھم تعسًا" اور "اضل اعمالھم" کا جملہ اسی فعل مقدر پر عطف ہے اور دونوں جملے نفرین کی صورت میں ہیں، جیسے "قاتلھم اللہ" اور ظاہر ہے کہ خدا کی طرف سے نفرین اس کے وقوع پذیر ہونے کے معنی میں ہے

"ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملائکۃ"

(حٰم سجدہ: ۳۰)

مومنین کے اعمال میں برکت ہوتی ہے، لیکن کفار کے اعمال برکت سے خالی ہوتے ہیں جو بہت جلد نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔

بعد کی آیت ان کے سقوط اور ان کے اعمال کی بربادی کو ان الفاظ میں بیان کرتی ہے: یہ اس لیے کہ خدا نے جو چیز نازل فرمائی انہوں نے اسے ناپسند کیا تو خدا نے بھی ان اعمال کو اکارت کر دیا۔ (ذالک بانھم کرھوا ما انزل اللہ فاحبط اعمالھم)۔

خدا نے ہر چیز سے پہلے آئین توحید کو نازل فرمایا، لیکن انہوں نے اس سے منہ موڑ لیا اور شرک کی طرف متوجہ ہو گئے۔ خدا نے حق و عدالت اور طہارت و تقویٰ کا حکم دیا، لیکن انھوں نے اس کی طرف بھی پیٹھ کر لی اور ظلم و فساد کو اپنا لیا، حتیٰ کہ جب ان کے سامنے خداوند وحدہٗ لاشریک کا نام لیا جاتا تو وہ اس سے بھی اظہار نفرت کرتے، جیسا کہ سورۂ زمر کی ۴۵ ویں آیت میں ہے۔

"واذا ذکر اللہ وحدہ اشمأزت قلوب الذین لا یؤمنون بالاٰخرۃ"

جی ہاں! جب یہ لوگ ان چیزوں سے متنفر ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ اس راہ میں قدم بھی نہیں اٹھاتے بلکہ ان کی تمام سعی و کوشش باطل کی راہوں پر گامزن ہونے میں صرف ہوتی ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے اعمال اکارت ہو جاتے ہیں۔

ایک روایت میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ:

"کرھوا ما انزل اللہ فی حق علی"

"ان لوگوں نے ہر اس چیز کو ناپسند کیا جو خدا نے علی علیہ السلام کے حق میں نازل کی"۔[1]

البتہ "ما انزل اللہ" کی تعبیر ایک وسیع معنی کی حامل ہے، جس کا ایک روشن اور واضح مصداق امیر المومنین علیہ السلام کی ولایت کا مسئلہ بھی ہے نہ یہ کہ مفہوم اسی میں منحصر ہے۔

قرآن مجید بہت سے مقامات پر ظالموں کو "حسنی نمونے" دکھاتا ہے لہٰذا یہاں پر بھی انہیں گذشتہ اقوام کے حالات کا مطالعہ کرنے کی دعوت دیتے ہوئے فرماتا ہے: تو کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں، تاکہ دیکھتے کہ جو لوگ ان سے پہلے تھے ان کا کیا انجام ہوا، وہی جنہوں نے کفر و سرکشی کی راہیں اختیار کیں اور خدا نے انھیں ہلاک کر دیا (افلم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبۃ الذین من قبلھم دمّر اللہ علیھم)۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان انہی آیات کے ذیل میں۔

وہ یہ گمان نہ کریں کہ اس قسم کا دردناک انجام گذشتہ اقوام کے سرکش لوگوں کے لیے مخصوص تھا اور وہ بچ جائیں گے، نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے" مشرکین اور کفار کے لیے بھی اس قسم کی سزا ہوگی" (وللکافرین امثالھا)۔ [1]

وہ اس بات کی توقع ہرگز نہ رکھیں کہ ان جیسے کردار کا مظاہرہ بھی کریں گے اور ان جیسے انجام سے دوچار بھی نہیں ہوں گے، انہیں چاہیئے کہ گزشتہ لوگوں کے آثار بھی دیکھیں اور اپنے مستقبل اور انجام کا بھی ان کی زندگی کے آئینے میں مشاہدہ کریں۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ "دمر" "تدمیر" کے مادہ سے ہے، جس کا اصل معنی "ہلاک کرنا" ہے، لیکن جب "علیٰ" کے ساتھ مذکور ہو تو اس کا معنی ہر چیز کو حتی کہ انسان کا اپنی اولاد، خاندان اور مخصوص اموال کو ملیامیٹ اور نیست و نابود کرنا ہوتا ہے۔ [2] اس طرح سے یہ تعبیر ایک بہت بڑی دردناک مصیبت کی نشاندہی کر رہی ہے اور خاص کر جب لفظ "علیٰ" پر توجہ مرکوز کی جائے کہ جو کسی کام پر تسلط اور غلبہ کے لیے استعمال ہوتا ہے، تو اب پورے جملے کا مفہوم یہ ہوگا کہ خدا نے ان اقوام پر، ان کے اموال پر اور ان کی تمام پسندیدہ چیزوں پر ہلاکت اور تباہی و بربادی کو گرا دیا۔

"زمین میں چلنے پھرنے" کے بارے میں ہم نے تفسیر نمونہ جلد سوم (سورۂ آل عمران کی ۱۳۷ ویں آیت) کے ذیل میں تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ اسی طرح سولہویں جلد میں اس ضمن میں بات کی گئی ہے۔

اسی سلسلے کی آخری آیت میں خدا نے مؤمنین کو اپنی مکمل حمایت کی یقین دہانی کرواتے ہوئے سرکش کفار کی نابودی کی خبر دی ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ خدا ایمان داروں کا مولا اور سرپرست ہے، لیکن کافروں کا کوئی مولا نہیں ہے۔ (ذالک بان اللہ مولی الذین اٰمنوا وان الکافرین لا مولیٰ لھم)۔ [3]

"مولیٰ" بمعنی "ولی"، سرپرست، دوست اور مددگار ہے۔ تو اس لحاظ سے خدا نے مومنین کی ولایت، سرپرستی اور امداد کو اپنے ذمہ لے لیا ہے اور کافروں کو اس اپنی ولایت کے دائرے سے نکال دیا ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ جو لوگ اس کی ذات پاک کی ولایت کے زیر سایہ ہوتے ہیں، خدا ان کے ہر آڑے وقت میں مدد فرماتا ہے اور ثبات قدمی عطا فرماتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ اپنے گوہر مراد کو پا لیتے ہیں، لیکن جو لوگ اس دائرے سے خارج ہوتے ہیں ان کے اعمال کو اکارت کر دیتا ہے اور انجام کار وہ ہلاکت سے دوچار ہوتے ہیں۔

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ زیر تفسیر آیت میں اللہ کو صرف "مومنین کا مولا" کی حیثیت سے ذکر کیا گیا ہے، جب کہ دوسری بعض آیات میں کافروں کا مولا بھی بتایا گیا ہے، مثلاً سورۂ یونس کی تیسویں آیت میں ہے۔

"وردوا الی اللہ مولاھم الحق وضل عنھم ما کانوا یفترون۔"

---

[1] "امثالھا" کی ضمیر "عاقبۃ" کی طرف لوٹ رہی ہے، جو پہلے جملے سے سمجھی جاتی ہے۔

[2] تفسیر روح المعانی، تفسیر روح البیان اور تفسیر فخر الرازی۔

[3] "ذالک" کا مشار الیہ مومنین کا نیک انجام اور کفار کا برا انجام ہے جن کی طرف گذشتہ آیات میں اشارہ ہو چکا ہے۔

"وہ اپنے حقیقی مولا خدا کی طرف لوٹائے جائیں گے اور جن بتوں کو وہ جھوٹ سے خدا کا شریک گردانتے تھے وہ غائب اور نابود ہو جائیں گے۔"

اگر ایک نکتے کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ ایک بات واضح ہو جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا کی "ولایت عامہ" یعنی خالق اور مدبر ہونا سب کے لیے ہے، لیکن اس کی "ولایت خاصہ" کہ جس میں اس کی طرف سے حمایت بھی شامل ہے، صرف مومنین کے شاملِ حال ہوتی ہے۔ [1]

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ آیت قرآن کی تمام دوسری آیات سے زیادہ امید بخش ہے یعنی "ارجی آیۃ فی القرآن" ہے۔ کیونکہ یہ تمام مومنین ہیں، خواہ وہ عالم ہیں یا جاہل، زاہد ہیں یا راغب، چھوٹے ہیں یا بڑے، مرد ہیں یا عورت اور بوڑھے ہیں یا جوان، یہ آیت ان سب مومنین کے لیے پروردگار عالم کی خاص عنایت اور حمایت کی نشاندہی کرتی ہے، حتیٰ کہ گناہگار مومنوں کو بھی اس سے مستثنیٰ نہیں کرتی۔ خدا سخت سے سخت حوادث اور جانکاہ مصائب میں اپنی حمایت کے نمونے دکھا چکا ہے اور ہر شخص اپنی زندگی میں اس چیز کو ضرور محسوس کرتا ہے اور تاریخ میں بھی اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی جنگ سے واپسی پر ایک درخت کے نیچے اکیلے بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ایک مشرک نے تلوار نیام سے نکال کر آپ پر تان کر کہا:

"من یخلصک منی"

"اب بتاؤ کہ تمہیں مجھ سے کون بچا سکتا ہے؟"

تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے برجستہ فرمایا: اللہ! یہ سن کر اس مشرک کے پاؤں ڈگمگا گئے۔ وہ زمین پر گر پڑا اور تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

رسول اللہؐ نے وہ تلوار اٹھا کر فرمایا: "اب تم بتاؤ کہ تمہیں میرے ہاتھوں سے کون چھڑا سکتا ہے"؟ تو اس نے کہا، کوئی نہیں! یہ کہا اور ایمان لے آیا۔ [2]

جی ہاں! خدا تمام مومنین کا مولا ہے اور کفار کا نہ تو کوئی مولا ہے اور نہ ہی کوئی پناہ گاہ۔

---

[1] بعض مفسرین مثلاً آلوسی نے تفسیر روح المعانی میں زیر نظر آیت کی تفسیر کے سلسلے میں "مولا" کا معنی "ناصر" اور سورۂ یونس کی آیت جیسی آیات میں مولا کا معنی "مالک" لکھا ہے۔

[2] تفسیر روح البیان جلد ۸ صفحہ ۵۔

۱۲۔ اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ○

۱۳۔ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِىَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ ۚ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ○

۱۴۔ اَفَمَنْ كَانَ عَلٰي بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْۗءُ عَمَلِهٖ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَاۗءَهُمْ ○

ترجمہ

۱۲۔ خدا ان لوگوں کو جو ایمان لے آئے اور اچھے اچھے کام کرتے رہے، بہشت کے ان باغات میں پہنچا دے گا، جن کے نیچے نہریں جاری ہیں اور جو کافر ہیں وہ دُنیا کی جلد ختم ہونے والی متاع سے استفادہ کرتے ہیں اور چوپایوں کے مانند کھاتے ہیں اور آخر ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔

۱۳۔ اور جس شہر نے تجھے نکال دیا، کتنے شہر تھے جو اس سے زیادہ طاقت ور تھے کہ جنہیں ہم نے تباہ و برباد کر دیا اور کوئی ان کا مددگار بھی نہیں تھا۔

۱۴۔ تو کیا جو شخص اپنے پروردگار کی طرف سے روشن دلیل رکھتا ہو اس شخص کے برابر ہو

سکتا ہے، جس کی بداعمالیاں اسے بھلی کر کے دکھائی گئی ہوں اور وہ اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی کرتا ہو؟۔

تفسیر

مؤمنین اور کفار کا انجام:

گذشتہ آیات میں حق و باطل اور ایمان و کفر کی مسلسل آویزش کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے۔ اب ان آیات میں ایک واضح تقابل کے ذریعے مومنین اور کفار کا انجام بیان کیا جارہا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ دونوں گروہ دنیا ہی کی زندگی میں ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہیں، بلکہ آخرت میں بھی ان کی زندگی میں زبردست فرق ہوگا۔ ارشاد ہوتا ہے: خدا ان لوگوں کو جو ایمان لے آئے اور اچھے اچھے کام کرتے رہے بہشت کے ان باغات میں پہنچا دیگا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں (ان اللہ یدخل الذین آمنوا وعملوا الصالحات جنات تجری من تحتها الانهار)۔

جبکہ کافر لوگ دنیا کی زود گزر متاع سے استفادہ کرتے ہیں اور چوپایوں کے مانند کھاتے ہیں اور آخران کا ٹھکانا جہنم ہے (والذین کفروا یتمتعون ویأکلون کما تأکل الانعام والنار مثوی لهم)۔[1]

یہ ٹھیک ہے کہ دونوں قسم کے لوگ اسی دنیا میں رہ رہے ہیں اس کی نعمتوں سے بہرہ مند بھی ہو رہے ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ مومنین کی زندگی کا مقصد ایسے اعمال صالح کی بجاآوری ہے جو مفید، تعمیری اور رضائے الٰہی کے حصول کا سبب ہوتے ہیں، جبکہ کفار کی زندگی کا اصل مقصد صرف کھانا پینا اور سونا اور دنیاوی لذتوں سے لطف اندوز ہونا ہوتا ہے۔

مومنین کا ہر ایک اقدام معرفت پر مبنی ہوتا ہے، جب کہ کفار بے مقصد زندگی گزارتے ہیں اور بے مقصد موت کو اختیار کرتے ہیں بالکل ویسے ہی جیسے چوپائے ہوتے ہیں۔

مومنین نے دنیاوی زندگی میں اپنے لیے بہت سی شرائط اور حدیں عائد کر رکھی ہیں۔ وہ دنیاوی امور کے جواز حصول اور مصرف کی کیفیت کے سلسلے میں بڑی سوچ بچار سے کام لیتے ہیں، لیکن کفار چوپایوں کے مانند ہوتے ہیں جنہیں اس بات کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ یہ چارہ ان کے مالک کا ہے یا غصبی؟ کسی یتیم اور بیوہ کا اس میں حق ہے یا

---

[1] "کما یأکل ..." ایک مقدر مفعول مطلق کے مقام نصب پر ہے۔ اصل میں یوں ہے "یأکلون اکلا کما یأکل الانعام"۔

یا نہیں۔

مؤمنین جب کسی دنیاوی نعمت سے استفادہ کرتے ہیں تو اس کے عطا کرنے والے کے بارے میں سوچتے ہیں، اس نعمت میں اُس کی آیات کو دیکھتے ہیں اور منعم حقیقی کا شکر بجالاتے ہیں۔ جب کہ کفار کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ بے سوچے سمجھے اور کسی چیز کے بارے میں سوچے بغیر اس سے لُطف اندوز ہوتے ہیں اور ہمیشہ اپنے ظلم و گناہ کے بوجھ میں اضافہ کرتے رہتے ہیں، خود کو ہلاکت کے نزدیک کرتے رہتے ہیں بالکل ویسے ہی جیسے کوئی موٹی تازہ بکری جتنا زیادہ کھاتی جاتی ہے اتنا ہی زیادہ موٹی ہوتی جاتی ہے اور ذبح ہونے کے زیادہ قریب ہوتی جاتی ہے۔

بعض مفسرین نے ان دونوں گروہوں کا باہمی فرق ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"ان المؤمن لا یخلوا اکلہ عن ثلاث: الورع عند الطلب، واستعمال الادب، والاکل للسبب، والکافر یطلب للنھمۃ، ویأکل للشھوۃ وعیشہ فی غفلۃ"

"مؤمن کا کھانا تین صورتوں سے خالی نہیں ہوتا، کھانے کے حصول میں پرہیزگاری، ادب کو کام میں لانا اور مصرف میں مقصد کو پیش نظر رکھنا، جب کہ کافر کی طلب روزی غیر مشروط، اس کا کھانا شہوت کے لیے اور اس کی تمام زندگی غفلت میں گزرتی ہے۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ مؤمنین کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ "خدا انہیں بہشت کے باغوں میں پہنچا دیگا" لیکن کفار کے متعلق فرمایا گیا ہے "ان کا ٹھکانا جہنم ہے" پہلی تعبیر اہل ایمان کے احترام اور ان کی طرف توجہ کی غماز ہے۔ جب کہ دوسری تعبیر کفار کی تحقیر اور ان سے بے اعتنائی کی آئینہ دار ہے کیونکہ وہ خدا کی ولایت کے دائرے سے نکل چکے ہیں۔

بعض مفسرین نے "والنار مثوی لھم" (جہنم کی آگ ان کا ٹھکانا ہے) کے جملے سے یہ سمجھا ہے کہ وہ اس وقت بھی جہنم میں ہیں۔ ان کے بقول کیونکہ یہ جملہ فعل مضارع اور مستقبل کی صورت میں نہیں ہے بلکہ حال کی خبر دے رہا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کیونکہ ان کے اپنے کردار اور کرتوت ہی آگ ہیں جس میں وہ گرفتار ہیں اور وہ انھیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے ہر چند کہ یہ حیوان صفت لوگ اس چیز سے غافل اور بے خبر ہیں چنانچہ ہم سورۂ توبہ کی آیت ۴۹ میں پڑھتے ہیں:

"وان جھنم لمحیطۃ بالکافرین"

"جہنم نے کافروں کو ہر طرف سے گھیرا ہوا ہے"

قرآن مجید کی کچھ اور آیات میں بھی ان جہنمیوں کو چوپایوں سے تشبیہ دی گئی ہے، بلکہ انہیں ان سے بھی بدتر گردانا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

"اولئک کالانعام بل ھم اضل اولئک ھم الغافلون" (اعراف/۱۷۹)

"یہ لوگ چوپایوں کے مانند ہیں، بلکہ ان سے بھی بدتر یہ غافل لوگ ہیں۔

اس کی مفصل تشریح ہم تفسیر نمونہ کی ساتویں جلد کے ابتدائی حصے میں پیش کر چکے ہیں۔

اس مقصد کی تکمیل کے لیے بعد کی آیت میں مشرکین مکہ اور سابقہ دور کے بت پرستوں کے درمیان ایک تقابلی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے اور واضح لفظوں میں انہیں سخت تنبیہ کی جا رہی ہے اور ضمنی طور پر ان کے ان بعض جرائم کو بیان کیا جا رہا ہے جو جنگ کا جواز فراہم کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: "اور جس شہر سے لوگوں نے تجھے نکال دیا ہے اس سے زیادہ قوی بہت سے شہر تھے، جن کو ہم نے تباہ و برباد کر دیا، جبکہ کوئی ان کا مددگار نہیں تھا (وکاین من قریۃ ھی اشد قوۃ من قریتک التی اخرجتک اھلکناھم فلا ناصر لھم)۔

وہ یہ گمان نہ کریں کہ چند روزہ دنیا ان کے کچھ کام آئے گی، اس لیے وہ اس قدر جسور اور جری ہو چکے ہیں کہ خدا کے عظیم رسولؐ کو مقدس ترین شہر سے نکال دیا ہے۔ وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ صورت حال ہمیشہ یونہی رہے گی، نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے یہ لوگ قوم عاد و ثمود، فراعنہ مصر اور ابرہہ کے لشکر کے مقابلے میں تو بہت ہی کمزور اور ناتوان ہیں، خدا نے تو اُن کو بھی نابود کر دیا تھا، اور انھیں تہس نہس کر دیا تھا، ان کی سرکوبی تو معمولی بات ہے۔

ابن عباس سے ایک روایت منقول ہے کہ جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ سے غار ثور کی طرف جا رہے تھے تو آپؐ نے مکہ کی طرف منہ کر کے کہا:

"انت احب البلاد الی اللہ وانت احب البلاد الیّ ولولا المشرکون اھلک اخرجونی لما خرجت منک"

تو خدا کے نزدیک بھی محبوب ترین شہر ہے اور میرے نزدیک بھی محبوب ترین شہر ہے اگر تیرے رہنے والے مشرک لوگ مجھے نہ نکالتے تو میں اپنی مرضی سے کبھی نہ نکلتا۔"

اسی موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی (جس میں پیغمبر کو نصرت الٰہی کی خوشخبری دی گئی ہے اور مشرکین کو سزا کے لیے متنبہ کیا گیا ہے)۔[1]

اس شانِ نزول کے مطابق یہ آیت مکہ میں نازل ہوئی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ شانِ نزول سورۂ قصص کی ۸۵ ویں آیت سے متعلق ہے اور بہت سے مفسرین نے اسے وہیں پر ذکر کیا ہے اور اس کی زیادہ مناسبت بھی اسی آیت کے ساتھ معلوم ہوتی ہے، جس میں فرمایا گیا ہے:

"ان الذی فرض علیک القرآن لرادک الی معاد"

"جس خدا نے تجھ پر قرآن فرض کیا ہے وہی تجھے تیری (ولادت کی) جگہ لوٹائے گا۔"[2]

یہاں پر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ آنحضرتؐ کو باہر نکال دینے کی نسبت شہر مکہ کی طرف دی گئی ہے جبکہ

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۹ صفحہ ۶۰۵۵۔

[2] اس بارے میں مزید تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۱۶ میں ملاحظہ فرمائیے (مذکورہ آیت کی تفسیر کے ذیل میں)

نکالنے والے اہالیان شہر تھے۔ یہ ایک لطیف کنایہ ہے، جو اس شہر پر ایک خاص گروہ کے تسلط کو بیان کرتا ہے۔ اس طرح کے کنایئے قرآن مجید کی اور بھی آیات میں ذکر ہوئے ہیں۔

ضمنی طور پر ہم پھر یہ بتاتے چلیں کہ لفظ "قریۃ" شہر اور آبادی کے لیے بولا جاتا ہے نہ کہ "گاؤں" کے معنی میں ہے اور اس بات کو ہم پہلے بھی کئی مقامات پر بیان کر چکے ہیں۔

اسی سلسلے کی آخری آیت میں مومنین اور کفار کے درمیان ایک اور تقابل کو پیش کیا گیا ہے۔ ان دونوں گروہوں کا آپس میں ہر چیز میں فرق ہے۔ ایک گروہ ایمان پر قائم اور اعمال صالح پر کاربند ہے، جب کہ دوسرا گروہ پورے طور پر حیوانی زندگی گزار رہا ہے۔ ایک پروردگار کی ولایت کے زیر سایہ رہ رہا ہے اور دوسرا بے مولا اور بے سرپرست ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: تو کیا جو شخص اپنے پروردگار کی طرف سے روشن دلیل پر ہو اس شخص کے برابر ہو سکتا ہے، جس کی بداعمالیاں اسے بھلی کر کے دکھائی گئی ہوں اور وہ اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی کرتا ہو۔ (افمن کان علی بینۃ من ربہ کمن زین لہ سوء عملہ واتبعوا اھوائھم)۔

پہلے گروہ نے اپنے راستے کو پا لیا ہے اور وہ صحیح معرفت، یقین، دلیل، اور قطعی برہان کے ساتھ اس پر گامزن ہے اپنے راستے اور مقصد کو واضح طور پر دیکھ رہا ہے اور اس کی طرف رواں دواں ہے، جبکہ دوسرا گروہ غلط پہچان اور حقائق کے عدم ادراک کا شکار ہے اور اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہے راہ سے بھٹک کر منزل مقصود سے کوسوں دور ہے۔ اس بھٹکنے کا اصل سبب سرکش نفس کی خواہشات کی اتباع ہے کیونکہ خواہشات نفسانی انسان کی عقل و فکر پر پردے ڈال دیتی ہیں۔ اچھائیوں کو برائیاں اور برائیوں کو اچھائیاں بنا کر پیش کرتی ہیں۔ حتی کہ بعض اوقات سرکش نفس کا تابع انسان اپنے ناپاک اور شرم آور کردار پر فخر و مباہات کرنے لگتا ہے، جیسا کہ سورۂ کہف کی ۱۰۳ تا ۱۰۵ آیات میں ہے:

"قل ھل ننبئکم بالاخسرین اعمالا الذین ضل سعیھم فی الحیوۃ الدنیا وھم یحسبون انھم یحسنون صنعا اولئک الذین کفروا بآیات ربھم ولقائہ فحبطت اعمالھم فلا نقیم لھم یوم القیامۃ وزنا"

"کہہ دے: کیا ہم تمہیں ایسے لوگوں کے بارے میں بتائیں کہ جو سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے ہیں؟ یہ وہی لوگ تو ہیں کہ دنیاوی زندگی کے لیے جن کی سعی و کوشش کا کچھ حاصل نہیں اور پھر بھی وہ یہی سمجھتے ہیں کہ وہ اچھے کام انجام دے رہے ہیں، وہی تو ہیں جو اپنے رب کی آیات اور اس کی ملاقات کے منکر ہیں، اسی لیے تو ان کے اعمال اکارت جائیں گے اور قیامت کے دن ہم ان کے لیے میزان اور ترازو قائم نہیں کریں گے۔ (کیونکہ ان کے اعمال میں کوئی وزن نہیں ہوگا۔)

"بینۃ" آشکار اور روشن دلیل کے معنی میں ہے اور یہاں پر قرآن مجید پیغمبر اکرم کے معجزات اور دوسرے عقلی دلائل

کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

ظاہر ہے کہ "افمن کان ....." میں استفہام "استفہام انکاری" ہے یعنی یہ دونوں گروہ آپس میں ہرگز برابر نہیں ہو سکتے۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان نفس پرستوں کے بُرے اعمال کو کون بھلا بنا کر پیش کرتا ہے؟ خود وہ آپ یا خدا، یا شیاطین؟ تو جواب یہ ہے کہ سب کے سب! کیونکہ قرآنی آیات میں ان تینوں کی طرف نسبت دی گئی ہے۔ سورۂ نمل کی چوتھی آیت میں فرمایا گیا ہے:

"ان الذین لا یؤمنون بالاٰخرة زینّا لھم اعمالھم"

"جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ہم ان کے اعمال کو ان کی نگاہوں میں مزین کر دیتے ہیں"۔

دوسری متعدد آیات بشمول سورۂ عنکبوت کی ۳۸ ویں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ شیطان نے ان کے اعمال کو بنا سنوار کر پیش کیا ہے۔

"وزین لھم الشیطان اعمالھم"

اور زیر تفسیر آیت میں "واتبعوا اھوائھم" کے جملے کے پیش نظر یہ زینت ان کی خواہشات نفسانی کی اتباع کی وجہ سے ہوتی ہے اور یہ بات مکمل طور پر قابل فہم ہے کہ خواہشات نفسانی کی اتباع انسان سے ادراک اور تشخیص کی صلاحیت سلب کر لیتی ہے۔

البتہ اس کی شیطان کی طرف نسبت بھی صحیح ہے کیونکہ وہ نفسانی خواہشات کو بھڑکاتا اور انسان کو ہمیشہ وسوسوں میں ڈالتا رہتا ہے۔

اور اگر اس کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے تو اس لیے کہ وہ "مسبب الاسباب" ہے اور ہر سبب کا جو اثر ہوتا ہے وہ اسی کی جانب سے ہے۔ اسی نے آگ کو تپش عطا کی ہے اور خواہشات نفسانی کو حقائق پر پردہ ڈالنے کی تاثیر بھی نیز وہ اس تاثیر کے بارے میں بتا بھی چکا ہے۔ تو اس طرح سے ساری ذمہ داری خود انسان پر عائد ہوتی ہے۔

بعض مفسرین نے "افمن کان علیٰ بیّنة من ربہ" کو پیغمبرؐ کی طرف اشارہ سمجھا ہے اور بعد کے جملے کو کفارِ مکہ کی طرف۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ آیت کا وسیع معنی ہے اور یہ مفاہیم اس کے مصداق ہیں۔

۱۵۔ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ فِیْهَاۤ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَیْرِ اٰسِنٍ ۚ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ یَتَغَیَّرْ طَعْمُهٗ ۚ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِیْنَ ۚ۬ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّی ؕ وَ لَهُمْ فِیْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَ مَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ؕ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِی النَّارِ وَ سُقُوْا مَآءً حَمِیْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ ○

ترجمہ

۱۵۔ جس بہشت کا پرہیزگاروں سے وعدہ کیا گیا ہے اس کی صفت یہ ہے کہ اس میں صاف و شفاف پانی کی نہریں ہیں کہ جن میں بدبو نہیں ہے اور دودھ کی نہریں ہیں جن کا مزا تک نہیں بدلا اور شراب (طہور) کی نہریں ہیں جو پینے والوں کے لیے لذّت ہی لذّت ہیں، اور صاف و شفاف شہد کی نہریں ہیں اور وہاں ان کے لیے ہر قسم کے پھل ہیں اور (ان سب سے بڑھ کر) ان کے پروردگار کی طرف سے بخشش ہے۔ بھلا یہ لوگ ان کے برابر ہو سکتے ہیں جو ہمیشہ دوزخ کی آگ میں رہیں گے اور انہیں کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا تو وہ ان کی آنتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے گا۔

تفسیر

بہشت کی ایک اور صفت:

یہ آیت گذشتہ آیات کے مانند کافر اور مومن دونوں گروہوں کے اوصاف بیان کر رہی ہے۔ ایک گروہ کے شرم ناک اور بُرے اعمال ہیں جو ان کی نظر میں بھلے معلوم ہوتے ہیں اور دوسرے کے نیک اور صالح۔

اس آیت میں اہل بہشت کی چھ قسم کی نعمتوں اور اہل دوزخ کے دو قسم کے سخت اور دردناک عذاب کا تذکرہ کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ان کے انجام کو واضح کیا گیا ہے۔

اہل بہشت کی نعمتوں میں چار نہروں کا نام لیا گیا ہے، جن میں سے ہر ایک ایک خاص چیز کی ہے اور ہر ایک کا اپنا مزہ ہے، پھر بہشت کے پھلوں کا ذکر ہے اور آخر میں روحانی نعمتوں کا تذکرہ ہے۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: جس بہشت کا پرہیزگاروں سے وعدہ کیا گیا ہے اس کی صفت یہ ہے کہ اس میں صاف و شفاف پانی کی نہریں ہیں جن میں بدبو نہیں ہے (مثل الجنۃ التی وعد المتقون فیھا انھار من ماء غیر اٰسن)۔[1]

"اٰسن" کا معنی "بدبو" ہے، لہٰذا "ماء غیر اٰسن" کا معنی ہوگا، وہ پانی جو مدتوں رہنے کے باوجود بدبودار نہیں ہوتا۔ یہ بہشت کی نہروں کی وہ پہلی قسم ہے جس کا پانی صاف و شفاف، خوشبودار اور خوش ذائقہ ہے۔

پھر فرمایا گیا ہے: اور دودھ کی نہریں ہیں جن کا مزہ تک نہیں بدلا (وانھار من لبن لم یتغیر طعمہ)۔

اصولی طور پر بہشت ایک ایسا مقام ہے، جہاں پر نہ تو کسی چیز کے بگڑنے کا اندیشہ ہے نہ ہی خراب ہونے کا۔ یہ تو اس مادی دُنیا کا خاصہ ہے جس میں مختلف قسم کے جراثیم ہوتے ہیں جو غذا کو خراب کر دیتے ہیں۔

اس کے بعد بہشت کی تیسری قسم کی نہروں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اور شراب (طہور) کی نہریں ہیں جو پینے والوں کے لیے لذت ہی لذت ہیں (وانھار من خمر لذۃ للشاربین)۔

آخر میں بہشت کی چوتھی قسم کی نہر کا حال اس صورت میں بیان فرمایا گیا ہے: اور صاف و شفاف شہد کی نہریں

---

[1] اس آیت کی تفسیر میں مفسرین کے مختلف اقوال ملتے ہیں۔ سب سے مناسب قول یہی ہے کہ "مثل الجنۃ" مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے، جو تقدیری طور پر یوں ہے "مثل الجنۃ التی وعد المتقون جنۃ فیھا انھار" درحقیقت یہ آیت سورۂ رعد کی ۳۵ ویں آیت سے ملتی جلتی ہے، جس میں کہا گیا ہے:

"مثل الجنۃ التی وعد المتقون تجری من تحتھا الانھار"

ہیں (وانھار من عسل مصفّی)۔

ان گوناگوں نہروں جن میں سے ہر ایک علیحدہ مقصد کے لیے پیدا کی گئی ہے کے علاوہ پانچویں نعمت کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے اور وہ ہے بہشت کے مختلف النوع پھل۔ ارشاد فرمایا گیا ہے: اور وہاں ان کے لیے ہر قسم کے پھل ہیں (ولھم فیھا من کل الثمرات)۔[1]

طرح طرح کے پھل مختلف ذائقے اور مختلف خوشبو کے ساتھ، جن کا ہم تصور کر سکتے ہیں یا ہمارے تصور سے باہر ہیں سب کے سب بہشت والوں کو عطا ہوں گے۔

آخر میں خدا کی چھٹی نعمت کا تذکرہ ہے جو گذشتہ مادی نعمتوں سے ہٹ کر ہے اور روحانی حیثیت کی حامل ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ان کے لیے ان کے پروردگار کی طرف سے بخشش ہے (ومغفرۃ من ربھم)۔

ایک عظیم اور وسیع رحمت جو ان کی تمام لغزشوں کو چھپا رہی ہوگی اور انہیں روحانی تسکین عطا کر رہی ہوگی، اور بارگاہ ربّ العزت کا محبوب بنا رہی ہوگی اور "رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ ذالک الفوز العظیم (خدا ان سے راضی اور وہ خدا سے راضی) اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ (مائدہ 119) کا مصداق بنا رہی ہیں۔

تو اس طرح سے پاک باز اور صالح العمل مؤمنین بہشت بریں میں خدا کی ہر طرح کی مادی اور روحانی نعمتوں سے اس کے جوار میں رہ کر بہرہ مند ہوں گے۔

اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ ان کا مقابل گروہ کس انجام سے دوچار ہوگا؟ تو اسی آیت میں اسے بھی بیان فرمایا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: بھلا یہ لوگ ان کے برابر ہو سکتے ہیں جو ہمیشہ دوزخ کی آگ میں رہیں گے اور انھیں کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا، تو وہ انکی آنتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے گا (کمن ھو خالد فی النار وسقوا ماءً حمیمًا فقطع امعاءھم)۔[2]

"امعاء" جمع ہے "معی" (بروزن "سعی") کی، اور "معا" (بروزن "غنا") کا معنی آنت ہے اور کبھی اس کا اطلاق شکم کے اندر موجود تمام چیزوں پر بھی ہوتا ہے اور ان کا ٹکڑے ٹکڑے ہونا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جہنم کا یہ وحشت ناک مشروب اس قدر گرم ہوگا کہ پیٹ میں موجود تمام چیزوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے گا۔

---

[1] اس جملے کا ایک محذوف ہے جو تقدیری صورت میں یوں ہے۔
"لھم فیھا انواع من کل الثمرات"

[2] اس آیت کی تفسیر میں بھی مختلف اقوال ملتے ہیں اور ان سب میں مناسب تر یہی ہے کہ کہا جائے کہ اس آیت میں ایک مقدار ہے جس کی اصلی اور تقدیری صورت یوں ہے۔
"افمن ھو خالد الجنۃ التی ھذہ صفاتہ کمن ھو خالد فی النار"

چند نکات

۱۔ بہشت کی چار نہریں: قرآنی آیات سے یہ بات بخوبی سمجھی جاسکتی ہے کہ بہشت میں مختلف قسم کی نہریں اور چشمے ہیں، جن میں سے ہر ایک کا اپنا فائدہ اور اپنا لطف و مزہ ہے، جن میں سے چار کا نمونہ تو مندرجہ بالا آیت میں پیش کیا گیا ہے اور باقی کے نمونے انشاء اللہ سورۂ دہر کی تفسیر میں بیان ہوں گے۔

ان چار قسم کی نہروں کو "انہار" کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک نہر نہیں بلکہ کئی کئی "نہریں" ہونگی۔

ہم پہلے بھی کئی مرتبہ بتا چکے ہیں کہ بہشت کی نعمتیں ایسی ہیں جنہیں روزمرہ کی دنیاوی زندگی کے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا، الفاظ ان نعمتوں کی کماحقہ تصویر کشی سے قاصر اور عاجز ہیں، بلکہ صرف ان کا ایک ہلکا اور معمولی سا خاکہ پیش کرسکتے ہیں۔

زیر تفسیر آیت میں بہشت کی چار پانی، دودھ، شراب طہور، اور شہد کی نہروں کا ذکر کیا گیا ہے، ممکن ہے پہلی نہر پیاس دور کرنے کے لیے، دوسری خوراک کے حصول کے لیے، تیسری نشاط اور فرحت بخشنے کے لیے اور چوتھی لذت و قوت پیدا کرنے کے لیے ہو۔

یہ بات بھی جاذب توجہ ہے کہ قرآن کی دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام اہل بہشت ان تمام نہروں سے سیراب نہیں ہوں گے، بلکہ مراتب اور منصب کے لحاظ سے ان سے بہرہ ور ہوں گے۔ جیسا کہ سورۂ مطففین کی ۲۸ ویں آیت میں ہم پڑھتے ہیں:

"عینا یشرب بها المقربون"

"ایسا چشمہ ہے جس سے مقربین بارگاہ الٰہی پانی پئیں گے"۔

۲۔ شراب طہور: واضح سی بات ہے کہ بہشت کی شراب کا اس دنیا کی غلیظ اور نجس شراب سے کسی قسم کا کوئی رابطہ اور واسطہ نہیں ہے، جیسا کہ قرآن مجید ایک اور مقام پر اس شراب بہشت کی یوں تعریف کرتا ہے۔

"لا فیها غول ولا هم عنها ینزفون"

"وہ شراب ایسی ہے، جس سے نہ تو عقل خراب ہوتی ہے اور نہ مستی کا سبب بنتی ہے"۔

(صافات / ۴۷)

۳۔ خراب نہ ہونے والے مشروبات: بہشت کی نہروں کی ایک مرتبہ تو غیر اسن (اس کی بو نہیں بدلی) کے ساتھ اور دوسری مرتبہ "لم یتغیر طعمه" (اس کا ذائقہ نہیں بدلا) کے ساتھ تعریف و توصیف کی گئی ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ بہشت کے مشروبات اور غذائیں ہمیشہ تر و تازہ رہیں گی۔ پہلے دن کی سی تازگی آخر ایسا کیوں نہ ہو، جب کہ خوراک کا تغیر اور اس میں خرابی جراثیم کی وجہ سے عمل میں آتی ہے، اگر یہ دنیا میں نہ ہوتے تو کسی چیز میں کوئی خرابی پیدا نہ ہوتی اور ہر چیز اپنی اصلی حالت پر باقی رہتی، لیکن چونکہ بہشت خرابی پیدا کرنے والوں کی جگہ نہیں ہے، لہٰذا وہاں ہر چیز پاک، صاف، صحیح و سالم اور تر و تازہ رہے گی۔

۴۔ **پھل کیوں؟** اس آیت میں بھی اور قرآن کی دوسری آیات میں بھی بہشت کی غذاؤں کے تذکرے میں پھلوں کا ذکر لازمی طور پر ہوا ہے، مختلف الانواع پھل جو تمام ذائقوں کا باب ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پھل بہشت کی نہایت اہم غذا ہیں۔ حتّٰی کہ اس دنیا میں بھی انسانی غذاؤں میں سب سے زیادہ صحیح وسالم اور بہترین غذا پھل ہی ہیں۔

۵۔ "**سقوا**": انہیں پلایا جائے گا کی تعبیر فعل مجہول کے ساتھ کی گئی ہے جو اس حقیقت کی غماز ہے کہ ان (جہنمیوں) کو کھولتا اور جلتا پانی زبردستی پلایا جائے گا وہ اپنی خوشی سے نہیں پئیں گے اور جہنم کی اس آگ میں ان کے سیراب ہونے کے بجائے، ان کی آنتوں کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے اور دوزخ کے معمول کے مطابق پھر وہ اپنی اصلی حالت میں آ جائیں گے، کیونکہ وہاں موت نہیں ہے۔

۱۶۔ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ حَتّٰٓى اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَاۗءَهُمْ ○

۱۷۔ وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ ○

۱۸۔ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً ۚ فَقَدْ جَاۗءَ اَشْرَاطُهَا ۚ فَاَنّٰى لَهُمْ اِذَا جَاۗءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ ○

۱۹۔ فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوٰىكُمْ ○

ترجمہ

۱۶۔ ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو تیری طرف کان لگائے رہتے ہیں، لیکن جب تیرے پاس سے نکلتے ہیں تو جن لوگوں کو خدا نے علم و دانش عطا کی ہے، ان سے (بطور مذاق) کہتے ہیں، ابھی اس شخص نے کیا کہا تھا؟ یہ وہی لوگ ہیں جن کے دلوں پر خدا نے مہر لگا دی ہے اور وہ اپنی خواہشات نفسانی کی پیروی کرتے ہیں (لہذا کچھ نہیں سمجھتے)۔

۱۷۔ جو لوگ ہدایت یافتہ ہیں ان کو خدا مزید ہدایت کرتا ہے اور انھیں پرہیز گاری کی

رُوح عنایت فرماتا ہے۔

۱۸۔ تو کیا یہ لوگ بس قیامت کے انتظار میں ہیں کہ ان پر ناگہان آجائے (تو اِس وقت وہ ایمان لائیں گے) حالانکہ اس کی نشانیاں تو آچکی ہیں، لیکن جس وقت وہ آپہنچے گی تو اس وقت ان کی توجّہ اور ایمان انہیں کچھ فائدہ نہ دے گا۔

۱۹۔ پس جان لے کہ اللہ کے سوا کوئی معبُود نہیں اور اپنے گناہ پر اور ایمان دار مردوں اور ایمان دار عورتوں کے لیے استغفار کر اور خداوند تعالیٰ تمھارے چلنے پھرنے اور ٹھہرنے کی جگہ کو جانتا ہے۔

تفسیر

قیامت کی نشانیاں ظاہر ہو چکی ہیں:

یہ آیات وحی الٰہی، آیات قرآنی اور احادیث نبوی کے بارے میں منافقین کی کیفیت کی تصویر کشی اور دشمنانِ اسلام کے ساتھ جنگ و جہاد کے مسئلے کو بیان کر رہی ہیں۔

مدنی سُورتوں میں منافقین کا بہت تذکرہ ملتا ہے جب کہ مکّی سُورتوں میں ایسا نہیں ہے، کیونکہ منافقت اور نفاق کا مسئلہ اسلام کی کامیابی اور اس کے مکمل طور پر مسلط ہو جانے کے بعد پیدا ہُوا، کیونکہ مخالفین کی طاقت کمزور ہو گئی تھی اور وہ کھلم کھلا طور پر اسلام کی مخالفت نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا وہ بظاہر اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اسلام کے دائرے میں آگئے تاکہ اس طرح سے وہ مسلمانوں کے غیظ و غضب سے بچے رہیں، لیکن باطنی طور پر مختلف سازشوں میں مصروف رہے۔ مدینہ کے یہودی جو فوجی اور اقتصادی لحاظ سے بہت طاقت ور تھے وہ بھی منافقین کے پشت پناہ ثابت ہوئے۔

بہرحال، وہ سچے مؤمنین کی صفوں میں گھُس آئے، نماز جمعہ اور دیگر اجتماعات میں رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے، لیکن قرآنی آیات کے مقابلے میں ان کا ردّ عمل ان کے دلوں کی بیماری کا آئینہ دار ہوتا۔

اس لیے زیرِ تفسیر آیات میں سے پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: ان میں سے کچھ لوگ تیرے پاس آتے ہیں،

تیری باتوں کو کان لگا کر سنتے بھی ہیں، لیکن جب تیرے پاس سے نکلتے ہیں تو جن لوگوں کو خدا نے علم و دانش عطا کی ہے ان سے تحقیر اور تمسخر کے انداز میں کہتے ہیں، ابھی اس شخص نے کیا کہا تھا (ومنهم من يستمع اليك حتى اذا خرجوا من عندك قالوا للذين اوتوا العلم ماذا قال انفا)۔

"اس شخص" سے ان کی مراد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات تھی۔

ان لوگوں کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی گوہر بار گفتگو کے بارے میں ردّ عمل، اس قدر تحقیر آمیز، غلط اور نا روا تھا جس سے صاف سمجھا جاتا تھا کہ وہ آسمانی وحی پر بالکل ایمان نہیں رکھتے۔

"انفا" "انف" کے مادہ سے ہے، جس کا معنی ہے "ناک" اور ناک چونکہ انسان کے چہرے پر خاص طور سے ایک نمایاں چیز ہے، لہذا یہ کلمہ کسی قوم کے شریف اور معزز افراد کے لیے استعمال ہوتا ہے اور زمانے کے لحاظ سے اس کا اطلاق زمانہ حال پر ہوتا ہے، جیسا کہ اسی آیت میں ذکر ہوا ہے۔

ضمنی طور پر یہ بھی بتاتے چلیں کہ "للذين اوتوا العلم" کی تعبیر اس بات کی نشاں دہی کر رہی ہے کہ مومنین کی علامت ان کا کافی حد تک علم کا حامل ہونا بھی ہے، کیونکہ علم ہی ایمان کا سرچشمہ ہوتا ہے اور ایمان ہی کی وجہ سے علم حاصل ہوتا ہے۔

لیکن آیت کے آخر میں قرآن مجید ان (کفار) کو دندان شکن جواب دیتے ہوئے فرماتا ہے: رسولؐ کی باتوں میں نہ تو کسی قسم کی پیچیدگی ہوتی ہے اور نہ ہی بے معنی ہوتی ہیں، بلکہ یہ لوگ خود ایسے ہیں جن کے دلوں پر خدا نے مہر لگا دی ہے اور وہ اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں، لہذا انھیں کچھ سمجھ نہیں آتا (اولئك الذين طبع الله على قلوبهم واتبعوا اهواءهم)۔

درحقیقت دوسرا جملہ پہلے جملے کی علت ہے۔ یعنی خواہشات نفسانی کی پیروی انسان سے حقائق کے ادراک کی طاقت اور تشخیص کی صلاحیت سلب کر لیتی ہے اور اس کے دل پر پردہ ڈال دیتی ہے، گویا خواہش پرستوں کے دل اس ظرف کے مانند ہو جاتے ہیں، جس کا منہ بند کر دیا جائے اور اسے سر بمہر کر دیا جائے، نہ تو اس میں کوئی چیز رکھی جا سکتی ہے اور نہ ہی اس سے نکالی جا سکتی ہے۔

ان کے برعکس سچے مومنین ہیں، جن کے بارے میں بعد کی آیت میں گفتگو ہو رہی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

جو لوگ ہدایت یافتہ ہیں انہیں مزید ہدایت کرتا ہے اور انہیں تقوٰے اور پرہیزگاری کی رُوح عطا فرماتا ہے۔

(والذين اهتدوا زادهم هدى واتاهم تقواهم)۔

جی ہاں! انہوں نے ہدایت کیلیے پہلے از خود اقدام کیا، اپنی عقل و خرد اور فطرت سے صحیح معنوں میں کام لیا پھر خدا بھی حسب وعدہ اپنی راہ پر چلنے والے مجاہدوں کی زیادہ سے زیادہ ہدایت اور رہنمائی کرتا ہے، ان کے دلوں میں نورِ ایمان ڈال دیتا ہے اور شرح صدر اور روشن بینی سے انہیں بہرہ مند کرتا ہے۔ یہ تو ہوتا ہے ایمان اور اعتقاد کے لحاظ سے، لیکن عملی لحاظ سے بھی ان میں تقوٰی کی رُوح کو اس حد تک زندہ کرتا ہے کہ انہیں گناہوں سے نفرت ہونے

لگتی ہے اور اطاعت و نیکی سے جنون کی حد تک محبت کرنے لگتے ہیں۔

بعد کی آیت میں مذاق اڑانے والے اس بے ایمان ٹولے کو زبردست تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: تو کیا یہ لوگ بس قیامت ہی کے انتظار میں ہیں کہ ان پر ناگہاں آجائے (تو اس وقت وہ ایمان لائیں گے) حالانکہ اس کی نشانیاں تو آ ہی چکی ہیں۔ لیکن جس وقت قیامت ان کے سر پر آپہنچے گی تو اس وقت ان کے لیے بیداری، توجہ اور ایمان مفید واقع نہیں ہوں گے (فھل ینظرون الّا الساعۃ ان تأتیھم بغتۃ فقد جاء اشراطھا فانّی لھم اذا جاءتھم ذکراھم)۔

جی ہاں! جس وقت ان لوگوں کو ایمان لانا چاہیئے اور وہ ایمان ان کے لیے مفید بھی ہو اس وقت تو ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور حق کے آگے سر تسلیم خم نہیں کرتے بلکہ تمسخر اڑاتے اور ٹھٹھا مذاق کرتے ہیں، لیکن جب ہولناک حوادث اور قیامت کا آغاز دنیا کو لرزہ براندام کر دے گا تو اس قسم کے لوگ وحشت زدہ ہو کر خضوع و خشوع اور ایمان کا اظہار کریں گے، لیکن اس وقت انھیں اس کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔

اس کی مثال یوں سمجھئے، جیسے ہم کسی کو کہیں کہ آیا تم اس انتظار میں ہو کہ وقت ہاتھ سے نکل جائے اور تمہارا مریض موت کے دہانے تک پہنچ جائے، پھر ڈاکٹر اور دوا کا بندوبست کرو؟ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ موقع ہاتھ سے نکل جانے سے پہلے کوئی مفید اور مؤثر قدم اُٹھاؤ۔

"اشراط" "شرط" (بروزن "شرف") کی جمع ہے جس کا معنی علامت ہے بنابریں "اشراط الساعۃ" سے مراد قیامت کے قریب ہونے کی علامتیں ہیں۔

یہاں پر قیامت کے قریب ہونے سے کیا مراد ہے؟ مفسرین نے اس بارے میں تفصیلی بحث کی ہے، حتّٰی کہ اس سلسلے میں بہت سی چھوٹی بڑی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔

لیکن بہت سے لوگ اس بات کے معتقد ہیں کہ زیر تفسیر آیت میں "اشراط الساعۃ" سے مراد خود پیغمبر اسلام کا قیام ہے اور اس کی گواہ خود آپ کی یہ حدیث ہے جس میں آپؐ نے ارشاد فرمایا ہے:

"بعثت انا و الساعۃ کھاتین و ضم السبابۃ والوسطیٰ"

"میری بعثت اور قیامت ان دو کے مانند ہیں" اور پھر آپؐ نے اپنی دو انگلیوں کو ملا کر اشارہ کیا ایک درمیانی انگلی اور دوسری انگشتِ شہادت"۔[1]

بعض مفسرین نے "شق القمر" کے مسئلے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں رونما ہونے والے بعض دوسرے واقعات کو بھی "اشراط الساعۃ" میں شمار کیا ہے۔

اس بارے میں بہت سی حدیثیں بھی وارد ہوئی ہیں، خصوصاً بہت سے گناہوں کا عوام الناس میں عام ہو جانا بھی

---

[1] تفسیر مجمع البیان، تفسیر قرطبی، تفسیر فی ظلال القرآن اور کئی دوسری تفسیریں، انہی آیات کے ذیل میں۔ (تعبیر میں قدرے تفاوت کے ساتھ)

قیامت کے قریب ہونے کی علامات میں شمار کیا گیا ہے۔ جیسا کہ شیخ مفید علیہ الرحمہ نے پیغمبر اسلامؐ کی ایک حدیث "روضۃ الواعظین" میں درج کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"من اشراط الساعۃ ان یرفع العلم، ویظھر الجھل ویشرب الخمر و یفشو الزنا"

"قیامت کی علامتوں میں سے ہے، علم کا اٹھا لیا جانا، جہالت کا آشکار ہو جانا، شراب کا پیا جانا اور زنا کی کثرت۔"[1]

حتیٰ کہ اہم اور موثر واقعات کو بھی "اشراط الساعۃ" میں شمار کیا گیا ہے جیسے امام مہدیؑ (ارواحنا فداہ) کا قیام ہے۔

لیکن یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ہم کبھی تو "اشراط الساعۃ" کے بارے میں بطور مطلق بحث کرتے ہیں کہ قیامت کے نزدیک ہونے کی کیا علامتیں ہیں اور کبھی صرف اور خاص طور پر آیت کے بارے میں۔

آیت کے بارے میں مطلب وہی ہے جو ہم بتا چکے ہیں، لیکن مطلق طور پر قیامت کے نزدیک ہونے کی علامتوں کے بارے میں بڑی حد تک بحث کی گئی ہے اور اس بارے میں بہت سی روایات مشہور اسلامی کتابوں میں درج ہیں اور ہم بھی نکات کی بحث میں اس طرف اشارہ کریں گے۔[2]

کیا پیغمبر اسلامؐ کی بعثت قیامت کے قریب ہونے کی علامت ہے؟

یہاں پر یہ سوال پیش آتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کو کیونکر قرب قیامت کی علامت قرار دیا گیا ہے، جب کہ چودہ سو سال ہے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے، مگر اب تک قیامت کا کچھ پتہ نہیں؟

اس سوال کا جواب ایک نکتے کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ باقی ماندہ دنیا کو اس کے گزشتہ حصے کے تناظر میں دیکھنا چاہیئے اور آئندہ کو گذشتہ سے تقابل کر کے دیکھا جانا چاہیئے اور اس تقابل میں دنیا کا جو حصہ باقی رہ گیا ہے وہ بہت زیادہ نہیں ہے۔ جیسا کہ پیغمبر اسلامؐ کی ایک حدیث میں ہے کہ ایک دن آنحضرتؐ نے عصر کے بعد اور غروب آفتاب سے کچھ پہلے اپنے اصحاب سے خطبہ ارشاد فرمایا اور کہا:

"والذی نفس محمد بیدہ مثل ما مضیٰ من الدنیا فیما بقی منھا الا مثل ما مضیٰ من یومکم ھذا فیما بقی منہ، وما بقی منہ الا الیسیر"

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ صفحہ۔

[2] جو کچھ ہم بتا چکے ہیں اگر اس کو مد نظر رکھا جائے تو معلوم ہوگا "فقد جاء اشراطھا" کے جملے سے یہ مراد نہیں ہے کہ قیامت کی تمام علامات پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں ظاہر ہو چکی ہیں، بلکہ اس سے یہ مراد ہے کہ ان میں سے بعض علامتیں ظاہر ہو چکی ہیں، جو قیامت کے قریب ہونے کی خبر دیتی ہیں ہر چند کہ کچھ اور علامتیں ابھی بعد میں ظاہر ہوں گی۔

"اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں محمدؐ کی جان ہے، جو مدت دُنیا کی گزر چکی ہے اس حصّے کی نسبت جو کچھ باقی رہ گیا ہے اس مقدار کے مانند ہے جو تمہارے آج کے دن کا حصّہ گزر چکا ہے اس حصّے کی نسبت جو کچھ باقی رہ گیا ہے اور تم دیکھ رہے ہو کہ اس دن کا حصّہ تھوڑی سی مقدار سے زیادہ باقی نہیں ہے۔ [1]

اس سلسلے کی آخری آیت ایمان و کفر اور مومنین و کفار کے انجام کے متعلق تمام گفتگو کے نتیجے کے طور پر بیان ہوئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: پس جان لو کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے (فاعلم انہ لا الٰہ الا اللہ)۔

یعنی توحید کی راہ پر قائم رہو کیونکہ شفا عطا کرنے کی دوا اور نجات کا بہترین وسیلہ یہی توحید ہے کہ جس کی علامات اس سے پہلے کی آیات میں بیان ہو چکی ہیں۔

بنابریں اس آیت کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم توحید سے بے خبر تھے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس راہ پر برقرار رہیں اور ثابت قدم۔ بالکل ویسے ہی جیسے سورۂ حمد کی یہ آیت ہے "اھدنا الصراط المستقیم"۔ مفسرین کہتے ہیں کہ اس کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ ہم ہدایت پر نہیں، لہٰذا صراط مستقیم کی ہدایت فرما، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہمیں ہدایت کی راہ پر ثابت قدم رکھ۔

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ امر توحید میں زیادہ غور و فکر سے کام لیا جائے اور اعلیٰ سے اعلیٰ مقامات کی طرف ارتقار کی کوشش کی جائے، کیونکہ یہ ایک ایسا امر ہے کہ جس میں جتنا زیادہ سوچ بچار اور غور و فکر سے کام لیا جائے اور خدا کی آیات کا جتنا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کیا جائے اتنا ہی اعلیٰ سے اعلیٰ مراحل کی طرف ترقی ہوتی جاتی ہے اور گزشتہ آیات میں ایمان اور کُفر کے متعلق جو کچھ بتایا جا چکا ہے اس کے بارے میں تحقیق و جستجو بھی ایمان و کفر کے اضافے کا بذات خود ایک عامل ہے۔

تیسری تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد توحید کا عملی پہلو ہے۔ یعنی آپ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ پوری کائنات میں صرف خدا ہی کی ذات ہے جو پناہ گاہ کی حیثیت رکھتی ہے، لہٰذا اس کی پناہ میں آجائیے اور مشکل کا حل بھی اسی کے پاس ہے لہٰذا اسی سے حل مشکلات کی دُعا کیجیے اور دشمن کی افرادی قوت سے ہرگز نہ گھبرائیے۔

ان تینوں تفسیروں کا آپس میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور ممکن ہے کہ تینوں آیت کے مفہوم میں جمع ہوں۔

عقیدے پر مبنی اس مسئلے کے بیان کے بعد ایک بار پھر تقوٰے اور گناہوں سے پاک ہونے کی بات کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اور اپنے لیے اور ایمان دار مردوں اور ایمان دار عورتوں کے گناہوں پر استغفار کرتے رہو (واستغفر لذنبک وللمؤمنین والمؤمنات)۔

ظاہری بات ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عصمت کی بنا پر ہرگز کسی گناہ کے مرتکب نہیں ہوئے اور اس قسم کی تعبیر

---

[1] تفسیر رُوح المعانی جلد ۲۶ صفحہ ۴۰۔

یا تو "خوب تر" کو چھوڑ کر "خوب" کو اپنانے اور "حسنات الابرار سیئات المقربین" کی طرف اشارہ ہے، یا پھر مسلمانوں کے لیے تنبیہ اور نمونۂ عمل ہے (جب معصوم نبی کو استغفار کا حکم ہے، تم گناہگار تو بطریق اولیٰ استغفار کرنے کے لیے مامور ہیں)۔

ایک روایت میں ہے کہ "حنظلہ یمانی" کہتے ہیں" میں ایک تند زبان شخص تھا اور اپنے گھر والوں سے سخت کلامی سے پیش آتا تھا، رسول اللہ کی خدمت میں عرض کی یا رسول اللہ! مجھے اس بات کا خوف ہے کہ زبان کی یہ تندی مجھے جہنم میں نہ لے جائے! تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"فأین انت من الاستغفار؟ انی لاستغفر اللہ فی الیوم مائة مرة۔"

"تم استغفار سے کیوں غافل ہو؟ حتی کہ خود میں بھی روزانہ سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں"۔ (اور بعض روایات میں ہے ستر مرتبہ)۔ [1]

اگر دوسرے لوگ اپنے گناہوں اور معاصی پر استغفار کرتے ہیں تو پیغمبر اکرمؐ جس لمحے یاد خدا نہ کرسکتے، یا "خوب تر" کے بجائے "خوب" کو انجام دیتے تھے تو استغفار کرتے تھے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ یہاں پر خدا نے مومنین اور مومنات کے لیے شفاعت کی سفارش کی ہے اور اپنے پیغمبر کو ان کیلیے استغفار کا حکم دیا ہے تاکہ اپنی رحمت ان کے شامل حال کرے۔ چنانچہ اس سے دنیا و آخرت میں مسئلہ "شفاعت" کی گہرائی اور مسئلۂ "توسل" کی اہمیت بھی واضح اور آشکار ہو جاتی ہے۔

اس آیت کے ذیل میں علت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، خدا تمہارے چلنے پھرنے اور ٹھہرنے کی جگہ کو جانتا ہے (واللہ یعلم متقلبکم ومثواکم)۔

وہ تمہارے ظاہر و باطن، اندرون و بیرون اور اشارے کنائے کو اچھی طرح جانتا ہے، حتی کہ تمہارے افکار، نیتوں اور حرکات و سکنات سے بھی پوری طرح باخبر ہے۔ اسی لیے تمہیں چاہیئے کہ تم اس کی طرف توجہ کرو اور اس کی بارگاہ سے طلب مغفرت کرو۔

"متقلب" کا معنی آمد و رفت کی جگہ اور "مثوی" کا معنی ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ [2]

ظاہر یہ ہے کہ ان دونوں کلمات کا مفہوم وسیع اور عام ہے، جس میں انسان کی تمام حرکات و سکنات آجاتی ہیں خواہ وہ دنیا میں ہوں یا آخرت میں، شکم مادر میں ہوں یا قبر کے پیٹ میں۔ اگرچہ بہت سے مفسرین نے ان کے محدود معانی بتائے ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ اس سے انسان کی دن کو حرکات اور رات کو سکون مراد ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے دنیا

---

[1] مجمع البیان جلد ۹ صفحہ ۱۰۲ (انہی آیات کے ذیل میں)۔

[2] بنا بریں "منقلب" اسم مفعول ہے جو یہاں پر اسم مکان کے معنی میں ہے، لیکن کچھ اور مفسرین اسے "مصدر میمی" سمجھتے ہیں جس کا معنی ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل ہونا ہے۔ لیکن "مثوی" کے قرینے کے پیش نظر جو کہ مسلم طور پر اسم مکان ہے، پہلا معنی زیادہ مناسب ہے۔

میں چلنے پھرنے کی اور آخرت میں انسان کے ٹھہرنے کی جگہ مراد ہے، بعض کہتے ہیں کہ اس سے انسان کا باپوں کی پشت اور ماؤں کے رحم میں منتقل ہونا اور قبر میں ثبات و قرار مراد ہے اور بعض کہتے ہیں اس سے انسان کا سفر میں حرکت کرنا اور حضر میں آرام کرنا مراد ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں آیت کا مفہوم وسیع اور عام ہے جو مذکورہ تمام تفاسیر کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔

"اشراط الساعۃ" کیا ہیں؟

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ "اشراط" "شرط" کی جمع ہے جس کا معنی "علامت" ہے اور "اشراط الساعۃ" قرب قیامت کی علامتوں کو کہتے ہیں، شیعہ سنی کتابوں میں اس بارے میں بہت سی روایات درج ہیں جب کہ قرآن مجید میں صرف اسی آیت میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اس بارے میں سب سے زیادہ مفصل اور جامع وہ حدیث ہے جو ابن عباس کے بقول حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد کی ہے۔ جس میں بہت سے مسائل ہمارے لیے درس آموز ہیں اور وہ بہت سے نکات کی حامل ہے۔ اسی لیے ہم یہاں پر مکمل حدیث کو نقل کیے دیتے ہیں۔

ابن عباس کہتے ہیں کہ ہم حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرتؐ کے ہمراہ تھے (حجۃ الوداع، اس حج کو کہتے ہیں جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آخری عمر میں ادا کیا تھا) پیغمبرؐ خدا نے خانہ کعبہ کے دروازے کی زنجیر کو پکڑ کر ہماری طرف منہ کر کے ارشاد فرمایا:

"آیا تمھیں "اشراط الساعۃ" سے آگاہ کروں؟"

حضرت سلمان نے جو اس وقت آنحضرتؐ کے سب سے زیادہ نزدیک تھے، عرض کی: ضرور ارشاد فرمایئے یا رسولؐ اللہ!

آپ نے ارشاد فرمایا: قیامت کی نشانیوں میں سے ہے نماز کو ضائع کر دینا شہوتوں کی پیروی کرنا، خواہشات نفسانی کی طرف مائل ہونا، دولت مندوں کی عزت کرنا، دین کو دنیا کے بدلے بیچ ڈالنا، ایسے موقع پر مومن کا دل یوں گھلتا رہے گا جس طرح نمک پانی میں گھلتا ہے، کیونکہ وہ ان برائیوں کو دیکھے گا، لیکن ان کا ازالہ اور تبدیلی اس کے بس سے باہر ہوگی۔

سلمان نے عرض کی: یا رسولؐ اللہ! ایسا بھی ہوگا؟

فرمایا: ہاں اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، سلمان! اس زمانے میں حکام ظالم، وزراء فاسق پیشہ ور ظالم اور امانت میں خیانت کرنے والے لوگوں پر حکومت کریں گے۔

سلمان: یا رسولؐ اللہ ایسا بھی ہوگا۔

فرمایا: "سلمان! اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اس وقت اچھائیاں برائیاں اور برائیاں

اچھائیاں سمجھی جائیں گی، امانت خائنوں کے سپرد کی جائے گی، امین خائن بن جائیں گے، جھوٹوں کی تصدیق اور سچوں کی تکذیب کی جائے گی۔"

سلمان: تو کیا ایسا بھی ہوگا؟ اے اللہ کے رسول!"

فرمایا: ہاں! خدا کی قسم اے سلمان! اس وقت حکومت عورتوں کے ہاتھ میں ہوگی، غلاموں سے مشورہ کیا جائے گا، لڑکے منبروں پر بیٹھیں گے، جھوٹ دل لگی کے طور پر بولا جائے گا، زکوٰۃ کو تاوان سمجھا جائے گا اور بیت المال کو غنیمت سمجھ کر لوٹا جائے گا۔"

"لوگ اپنے والدین سے برائی اور دوستوں سے اچھائی کریں گے، آسمان پر دم دار ستارہ ظاہر ہوگا۔"

سلمان: "یا رسول اللہ! کیا ایسا بھی ہوگا؟"

فرمایا: ہاں سلمان! اُس کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اس وقت عورت اپنے شوہر کے ساتھ تجارت میں شریک ہوگی (اور دونوں کی سرگرمیاں گھر سے باہر کے ماحول سے متعلق ہوں گی اور دونوں کی توجہ دولت سمیٹنے پر مرکوز ہوگی) بارشیں کم ہوں گی، سخی لوگ بخیل ہو جائیں گے اور غریبوں کو حقیر سمجھا جائے گا، اس وقت بازار ایک دوسرے کے نزدیک ہو جائیں گے ایک (دوکاندار) کہے گا، میں نے کچھ نہیں بیچا، دوسرا کہے گا مجھے منافع حاصل نہیں ہوا، غرض سب اپنے رب کی شکایت اور مذمت کرتے ہوں گے۔

سلمان! اللہ کے رسول! ایسا بھی ہوگا؟"

فرمایا: "ہاں سلمان! اُس کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اس وقت ایسی قومیں حکومت کریں گی کہ اگر کوئی شخص بات کرے گا تو وہ لوگ اسے مار ڈالیں گے اور اگر خاموشی اختیار کرے گا تو اس کا سب کچھ مباح سمجھ کر لوٹ لیا جائے گا، اس کی عزت و احترام کو پامال کر کے اس کا خون بہایا جائے گا، دلوں کو خوف و وحشت اور دشمنی سے بھر دیا جائے گا اس وقت سب لوگوں پر خوف و وحشت طاری ہوگی۔"

سلمان: "یا رسول اللہ! آیا ایسا بھی ہوگا؟"

فرمایا: ہاں سلمان! اس کی قسم جس کے دستِ قدرت میں میری جان ہے اس وقت کچھ مشرق سے لے آئیں گے اور کچھ مغرب سے لے آئیں گے (کچھ قانون مشرق سے اور کچھ قانون مغرب سے لے آئیں گے) اور میری اُمت مختلف رنگ اختیار کرے گی۔ اس وقت کی امت کے کمزور افراد پر افسوس ہے، نہ تو چھوٹوں پر رحم کریں گے نہ ہی بڑوں کا احترام کریں گے اور نہ ہی کسی گناہ گار کو بخشیں گے۔ ان کے جسم تو انسانوں جیسے ہوں گے لیکن دل شیاطین کے سے۔"

سلمان: "یا رسول اللہ! آیا ایسا بھی ہوگا؟"

فرمایا: "ہاں! اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اے سلمان! اس زمانے میں مرد، مردوں پر قناعت کریں گے اور عورتیں عورتوں پر اور لڑکوں پر اسی طرح رقابت کریں گے جس طرح لڑکیوں پر ان کے

خاندانوں میں کی جاتی ہے، عورتیں خود کو مردوں کے مشابہ بنائیں گی اور مرد عورتوں کے اور عورتیں زین سواری کریں گے (اور خود نمائی کریں گی) خدا کی ان پر لعنت ہو۔

سلمان! "اللہ کے رسولؐ! آیا ایسا بھی ہوگا؟"

فرمایا: "ہاں سلمان! اس کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اس زمانے میں مسجدوں کو یوں سجایا جائے گا جس طرح یہود و نصاریٰ اپنی عبادت گاہوں کو سجاتے ہیں، قرآنوں کو مزین کریں گے (اس کے مضامین پر عمل نہیں کریں گے) مسجدوں کے مینار اونچے اونچے ہوں گے اور نمازیوں کی صفیں بڑی تعداد میں ہوں گی، لیکن ان کے دل ایک دوسرے کے دشمن اور زبانیں مختلف ہوں گی۔"

سلمان: "یا رسول اللہ! آیا ایسا بھی ہوگا؟"

فرمایا: "ہاں سلمان! اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اس زمانے میں میری اُمت کے لڑکے سونے کے ساتھ زینت کریں گے، حریر و دیبا پہنیں گے اور چیتے کی کھال سے اپنا لباس تیار کر کے پہنیں گے۔"

سلمان: "یا رسولؐ اللہ! آیا ایسا بھی ہوگا؟"

فرمایا: "ہاں سلمان! اس کی قسم جس کے دست قدرت میں میری جان ہے، اس وقت زنا عام ہو جائے گا، کام غیبت اور رشوت سے انجام پائیں گے، دین کو پائمال کریں گے اور دُنیا کو سر پر رکھیں گے۔"

سلمان! "یا رسولؐ اللہ! آیا یوں بھی ہوگا؟"

فرمایا: "ہاں! سلمان! اس کی قسم جس کے دستِ قدرت میں میری جان ہے، اس وقت طلاق کی بہتات ہو جائے گی خدا کی کسی حد کا اجرا نہیں کیا جائے گا لیکن یہ بات خدا کو نقصان نہیں پہنچائے گی (بلکہ وہ لوگ خود نقصان اٹھائیں گے)۔"

سلمان: "آیا ایسا بھی ہوگا یا رسولؐ اللہ!"

فرمایا: "ہاں سلمان! جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اس کی قسم اس زمانہ میں عورتیں گانا گائیں گی، لہو و لعب اور گانے بجانے کے آلات کھلم کھلا ہوں گے اور میری اُمت کے شریران کے پیچھے پھریں گے۔"

سلمان: "یا رسولؐ اللہ! ایسا بھی ہوگا؟"

فرمایا: "ہاں سلمان! جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اُس کی قسم، اس وقت میری اُمت کے مالدار لوگ تفریح کی غرض سے متوسط طبقہ تجارت کے قصد سے اور غریب لوگ ریاکاری کے لیے حج پر جائیں گے۔ اس وقت ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو قرآن کو غیر خدا کے لیے تھامیں گے اور اس کے ساتھ لہو و لعب کے آلات کا سا سلوک کریں گے اور ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو غیر خدا کے لیے علم دین حاصل کریں گے، زنا کی اولاد کثرت سے ہوگی، قرآن کو راگ کی طرز میں پڑھا جائے گا اور دُنیا کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جائیں گے۔"

سلمان: ایسا بھی ہوگا یا رسولؐ اللہ!؟"

فرمایا: ہاں سلمان! جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اس کی قسم یہ اس وقت ہوگا، جب حرمت کے پردے

چاک ہو جائیں گے، گناہ کثرت سے رونما ہوں گے، بدکار لوگ نیک لوگوں پر مسلط ہو جائیں گے، جھوٹ عام ہو جائے گا۔ ہٹ دھرمی زیادہ ہو جائے گی اور فقر و فاقہ کی کثرت ہو جائے گی۔ لوگ مختلف لباسوں کی وجہ سے ایک دوسرے پر فخر کریں گے، بارشیں بے موقع ہوں گی، جوا اور آلاتِ موسیقی کو اچھا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو بُرا سمجھیں گے۔

"حالات اس حد تک بگڑ جائیں گے کہ اس وقت مومن تمام لوگوں سے زیادہ ذلیل ہوگا، قرآن کے قاری اور عبادت گزار لوگ ایک دوسرے کی بدگوئی کریں گے اور انہیں ملکوت اعلیٰ میں نجس اور پلید لوگوں کے نام سے پکارا جائے گا۔"

سلمان: "یا رسول اللہ! کیا ایسا بھی ہوگا؟"

فرمایا، "ہاں سلمان! جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اس کی قسم اس وقت مالدار لوگ غریبوں پر کوئی رحم نہیں کریں گے، حتیٰ کہ کوئی ضرورت مند لوگوں میں کھڑا ہو کر اپنی حاجت کا اظہار کرے گا تو کوئی اسے کچھ نہیں دے گا۔"

سلمان: "ایسا بھی ہوگا یا رسول اللہ!"

فرمایا: "ہاں سلمان! جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اس کی قسم، اس وقت "رویبضہ" بھی بات کرے گا۔"

سلمان: "یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان جائیں، "رویبضہ" کیا ہے؟"

فرمایا: "جس نے کبھی کوئی بات نہیں کی ہوگی وہ بھی مظلوم و محروم انسان کے حق میں بات کرے گا۔" (وہ شخص بھی بولے گا جسے بولنے کا موقع نہیں دیا جاتا ہوگا)۔

"تو اس وقت زیادہ دیر نہیں گزرے گی کہ زمین سے اس انداز میں چیخ بلند ہوگی کہ ہر گروہ یہ سمجھے گا کہ یہ آواز اسی کے علاقے سے اُٹھ رہی ہے۔

پھر ایک عرصے تک جب تک خدا چاہے گا لوگ اسی حال پر باقی رہیں گے، پھر اسی دوران میں پتھر زمین میں شگاف کریں گے اور زمین اپنے دل کے ٹکڑے باہر نکال پھینکے گی، یعنی سونا اور چاندی۔"

پھر آپؐ نے ہاتھ سے ستون مسجد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "ان کے مانند" اور اس روز سونا اور چاندی کسی کام کے نہیں رہیں گے، حکم الٰہی پہنچ جائے گا، یہ ہے معنی خدا کے اس فرمان کا "فقد جاء اشراطها"[1]

---

[1] تفسیر نور الثقلین بحوالہ تفسیر علی بن ابراہیم و تفسیر صافی اسی آیت کے ذیل میں۔

۲۰۔ وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُورَةٌ ۚ فَإِذَا أُنزِلَتْ سُورَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيهَا الْقِتَالُ ۙ رَأَيْتَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ يَنظُرُونَ إِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۖ فَأَوْلَىٰ لَهُمْ ۚ ○

۲۱۔ طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوفٌ ۚ فَإِذَا عَزَمَ الْأَمْرُ ۚ فَلَوْ صَدَقُوا اللَّهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ ○

۲۲۔ فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِن تَوَلَّيْتُمْ أَن تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ ○

۲۳۔ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمَىٰ أَبْصَارَهُمْ ○

۲۴۔ أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا ○

ترجمہ

۲۰۔ اور مؤمنین کہتے ہیں کہ (جہاد کے بارے میں) کوئی سُورت کیوں نازل نہیں ہوتی؟ لیکن جب کوئی محکم سُورت نازل ہوتی ہے کہ جس میں جہاد کا ذکر ہو تو تُو بیمار دِل منافقوں کو دیکھے گا کہ تیری طرف اس طرح دیکھیں گے، جس طرح کسی کو موت آنے لگے۔ پس موت اور تباہی ان کے لیے بہتر ہے۔

۲۱۔ لیکن اگر وہ اطاعت کریں اور سنجیدہ اور شائستہ بات کریں تو یہ ان کے لیے بہتر ہے پھر جب جہاد کا حتمی حکم آجائے تو اگر یہ لوگ خدا سے سچے رہیں (اور صدق وصفا

کا راستہ اختیار کریں) تو ان کے حق میں بہتر ہے۔

۲۲۔ لیکن اگر تم روگردانی اختیار کرو تو تم سے سوائے زمین میں فساد اور قطع رحمی کے اور کیا توقع رکھی جاسکتی ہے۔

۲۳۔ یہ ایسے لوگ ہیں جنھیں خدا نے اپنی رحمت سے دُور کر دیا ہے، ان کے کانوں کو بہرہ اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے۔

۲۴۔ کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا پھر کیا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہُوئے ہیں۔

تفسیر

وہ جہاد کے نام سے بھی ڈرتے ہیں:

ان آیات میں جہاد کے متعلق مومنین اور منافقین کا ردّعمل بیان کیا جارہا ہے، گزشتہ آیات میں ان دونوں گروہوں کے متعلق گفتگو کے سلسلے میں یہ آیات تتمہ کی حیثیت رکھتی ہیں، چنانچہ سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: مومنین ہمیشہ کہتے رہتے ہیں کہ کوئی سُورت کیوں نازل نہیں ہوتی (و یقول الذین امنوا لولا نزلت سورۃ)۔

ایسی سُورت کہ جس میں جہاد کا حکم ہو اور سنگدل، خونخوار اور بے منطق دشمن کے مقابلے میں ہمیں ہمارے فرائض سے آگاہ کرے۔ ایسی سُورت کہ جس کی آیات ہمارے دلوں کے لیے نورِ ہدایت ہُوں اور ہماری رُوح کو اپنے فروغ سے روشن کریں۔

یہ تو ہے حقیقی مومنین کی کیفیت۔

لیکن منافقوں کا حال یہ ہے کہ "جب کوئی محکم سُورت نازل ہوتی ہے جس میں جنگ اور جہاد کا ذکر ہو تو تو بیمار دل منافقوں کو دیکھے گا کہ تیری طرف اس طرح دیکھیں گے جس طرح کوئی موت کے کنارے پہنچ کر پریشان اور مبہوت ہو کر دیکھتا ہے اور جس کی آنکھوں کے ڈھیلے حرکت کرنے سے رُک جاتے" (فاذا انزلت سورۃ محکمۃ وذکر فیھا القتال رأیت الذین فی قلوبھم مرض ینظرون الیک نظر المغشی علیہ

من الموت)۔

جنگ کا نام سننے سے وحشت واضطراب انہیں سرتاپا یوں گھیر لیتے ہیں جیسے قریب ہے کہ دل ان کے سینے سے باہر آجائیں ان کی عقلیں ماؤف ہو جائیں، آنکھیں پتھرا جائیں جس طرح موت کے قریب انسان کی آنکھیں بے حس وحرکت اور کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں اور یہ ڈرپوک اور بزدل منافقین کی کیفیت کی ایک واضح اور مکمل تصویر ہے۔

آخر جہاد کے بارے میں مومنین اور منافقین کا مختلف ردّعمل کیوں نہ ہو، جبکہ پہلا گروہ اپنے محکم ایمان کی وجہ سے ایک تو اپنے پروردگار کے لطف وکرم اور امداد کا امیدوار ہوتا ہے اور دوسرے اس کی راہ میں شہادت سے بھی نہیں گھبراتا۔

ان کے لیے میدانِ جہاد، محبوب سے اظہارِ عشق کا مقام، شرافت اور فضیلت کا میدان، استعداد اور صلاحیت کے پروان چڑھنے کی جگہ اور استقامت و فتح وکامرانی کا میدان ہوتا ہے۔ اس طرح کے میدان سے خوف کے کیا معنی۔

جبکہ منافقین کے لیے موت، تباہی اور بربادی کا مقام، شکست اور دنیاوی لذتوں کو خیرآباد کہنے کی جگہ ظلمتوں اور تاریکیوں بھرا میدان اور ایسا میدان ہوتا ہے جس کا مستقبل وحشت ناک اور نامعلوم ہوتا ہے۔

بعض مفسرین کے نظریہ کے مطابق "سورۃ محکمۃ" سے مراد وہ سورتیں ہیں جن میں جہاد کے مسائل بیان کیے گئے ہیں لیکن اس تفسیر کی کوئی دلیل نہیں ملتی۔ بلکہ اس کی بظاہر تفسیر یہ ہے کہ "محکم" یہاں پر مستحکم، پائدار، دوٹوک اور ہر قسم کے ابہام سے خالی کے معنی میں ہے جو بعض اوقات "متشابہ" کے مقابل میں ذکر ہوتا ہے، البتہ چونکہ آیات جہاد میں عام طور پر واضح اور دوٹوک حکم ہوتا ہے لہٰذا اس مفہوم سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے، لیکن اس میں منحصر نہیں ہے۔

"الذین فی قلوبھم مرض" (جن لوگوں کے دلوں میں بیماری ہے) کی تعبیر قرآنی زبان میں عام طور پر منافقین کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ بعض مفسرین اس سے جو یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے مراد "ضعیف الایمان" لوگ ہیں تو ان کا نظریہ نہ تو قرآن کی دوسری آیات سے ہم آہنگ ہے اور نہ ہی زیر تفسیر آیت سے قبل وبعد کی آیات سے جو سب کی سب منافقین کے متعلق گفتگو کر رہی ہیں۔

بہرحال آیت کے آخر میں مختصراً فرمایا گیا ہے: ان پر افسوس ہے کہ موت اور تباہی ان کے لیے ان کی زندگی سے بہتر ہے۔ (فاولیٰ لھم)۔

"اولیٰ لھم" کا جملہ عربی ادب میں عام طور پر کسی کو دھمکی دینے کسی پر لعنت بھیجنے، کسی سے اظہار نفرت کرنے اور کسی کے لیے بدبختی اور پریشانی کی آرزو کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔[1]

بعض مفسرین نے اس کی "الموت اولیٰ لھم" (موت ان کے لیے بہتر ہے) کے معنی سے تفسیر کی ہے۔

---

[1] کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ جملے کا معنی یوں ہوں گا: "یلیہ مکروہ" اور اسے "ویل لھم" کے ہم معنی سمجھا ہے۔

اور اگر ان دونوں معانی کو آپس میں ملا دیا جائے جس طرح ہم نے آیت کی تفسیر میں کیا ہے تو کوئی مانع موجود نہیں ہے۔

بعد کی آیت میں فرمایا گیا ہے: لیکن اگر وہ اطاعت کریں اور فرمانِ جہاد سے منہ نہ موڑیں، نیک، سنجیدہ اور اچھی باتیں کریں تو یہ ان کے لیے بہتر ہے (طاعة وقول معروف)۔[1]

ممکن ہے "قولِ معروف" کی تعبیر منافقین کی جہاد کے بارے میں ان ناموزوں اور غیر مناسب باتوں کے مقابلے میں ہو جو وہ جہاد کی آیات نازل ہونے کے بعد کیا کرتے تھے، کبھی تو کہتے تھے کہ:

"لا تنفروا فی الحر"

"اس قدر شدید گرمی میں میدانِ جہاد کی طرف مت نکلو" (توبہ/۸۱)

اور کبھی کہتے:

"واذ یقول المنافقون والذین فی قلوبھم مرض ما وعدنا اللہ و رسولہ الا غرورا"

"خدا اور اس کے رسولؐ نے ہمیں کامیابی کے جھوٹے وعدے کے سوا اور کچھ نہیں دیا" (احزاب/۱۲)

کبھی مؤمنین کو ناامید کرنے اور انہیں میدان جنگ سے روکنے کے لیے کہتے:

"ھلم الینا"

"ہماری طرف آؤ اور خوش رہو" (احزاب/۱۸)

وہ لوگوں کو نہ صرف جہاد کی ترغیب نہیں دیتے تھے بلکہ ان کے حوصلے پست کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور بھی لگایا کرتے۔

مزید فرمایا گیا ہے: پھر جب لڑائی ٹھن جائے اور حکم جہاد قطعی ہو جائے تو اگر یہ لوگ خدا سے سچے رہیں اور صدق و صفا کی راہ اختیار کریں تو ان کے حق میں بہتر ہے (فاذا عزم الامر فلو صدقوا اللہ لکان خیرا لھم)۔

یہ بات دُنیا میں بھی ان کی سرفرازی کا باعث ہے اور آخرت میں بھی وہ ثوابِ عظیم اور بہت بڑی کامیابی حاصل کریں گے۔

"عزم الامر" دراصل کسی کام کے پختہ اور محکم ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن قبل و بعد کی آیات کے قرینے کی وجہ سے اس سے مراد "جہاد" ہے۔

---

[1] "طاعة" مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے جو تقدیری طور پر یوں ہوگی: "طاعة وقول معروف امثل لھم"۔ بعض اسے مبتدا محذوف کی خبر سمجھتے ہیں جو تقدیری طور پر یوں ہوں گی "امرنا طاعة" لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

بعد کی آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے: لیکن اگر مخالفت کا راستہ اختیار کرو اور فرمان الٰہی اور اس کی کتاب پر عمل کرنے سے روگردانی کرو تو تم سے سوائے روئے زمین پر فساد برپا کرنے اور قطع رحمی کے اور کیا توقع رکھی جا سکتی ہے (فھل عسیتم ان تولیتم ان تفسدوا فی الارض وتقطعوا ارحامکم)[1]

کیونکہ اگر تم قرآن اور توحید سے روگردان ہو جاؤ تو یقیناً جاہلیت کی طرف لوٹ جاؤ گے اور جاہلیت کا طریقہ کار تو بس "فساد فی الارض"، قتل و غارت اور خوں ریزی اور قریبی عزیزوں اور بیٹیوں کو موت کے گھاٹ اتارنا ہے۔

یہ اس صورت میں ہے جب "تولیتم" کو "تولی" یعنی روگردانی کے مادہ سے لیا جائے، لیکن بہت سے مفسرین نے اسے "ولایت" (حکومت) کے مادہ سے لیا ہے جس کا معنی یہ ہوگا کہ اگر حکومت کی باگ ڈور تمہارے ہاتھ آجائے تو تم سے تباہی و بربادی، خون ریزی اور قطع رحمی کے علاوہ اور کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔

گویا کچھ منافقین نے میدان جہاد سے راہ فرار اختیار کر لینے کے یہ بہانہ گھڑ لیا تھا کہ ہم میدان جنگ میں کیوں قدم رکھیں اور کیوں وہاں پر خوں ریزی کا ارتکاب کریں اور اپنے قریبیوں کو موت کے گھاٹ اتار کر "مفسد فی الارض" بنیں۔

قرآن مجید ان کے اس بہانے کے جواب میں کہتا ہے: تو کیا جب حکومت تمہارے پاس تھی، اس وقت تم "فساد فی الارض"، قتل و غارت اور خون ریزی اور قطع رحمی کے علاوہ اور کیا کیا کرتے تھے؟ یہ سب بہانے ہیں۔ اسلام میں جنگ کا مقصد فتنہ کی آگ کو بجھانا ہے نہ کہ فتنہ و فساد کو ہوا دینا اور ظلم و ستم کی بساط کو الٹنا ہے نہ کہ قطع رحمی۔

اہل بیت اطہار علیہم السلام سے منقول بعض روایات میں ہے کہ "یہ آیت بنی امیہ کے بارے میں ہے کہ جب انہوں نے زمام حکومت سنبھالی تو نہ تو کسی چھوٹے پر رحم کیا اور نہ ہی کسی بڑے پر۔ حتیٰ کہ وہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو بھی موت کے گھاٹ اتارنے سے نہیں چوکے"۔[2]

ظاہر ہے کہ ابوسفیان سے لے کر اس کے پوتوں پڑپوتوں تک تمام بنی امیہ اس آیت کا روشن مصداق تھے اور روایت کی مراد بھی یہی ہے، لیکن آیت کا مفہوم عام اور وسیع ہے جس میں تمام ظالم اور مفسد منافقین شامل ہیں۔

بعد کی آیت اس منافق اور بہانہ جو مفسد گروہ کے حتمی انجام کو ان لفظوں میں بیان کرتی ہے: "یہ وہی لوگ ہیں جنہیں خدا نے اپنی رحمت سے دور رکھا، ان کے کانوں کو بہرہ اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے۔ نہ تو وہ کسی

---

[1] اگرچہ مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں بہت کم بحث کی ہے، لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ "ان تولیتم" کا جملہ جو "عسیٰ" کے اسم اور خبر کے درمیان واقع ہوا ہے جملۂ شرطیہ ہے اور اس کی جزاء "فھل عسیتم ان تفسدوا فی الارض" کا مجموعی جملہ ہے جو تقدیری طور پر یوں ہے "ان تولیتم عن کتاب اللہ فھل یترقب منکم الا الفساد فی الارض"۔

[2] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ صفحہ ۴۰۔

حقیقت کو سن سکتے ہیں اور نہ ہی اسے دیکھ سکتے ہیں (اولئک الذین لعنھم اللہ فاصمّھم واعمٰی ابصارھم)۔

وہ اسلامی جہاد کو، جو حق و عدالت پر مبنی ہوتا ہے قطع رحمی اور فساد فی الارض سے تعبیر کرتے ہیں لیکن دورِ جاہلیت میں انہوں نے خود جن جرائم کا ارتکاب کیا ہے، اپنی حکومت کے دوران بے گناہوں کا جو خون بہایا ہے اور معصوم نومولود بچوں کو اپنے ہاتھوں سے زندہ درگور کیا ہے، کیا وہ سب حق بھی تھا اور عدالت پر مبنی بھی؟ خدا کی لعنت ہو ان پر جن کے پاس نہ تو حق سننے کے لیے کان ہیں اور نہ ہی حقیقت کو دیکھنے کے لیے آنکھیں۔

حضرت امام علی بن الحسینؑ سے روایت ہے کہ آپ نے اپنے فرزند امام محمد باقر علیہ السلام سے فرمایا:

"ایاک ومصاحبۃ القاطع لرحمہ، فانی وجدتہ ملعونا فی کتاب اللہ عزوجل فی ثلاث مواضع، قال اللہ عزوجل "فھل عسیتم...."

"میرے بیٹے! ان لوگوں کی دوستی سے پرہیز کرو جو قطع رحمی کرتے ہیں، کیونکہ میں نے انہیں قرآن میں تین مقام پر ملعون پایا ہے اور پھر آپ نے آیت "فھل عسیتم...." کی تلاوت فرمائی۔"[1]

"رحم" دراصل شکم مادر میں جنین کے رہنے کی جگہ کو کہتے ہیں، بعد ازاں اس تعبیر کا تمام رشتہ داروں پر اطلاق ہونے لگا، اس لیے کہ ان سب کا ایک ہی "رحم" سے تعلق ہوتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

"ثلاثۃ لا یدخلون الجنۃ مدمن خمر ومدمن سحر وقاطع رحم"

تین قسم کے لوگ ایسے ہیں جو بہشت میں ہرگز داخل نہیں ہوں گے، شرابی، جادوگر اور قطع رحمی کرنے والے۔[2]

ظاہری بات ہے کہ ایسے لوگوں پر خدا کی لعنت اور رحمت خدا سے دوری اسی طرح ان سے حقائق کے ادراک کی قوت کا سلب ہو جانا، ہرگز جبر پر مبنی نہیں ہے، کیونکہ یہ خود ان کے اپنے اعمال کی سزا اور ان کے کردار و گفتار کا ردِ عمل ہے۔

اسی سلسلے کی دوسری آیت میں اس بدبخت گروہ کے انحراف اور گمراہی کے سبب کو یوں بیان فرمایا گیا ہے: تو کیا یہ لوگ قرآنی آیات میں غور نہیں کرتے (تاکہ حقائق ادراک کر کے اپنے فرائض کو انجام دیں) یا پھر کیا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں (افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالھا)۔

---

[1] اصول کافی جلد ۲ باب من تکرہ مجالستہ حدیث ۱، لیکن دوسری دو آیتیں جو حدیث کے ضمن میں بیان ہوئی ہیں ایک تو سورۂ رعد کی ۲۵ ویں آیت ہے اور دوسری سورۂ بقرہ کی ۲۷ ویں آیت ہے ایک میں صراحت کے ساتھ لعنت کا تذکرہ ہے اور دوسری میں کنایہ کے طور پر۔

[2] خصال صدوق۔

جی ہاں! ان کی مصیبت کا سبب ان دو چیزوں میں سے ایک ہے یا تو وہ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے جو قرآن ہدایت الٰہی کا حامل اور شفا عطا کرنے کا مکمل نسخہ ہے یا اگر غور تو کرتے ہیں لیکن خواہشاتِ نفسانی کی اتباع اور پہلے سے انجام دیئے ہوئے کرتوتوں کی وجہ سے ان کے دلوں پر ایسے قفل پڑ چکے ہیں کہ کوئی بھی حقیقت ان کے دلوں تک نہیں پہنچ پاتی۔

دوسرے لفظوں میں اگر کوئی شخص تاریکیوں میں اپنا راستہ کھو بیٹھے اور اس کے ہاتھ میں کوئی چراغ بھی نہ ہو یا اگر چراغ تو ہو لیکن اس کی آنکھیں نابینا ہوں تو وہ راستے سے بھٹک جائے گا، لیکن اگر ہاتھ میں چراغ بھی ہو اور آنکھیں بھی صحیح و سالم ہوں تو راستہ واضح ہوتا ہے۔

"اقفال" "قفل" کی جمع ہے، جو اصل میں "قفول" (واپس لوٹ جانا) کے مادہ سے ہے یا "قفیل" (بمعنی خشک چیز) کے مادہ سے، چونکہ جس وقت دروازے کو بند کر کے اسے تالا لگا دیا جاتا ہے تو جو شخص بھی آتا ہے وہاں سے واپس پلٹ جاتا ہے اور خشک اور ٹھوس چیز کے مانند کوئی چیز بھی اس میں داخل نہیں ہو سکتی لہٰذا یہ کلمہ اس مخصوص اوزار پر استعمال ہونے لگا۔

چند نکات

۱۔ **قرآن فکر و عمل کی کتاب ہے:** قرآن کی مختلف آیات اس حقیقت کو واشگاف الفاظ میں بیان کر رہی ہیں کہ یہ عظیم آسمانی کتاب صرف تلاوت کرنے کے لیے نہیں ہے، بلکہ اس کا منتہائے مقصود "ذکر" (یاد دہانی)، "تدبر" (نتائج پر غور و خوض)، "انذار" (لوگوں کو ظلمات سے نکال کر نور تک پہنچانا) اور "شفا، رحمت اور ہدایت" ہے۔

"وھٰذا ذکر مبارک انزلناہ"

"یہ بابرکت یاد دہانی ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے۔ (انبیاء/۵۰)

"کتاب انزلناہ الیک مبارک لیدبروا اٰیاتہ"

"یہ بابرکت کتاب ہے جسے ہم نے تجھ پر نازل کیا ہے تاکہ تو اس کی آیات میں غور کرے"

(ص/۲۹)

سورۂ انعام کی ۱۹ ویں آیت میں ہے:

"واوحی الیّ ھٰذا القراٰن لانذرکم بہ ومن بلغ"

"یہ قرآن مجھ پر وحی کیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعے سے تمہیں اور ان لوگوں کو ڈراؤں جن تک یہ پیغام پہنچے۔"

سورۂ ابراہیمؑ کی پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے:

"کتاب انزلناہ الیک لتخرج الناس من الظلمات الی النور"

یہ ایک کتاب ہے، جسے ہم نے تجھ پر نازل کیا ہے تاکہ اس کے ذریعے تو لوگوں کو تاریکیوں

سے نکال کر نور تک پہنچائے۔

سورۂ بنی اسرائیل کی ۸۲ ویں آیت میں ہے:

" وننزل من القرآن ما هو شفاء ورحمة للمؤمنين "

" ہم قرآن کی ایسی آیتیں بھی نازل کرتے ہیں جو مومنین کے لیے شفا اور رحمت کا سبب ہیں۔"

اس طرح قرآن مجید کو مسلمانوں کی زندگی کے لیے راہنما کی حیثیت سے اختیار کیا جانا چاہیئے اور اسے اپنے لیے اسوہ اور نمونہ عمل قرار دینا چاہیئے، اس کے احکام پر پورے طور پر عمل کرنا چاہیئے اور اس سے سرمو انحراف نہیں کرنا چاہیئے اور زندگی کے تمام خطوط کو اس سے ہم آہنگ کرنا چاہیئے۔

لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں کا سلوک اس سے نہایت ہی ناروا ہے اور اسے صرف بے معنی ورد و وظیفہ تک محدود کر دیا گیا ہے۔ صرف سرسری تلاوت پر اکتفا کیا جاتا ہے زیادہ سے زیادہ تجوید، خوش الحانی اور اچھی آواز سے پڑھنے کو اہمیت دیتے ہیں مسلمانوں کی بہت بڑی بدبختی ہے کہ انہوں نے قرآن مجید کو اپنی زندگی کے پروگراموں سے نکال کر بس اس کے الفاظ پر گزارہ کر رکھا ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان زیر تفسیر آیات میں بڑی صراحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ دل کے مریض ان منافق لوگوں نے قرآن میں تدبر نہیں کیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہیں یہ سیاہ اور تاریک دن دیکھنے نصیب ہوئے۔

" تدبر" " دبر" (بروزن "ابر") کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے، کسی چیز کے نتائج اور انجام پر غور کرنا۔ یہ " تفکر" کے برعکس ہے، جس کا زیادہ تر اطلاق کسی چیز کے اسباب اور وجوہات پر غور کرنے پر ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ان دونوں کلموں کا استعمال نہایت ہی معنی خیز ہے۔

نیز اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ قرآن مجید سے استفادہ کے لیے ایک قسم کی خود سازی کی ضرورت ہوتی ہے۔ قرآن مجید خود بھی اس قسم کی خود سازی کے لیے معاون ثابت ہوتا ہے، کیونکہ اگر دلوں پر ہوا و ہوس، تکبر اور غرور، ہٹ دھرمی اور تعصب کے تالے لگے ہوئے ہوں تو یہ رکاوٹیں نور حق کو ان میں داخل ہونے سے روک دیتی ہیں اور زیر تفسیر آیات میں بھی اس تفسیر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، کیا ہی زیبا فرمان ہے امیر المومنین علی علیہ السلام کا جو ایک خطبے کے ضمن میں متقین کے بارے میں ہے:

" اما الليل فصافون اقدامهم، تالين لاجزاء القرآن، يرتلونها ترتيلا، يحزنون بدائهم، ويستثيرون به دواء دائهم، فاذا مروا بآية فيها تشويق ركنوا اليها طمعا، وتطلعت نفوسهم اليها شوقا، وظنوا انها نصب اعينهم، واذا مروا بآية فيها تخويف اصغوا اليها مسامع قلوبهم، وظنوا ان زفير جهنم وشهيقها في اصول اذانهم "

وہ رات کے وقت قیام کرتے ہیں، قرآن کی ٹھہر ٹھہر کر اور سوچ سمجھ کر تلاوت کرتے ہیں۔

اپنے آپ کو اس کے ذریعے پر سوز کرتے ہیں، اپنے درد کی دوا اسی میں تلاش کرتے ہیں، جب کسی ایسی آیت پر پہنچتے ہیں جس میں شوق دلایا گیا ہے تو وہ بڑے اشتیاق کے ساتھ اس کی طرف مائل ہوتے ہیں، دل کی آنکھیں بڑے شوق کے ساتھ اور خوب غور سے اسے دیکھتی ہیں اور ہمیشہ اسے اپنا نصب العین قرار دیتے ہیں اور اگر کسی آیت پر پہنچتے ہیں جس میں ڈرایا گیا ہے تو دل کے کان کھول کر اسے سنتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ جلا ڈالنے والی دوزخ کی آگ کی چیخ و پکار اور اس کے شعلوں کی لپیٹوں کی آواز ان کے دل کے کانوں میں گونج رہی ہے۔ [1]

۲۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث: حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام "ام علیٰ قلوب اقفالھا" کے جملہ کی تفسیر میں یوں فرماتے ہیں:

"ان لک قلبًا ومسامع وان اللہ اذا اراد ان یھدی عبدًا فتح مسامع قلبہ، واذا اراد بہ غیر ذالک ختم مسامع قلبہ، فلا یصلح ابدًا وھو قول اللہ عز وجل: ام علیٰ قلوب اقفالھا"

تمہارے لیے دِل بھی ہے اور کان بھی (جن میں داخل ہونے کے رستے ہیں) اور جب خدا کسی بندے کو (اس کے تقوٰے کی وجہ سے) ہدایت کرنا چاہے تو اس کے دل کے کانوں کو کھول دیتا ہے اور جب اس کے علاوہ اور برعکس چاہتا ہے تو اس کے دل کے کانوں پر مہر لگا دیتا ہے اور اس کی کبھی اصلاح نہیں ہو سکتی اور یہی ہے معنی خدا کے اس قول "ام علیٰ قلوب اقفالھا" کا۔ [2]

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۳، معروف بہ خطبہ ہمام۔

[2] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۱۔

۲۵۔ اِنَّ الَّذِیْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰٓی اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُمُ الْهُدَی ۙ الشَّیْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ ؕ وَاَمْلٰی لَهُمْ ○

۲۶۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِیْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِیْعُكُمْ فِیْ بَعْضِ الْاَمْرِ ۚ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ ○

۲۷۔ فَكَیْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ یَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ○

۲۸۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَاۤ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَكَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ○

ترجمہ

۲۵۔ جو لوگ حق کے واضح ہو جانے کے بعد بھی اُلٹے پاؤں پھر گئے ہیں شیطان نے اِن کے بُرے اعمال کو ان کی نگاہوں میں بنا سجا کر پیش کیا ہے اور انہیں لمبی آرزوؤں پر فریفتہ کیا ہے۔

۲۶۔ یہ اس لیے ہے کہ جو نزُول وحی کو ناپسند کرتے ہیں اُنہوں نے کہا کہ بعض کاموں میں ہم تمھاری پیروی کریں گے، جب کہ خدا ان کے رازوں سے آگاہ ہے،

۲۷۔ اس وقت ان کا کیا حال ہوگا جب (موت کے) فرشتے ان کے چہروں اور ان کی پشت پر مارتے ہوں گے (اور ان کی رُوح قبض کریں گے)۔

۲۸۔ یہ سب اس وجہ سے ہے کہ جس چیز سے خدا ناخوش ہے، اس کی تو یہ لوگ پیروی

کرتے ہیں اور جس میں خدا کی خوشی ہے اس سے بیزار ہیں۔ لہٰذا خدا نے ان کے سب اعمال اکارت کر دیئے۔

تفسیر

وہ قرآن میں غور کیوں نہیں کرتے؟

یہ آیات بھی منافقین کے بارے میں ہیں اور ان کے مختلف اعتراضات بیان کر رہی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے بیشک جو لوگ حق واضح ہو جانے کے بعد بھی اُلٹے پاؤں پھر گئے ہیں، شیطان نے ان کے بُرے اعمال کو ان کی نگاہوں میں بنا سجا کر پیش کیا ہے اور انہیں لمبی آرزوؤں پر فریفتہ کر دیا ہے (ان الذین ارتدوا علی ادبارھم من بعد ما تبین لھم الھدی الشیطان سوّل لھم واملی لھم)۔

اگرچہ بعض مفسرین نے خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ آیت ان بعض اہل کتاب کافروں کے متعلق گفتگو کر رہی ہے جو پیغمبر اسلامؐ کی بعثت سے پہلے اپنی آسمانی کتابوں سے آنحضرتؐ کی نشانیاں بیان کیا کرتے تھے اور آپؐ کے ظہور کے شدید منتظر تھے لیکن جب آپؐ تشریف لے آئے اور وہ نشانیاں بھی ظاہر ہو گئیں تو اُلٹے پاؤں پھر گئے اور خواہشات نفسانی اور مادی فوائد ان کے ایمان کی راہ میں رکاوٹ بن گئے۔

لیکن گذشتہ اور آئندہ آیات سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ یہ آیت بھی منافقین کی بات کر رہی ہے، جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نزدیک سے دیکھا آپؐ کی حقانیت کے دلائل کا بخوبی مشاہدہ کیا اور سُنا لیکن نفسانی خواہشات اور شیطانی پھندوں میں آکر پیٹھ پھیر دی۔

"سوّل" "سُوْل" (بروزن "قفل") کے مادہ سے ہے، جس کا معنی ایسی حاجت ہے جس کے پورا ہونے کے لیے نفس انسانی حریص ہوتا ہے[1] "تسویل" کا معنی ان امور کی بابت رغبت اور شوق دلانا ہے جن کی انسان کو حرص ہوتی ہے۔ اس امر کی شیطان کی طرف نسبت ان وسوسوں کی وجہ سے ہے جو وہ انسان کے دل میں ڈالتا ہے اور اس کی ہدایت کے آگے رکاوٹ بنتا ہے۔

"املیٰ لھم" "املاء" سے ہے جس کا معنی لمبی چوڑی اور دُور دراز کی امیدیں اور آرزوئیں باندھنا ہے جو انسان

---

[1] لہٰذا بعض مفسرین نے اس کی "امید اور آرزو" کے معنی میں تفسیر کی ہے جیسا کہ سورہ طٰہٰ کی ۹۶ ویں آیت میں ہے۔ "قد اوتیت سؤلک یا موسیٰ"۔

کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں اور حق سے باز رکھتی ہیں۔

بعد کی آیت ان شیطانی تسویلات اور سجاوٹوں کی اس طرح تشریح کرتی ہے: یہ اس لیے کہ وہ ان لوگوں سے کہتے ہیں جو پیغمبر اسلام پر نزول وحی کو ناپسند کرتے ہیں، ہم بعض کاموں میں تمہاری بات مانیں گے (ذالک بانھم قالوا للذین کرھوا ما نزل اللہ سنطیعکم فی بعض الامر)۔

منافقین کا کام یہی ہوتا ہے کہ وہ غلط کار اور مخالف لوگوں کے پیچھے لگے رہتے ہیں اور اگر تمام پہلوؤں کے لحاظ سے ان میں مشترک قدریں نہ پائی جاتی ہوں تو جس حد تک بھی ان کی قدریں آپس میں مشترک ہوتی ہیں ان سے تعاون بلکہ ان کی اطاعت کرتے ہیں۔

منافقین مدینہ بھی بنی نضیر اور بنی قریظہ کے یہودیوں کے پاس آئے جو آنحضرت کی بعثت سے قبل اسلام کے مبلغ تھے۔ لیکن جب آنحضرتؐ کی بعثت ہوگئی تو حسد، تکبر اور مفادات خطرے میں پڑ جانے کی وجہ سے ظہور اسلام کو ناپسند کرنے لگے اور چونکہ پیغمبر اسلام کی مخالفت اور آپ کے خلاف سازشیں منافقین اور یہود کے درمیان قدر مشترک تھیں لہٰذا ان سے باہمی تعاون کا وعدہ کرلیا۔

"فی بعض الامر" کی تعبیر شاید اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہم صرف اس حد تک تمہارے ساتھ تعاون کریں گے۔ لیکن تم چونکہ بت پرستی کے مخالف اور روز قیامت کے معتقد ہو لہٰذا ہم ان امور میں تمہارے ساتھ نہیں ہیں۔[1]

یہ بات سورۂ حشر کی گیارہویں آیت سے ملتی جلتی ہے، جس میں کہا گیا ہے:

"الم تر الی الذین نافقوا یقولون لاخوانھم الذین کفروا من اھل الکتاب لئن اخرجتم لنخرجن معکم ولا نطیع فیکم احدا ابدا وان قوتلتم لننصرنکم"

"کیا تم نے منافقین کو نہیں دیکھا جو اپنے اہل کتاب کافر بھائیوں سے کہتے ہیں کہ اگر تم ان شہروں سے کوچ کرو گے تو ہم بھی تمہارے ساتھ آئیں گے اور تمہاری مخالفت میں کسی بھی شخص کی اطاعت نہیں کریں گے اور اگر وہ تمہارے ساتھ لڑیں گے تو ہم تمہاری مدد کریں گے۔"

آیت کے آخر میں انہیں مختصر سی عبارت کے ساتھ تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: خدا ان کی مخفی باتوں اور رازوں سے آگاہ ہے (واللہ یعلم اسرارھم)۔

ان کے باطنی کفر اور نفاق سے بھی آگاہ ہے اور یہودیوں کے تعاون سے یہ جو سازشیں تیار کرتے ہیں ان سے بھی آگاہ ہے اور وقت آنے پر انہیں سزا دے گا۔

---

[1] اس آیت کی تفسیر میں کئی اور احتمالات کا ذکر بھی کیا گیا ہے جو گذشتہ اور آئندہ آیات سے ہم آہنگ نہیں ہیں لہٰذا انہیں ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

نیز یہ بھی کہ یہود کی مخفی دشمنی وعناد اور حسد سے بھی آگاہ ہے، وہ اپنی کتاب کی گواہی کے پیش نظر پیغمبر اسلام کی نشانیوں سے اس قدر آگاہ تھے کہ انہیں ویسے پہچانتے تھے جس طرح اپنی اولاد کو پہچانتے تھے اور یہ نشانیاں آپ کے ظہور سے پہلے لوگوں کو کھلے بندوں بتاتے تھے۔ لیکن آپ کے ظہور کے بعد انہوں نے ان سب کو چھپا دیا ہے، خدا اس مخفی کام سے آگاہ ہے۔

امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ "کرھوا ما نزل اللہ" سے مراد "بنی امیہ" ہیں جو حضرت علی علیہ السلام کی ولایت کے بارے میں فرمان الٰہی کے نزول کو پسند نہیں کرتے تھے۔[1]

ظاہر سی بات ہے کہ یہ تطابق اور بیان مصداق ہے کہ آیت کا مفہوم اسی میں منحصر ہے۔

بعد کی آیت اس تہدید کی وضاحت ہے جس میں کہا گیا ہے: اس وقت ان کا کیا حال ہوگا جب موت کے فرشتے ان کے چہروں اور پشت پر ماریں گے اور ان کی روح قبض کریں گے (فکیف اذا توفتھم الملائکۃ یضربون وجوھھم وادبارھم)۔[2]

جی ہاں یہ فرشتے مامور ہیں کہ موت کے آغاز ہی میں انہیں سزا دینا شروع کر دیں تاکہ وہ کفر و نفاق اور ہٹ دھرمی و عناد کا مزہ چکھیں، ان کے چہروں پر اس لیے ماریں گے کہ انہوں نے دشمنانِ خدا کی طرف منہ کیا ہوگا اور پشت پر اس لیے کہ خدا کی آیات اور پیغمبر کی طرف پشت کی ہوگی۔

یہ بات سورۂ انفال کی ۵۰ ویں آیت سے ملتی جلتی ہے جو کفار و منافقین کے بارے میں ہے، اسی میں ہے۔

"ولو ترٰی اذ یتوفی الذین کفروا الملائکۃ یضربون وجوھھم وادبارھم وذوقوا عذاب الحریق"

"اور اگر تو کافروں کو اس وقت دیکھے کہ جب موت کے فرشتے ان کی روح قبض کرتے ہیں اور ان کے چہروں اور پشت پر مارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جلا ڈالنے والے عذاب کا مزہ چکھو"

اسی سلسلے کی آخری آیت میں بھی بوقت وفات ان پر عذاب الٰہی کی علت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ عذاب اور سزا اس لیے ہے کہ جس چیز سے خدا ناخوش ہے اس کی تو یہ لوگ پیروی کرتے ہیں اور جس میں خدا کی خوشی ہے اس سے بیزار ہیں، لہٰذا خدا نے ان کے سب اعمال کو اکارت کر دیا ہے (ذالک بانھم اتبعوا ما اسخط اللہ وکرھوا رضوانہ فاحبط اعمالھم)۔

کیونکہ تمام اعمال کی قبولیت اور ہر قسم کی سعی و کوشش منظور ہونے کی شرط اولین خدا کی رضا ہے، بنا بریں فطری بات ہے کہ جو لوگ خدا کو ناراض کرنے پر تلے ہوئے ہوتے ہیں اور اس کی رضا مندی کی مخالفت کرتے ہیں ان کے

---

[1] مجمع البیان جلد ۹ ص ۱۰۵۔

[2] "کیف" ایک مبتدا محذوف کی خبر ہے جو تقدیری صورت میں یوں ہے "فکیف حالھم ...؟"

اعمال اکارت جائیں گے اور وہ گناہوں کا بوجھ کاندھوں پر اُٹھائے اِس عالم سے اس عالم کو سدھاریں گے۔

ان لوگوں کا حال مومنین کے حالات کے بالکل برعکس ہے کیونکہ موت کے فرشتے بوقت وفات ان کے استقبال کو آتے ہیں اور خندہ پیشانی کے ساتھ انہیں کہتے ہیں: تم پر سلام ہو، اب تم اپنے انجام دیئے ہوئے اعمال کی وجہ سے بہشت میں چلے جاؤ۔ قرآن کے الفاظ میں:

"الذین تتوفاھم الملائکۃ طیبین یقولون سلام علیکم ادخلوا الجنۃ بما کنتم تعملون" (نحل/۳۲)

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ خدا کی ناراضی کے بارے میں جملہ فعلیہ "ما اسخط اللہ" آیا ہے اور اس کی رضامندی کے بارے میں جملہ اسمیہ "رضوانہ" ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ تعبیر کے اس فرق میں عجیب قسم کا لطف ہے اور وہ یہ کہ خدا کی ناراضی کبھی کبھی ہوتی ہے اور اس کی رضا و رحمت دائمی اور ہمیشہ ہے۔

یہ نکتہ بھی واضح ہے کہ خدا کے بارے میں ناراضی، غضب اور غصے کا ذکر نفسانی تاثرات کے معنی میں نہیں، جیسا کہ اس کی رضامندی روحانی خوشی کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ جیسا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"غضب اللہ عقابہ ورضاہ ثوابہ"

"خدا کا غضب اس کا عذاب ہے اور اس کی رضا اس کا ثواب ہے"[1]

---

[1] تفسیر المیزان جلد ۱۰ صفحہ ۲۶۶ بحوالہ توحید صدوق۔

۲۹۔ اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَنْ لَّنْ یُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ ○

۳۰۔ وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَیْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِیْمٰهُمْ ؕ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِیْ لَحْنِ الْقَوْلِ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ ○

۳۱۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰی نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِیْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِیْنَ ۙ وَنَبْلُوَاَخْبَارَكُمْ ○

ترجمہ

۲۹۔ کیا وہ لوگ جن کے دلوں میں مرض ہے، ان کا یہ خیال ہے کہ خدا ان کے کینوں کو ظاہر نہیں کرے گا؟

۳۰۔ اگر ہم چاہیں تو انھیں تجھ کو دکھادیں تاکہ تو انھیں ان کے چہرے مہرے سے پہچان لے اگرچہ تو انھیں ان کے اندازِ گفتگو سے پہچان سکتا ہے اور خدا تمھارے اعمال سے واقف ہے۔

۳۱۔ اور ہم تم لوگوں کو ضرور آزمائیں گے تاکہ معلوم ہو جائے کہ تم لوگوں میں صحیح معنوں میں مجاہد اور صابر کون ہیں؟ اور ہم تمھاری خبروں کو بھی آزمائیں گے۔

تفسیر

منافقین انداز گفتگو سے پہچانے جاتے ہیں:

ان آیات میں بھی ایک اور بحث کے حوالے سے منافقین کی صفات اور علامات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اور اس بات پر خاص تاکید کی گئی ہے کہ یہ لوگ یہ تصور نہ کریں کہ ہمیشہ اپنے نفاق کو رسولِ خدا اور مومنین سے چھپائے رکھیں گے اور اپنے آپ کو بہت بڑی رسوائی سے بچاتے رہیں گے۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: کیا وہ لوگ جن کے دلوں میں مرض ہے انہیں یہ خیال ہے کہ خدا ان کے شدید کینوں کو ظاہر نہیں کرے گا (ام حسب الذین فی قلوبھم مرض ان لن یخرج اللہ اضغانھم)[1]

"اضغان" "ضغن" (بروزن "حرص") اور بروزن "عقد" سخت اور شدید کینے کے معنی میں ہے۔

ان کے دل میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مومنین کے بارے میں زبردست کینہ تھا اور ہر وقت اس بات کی انتظار میں تھے کہ کوئی موقع ملے اور ان پر کاری ضربیں لگائیں، قرآن پاک انہیں متنبہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ یہ تصور نہ کریں کہ وہ ہمیشہ اپنے حقیقی چہرے کو چھپائے رکھیں گے۔

لہٰذا بعد کی آیت میں فرمایا گیا ہے: اگر ہم چاہیں تو انہیں تجھ کو دکھا بھی دیں تاکہ تو اُن کو ان کے چہرے مہرے سے پہچان لے (ولو نشاء لاریناکھم فلعرفتھم بسیماھم)۔

ہم اُنکے چہروں پر ایسا نشان لگائیں گے جسے دیکھ کر آپ ان کے نفاق سے آگاہ ہو جائیں گے اور "رأی العین" سے انہیں دیکھیں گے۔

پھر فرمایا گیا ہے: اگرچہ تو اب بھی انہیں ان کے اندازِ گفتگو سے پہچان سکتا ہے۔ (ولتعرفنھم فی لحن القول)۔

راغب مفردات میں کہتے ہیں کہ "لحن" کا معنی یہ ہے کہ لفظ کو اپنے قواعد اور اصل طریقۂ کار سے پھیر دیا جائے یا اصلی اعراب کی جگہ کوئی دوسرا اعراب دیا جائے یا صراحت سے اشارے اور کنائے کی طرف لے جایا جائے۔ زیرِ تفسیر آیت میں اس سے تیسرا معنی مراد ہے، یعنی دل کے مریض منافقوں کو اس طرح پہچانا جا سکتا ہے کہ وہ ایک صریح اور واضح معنی کو کنائے، تکلیف دہ تعبیر اور دل دکھانے کے انداز میں استعمال کرتے ہیں۔

---

[1] بعض مفسرین نے مندرجہ بالا آیت میں "ام" کو "استفہامیہ" سمجھا ہے اور بعض دوسرے مفسرین نے اسے "منقطعہ" بمعنی "بل" سمجھا ہے۔ لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

جہاں پر جہاد کی بات ہوتی ہے، وہاں پر وہ کوشش کرتے ہیں کہ لوگوں کے ارادے کمزور اور ان کے حوصلے پست کر دیں۔ جہاں پر حق اور عدالت کی بات ہوتی ہے وہاں پر وہ اسے دوسرے لفظوں میں پھیر لے جاتے ہیں اور جہاں پر نیک اور پاکیزہ اور اسلام کے پیش قدم لوگوں کا تذکرہ آتا ہے تو وہ کوشش کرتے ہیں کہ انھیں عیب دار اور کم حیثیت بنا کر پیش کریں۔

لہٰذا ابو سعید خدری سے مروی ایک مشہور روایت میں ہے:

"لحن القول بغضهم علی بن ابی طالب، وکنا نعرف المنافقین علیٰ عهد رسول الله ببغضهم علی بن ابی طالب"

"لحن القول" سے مراد علی بن ابی طالب کے ساتھ بغض ہے اور پیغمبر خدا کے زمانے میں منافق لوگوں کو ہم علی بن ابی طالب کے ساتھ دشمنی سے پہچانا کرتے تھے۔ [1]

جی ہاں منافقوں کی ایک واضح علامت یہ بھی ہے کہ وہ مسلمانوں میں سے مومن اوّل اور اوّلین جانبازِ اسلام سے دشمنی کیا کرتے تھے۔

اصولی طور پر یہ بات ممکن نہیں ہے کہ انسان کسی چیز کو دل میں چھپائے رہے اور اسے ایک طویل عرصے تک اس قدر مخفی رکھے کہ اشارات و کنایات اور "لحن القول" میں بھی اسے ظاہر نہ کر پائے۔ اسی لیے تو حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ما اضمر احد شیئاً الا ظهر فی فلتات لسانه وصفحات وجهه"

"کوئی شخص کسی چیز کو اپنے دل میں مخفی نہیں رکھتا مگر یہ کہ باتوں باتوں میں اس کے منہ سے غیر شعوری طور پر نکل جاتی ہے اور اس کے چہرے پر آشکار ہو جاتی ہے۔ [2]

قرآن مجید کی دوسری آیات میں منافقین کی تکلیف دہ باتوں کو بیان کیا گیا ہے جو اسی "لحن القول" کا مصداق ہیں، یا پھر ان کی مشکوک حرکتوں کو نقل کیا گیا ہے، شاید اسی وجہ سے بعض مفسرین نے کہا ہے کہ زیرِ تفسیر آیت کے نزول

---

[1] تفسیر مجمع البیان اسی آیت کے ضمن میں۔ ساتھ ہی ہم یہ بھی بتاتے چلیں کہ اس روایت کو اہلِ سنت کے بہت سے بزرگوں نے بھی اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے، جن میں سے چند ایک علماء اور ان کی کتابوں کے نام یہ ہیں، احمد نے کتاب "فضائل" میں، ابن عبد البر نے "استیعاب" میں ذہبی نے "تاریخ اوّل الاسلام" میں، ابن اثیر نے "جامع الاصول" میں، علامہ گنجی نے "کفایۃ الطالب" میں محب الدین طبری نے "ریاض النضرہ" میں سیوطی نے "درِ منثور" میں، آلوسی نے "روح المعانی" میں اور دوسرے بہت سے علماء نے اپنی اپنی کتابوں میں اسے درج کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسی مسلّمہ روایات میں ہے کہ جو پیغمبر اسلام سے منقول ہوئی ہے۔ (مزید تفصیل کے لیے "احقاق الحق" جلد سوم ص ۱۱۰ ملاحظہ فرمائیے)۔

[2] نہج البلاغہ کلمات قصار جملہ ۲۶۔

کے بعد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منافقین کو ان کی علامتوں سے بخوبی پہچان لیا کرتے تھے۔

اس بات کی واضح دلیل یہ چیز ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ:

"ولا تصل علیٰ احد منھم مات ابدًا ولا تقم علیٰ قبرہ"

"جب ان میں سے کوئی مر جائے تو اس پر نماز نہ پڑھیں اور اس کی بخشش کے لیے دعا کرنے کی خاطر کھڑے نہ ہوں۔" (توبہ/۸۴)

جن موقعوں پر خاص طور پر منافقین اپنے حقیقی چہرے ظاہر کیا کرتے تھے ایک جہاد کا موقع بھی تھا، جنگ سے قبل امداد کی جمع آوری کے وقت، میدانِ جنگ میں دشمن کے شدید حملوں کے موقع پر اور جنگ کے بعد تقسیم غنائم کے وقت۔ قرآن مجید کی بہت سی آیات میں خاص کر سورۂ توبہ اور سورۂ احزاب کی آیتوں میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ ایک عام مسلمان تک بھی انہیں ایسے موقع پر پہچان لیا کرتا تھا۔

آج کے دور میں بھی "لحن القول" کے ذریعے اور ان کے اہم اجتماعی مسائل خصوصاً بحرانوں اور جنگوں میں ردِّ عمل کی وجہ سے منافقین کی پہچان مشکل بات نہیں ہے اور ذرا سا غور و فکر کرنے سے انہیں ان کی رفتار اور گفتار سے پہچانا جا سکتا ہے کیا ہی بہتر ہو کہ مسلمان بیدار ہوں اور اس آیت سے ہدایت لیتے ہوئے اس خطرناک اور کینہ پرور گروہ کو پہچانیں اور اسے الم نشرح کریں۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: خدا تم سب کے اعمال کو جانتا ہے (واللہ یعلم اعمالکم)۔

بعد کی آیت میں مومنین اور منافقین میں تمیز اور پہچان کے ذرائع پر زیادہ سے زیادہ تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: اور ہم تم لوگوں کو ضرور آزمائیں گے تاکہ معلوم ہو جائے کہ تم لوگوں میں صحیح معنوں میں مجاہد اور صابر کون ہیں اور مجاہدوں کی شکل کے سست عناصر منافق کون ہیں؟ (ولنبلونکم حتّٰی نعلم المجاھدین منکم والصابرین)۔

اگرچہ اس آزمائش کا میدان وسیع اور عام ہے اور تمام فرائض کی ادائیگی کے موقع پر صبر و شکیبائی بھی اس میں شامل ہے، لیکن "مجاہدین" کے لفظ اور اوّل و آخر کی آیات کی مناسبت سے زیادہ تر میدانِ جہاد و جنگ میں آزمائش مراد ہے اور یہ ہے بھی حقیقت کہ میدان جہاد ایک عظیم اور سخت آزمائش کا مقام ہوتا ہے اور وہاں پر بہت کم ہی کوئی شخص اپنے حقیقی چہرے کو لوگوں کی نگاہوں سے چھپا سکتا ہے۔

نیز اسی آیت کے ذیل میں فرمایا گیا ہے: تمہاری آزمائش کے علاوہ "ہم تمہاری خبروں کو بھی آزمائیں گے" (ونبلوا اخبارکم)۔

بہت سے مفسرین کہتے ہیں کہ یہاں پر "اخبار" سے مراد انسانوں کے اعمال ہیں کیونکہ جب کوئی عمل انسان سے سرزد ہوتا ہے تو وہ "خبر" کے مانند لوگوں میں نشر ہو جاتا ہے۔ بعض دوسرے کہتے ہیں کہ یہاں پر "اخبار" سے مراد انسان کے اندرونی راز ہیں، کیونکہ لوگوں کے اعمال ان اسرار کی خبر دیتے ہیں۔

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ یہاں پر "اخبار" ان خبروں کے معنی میں ہو کہ جو لوگ اپنی کیفیت یا معاہدات کے

متعلق دیتے ہیں۔ مثلاً منافقین نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معاہدہ کیا ہوا تھا کہ میدان جنگ سے پیٹھ نہیں پھیریں گے۔ اور پھر انہوں نے اپنے اس معاہدے کو توڑ ڈالا۔ چنانچہ سورۂ احزاب کی ۱۵ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

"ولقد کانوا عاھدوا اللہ من قبل لا یولون الادبار"

نیز ان میں سے کچھ پیغمبر اسلام سے میدانِ جہاد سے پلٹ جانے کی اجازت مانگا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں جب کہ وہ غیر محفوظ نہیں تھے، ان کا اصل مقصد میدان سے فرار کرنا ہوتا تھا، قرآنی الفاظ میں:

"ویستأذن فریق منھم النبی یقولون ان بیوتنا عورۃ وما ھی بعورۃ ان یریدون الا فرارا" (احزاب۔ ۱۳)

تو اس طرح سے خدا تعالیٰ انسانوں کے اعمال کو بھی آزماتا ہے اور ان کی گفتار اور خبروں کو بھی۔

اس تفسیر کے مطابق زیر تفسیر آیت کے دونوں جملوں کے دو مختلف معانی ہیں جب کہ پہلی تفسیر کے مطابق یہ دونوں حصے ایک دوسرے کی تاکید کرتے ہیں۔

بہر حال یہ پہلی مرتبہ نہیں ہے کہ خداوند عالم لوگوں کو علی الاعلان فرما رہا ہو کہ ہم تمہیں آزمائیں گے تاکہ تمہاری صفیں ایک دوسرے سے نمایاں اور ممیز ہو جائیں اور حقیقی مومنین کو ضعیف الاعتقاد اور منافقین سے علیحدہ پہچانا جا سکے۔ قرآن کی بہت سی آیات میں آزمائش و امتحان کے مسئلے کو بیان کیا گیا ہے۔

ہم نے بھی پہلی جلد سورہ بقرہ کی آیت ۱۵۵ کے ذیل میں خدا کی آزمائش کے بارے میں تفصیل سے بحث کی ہے اسی طرح سورہ عنکبوت کے آغاز میں بھی (ملاحظہ ہو تفسیر نمونہ جلد ۱ اور جلد ۱۶ متعلقہ حصے)۔

ساتھ ہی یہ بتاتے چلیں کہ "حتّٰی نعلم المجاھدین منکم" (تاکہ تم میں سے مجاہدین کی شناخت ہو جائے) کا جملہ اس معنی میں نہیں ہے کہ خدا ان لوگوں سے واقف نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد خدا کے علم کا خارج میں ظہور اور ایسے افراد کو نمایاں کرنا ہے یعنی اس طرح سے خارج میں بھی خدا کا علم حقیقت کی صورت اختیار کرلے اور حقیقی مجاہدین کی صفیں بھی دوسرے نام نہاد مجاہدین سے علیحدہ ہو جائیں گی۔

۳۲۔ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَشَآقُّوا الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَھُمُ الْھُدٰی ۙ لَنْ یَّضُرُّوا اللّٰہَ شَیْئًا ؕ وَسَیُحْبِطُ اَعْمَالَھُمْ ○

۳۳۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَکُمْ ○

۳۴۔ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ مَاتُوْا وَھُمْ کُفَّارٌ فَلَنْ یَّغْفِرَ اللّٰہُ لَھُمْ ○

ترجمہ

۳۲۔ بے شک جو لوگ کافر ہو گئے اور انہوں نے لوگوں کو خدا کی راہ سے روکا، اور حق کے ظاہر ہو جانے کے بعد رسولِ خدا کی مخالفت کی تو وہ خدا کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچاتے اور وہ بہت جلد ان کے اعمال کو اکارت کر دے گا۔

۳۳۔ اے وہ لوگو جو ایمان لے آئے ہو! خدا کی اطاعت کرو اور رسولِ خدا کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو ضائع نہ کرو۔

۳۴۔ جو لوگ کافر ہو گئے اور انہوں نے لوگوں کو خدا کی راہ سے روکا پھر کافر ہی مر گئے تو خدا ان کو ہرگز نہیں بخشے گا۔

تفسیر

کفر کی حالت میں مرنے والے نہیں بخشے جائیں گے:

گذشتہ آیات میں منافقین کے بارے میں مختلف زاویوں سے گفتگو کی گئی تھی اب ان آیات میں کفار کے ایک اور ٹولے کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: بے شک جو لوگ کافر ہو گئے انہوں نے لوگوں کو خدا کی راہ سے روکا اور حق ظاہر ہو جانے کے بعد رسولؐ خدا کی مخالفت کی تو وہ خدا کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچاتے اور وہ بہت جلد ان کے اعمال کو اکارت کر دے گا (ان الذین کفروا وصدوا عن سبیل اللہ و شاقوا الرسول من بعد ما تبین لھم الھدیٰ لن یضروا اللہ شیئاً وسیحبط اعمالھم)۔

ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ وہی مشرکین مکہ ہوں یا مدینہ کے کافر یہودی ہوں یا دونوں قسم کے لوگ ہوں، کیونکہ "کفر" اور "صد عن سبیل اللہ" (لوگوں کو راہِ خدا سے روکنا) کی تعبیر قرآنی آیات میں دونوں قسم کے لوگوں کے بارے میں آئی ہے۔

"تبین الھدایت" مشرکین مکہ کے بارے میں معجزات کے ذریعے تھی اور اہل کتاب کافروں کے بارے میں ان کی آسمانی کتاب کے ذریعے سے۔

ان کے اعمال کا اکارت جانا یا تو ان کے ان نیک اعمال کی طرف اشارہ ہے جو وہ کبھی کبھار انجام دیا کرتے تھے، جیسے مہمان نوازی، مسافرین کی امداد اور انھیں کھلانا پلانا وغیرہ یا پھر ان کے اسلام کے خلاف منصوبوں کی ناکامی کی طرف اشارہ ہے۔

بہر حال ان لوگوں میں تین قسم کی صفات پائی جاتی تھیں ایک کفر، دوسری "صد عن سبیل اللہ" اور تیسری رسولؐ پاک سے دشمنی۔ پہلی صفت تو خدا کے ساتھ مخالفت پر مبنی تھی، دوسری اس کے بندوں کے ساتھ مخالفت پر اور تیسری رسولؐ اللہ کے ساتھ مخالفت پر۔

بعد کی آیت میں روئے سخن مومنین کی طرف ہے اور کفار و منافقین کے طرز عمل کو واضح کرنے کے بعد ان کے راستے کی ان الفاظ میں وضاحت کی گئی ہے، اے وہ لوگو جو ایمان لے آئے ہو! خدا کی اطاعت کرو، رسولؐ خدا کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو باطل نہ کرو (یا ایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول ولا تبطلوا اعمالکم)۔

حقیقت یہ ہے کہ مومنین کی تمام زندگی کفار و منافقین کی زندگی کے بالکل برعکس ہے کیونکہ کفار و منافقین فرمان الٰہی کی مخالفت کرتے ہیں اور مومنین اطاعت کرتے ہیں وہ رسولؐ خدا سے دشمنی کرتے ہیں اور یہ آپ کی فرمانبرداری اُن کے اعمال کفر، ریاکاری اور احسان جتانے کے ذریعے اکارت ہو جاتے ہیں جبکہ مومنین کے اعمال ان چیزوں سے خالی ہوتے ہیں اور ان کی جزا خدا کے پاس محفوظ ہے۔

بہر حال آیت کا انداز بتا رہا ہے کہ اس زمانے میں کچھ ایسے مومنین بھی تھے جو خدا اور رسولؐ کی اطاعت اور اپنے

اعمال کی حفاظت کے معاملے میں کوتاہی کیا کرتے تھے، جنہیں خداوند عالم نے ان آیات کے ذریعے خبردار کیا ہے۔

بعض فقہا نے "ولا تبطلوا اعمالکم" کے ذریعے نماز کو توڑنے کی حرمت پر استدلال قائم کیا ہے لیکن جیسا کہ گذشتہ اور آئندہ آیات اسی طرح خود یہی آیت گواہی دے رہی ہیں کہ اس کا اس معنی سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ شرک و کفر، ریاکاری اور احسان جتانے وغیرہ کے ذریعے اپنے اعمال کو باطل نہ کرنا ہے۔

اسی سلسلے کی آخری آیت، گزشتہ آیات میں کفار کے متعلق جو کچھ بیان ہو چکا ہے، ان کی وضاحت اور تاکید کے طور پر ہے اور ساتھ ہی ان لوگوں کو توبہ اور بازگشت کے رستے بتا رہی ہے جو توبہ کرنے کے لیے مائل ہوں، ارشاد ہوتا ہے: بے شک جو لوگ کافر ہو گئے اور انہوں نے لوگوں کو خدا کی راہ سے روکا، پھر کافر ہی مر گئے تو خدا ان کو ہرگز نہیں بخشے گا۔ (ان الذین کفروا وصدوا عن سبیل اللہ ثم ماتوا وھم کفار فلن یغفر اللہ لھم)

کیونکہ موت کے ساتھ ہی توبہ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور وہ اپنے کفر اور دوسروں کی گمراہی کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا کر اس دنیا سے سدھاریں گے، تو پھر انہیں کیسے معاف کیا جا سکتا ہے؟

تو اس طرح ان آیات میں مجموعی طور پر تین قسم کے لوگوں کا تذکرہ ہوا ہے، منافقین کا، کفار کا اور مومنین کا اور ان میں سے ہر ایک کی صفات اور انجام کو علیحدہ علیحدہ بیان کیا گیا ہے۔

ثواب ضائع ہونے کے اسباب:

قرآن کی مختلف آیات بشمول زیر تفسیر آیت میں جن حساس نکتوں کی طرف زیادہ توجہ دلائی گئی ہے اور خبردار کیا گیا ہے ان میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ مومنین ہوشیار رہیں کہ ان کے اعمال بھی کفار کے اعمال کی طرح اکارت نہ چلے جائیں۔ بالفاظ دیگر خود عمل ایک علیحدہ بات ہے اور اس کی حفاظت ایک اور بات۔ اگرچہ عمل بھی اہم چیز ہے لیکن عمل کی حفاظت اس سے اہم تر ہے۔ ایک پاک و پاکیزہ، صحیح و سالم اور مفید عمل وہی ہوتا ہے جو آغاز سے ہی صحیح سالم اور بے عیب ہو اور آخری عمر تک اس کی حفاظت کی جائے۔

جو اسباب و عوامل انسان کے اعمال کو خطرے میں ڈال دیتے ہیں یا انہیں نیست و نابود کر دیتے ہیں، بہت ہیں جن میں چند ایک یہ ہیں۔

۱۔ احسان جتانا اور تکلیف پہنچانا۔ جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

"یا ایھا الذین امنوا لا تبطلوا صدقاتکم بالمن والاذی کالذی ینفق مالہ رئاء الناس ولا یؤمن باللہ والیوم الاخر۔

"اے ایمان دارو! اپنے مال کے راہ خدا میں خرچ کو احسان جتانے اور تکلیف پہنچانے کے ذریعے ضائع مت کرو، اس شخص کے مانند جو اپنے مال کو لوگوں کے دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے اور خدا اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔ (بقرہ/ ۲۶۴)

یہاں پر عمل ضائع ہونے کے دو عوامل بتائے گئے ہیں۔ ایک منت جتانا اور تکلیف پہنچانا اور دوسرے ریاکاری اور کفر ہیں، پہلا عامل عمل کی انجام دہی کے بعد درپیش آتا ہے اور دوسرا اس کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ اور نیک اعمال کو آگ میں ڈال دیتا ہے۔

۲۔ **عُجب اور خود پسندی** ایک اور عامل ہے جو آثارِ عمل کو مٹا دیتا ہے۔ لہٰذا حدیث میں ہے:

"العجب یأکل الحسنات کما تأکل النار الحطب"

خود پسندی نیکیوں کو یوں ختم کر دیتی ہے، جس طرح آگ ایندھن کو۔ [1]

۳۔ حسد بھی نیکیوں کے ضائع ہونے کا ایک سبب ہے اور اس کے بارے میں بھی حدیث میں تقریباً وہی الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو عُجب و خود پسندی کے بارے میں ہیں۔

چنانچہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"ایاکم والحسد فان الحسد یأکل الحسنات کما تأکل النار الحطب" [2]

اصولی طور پر جس طرح اچھائیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں

"ان الحسنات یذھبن السیئات"

اسی طرح کبھی کبھی برائیاں بھی اچھائیوں کو بالکل بے اثر بنا دیتی ہیں۔

۴۔ **مرتے دم تک ایمان پر قائم رہنا** بقائے عمل کی اہم ترین شرط ہے، کیونکہ قرآن مجید صراحت کے ساتھ کہہ رہا ہے کہ جو لوگ بے ایمان ہو کر مرتے ہیں ان کے سارے کے سارے عمل اکارت جاتے ہیں۔ [3]

اسی سے ہم اعمال کی حفاظت کے مسئلے کی اہمیت اور مشکلات کا اندازہ لگاتے ہیں، لہٰذا ایک حدیث میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

"الا بقاء علی العمل اشد من العمل، قال وما الابقاء علی العمل؟ قال یصل الرجل بصلة وینفق نفقة للہ وحدہ لا شریک لہ، فکتب لہ سرًا، ثم یذکرھا فتمحی فتکتب لہ علانیة، ثم یذکرھا فتمحی وتکتب لہ ریاء"

"اعمال کی حفاظت خود اعمال کی بجا آوری سے زیادہ سخت ہے۔ راوی نے عرض کیا، اعمال

---

[1] تفسیر روح البیان جلد ۸ صفحہ ۵۲۲۔

[2] بحار الانوار جلد ۷۳، صفحہ ۲۵۵

[3] سورۂ زمر آیت ۶۵۔

کی حفاظت سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: انسان کبھی بخشش کرتا ہے یا راہِ خدا میں چھپ کر خرچ کرتا ہے تو اس کے نامۂ اعمال میں ایک مخفی عمل لکھا جاتا ہے۔ پھر کسی جگہ پر اس کا تذکرہ کرتا ہے تو مخفی نیکی کے بجائے ظاہری نیکی لکھ دی جاتی ہے۔ پھر ایک اور جگہ پر اسے بیان کرتا ہے تو نیکی کو مٹا کر ریاکاری لکھ دی جاتی ہے۔"[1]

زیرِ تفسیر آیت مذکورہ تمام امور کی طرف ایک اجمالی اشارہ کرتے ہوئے فرماتی ہے:

" ولا تبطلوا اعمالکم "[2]

---

[1] کافی جلد ۲ باب ریاء حدیث ۱۷۔

[2] اعمال کے ضائع ہونے کے بارے میں مزید تفصیل تفسیر نمونہ جلد دوم سورۂ بقرہ کی ۲۱۷ ویں آیت کی تفسیر میں ملاحظہ فرمائیں

۳۵۔ فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلْمِ ۖ وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ ۗ وَاللَّهُ مَعَكُمْ وَلَن يَتِرَكُمْ أَعْمَالَكُمْ ○

ترجمہ

۳۵۔ تم کبھی ہمت نہ ہارو اور دشمن کو (رسوا کن) صلح کی دعوت نہ دو تم تو غالب ہو اور خدا تمہارے ساتھ ہے اور وہ تمہارے اعمال کے ثواب میں ہرگز کمی نہ کرے گا۔

تفسیر

بے جا اور رسوا کن صلح:

گذشتہ آیات جہاد کے سلسلہ میں تھیں اور یہ آیت بھی جہاد ہی کے بارے میں ایک اہم نکتے کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور وہ یہ کہ سست اور ضعیف الایمان افراد جہاد کی سختیوں اور میدانِ جنگ کی مشکلات سے جان چھڑانے کے لیے عام طور پر "صلح" کا پرچار کرنے لگتے ہیں۔ یقیناً صلح ایک بہت اچھی چیز ہے، لیکن اپنے مقام پر۔ ایسی صلح جو اسلام کے اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کرے اور مسلمانوں کی عزت و عظمت اور شرافت کی حفاظت کرے، نہ کہ وہ صلح جو مسلمانوں کی ذلت اور خواری کا باعث بن جائے۔

اسی لیے ارشاد فرمایا گیا ہے: اب جب کہ گذشتہ احکام کو تم نے سن لیا تو اب تم ہمت نہ ہارو اور دشمن کو صلح کی دعوت نہ دو، تم برتر ہو۔ (فلا تهنوا وتدعوا الى السلم وانتم الاعلون) [1]

یعنی اب جبکہ تمہاری فتح و برتری کی علامت ظاہر ہو چکی ہے تو تم ایسی صلح کی پیش کش کر کے اپنی کامیابی کو ملیا میٹ

---

[1] "تدعوا" مجزوم ہے اور "لا تهنوا" پر اس کا عطف ہے۔ جس کا معنی یہ ہے:
"لا تهنوا ولا تدعوا الى السلم"۔

کر رہے ہو جس صلح کا معنی پیچھے ہٹنا اور شکست تسلیم کرنا ہے۔ یہ تو سستی اور کمزوری کی وجہ سے ہے، یہ ایک طرح کی بڑی آرام طلبی ہے جس کے نتائج نہایت ہی دردناک اور خطرناک ہوتے ہیں۔

اسی آیت کے ضمن میں مسلم مجاہدین کے حوصلے بلند کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے: اور خدا تمہارے ساتھ ہے اور وہ ہرگز تمہارے اعمال کے ثواب کو کم نہ کرے گا (واللہ معکم ولن یترکم اعمالکم)۔

جس کے ساتھ خدا ہے کامیابی کے تمام اسباب و عوامل بھی اسی کے پاس ہیں وہ اپنے آپ کو کبھی اکیلا نہیں سمجھتا، نہ تو کبھی سستی کا اظہار کرتا ہے اور نہ ناتوانی کا، صلح کے نام پر دشمن کے آگے ہتھیار نہیں ڈالتا، شہداء کے خون سے حاصل ہونے والے نتائج کو برباد نہیں کرتا۔

"لن یترکم" "وتر" (بروزن "سطر") کے مادہ سے ہے، جس کا معنی ہے "اکیلا"۔ اسی لیے ان لوگوں کو "وتر" (بروزن "فکر") کہتے ہیں جن کے قریبی رشتہ دار میدان جنگ میں مارے جاتے ہیں اور وہ اکیلے رہ جاتے ہیں۔ نقص اور کمی کو بھی "وتر" کہتے ہیں اور زیر تفسیر آیت میں اسی چیز کو لطیف کنایہ میں بیان کیا گیا ہے کہ خدا تمہیں اکیلا نہیں چھوڑے گا اور تمہارے اعمال کے اجر و ثواب کو تمہارے ہمراہ کر دے گا۔

خاص کر یہ تو جب تم جانتے ہو کہ جہاد کی راہ میں تم جو بھی قدم اٹھاتے ہو وہ لکھ لیے جاتے ہیں اس سے صرف یہ نہیں کہ تمہارے اجر و ثواب میں سے کچھ کمی نہیں کرتا، بلکہ اپنے فضل و کرم سے اس میں اضافہ بھی کرتا ہے۔

ہمارے ان تمام بیانات کا جو صلح کے بارے میں ہیں سورۂ انفال کی ۶۱ ویں آیت سے کوئی تضاد نہیں ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ:

"وان جنحوا للسلم فاجنح لها وتوکل علی اللہ انہ ھو السمیع العلیم"

اگر وہ صلح پر مائل ہو جائیں تو تجھے بھی صلح کر لینی چاہیئے اور خدا پر بھروسہ رکھ، کیونکہ وہ سننے اور جاننے والا ہے۔

ان میں سے کسی آیت کو دوسری کا ناسخ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

بلکہ ان دونوں کا اپنا اپنا خاص موقع ہے ایک "معقول صلح" کی طرف اشارہ ہے اور دوسرا "بے جا صلح" کی طرف ایک وہ صلح ہے جس میں مسلمانوں کے ہر قسم کے مفادات کا تحفظ کیا جاتا ہے اور دوسری وہ ہے جو فتح اور کامرانی کے نزدیک کے وقت ضعیف اور سست ایمان مسلمانوں کی طرف سے پیش کی جاتی ہے، اسی لیے سورۂ انفال والی آیت کے بعد کے حصے میں فرمایا گیا ہے:

"وان یریدوا ان یخدعوک فان حسبک اللہ"

اور اگر وہ صلح کی بات کر کے تمہیں دھوکا دینا چاہیں اور اس کے پردے میں کوئی فریب کاری کارفرما ہو تو ان کی باتوں میں ہرگز نہ آ اور نہ ہی گھبرا، کیونکہ خدا تیرا پشت پناہ ہے۔"

امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام مالک اشتر کے نام اپنے ایک فرمان میں ان دونوں قسم کی صلح کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

" ولا تدفعن صلحا دعاك اليه عدوك ولله فيه رضا "

"جب دشمن تمھیں ایسی صلح کی دعوت دیں جس میں خدا کی رضامندی ہو تو اس پیش کش کو مت ٹھکراؤ"[1]

دشمن کی طرف سے صلح کی دعوت ایک طرف سے اور خدا کی رضا کا اس میں شامل ہونا دوسری طرف سے۔ تو اس طرح سے صلح دو حصّوں میں تقسیم ہوگئی جن کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔

بہر حال مسلمان سربراہوں کو صلح و جنگ کے موقع کی پہچان کرنی چاہیئے، کیونکہ یہ ایک نہایت ہی باریک ترین اور پیچیدہ ترین مسئلہ ہے، جس میں نہایت ہی دقّت اور ہوشیاری کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ اس بارے میں ذرا سی حسابی غلطی کا ہولناک اور مہیب انجام ہوتا ہے۔

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۵۳

۳۶۔ اِنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّ لَھْوٌ ؕ وَ اِنْ تُؤْمِنُوْا وَ تَتَّقُوْا یُؤْتِکُمْ اُجُوْرَکُمْ وَ لَا یَسْئَلْکُمْ اَمْوَالَکُمْ ○

۳۷۔ اِنْ یَّسْئَلْکُمُوْھَا فَیُحْفِکُمْ تَبْخَلُوْا وَ یُخْرِجْ اَضْغَانَکُمْ ○

۳۸۔ ھٰٓاَنْتُمْ ھٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ۚ فَمِنْکُمْ مَّنْ یَّبْخَلُ ۚ وَ مَنْ یَّبْخَلْ فَاِنَّمَا یَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِہٖ ؕ وَ اللّٰہُ الْغَنِیُّ وَ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ ۙ ثُمَّ لَا یَکُوْنُوْٓا اَمْثَالَکُمْ ع ○

ترجمہ

۳۶۔ دنیاوی زندگی تو بس کھیل تماشا ہے، اگر تم ایمان رکھو اور تقویٰ اختیار کرو تو وہ تم کو پورا اجر دے گا اور (اس کے عوض میں) تم سے تمہارا مال طلب نہیں کرے گا۔

۳۷۔ کیونکہ اگر وہ تم سے مال طلب کرے بلکہ تم سے اصرار کر کے مانگے بھی تو تم بخل کرتے ہو اور وہ تمہارے غصے اور کینے کو ظاہر کرے گا۔

۳۸۔ جی ہاں! تم تو وہی لوگ ہو جو خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے بلائے جاتے ہو تو بعض تم میں سے ایسے ہیں جو بخل کرتے ہیں اور جو شخص بخل کرتا ہے تو وہ اپنے ہی سے بخل کرتا ہے اور خدا تو بے نیاز ہے اور تم سب محتاج ہو۔ اور اگر تم روگردانی کرو گے

تو خدا تمہاری جگہ پر دوسرے لوگوں کو لے آئے گا اور وہ تمہاری طرح نہیں ہوں گے۔

تفسیر

اگر تم روگردانی کرو گے تو دوسرے لوگ آجائیں گے:

ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ سورہ "محمدؐ" سورۂ جہاد ہے جو جہاد کے مسئلے سے شروع ہوتی ہے اور جہاد ہی کے مسئلے پر ختم ہوتی ہے۔

زیر تفسیر آیات جو اس سورت کی آخری آیات ہیں، اسی سلسلے میں انسانی زندگی کے ایک اور مسئلے کو بیان کر رہی ہیں اور مسلمانوں کو اطاعت الٰہی کے لیے عموماً اور مسئلہ جہاد کے لیے خصوصاً پہلے سے زیادہ شوق دلا رہی ہیں اور انہیں زیادہ سے زیادہ متحرک کر رہی ہیں اور بتا رہی ہیں کہ دُنیاوی زندگی کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے، کیونکہ جہاد سے باز رکھنے کا ایک اہم عامل دنیاوی زندگی سے مانوس ہونا اور مادی دُنیا سے دل لگانا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: دنیاوی زندگی تو بس کھیل تماشا ہے۔ (انما الحیٰوۃ الدنیا لعب ولھو)۔

"لعب" (کھیل) ایسے کام کو کہا جاتا ہے جس میں ایک طرح کا خیالی نظم و نسق پایا جائے، جس کے ذریعے ایک خیالی مقصد تک پہنچا جا سکے اور "لھو" (فضول مشغولیت و تماشا) ہر اس کام کو کہا جاتا ہے جو انسان کو اپنی طرف مشغول رکھے اور اصولی مسائل سے اس کی توجہ ہٹا دے۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ دنیاوی زندگی ایک "کھیل" تماشا اور مہمل مشغولیت ہے۔ نہ تو جس سے کوئی کیفیت حاصل ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی حال۔ نہ اس کو کوئی دوام حاصل ہے اور نہ ہی بقا، یہ تو چند گزرنے والے لمحات اور ناپائیدار لذتوں پر مشتمل ہے، جس کے ساتھ کئی طرح کا سرور درد بھی ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: اگر تم ایمان رکھو اور تقوٰے اختیار کرو، تو وہ تم کو پورا اجر دے گا اور اس کے عوض میں تم سے تمہارا مال طلب نہیں کرے گا۔ (وان تؤمنوا وتتقوا یؤتکم اجورکم ولا یسئلکم اموالکم)۔[1]

ہدایت و راہنمائی اور دنیا و آخرت میں اس قدر جزا و ثواب کے بدلے میں نہ تو خدا تم سے کسی مال کا مطالبہ کرتا ہے اور نہ ہی اس کا رسولؐ، اصولی طور پر خدا کو تو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے اور پیغمبرؐ کی ساری ضرورتیں خود خدا پوری کرتا ہے۔

اگر تمہارے مال میں سے کچھ مختصر سا حصہ زکوٰۃ اور شرعی حقوق کے نام سے تم سے لیا جاتا ہے تو وہ بھی خود تم پر ہی

---

[1] "لا یسئلکم" کا جملہ مجزوم اور جملہ شرطیہ کی جزا یعنی "یؤتکم" پر عطف ہے۔

خرچ ہوتا ہے، تمہارے یتیموں، حاجت مندوں اور مسافروں کی ضرورت یا نگہداشت کے لیے اور تمہارے ملک کا امن و امان بحال رکھنے اور استقلال اور آزادی کی حفاظت، ملک کا نظم و نسق چلانے، ملکی ضروریات کو پورا کرنے اور شہر و قصبات کو آباد رکھنے کے لیے ہے۔

بنا بریں یہ مقدار بھی خود تمہارے لیے ہے، کیونکہ خدا اور رسول تم سب لوگوں سے بے نیاز ہیں۔ تو اس طرح سے آیت کے مفہوم اور صدقات و زکوٰۃ اور راہِ خدا میں خرچ کرنے کا حکم دینے والی دوسری آیات کے مفہوم کے درمیان کوئی تناقض نہیں "ولا یسئلکم اموالکم" کے جملے کی تفسیر اور احتمال تناقض دُور کرنے کے لیے اور بھی کئی احتمالات ذکر کیے گئے ہیں چنانچہ:

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ ہدایت اور ثواب کے بدلے میں تمہارے مال سے کچھ نہیں مانگتا۔

بعض کہتے ہیں: تمہارا سارا مال تم سے نہیں مانگتا، بلکہ اس کا ایک تھوڑا سا حصہ مانگتا ہے۔

بعض دوسرے کہتے ہیں: یہ جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سب مال خدا کے ہیں اگرچہ: ع

"چند روزے ایں امانت نزد ما ست"

لیکن سب سے زیادہ مناسب وہی پہلی تفسیر ہے۔

بہر حال یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ جہاد کا ایک حصہ "جہاد بالمال" بھی ہے اور اصولی طور پر دشمن کے ساتھ ہر قسم کی جنگ کے لیے اخراجات کی ضرورت ہوتی ہے جسے باایمان اور متقی مسلمانوں اور ان لوگوں سے جمع کیا جانا چاہیئے جو دُنیا سے وابستہ اور دل بستہ نہیں ہیں، زیر نظر آیات درحقیقت اسی چیز کے لیے فکری اور علمی رستہ ہموار کر رہی ہیں۔

بعد کی آیت اکثر لوگوں کی مال و دولت سے محبت اور دلچسپی کی حد بیان کرتے ہوئے کہتی ہے: اگر وہ تم سے مال کا مطالبہ کرے بلکہ اصرار بھی کرے پھر بھی تم بخل کرو گے، بلکہ اس سے بڑھ کر تمہارے کینے اور غصے کو آشکار کرے گا (ان یسئلکموھا فیحفکم تبخلوا ویخرج اضغانکم)۔

"یحفکم"، "احفاء" کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے "مطالبے اور سوال میں اصرار کرنا" اور "احفاء" دراصل "حفاً" سے ہے، جس کا معنی ہے ننگے پاؤں چلنا۔ یہ تعبیر ایسے کاموں کے لیے کنایہ ہے جنہیں انجام دینے کے لیے انسان آخری حد تک کوشش کرتا ہے۔ اسی لیے "احفاء شارب" کا معنی مونچھوں کو آخری حد تک منڈوانا ہے۔

"اضغان" "ضغن" کی جمع ہے، جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں اس کا معنی ہے "سخت کینہ"۔

خلاصۃ الکلام یہ کہ یہ آیت بہت سے لوگوں کی مال اور مالی امور کے ساتھ سخت محبت اور دلچسپی کو ترک کرنے کی ترغیب بھی دے رہی ہے کہ چھوڑو ایسی محبت کو کہ اگر خدا بھی تم سے مال طلب کرے تو تمہیں غصہ آجاتا ہے اور کینے کا اظہار کرنے لگتے ہو۔

تو اس طرح اس تازیانۂ ملامت کے ذریعے انسان کی خفتہ رُوح کو بیدار کیا جا رہا ہے تاکہ وہ مال کی غلامی کا جوا اپنی گردنوں سے اتار پھینکیں اور اپنے آپ کو اس حد تک تبدیل کریں کہ سب کچھ دوست کی راہ میں خرچ کر دیں اور سب کچھ اس

کے لیے نثار کردیں، جس کے بدلے میں اس کے تقوٰے، رضا اور خوشنودی کو حاصل کرلیا۔

زیرتفسیر آیات میں سے آخری آیت جو سُورہ محمدؐ کی بھی آخری آیت ہے اور گذشتہ آیات میں مذکور مادی مسائل اور لوگوں کی دُنیا سے دلچسپی اور راہ خدا میں خرچ کرنے کے بارے میں ایک اور تاکید ہے: ارشاد ہوتا ہے: جان لو کہ تم وہی لوگ ہو جو راہ خدا میں خرچ کرنے کے لیے بلائے جاتے ہو تو تم میں سے بعض لوگ تو اس فرمان الٰہی کی اطاعت کرتے ہیں جب کہ بعض اور لوگ بخل کرتے ہیں (ھاانتم ھٰؤلاء تدعون لتنفقوا فی سبیل اللہ فمنکم من یبخل)۔

اس مقام پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اس سے پہلی آیات میں تو کہا جا چکا ہے کہ خدا تم سے مال کا طلب نہیں کرتا تو پھر اس آیت میں فی سبیل اللہ خرچ کرنے کا حکم کیونکر دیا جارہا ہے؟

آیت کا دوسرا حصّہ خود ہی اس سوال کا جواب دیتا ہے اور پہلے کہتا ہے: جو شخص خرچ کرنے سے بخل کرتا ہے تو وہ خود اپنے ہی لیے بخل کرتا ہے (ومن یبخل فانما یبخل عن نفسہ)۔[1]

کیونکہ اس خرچ کا نتیجہ دُنیا میں بھی تمہارے حق میں ہے اور تمہارے فائدے کے لیے ہے۔ کیونکہ طبقاتی فاصلے کم ہوجائیں گے، معاشرے میں امن وامان قائم ہوگا اور عداوت اور کینے کے بجائے پیار و محبت اور صدق وصفا کا دور دورہ ہوگا، یہ ہے تمہارا دنیاوی ثواب اور فائدہ۔

اور آخرت میں بھی وہ تمہیں درہم ودینار کے بدلے میں ایسی نعمتیں عطا فرمائے گا، جس کا انسانی ذہن میں تصوّر محال ہے اسی لیے تم جس قدر بخل کروگے، خود اپنے ہی ساتھ بخل کروگے۔

دوسرے لفظوں میں یہاں پر انفاق کا ذکر زیادہ تر جہاد کے بارے میں انفاق کے لیے ہے اور "فی سبیل اللہ" کی تعبیر بھی اسی معنی سے مناسبت رکھتی ہے اور واضح سی بات ہے کہ جس قدر بھی جہاد کے اُمور میں زیادہ امداد کی جائے گی اسی قدر معاشرے کی عزت، استقلال اور وجود کی زیادہ حفاظت کی جاسکے گی۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ: خدا غنی اور بے نیاز ہے اور تم سب اس کے محتاج ہو (واللہ الغنی وانتم الفقراء)۔

وہ تمہارے خرچ کرنے سے بھی بے نیاز ہے اور تمہاری اطاعت سے بھی۔ یہ تم ہو کہ دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اس کے لطف وکرم، رحمت وعنایت اور اس کے اجر وثواب کے محتاج ہو۔

اصولی طور پر تمام ممکن الوجود اور سوائے ذات خدا کے کل کائنات مجسم ضرورت، فقر اور احتیاج ہے اور غنی بالذات صرف اور صرف خدا ہے۔ باقی سب اپنے اصل وجود میں بھی ہمیشہ اسی کے محتاج ہیں اور لمحہ بہ لمحہ اس کے فیض وجود کے لایزال منبع سے مدد حاصل کرتے رہتے ہیں حتّٰی کہ ایک لمحہ کے لیے بھی وہ اپنے فیض کو روک لے تو تمام کائنات

---

[1] "بخل" کا لفظ کبھی تو "عن" کے ساتھ متعدی ہوتا ہے اور کبھی "علٰی" کے ساتھ پہلی صورت میں منع اور روکنے کے معنی میں ہوگا اور دوسری صورت میں نقصان پہنچانے کے معنی میں۔

ختم ہو جائے اور عالم ہستی کی عمارت دھڑام سے نیچے آگرے ۔ ع

فرور یزند قالبہا

آخری جملہ تمام مسلمانوں کے لیے تنبیہ کی حیثیت رکھتا ہے کہ تم اس عظیم نعمت کی قدر جانو کہ خدا نے تمھیں اپنے مقدس دین کا محافظ قرار دیا ہے تاکہ تم اس کے دین کے حامی اور اس کے رسولؐ کے مددگار رہو۔ اگر تم نے اس عظیم نعمت کی قدر نہ جانی "اگر تم نے روگردانی کی تو وہ یہ فریضہ کسی اور قوم کے سپرد کردے گا جو تم جیسی نہیں ہوگی" (وان تتولوا یستبدل قوما غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم)۔

یقیناً یہ بوجھ کبھی زمین پر نہیں رکھا جائے گا۔ اگر تم نے اپنے موقف کی اہمیت کو نہ پہچانا اور اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ نہ ہوئے تو خدا ایک اور قوم کو بھیجے گا اور یہ عظیم ذمہ داری اس کے کندھوں پر ڈال دے گا، وہ ایسی قوم ہوگی جو ایثار و قربانی، جاں نثاری اور فداکاری، جان و مال خرچ کرنے اور فی سبیل اللہ انفاق کرنے میں تم سے کئی درجے برتر اور بالاتر ہوگی۔

یہ ایک بہت بڑی دھمکی اور تنبیہ ہے، جس سے ملتی جلتی اور زبردست تنبیہ سورۂ مائدہ کی ۵۴ ویں اور ۵۴ ویں آیت میں بھی بیان ہو چکی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

یا ایہا الذین اٰمنوا من یرتد منکم عن دینہ فسوف یأتی اللہ بقوم یحبہم ویحبونہ اذلۃ علی المؤمنین اعزۃ علی الکافرین یجاہدون فی سبیل اللہ ولا یخافون لومۃ لائم"

"اے ایمان دارو! تم میں سے جو شخص بھی اپنے دین سے پھر گیا (وہ خدا کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا) خدا مستقبل میں ایسی قوم کو لے آئے گا جسے وہ دوست رکھتا ہوگا اور وہ بھی خدا کو دوست رکھتی ہوگی، مومنین کے آگے متواضع اور کافروں کے سامنے ڈٹ جانے والی ہوگی، وہ ایسے لوگ ہوں گے جو راہِ خدا میں جہاد کریں گے اور ملامت کرنے والوں کی ملامت سے ہرگز نہیں گھبرائیں گے۔"

یہ بات بھی نہایت قابل توجہ ہے کہ زیر تفسیر آیت کے ذیل میں اکثر مفسرین نے نقل کیا ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد کچھ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ!

"من ہؤلاء الذین ذکرہم اللہ فی کتابہ؟"

"یہ کون لوگ ہیں جن کی طرف خدا نے اس آیت میں اشارہ کیا ہے؟"

اس دوران میں سلمان بھی آپؐ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی ران پر (ایک اور روایت کے مطابق ان کے شانے پر) ہاتھ مار کر فرمایا:

ہذا وقومہ، والذی نفسی بیدہ لو کان الایمان منوطا بالثریا

لتناولہ رجال من فارس ؛

" یہ اور اس کی قوم مراد ہیں، اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اگر ایمان ثریا کی بلندیوں پر بھی ہو تو فارس کے رہنے والے کچھ لوگ اسے وہاں سے بھی حاصل کر لیں گے۔"

اس حدیث کو اور اس سے ملتی جلتی دوسری احادیث کو اہل سنت کے مشہور محدثین نے بھی اپنی کتابوں میں درج کیا ہے، جیسے محدث بیہقی اور محدث ترمذی وغیرہ۔ شیعہ و سنی مشہور مفسرین کو بھی اس سے اتفاق ہے، جیسے مفسر قرطبی، مفسر روح البیان، مفسر مجمع البیان، فخر رازی، مراغی اور ابوالفتوح رازی وغیرہ۔

تفسیر دُرِّ منثور کے مفسر نے بھی اس آیت کے ذیل میں اس بارے میں کئی حدیثیں نقل کی ہیں۔[1]

ایک اور حدیث حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے جو مندرجہ بالا حدیث رسولؐ کے تتمہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ امام فرماتے ہیں:

" واللہ ابدل بھم خیرًا منھم، الموالی ؛

" خدا کی قسم خدا نے اپنے اس وعدے کو پورا فرمایا ہے اور غیر عرب کو جو اُن سے کئی گنا بہتر ہیں ان کا جانشین قرار دیا ہے۔"[2]

اگر پُورے غور و فکر اور ہر قسم کے تعصب سے ہٹ کر تاریخ اسلام اور اسلامی علوم کا مطالعہ کریں اور عجمیوں خصوصًا ایرانیوں کے میدان جنگ و جہاد اور علوم اسلامی کی چھان بین اور ترتیب و تدوین کے حصّے کو دیکھیں تو اس حدیث کی حقیقت کا اچھی طرح پتہ چل جائے گا۔ اس بارے میں تفصیل کے ساتھ کہنے کی بہت سی باتیں ہیں۔

---

[1] تفسیر درمنثور جلد ۶ صفحہ ۔

[2] مجمع البیان جلد ۹ صفحہ ۔

خداوندا! اپنے پاک دین کی راہ میں جہاد، ایثار اور فداکاری کے لیے ثابت قدم رکھ۔
بارالٰہا! یہ عظیم اعزاز جو تو نے ہمیں بخشا ہے کہ تیرے دین پاک کے داعی ہوں ہم سے واپس نہ لے۔
پروردگارا! اس وقت جب مشرق و مغرب کے شدید طوفان تیرے پاک دین کے آثار مٹانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے، ہمیں زیادہ سے زیادہ قوت، محکم ایمان، زیادہ ایثار اور زیادہ سے زیادہ خلوص کی دولت سے مالا مال فرما۔

آمین یارب العالمین

❁

جمعۃ المبارک ۱۷ رمضان (روز فتح بدر) ۱۴۰۵ھ کو "سورۂ محمدؐ" اور تفسیر نمونہ کی اکیسویں جلد اپنے اختتام کو پہنچی۔

❁

اس جلد کا اُردو ترجمہ بتاریخ ۱۷ رجب المرجب ۱۴۰۷ھ مطابق ۱۸ مارچ ۱۹۸۷ء بروز بُدھ بوقت ساڑھے سات بجے صبح بر مکان سیٹھ نوازش علی صاحب ۱۸ ای ماڈل ٹاؤن لاہور اختتام پذیر ہُوا۔
الحمدللہ اولاً و آخراً و صلی اللہ علیٰ محمد و آلہٖ ابداً سرمداً۔

سید صفدر حسین نجفی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشاریہ

تفسیر نمونہ (اردو ترجمہ) جلد ۲۱

ترتیب و تدوین ـــــــ سید شکیل حسین موسوی

موضوعات

۱	اصول و عقائد	۴۳۸
۲	احکام	۴۴۱
۳	اخلاقیات	۴۴۱
۴	اقوام گزشتہ	۴۴۲
۵	شخصیات	۴۴۳
۶	علماء و دانشور	۴۵۰
۷	کتب آسمانی	۴۵۱
۸	کتب تاریخ تفسیر و سیرت	۴۵۲
۹	لغات قرآن	۴۵۳
۱۰	متفرق موضوعات	۴۵۸
۱۱	مقامات	۴۶۵

اصول وعقائد

اسماء اللہ

اللہ	۲۷، ۱۸۳، ۱۳۹، ۱۳۰، ۲۸۵، ۲۴۷، ۲۹۹، ۳۵۷، ۳۰۷، ۳۲۰، ۳۳۳، ۳۴۸، ۳۵۰، ۴۱۲، ۳۸۱
حکیم	۲۷، ۱۲۴، ۲۰۷، ۲۵۷، ۲۶۹
رب	۸۵، ۱۲۴، ۱۳۰، ۱۳۹، ۱۶۱، ۲۴۹، ۲۵۷، ۲۸۵، ۳۳۳، ۳۸۷
رحمان	۲۷، ۶۷، ۷۳، ۷۹، ۱۲۴، ۱۳۹، ۲۰۷، ۲۶۹، ۳۴۸
رحیم	۲۷، ۱۳۹، ۱۸۳، ۲۰۷، ۲۶۹، ۳۴۸
سمیع	۱۳۹
عزیز	۱۸۳، ۲۰۷، ۲۵۷، ۲۶۹
علی	۲۷
علیم	۲۴، ۳۳، ۱۳۹
قدیر	۳۳۳

توحید

ہم نے اسے فصیح عربی قرآن بنایا۔ اصل کتاب لوح محفوظ میں ہے۔	۲۷
زمین وآسمان کو کس نے پیدا کیا، خدائے قادر وعلیم نے، زمین کو گہوارہ پرسکون بنایا۔ نزول آب، مردہ زمین زندہ کی جوڑے سواریاں بنائیں۔	۳۳، ۳۴
ہم نے اُن کو، اُن کے آباء کو نعمتوں سے بہرہ مند کیا۔	۵۶
توحید انبیاء کا دائمی پیغام	۵۷
کیا یہ رب کی رحمت کو تقسیم کرتے ہیں؟ ہم نے معیشت کو تقسیم کیا ہے تاکہ آپس میں خدمت اور تعاون کریں۔	۶۳ تا ۶۶
ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون اور اُن کی قوم کی طرف بھیجا	۸۵، ۸۶
بیشک خدا ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے۔ اُسی کی عبادت کرو	۱۰۵
میرے بندو! آج تمہیں کوئی خوف اور غم نہیں	۱۱۰ تا ۱۱۵
ہم نے قرآن کو مبارک رات میں نازل کیا۔ ہم نے ہی محمدؐ کو بھیجا۔ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں۔	۱۳۹، ۱۴۰
ہم نے ان سے پہلے سب لوگوں کو ہلاک کر ڈالا۔ وہ مجرم تھے۔ آسمانوں اور زمین کو بے مقصد نہیں، حق کے ساتھ پیدا کیا۔ اکثر نہیں جانتے۔	۱۷۷
وہی عزیز وحکیم ہے۔	۱۸۳
تاکہ خدا اس دن ہر قوم کو اس کے عمل کی جزا دے۔	۲۲۰
خدا وہ ہے جس نے زمین وآسمان کے درمیان ہوا، پانی اور دریا، کشتیاں تمہارے لیے مسخر کر دیں۔	۲۲۱، ۲۲۲

خدا نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا۔ ۲۲۳
ہم نے آسمانوں، زمین اور ان کے درمیان ہر شے کو حق کے ساتھ پیدا کیا ۲۶۹
جو کہتے ہیں ہمارا رب اللہ ہے اور اس پر قائم ہیں انہیں کوئی خوف وغم نہ ہوگا ۲۹۰
جس خدا نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تھکا بھی نہیں۔ وہی مردوں کو زندہ کرے گا۔ وہ ہر شے پر قادر ہے۔ ۳۳۳

عدل

ہم نے اُن پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود ظالم تھے۔ ۱۲۱
ہر شخص کو اس کے کیے کا بدلہ دیا جائے گا اُن پر ظلم نہ ہوگا۔ ۲۳۳

نبوّت

ان کے پاس جو بھی پیغمبر آیا اُس کا مذاق اُڑایا گیا۔ ۲۷، ۳۱
دولت مندوں نے (پیغمبروں) سے اپنے آباء کی اقتداء کا عذر کیا۔ اگر میں بہتر دین لایا ہوں تو..... انکار، عذاب ۵۲ تا ۵۵
میں خدا کا بھیجا ہوا ہوں۔ جب وہ آیا تو ہنسی اڑانے لگے۔ ۸۵
ہم ہی نے (محمدؐ کو) بھیجا۔ ہماری طرف سے ایک حکم تھا۔ ۱۳۹
رسول تو معجزات لے کر آچکا جس سے روگردان ہوئے۔ دیوانہ کہا ۱۴۹ تا ۱۵۲
کہہ دیجئے۔ جن کی عبادت کرتے ہو انہوں نے کچھ بتایا ہے۔ ثبوت پیش کرو ۲۶۲ تا ۲۶۶
میں نیا رسول نہیں ہوں۔ خدا ظالم قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔ ۲۷۷ تا ۲۸۴
جس طرح اولوالعزم پیغمبروں نے صبر کیا۔ صبر کرو! عذاب کے لیے جلدی نہ کرو۔ ۳۳۴

امامت

ظہور امامؑ اور نزول عیسیٰ قیامت کی ایک نشانی ہیں ۱۰۳، ۱۰۴

قیامت

قیامت میں زندہ کیے جاؤ گے ۳۵
ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ جائیں گے۔ ۳۹
ظہور امامؑ اور نزول عیسیٰؑ قیامت کی ایک نشانی ہے۔ ۱۰۳، ۱۰۴
قیامت اچانک آجائے گی، خبر تک نہ ہوگی، دوست دشمن ہو جائیں گے۔ مگر پرہیزگار ایک دوسرے کے دوست ہی رہیں گے ۱۱۰ تا ۱۱۳
جس دن کا ان سے وعدہ ہے وہ آپہنچے گا۔ اعمال بد کا مزہ چکھیں گے۔ قیامت کی خبر خدا ہی کو ہے۔ سب کو اُسی کی طرف لوٹنا ہے۔ ۱۲۶، ۱۲۸
انتظار کر جب آسمان سے دھواں نکلے

گا، اس عذاب کو دور کر، رسول کو جھٹلایا، دیوانہ کہا۔ بدلہ تو سخت عذاب کے دن لیں گے۔ ۱۴۹ تا ۱۵۲

ان سب کے لیے حق، باطل سے جُدا ہونے کا دن مقرر ہے۔ کوئی کسی کی مدد نہ کر سکے گا مگر جس پر خدا رحمت نازل کرے، وہ عزیز و حکیم ہے۔ ۱۸۳ تا ۱۸۵

جو خُدا کے دنوں (قیامت) کی توقع نہیں رکھتے اُن سے درگزر کریں۔ خدا ان کے اعمال کی جزا دے گا۔ ۲۲۰

قیامت کے دن تیرا پروردگار اُن کے اختلافات کا فیصلہ کر دے گا۔ ۲۲۷

معاد کے بارے میں دہریوں کی بہانہ تراشیاں ۲۴۷

خدا زندہ کرتا ہے۔ جمع کرے گا۔ زمین و آسمان کا مالک، اہلِ باطل گھاٹے میں ہوں گے۔ کتاب حق کہتی ہے، مومنین رحمت میں داخل ہوں گے۔ ۲۵۰ تا ۲۵۶

خدا کا وعدہ حق ہے، قیامت میں کوئی شک نہیں۔ ۲۵۷ تا ۲۶۳

وہ قیامت پر ایمان نہیں رکھتے خرافات سمجھتے اور مذاق اڑاتے ہیں ۳۰۴

جب کافر جہنم میں جھونکے جائیں گے۔ کیا یہ حق نہیں ہے؟ ہاں بے شک حق ہے۔ ۳۳۳

جنت

اپنی بیویوں سمیت جنت میں داخل ہو جاؤ طلائی برتنوں میں کھانا۔ ہر شے لذیذ، راحت کی ہر شے موجود، پھل کھاؤ ۱۱۴ تا ۱۱۸

پرہیزگار امن و امان میں، باغوں میں اور چشموں میں۔ ریشمی لباس حور العین سے تزویج ہر قسم کے پھل، موت کی تمنی ختم۔ یہ خدا کا فضل ہے۔ ۱۹۲ تا ۱۹۶

پرہیزگاروں کے لیے جنت میں صاف پانی، شراب طہور، دودھ اور شہد کی نہریں ہیں ۳۸۷ تا ۳۹۱

جہنم

مجرم ہمیشہ عذاب جہنم میں رہیں گے عذاب کم نہ ہوگا۔ مایوس ہو کر موت کی آرزو کریں گے۔ تمہیں اسی حال میں رہنا ہے۔ ہمارے رسول اور فرشتے اُن کے پاس ہیں اور لکھتے جاتے ہیں۔ ۱۲۰ تا ۱۲۳

تھوہر کا درخت۔ پگھلی ہوئی دھات کی طرح پیٹ میں ابال کھائے گا کھولتا ہوا پانی۔ مجرم کو جہنم میں پھینک دو۔ سر پر کھولتا ہوا عذاب ڈالو۔ مزا چکھ تُو تو طاقت ور تھا۔ ۱۸۶ تا ۱۹۰

جہنم ان کے پیچھے ہی پیچھے ہے یعنی وہ جہنم سے بچ کر نہیں جا سکتے وہ پیچھے لگا ہوا ہے۔ ۲۱۴ تا ۲۱۷

کافر جہنم کے سامنے لائے جائیں گے۔ تم اپنی زندگی میں مزے لوٹ چکے، آج سزا ملے گی۔ ۳۰۸
کافروں کو جہنم میں کھولتا ہوا پانی ملے گا جو آنتوں کو کاٹ ڈالے گا۔ ۳۹۷ تا ۳۹۱

معجزہ

ہم جو آیت (معجزہ) دکھاتے تھے وہ پہلے سے بڑھ کر اور اہم ہوتا تھا ۸۵
اُن کے پاس روشن معجزات اور دلائل کے ساتھ رسول آچکے ۱۴۹
میں واضح دلائل لے کر آیا ہوں" واضح معجزات اور دلائل" ۱۵۸
قریش نے آنحضرت سے معجزات طلب کیے۔ آپ نے بعض معجزات اُنہیں دکھائے ۱۷۵

احکام

عبادت

بے شک خدا ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے اسی کی عبادت کرو۔ ۱۰۵

جہاد

شہداء کا بلند مقام ۳۵۹، ۳۶۲
اسلام میں جنگ کے مقاصد ۳۶۲
تم خدا کی مدد کرو گے وہ تمہاری مدد کرے گا ۳۷۶
منافقین جہاد کے نام سے بھی ڈرتے ہیں ۴۰۳

اخلاقیات

اخلاق حسنہ

اگر میں تمہارے اجداد کے دین سے بہتر دین کی ہدایت کروں تو ..... اُن کے دین کو بُرا نہیں کہا صرف اپنے دین کو بہتر کہا ۵۴
نعمتوں کے موقعہ پر خدا کی یاد، عطاء نعمت پر حمد و شکر ۳۵، ۴۰
بہشتی انسان کی صفات ۲۹۹

اخلاق رذیلہ

شیاطین ان لوگوں کو راہِ خدا سے روکتے ہیں وہ اس خیال میں ہیں کہ ہم ہی ہدایت یافتہ ہیں۔ ہمارے پاس آئے گا تو کہے گا تو کیا ہی بُرا ساتھی ہے۔ ۷۴ تا ۷۸
اپنی قوم کو احمق بنایا۔ لوگوں نے اس کی اطاعت کی بیشک وہ بدعمل تھے ۹۰، ۹۱
فرعون نے عوام کو گمراہ کرنے کے لیے موسیٰ کی تحقیر کی ۹۱ تا ۹۴
کہیں شیطان تمہیں راہ خدا سے روک نہ دے وہ تمہارا دشمن ہے ۹۸

جن لوگوں نے ظلم کیا۔ اُن پر دردناک عذاب کا افسوس ہے ۱۰۵
تم میں سے اکثر حق کو ناپسند کرتے تھے ۱۱۹
والدین کے حقوق پامال کرنے والے ۳۰۲
منافقین انداز گفتگو سے پہچانے جاتے ہیں ۴۱۸ تا ۴۲۱

اقوامِ گزشتہ

بنی اسرائیل

ہم نے بنی اسرائیل کو عذاب سے نجات دلائی، منتخب کیا، برتری دی، اپنی نشانیاں دیں۔ کفرانِ نعمت کیا، سزا پائی ۱۶۹
کتاب، حکومت اور نبوت عطا کی، پاکیزہ رزق دیا اور لوگوں پر فضیلت دی، ظلم و برتری کی خواہش کی، اختلاف کیا ۲۲۶
بنی اسرائیل کی ناشکری، نعمات کی تفصیل ۲۲۷ تا ۲۳۲

تبع

یمن کے تبع بادشاہوں کے زمانے کی قوم ۱۸۰

ثمود

حجر نامی سرزمین میں رہتی تھی۔ ۳۱ ۳۲۳۰

جنّ

جب رسول پاکؐ طائف سے واپس ہوئے تو جنوں کے ایک گروہ نے نماز کے دوران آپ کی تلاوت سُنی اور ایمان لائے ۳۲۸

سبا

سرزمین یمن میں سبا قوم رہتی تھی ۳۲۳

عاد

ہودؑ نبی نے سرزمین احقاف میں اپنی قوم عاد کو ڈرایا ۳۱، ۳۱۳
ہم نے عاد کو وہ قدرت و طاقت دی تھی جو تمہیں (قریش) کو نہیں دی۔ عذاب کے وقت آنکھوں، کانوں اور عقول نے کچھ فائدہ نہ دیا ۳۲۰

قومِ شعیبؑ

سرزمین مدین میں رہتی تھی ۳۲۳

قوم فرعون

ایک بزرگوار پیغمبر آیا، میں رسولِ امین ہوں اگر ایمان نہیں لاتے تو دوسروں کو منع تو نہ کرو ۱۵۶ تا ۱۶۰

قوم لوط

راہِ شام میں رہتی تھی ۳۲۳

شخصیات

ابراھیم

جس نے مجھے پیدا کیا وہی میری رہنمائی کرے گا۔ میں بیزار ہوں جس کی تم عبادت کرتے ہو۔ کلمۂ توحید کو اپنی اولاد کیلئے برقرار رکھا تاکہ وہ خدا کی طرف رجوع کریں۔ ۵۶

قوم نے ابراہیمؑ کو رجم (سنگساری) کی دھمکی دی۔ ۱۵۹

تم اور تمہارے خدا قیامت میں ایک دوسرے سے کافر ہو جاؤ گے اور لعنت کرو گے ۲۷۶

ابن سینا

دورِ قدیم کا ایک ماہر و مشہور طبیب ۲۵۹

ابوجہل

نے رسول پاک سے کہا کہ "اپنے جدِ قصی بن کلاب کو زندہ کرلا تاکہ ہم اُس سے حالات موت دریافت کریں۔ ۱۶۴، ۲۱۶

ابوحمزہ ثمالی

سورۂ دخان کی تلاوت کے ثواب میں امام باقرؑ کی حدیث بیان کی۔ ۱۳۸

ابوذر غفاری

آپ اور قبیلہ غفاری کے اسلام لانے پر آیت ۱۰ احقاف کی شان نزول ۲۸۳

ابوسعید خدری

لحن القول سے مراد علیؑ سے بغض ہے ۱۵۵، ۴۱۹

ابوشاکر دیصانی

(فرقہ دیصانیہ کا عالم) ہشام بن حکم سے ھوالذی فی السماء الٰہ و فی الارض الٰہ کے معنی دریافت کیے ۱۲۸

ابولہب

نزدیک ترین رشتہ دار ہونے کے باوجود رسولؐ پاک کا صفِ اوّل کا دشمن تھا ۳۳۹

ابومالک اشعری

اللہ نے تین چیزوں سے ڈرایا، دھواں دابۃ الارض، دجال (رسولؐ پاک) ۱۵۴، ۱۵۵

اسعد ابوکرب

یمن کے تبع بادشاہوں میں کا ایک ۱۸۰

بلال

نیک دل، مفلس سادہ لوگ ابتداءِ اسلام لائے (سورہ احقاف آیت ۱۰ کی شانِ نزول میں) ۲۸۶

جابر بن عبداللہ

عیسیٰؑ اُتریں گے مسلمانوں کا امیر نماز کی امامت کرے گا (رسولؐ) ۱۰۳

جالینوس

دورِ قدیم کا ایک مشہور دماہر طبیب ۲۵۹

جعفرؑ بن محمدؐ صادق

دنیا میں جو بھی دوستی خدا کے لیے نہ ہوگی روزِ قیامت دشمنی میں بدل جائے گی ۱۱۳،۱۱۴

آسمانوں میں اور زمین میں جگہ جگہ اِلٰہ اور معبود وہی ہے ۱۲۸،۱۲۹

مبارک رات سے شبِ قدر مراد ہے جس میں قرآن نازل ہوا ۱۴۳

یحییٰ بن زکریاؑ اور حسینؑ بن علیؑ پر آسمان روتا رہا ۱۶۶،۱۶۷

تبع نے اوس خزرج سے کہا تم یہیں رہ جاؤ پیغمبر کا ظہور ہو جائے گا اگر مجھے اُس کا زمانہ نصیب ہوتا تو میں اُس کی خدمت کرتا ۱۸۰

اگر خدا نے قرآن کو آسان نہ کر دیا ہوتا تو کوئی بھی اُس کا ایک حرف زبان پر نہ لا سکتا یہ خدائے ازلی و ابدی کا کلام ہے ۲۰۱

جو سورہ جاثیہ کی تلاوت کرے گا، آتشِ جہنم کو نہ دیکھ پائے گا، رسول پاک کی ہم نشینی نصیب ہوگی ۲۰۶

خواہشات نفسانی سے ایسے بچو جیسے دشمن سے بچتے ہو ۲۲۱

ان پیشواؤں نے حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دے دیا ۲۳۸

تین قسم کے لوگ ظالم۔ بادشاہوں کے ساتھی، نفس پرست، واضح ارتکاب گنہگار ۲۴۲

جو شخص ہر جمعہ یا ہر رات احقاف کی تلاوت کرے خدا اُس سے دنیا کی وحشت اور خوف اُٹھا لیتا ہے اور قیامت کی وحشت سے بھی امان میں ہے۔ ۲۶۹

انبیاء و مرسلین کے سردار پانچ ہیں، نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور محمدؐ ۳۳۸

جو سورۂ محمدؐ کو تلاوت کرے گا شک و شبہ اُس کے دین میں کبھی داخل نہ ہوگا۔ ہمیشہ اللہ اور محمدؐ کی امان میں رہے گا۔ ۳۴۶

جو راہِ خدا میں مارے جاتے ہیں یا معرفتِ خدا، رسول اور اہل بیت کے حامل اپنی طبعی موت مرتے ہیں شہید ہیں ۲۶۲

مومن غلام سات سال کے بعد آزاد ہے، سات سال سے زائد اس سے خدمت لینا حلال نہیں۔ ۳۷۰

میرے والد مشکل کام میں غلام کی خود مدد فرماتے تھے۔ ۳۷۲

تمہارے پاس دل بھی ہے اور کان بھی۔ خدا جس کو ہدایت کرتا ہے اُس کے دل اور کان کھول دیتا ہے۔ ۴۱۱

جو (بنی اُمیہ) حضرت علیؑ کی ولائت کے بارے میں نزولِ فرمانِ الٰہی کو پسند نہیں کرتے ۴۱۵

خدا کا غضب اُس کا عذاب اور رضا اُس کا ثواب ہے ۴۱۶
خُدا نے اپنا وعدہ پورا فرمایا جو اُن سے کئی گنا بہتر تھے اُنہیں جانشیں مقرر کیا ۴۳۵

حذیفہ یمانی

علاماتِ قیامت، ظہورِ دجال، نزولِ عیسیٰ عدن سے آگ اٹھانا اور دھواں۔ (رسولؐ پاک) ۱۵۴

حسینؑ بن علیؑ

اے زمانے تجھ پر افسوس ہے تو اچھا دوست ثابت نہیں ہوا۔ ۲۴۶

ذی نیّرہ

ایک رومی کنیز جو کہ مکہ میں رہتی تھی مسلمان ہوگئی۔ ابوجہل نے اس پر تشدد کیا ۲۸۶

شامول

یہودیوں کا سب سے بڑا عالم جس نے تبع سے گفتگو کی ۱۸۱

شعیبؑ نبی

آپ کی قوم نے رجم (سنگساری) کی دھمکی دی ۱۵۹

شیبہ بن ربیعہ

طائف کی راہ میں ان کے سرسبز باغ تھے ۳۲۷

شیطٰن

جو رحمٰن کی یاد سے روگردانی کرتا ہے ہم اُس کے لیے شیطٰن مقرر کر دیتے ہیں جو اُسے راہ خدا سے روکتا رہتا ہے کیا بُرا ساتھی ہے۔ ۷۳ تا ۷۸

صہیب رومی

نیک دل مگر سادہ مفلس لوگ ابتداءً اسلام لائے۔ احقاف کی آیت ۱۱ کی شان نزول میں جن کا ذکر ہوا۔ ۲۸۶

عائشہؓ (زوجہ رسولؐ)

مروان سے کہا کہ تو ابھی پُشت پدر میں تھا کہ رسولؐ پاک نے تجھ پر لعنت کی ۳۰۶

عبداللہ بن زبعری

محفل سے رسولؐ پاک کے چلے جانے کے بعد آیا اور عیسیٰ کا معبود ہونا بیان کیا۔ ۹۸

عبداللہ بن سلام

ایک یہودی عالم جس نے رسولؐ پاک کی تصدیق کی تو یہودیوں نے اُسے گالیاں دیں اور جھوٹا کہا۔ ۲۸۳، ۲۸۴

احقاف آیت ۱۰ کی شان نزول میں بھی آپ کا ذکر ہے ۲۸۷

عبداللہ ابن عباس

اگر مدت حمل نو ماہ ہو تو رضاعت اکیس ماہ ہونی چاہیئے۔ مدت حمل چھ ماہ ہو تو رضاعت دو سال ہے۔ ۲۹۵

چالیس سال کی عمر میں بھی جس کی نیکی برائی پر غالب نہ آئے وہ جہنم کے لیے آمادہ ہو ۲۹۶

اولوالعزم پیغمبر پانچ ہیں ۳۳۸

جنگ اُس وقت تک جاری رہے گی جب تک زمین پر ایک بھی بت پرست مشرک باقی ہے۔ ۲۵۷

عبدالرحمان بن ابوبکر

دوست دار علیؑ تھا۔ مروان کو یزید کے لیے بیعت لینے پر جھڑکا ۳۰۶

عتبہ بن ربیعہ

طائف کی راہ میں ان کے سرسبز باغ تھے ۳۲۷

عدّاس

عتبہ و شیبہ بن ربیعہ کا عیسائی غلام تھا جسے انگور دے کر رسولؐ پاک کی خدمت میں بھیجا۔ آپ کی تبلیغ سے وہ مسلمان ہوگیا ۳۲۷

علیؑ ابن ابی طالبؑ

غلط اقدار کی نفی پر دو خطبات ۶۹، ۷۰

دو قسم کے لوگ ہلاک ہوئے ایک وہ جنہوں نے مجھے خدا جانا دوسرے وہ جنہوں نے الزامات لگائے ۱۰۸

دنیا کی بقا تک علماء زندہ ہیں۔ وہ موجود نہیں لیکن آثار دلوں میں زندہ ہیں ۱۱۵

نوشیرواں کے آثار پر ایک ساتھی نے شعر پڑھا۔ فرمایا یہ کیوں نہ پڑھا فمابکت۔ ۱۶۷، ۱۶۸

(روایات اہل بیت سے) الا من رحم اللہ سے امیرالمومنین مراد ہیں ۱۸۵

پوچھا کونسی طاقت غالب ہے۔ فرمایا خواہشات نفسانی ۲۴۱

خدا کی طرف سے کچھ فرشتے روزانہ نازل ہوکر بنی آدم کے اعمال لکھتے ہیں ۲۵۴

بھنی ہوئی کلیجی نرم روٹی افطار کے وقت پیش کی گئی سائل آیا۔ آپ نے اُسے دے دی۔ ۳۱۲

جو معرفت خدا و رسول و اہلبیت رکھتے ہوئے اپنے بستر پر بھی مرے وہ شہید ہے۔ ۳۶۲

اپنے ہاتھوں کی کمائی سے ایک ہزار غلام آزاد کیے ۳۶۹، ۳۷۰

(قنبر سے فرمایا) مجھے خدا سے شرم آتی ہے کہ تجھ سے بہتر لباس پہنوں ۳۷۲

قرآن کی ترتیل سے سوچ سمجھ کر تلاوت کرنا اور اپنے درد کی دوا اس میں تلاش کرنا اہل ایمان کا شیوہ ہے ۴۱۰، ۴۱۱

بات دیر تک دل میں چھپی نہیں رہتی یکایک زبان پر آہی جاتی ہے۔ ۴۱۹

جب دشمن ایسی صلح چاہیں جس میں خدا کی رضا ہو تو نہ ٹھکراؤ (مالک اشتر سے) ۴۲۹

علی ابن الحسین

(فرمانِ خدا) کوئی بندہ میری خواہشات کو اپنی خواہشات پر مقدم نہیں کرتا مگر یہ کہ میں اُس کی تمام تر توجہات کو آخرت کی طرف مبذول کر دیتا ہوں۔ ۲۴۱

اولوالعزم پیغمبر پانچ ہیں نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ اور محمد علیہم السلام کیونکہ مشرق و مغرب، جن وانس کے لیے مبعوث ہوئے۔ ۳۳۷

تم کسی کو اسیر کرو۔ سواری نہ ہو اور وہ پیدل نہ چل سکے تو اُسے رہا کر دو ۳۶۵

ایک غلام کو آزاد کرنے کا واقعہ ۳۷۰

علیؑ بن موسیٰؑ رضا

سب سے پہلے شہید ہی بہشت میں جائیں گے ۳۶۲

عمار

نیک دل مگر سادہ مفلس لوگ ابتداءً اسلام لائے (شان نزول احقاف آیت ۱۱) ۲۸۶

عمرؓ بن خطاب (صحابی)

مشیر برامام ابراہیم کا واقعہ ۳۱۱، ۳۱۲

عیسیٰ ابن مریم نبی

میں دانائی لایا ہوں خدا سے ڈرو اطاعت کرو۔ کچھ لوگوں نے انہیں خدا سمجھا۔ اُن پر عذاب کا افسوس ہے ۱۰۵ تا ۱۰۹

آپؑ کے قتل کی نسبت زمانہ (دہر) کی تعبیر استعمال ہوئی ہے۔ ۲۴۷

فرعون

فرعون اور اُس کے ساتھی سرداروں نے مذاق اُڑایا ۸۵ تا ۸۹

مصر کی حکومت میری۔ دریا میرے حکم میں۔ موسیٰ کے پاس سونے کے کنگن کیوں نہیں آخر ہم نے اُسے غرق نیل کر دیا۔ ۹۶

وہ متکبر اور تجاوز کرنے والوں میں سے تھا ۱۶۹

قصی بن کلاب

حضور پاک کے جدِ امجد جنہیں زندہ کرنے کی ابوجہل نے طنزاً خواہش کی تھی۔ ۱۷۴

محمد بن عبداللہؐ (رسول پاک)

اگر خدا کے نزدیک دنیا کا وزن مچھر کے پر کے برابر ہوتا..... ۷۰

عیسیٰ اُتریں گے اور مسلمانوں کا امیر امام جماعت ہوگا ۱۰۳

تمہارا کیا حال ہوگا جب ابن مریم نازل ہونگے ۱۰۳

قیامت اچانک واقع ہوگی لوگ اپنے کاموں میں مشغول ہوں گے ۱۱۴،۱۱۱
تمہیں جنت میں تمہاری پسند کی چیز ملے گی۔ آنکھیں لذت اٹھائیں گی جنتی درخت سے ایک پھل توڑے گا تو اُس کی جگہ دو اور پیدا ہو جائیں گے۔ ۱۱۸،۱۱۷
جو شب و روز جمعہ میں تلاوت "دخان" کرے اللہ اُسے جنت میں گھر دے گا ۱۳۸
جو شخص رات کو سورہ دخان پڑھے اُس کے لیے ستر ہزار فرشتے استغفار کریں گے ۱۳۸
قیامت کے نزدیک دجال کا ظہور عیسیٰ کا نزول عدن سے آگ اور آسمان پر دھواں چھا جائے گا جو چالیس روز تک رہے گا ۱۵۴
قیامت کی دس نشانیاں بذریعہ جناب امیر حدیث ۱۵۵
آسمان کے ایک دروازہ سے مومن کے اعمال اوپر جاتے اور دوسرے سے رزق نازل ہوتا ہے وہ مر جائے تو دونوں دروازہ گریہ کرتے ہیں ۱۶۷
تبع کو برا نہ کہو وہ ایمان لا چکا تھا ۱۶۷
جو جاثیہ کو تلاوت کرے اللہ اُس کے عیب چھپا لے گا۔ خوف اطمینان سے بدل جائے گا ۲۰۵،۲۰۶
ایام اللہ خدا کی نعمتوں کے دن ہیں آزمائش ابتلاؤں کے ذریعہ ہوتی ہے ۲۲۴
زمانہ کو گالیاں نہ دو خدا ہی زمانہ ہے فرزند آدم زمانہ کو گالی دے تو مجھے تکلیف ہوتی ہے میں زمانہ ہوں ۲۴۶
جو احقاف کی تلاوت کرے آیت کے ہر ذرے سے دس گنا نیکیاں ملیں گی ۲۶۸
شیطان اُن کے منہ پر ہاتھ پھیرتا ہے جو چالیس سال کے ہو کر بھی توبہ نہیں کرتے ۲۶۹
کس سے نیکی کروں؟ فرمایا ماں سے پھر ماں سے، پھر ماں سے پھر باپ سے ۲۹۹،۳۰۰
ایسے لوگ جن کے طیبات دنیا میں دیے گئے۔ ہمارے طیبات آخرت کا ذخیرہ ہیں۔ ۳۱۲
دنیا اور آخرت میں پلک جھپکنے کا فاصلہ ہے۔ ۳۳۸،۳۳۹
آپؐ صبر و استقامت کا نمونہ تھے ۳۳۹تا۳۴۲
سورۂ محمدؐ کا قاری انہار جنت سے سیراب ہوگا ۳۴۶
میری بعثت سے لے کر آخری مسلمان دجال سے لڑتا رہے گا۔ جہاد جاری رہے گا۔ ۳۵۷
شہادت سے بڑھ کر کوئی نیکی نہیں۔ مجاہدین دربان بہشت کے قائد ہوں گے ۳۶۰
عرصہ محشر میں انبیا بھی شہدا کے احترام میں سواریوں سے اتر جائیں گے ہر شہید ستر ہزار لوگوں کی شفاعت کرے گا ۳۶۱
جو حصول علم کے راستے میں مر جائے وہ شہید ہے ۳۶۲
غلاموں کی آزادی کے لیے جبرئیل مجھ سے بار بار سفارش کرتے رہے ۳۷۱
جس شخص کا بھائی اُس کے زیر دست ہے

جیسا خود کھائے اُسے بھی کھلائے ۳۷۲
اللہ تین گناہ معاف نہ کرے گا۔ زوجہ کے
مہر کا انکار، مزدوری غصب کرنا اور آزاد کو فروخت کرنا ۳۷۳، ۳۷۴
مشرک نے تلوار کھینچ کر کہا اب آپ کو کون بچائے گا۔ فرمایا اللہ ۳۸۰
تو محبوب شہر ہے۔ اگر یہ نکالتے تو میں تجھے نہ چھوڑتا (ابن عباس) ۳۸۴
دو نگلیاں اٹھا کر میری بعثت اور قیامت ان دو کی طرح متصل ہیں۔ ۳۹۵
فقدان علم، جہالت، شراب اور زنا کی کثرت قیامت کی نشانیاں ہیں ۳۹۶
قرب قیامت پر آپ کی حدیث عمدہ ۳۹۷
مغرب کے درمیانی وقت کی شان
اشراط الساعت پر حدیث سلمان فارسی سے طویل گفتگو ۳۹۹ تا ۴۰۲
شرابی، جادوگر اور قطع رحمی کرنے والے ہرگز جنت میں داخل نہ ہوں گے ۴۰۸
جس طرح نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں اسی طرح برائیاں نیکیوں کو مٹا دیتی ہیں ۴۲۵
اُمت میں بہتر دین لوگوں سے کون مراد ہیں؟
(۱) مسلمان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر یہ اور اس کی قوم ۴۳۴، ۴۳۵

محمد بن علیؑ (باقرؑ)

فرض و نفل نمازیں دخان کی تلاوت دیں ہاتھ میں نامہ عمل، قیامت میں مال زیر سایہ عرش مقام ۱۳۸
مبارک رات شب قدر ہے ۔۔۔
ہی مرتبہ بیت المعمور کی طرف اٹھایا گیا ۴۳
پھر درجہ بدرجہ ۲۳ سال تک نزول
یہود و نصاریٰ اپنے پیشواؤں کے لیے نماز روزے بے جا نہیں لائے نا پیشواؤں ۳۳۹
نے حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دیا
گزشتہ انبیاء داؤد یار کا باقی ماندہ علم ۳۷۴
آپ نے علوہ کھانے سے انکار کیا اور آیہ اذھبتم طیباتکم ۳۱۲
تلاوت فرمائی
کوئی قطرہ خدا کو خون (شہید) کے قطرے سے زیادہ محبوب نہیں ۳۶۱، ۳۷۰
جاؤ تم آزاد ہو مجھے پسند نہیں کہ اہل جنت سے خدمت لوں ۳۷۰
ان لوگوں نے ہر اُس چیز کو ناپسند کیا جو خدا نے علیؑ کے حق میں نازل کی ۴۱۵، ۴۷۹
اعمال کی حفاظت اعمال کی بجا آوری سے زیادہ سخت اور مشکل ہے ۴۲۵، ۴۲۶

مروان بن حکم

معاویہ کے دور میں مدینہ کا گورنر جس نے یزید کے لیے بیعت لینا چاہی ۳۰۶

موسیٰ بنی

میں تمہاری طرف رب العالمین کا رسول ہوں ۸۵ تا ۸۹

میں تمہارے لیے واضح دلیل لے کر آیا ہوں۔ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دو ۱۵۸

میرے بندوں کو لے کر نکل جاؤ۔ دریا کو کھلا چھوڑ دو۔ غرق ہونے والا لشکر۔ باغات و چشمے چھوڑ گئے ۱۶۱ تا ۱۶۵

جو کتاب موسیٰ پر نازل ہوئی پیشوا اور رحمت تھی۔ بعد کے انبیاء کو واضح طور پر بیان کیا ۲۸۹

نضر بن حارث

یہی محمد رسول اللہ کے پاس (مسجد الحرام میں) بیٹھا تھا نضر اور دیگر چند قریش نے کہا کہ محمد جو کہتا ہے ہمیں اس کی سفارش کی ضرورت نہیں۔ ۳۳، ۲۱۶

نوحؑ نبی

قوم نے رجم (سنگساری) کی دھمکی دی ۱۵۹

ولید بن مغیرہ

مسجد الحرام میں رسول پاک کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ۹۸

ولید اور ابوجہل کا مکالمہ ۲۴۲

ہشام بن حکم

ابوشاکر دیصانی نے ایک آیت کے معنی دریافت کیے ہشام صحیح جواب نہ دے سکا۔ ۱۲۸

ہودؑ نبی

ہود کی داستان یاد دلاؤ جب عاد کو احقاف میں ڈرایا ۳۱۴

علماء و دانشور

آلوسی (مفسر صاحب روح المعانی) ۴۱۹

ابن اثیر ۴۱۹

ابن اعرابی ۳۵۵

ابوالفتوح رازی (مفسر روح الجنان) ۳۰۶، ۴۳۵

بیہقی ۴۳۵

ترمذی ۴۳۵

جرجی زیدان (عیسائی مورخ) اسلام غلاموں کے ساتھ مہربان ہے ۳۷۳

راغب ۴۹، ۱۴۳، ۱۵۰، ۱۵۵، ۱۵۷، ۱۸۷، ۲۲۰، ۲۵۵، ۳۲۹، ۳۳۶، ۳۵۰، ۳۵۲، ۴۱۸

زمخشری ۲۸۸، ۳۴۹

سیوطی۔ مفسر صاحب درمنثور ۴۱۹

طباطبائی ۲۹۸

طبرسی ۱۱۶، ۱۲۹، ۲۱۳، ۲۴۷، ۲۹۰

فخر الدین رازی ۱۵۲، ۲۹۸، ۴۳۵

قرطبی ۲۸۷، ۴۳۵

گنجی علامہ ۴۱۹

مجلسی علامہ ۱۴۴

مقداد (فاضل) ۳۶۵

کُتبِ آسمانی

انجیل

قرآن تورات اور انجیل کی تصدیق کرتا ہے ۲۸۹

توراۃ

تورات جو موسیٰ پر نازل ہوئی وہ لوگوں کے لیے پیشوا اور رحمت تھی۔ بعد کے انبیاؑ کے اوصاف بیان کیے ۲۸۹

قرآن پاک

سورہ زخرف کے مضامین

توحید، نبوت، شرک کے خلاف جہاد اور معاد ۲۵

زخرف کی تلاوت کے فضائل

قاری سورہ سے خطاب ہوگا آج تم پر خوف ہے نہ غم بے حساب جنت میں داخل ہو جاؤ (رسول پاک) ۲۶

ہم نے قرآن کو فصیح عربی میں اتارا، یہ ہمارے پاس لوح محفوظ میں ہے کیا واپس لے لیں کہ تم مسرف ہو؟ ۲۷، ۲۸

قرآن ان دو شہروں کے کسی دولت مند پر کیوں نازل نہ ہوا ۶۲ تا ۶۶

زخرف آیت ۵۸ وَلَمَّا ضُرِبَ ابن .... شان نزول ۸۹، ۹۰

سورہ دخان کے مضامین

مبدا و معاد، قرآن کے بارے میں گفتگو، توحید اور کائنات میں خدا کی عظمت اور نشانیاں۔ ۱۳۷

ثوابِ تلاوت سورہ دخان

رسول پاک اور آئمہ کی احادیث قاری کے لیے ستر ہزار فرشتے استغفار کریں گے۔ نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں ۱۳۸

اس واضح کتاب کی قسم جسے ہم نے مبارک رات میں نازل کیا ۱۳۹

ہم نے یہ قرآن آسان کر دیا۔ تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں اگر نصیحت حاصل نہ کریں تو تم کامیابی کے اور وہ شکست کے خطرہ میں ۱۹۹ تا ۲۰۱

سورہ جاثیہ کے مضامین

یہ مکی سورہ توحید، قرآن کی عظمت اور گمراہوں کی تنبیہ پر مشتمل ہے ۲۰۵

ثواب تلاوت سورہ جاثیہ

اللہ قاری کے عیوب چھپائے گا خوف کو امن سے بدل دے گا (رسول پاک) ۲۰۵ تا ۲۰۶

آتش جہنم کو نہ دیکھ پائے گا۔ رسول کی ہم نشینی نصیب ہوگی (صادقؑ)

یہ کتاب خدا کی طرف سے نازل ہوئی جو غالب و دانا ہے ۳۰۰
یہ قرآن ہدایت ہے، منکر کیلئے دردناک عذاب ہے ۲۱۹
یہ قرآن اور شریعت لوگوں کے لیے بینائی، ہدایت اور رحمت کا وسیلہ ہے ۲۲۷

سورہ احقاف کے مضامین

عظمت قرآن، معاد، عدالت پروردگار ۲۶۷

تلاوت کے فضائل

جو شخص یہ سورۃ تلاوت کرے گا دنیا میں موجود ریت کے ذروں سے دس گن زیادہ نیکیاں ملیں گی (حدیث رسول) ۲۶۸
یہ کتاب عزیز و حکیم خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے ۲۶۹

سورہ محمدؐ کے مضامین

زمین کی سیر، گزشتہ اقوام، جنگ ۳۴۵

سورہ محمدؐ کی تلاوت کے فضائل

جو سورۂ محمدؐ کی تلاوت کرے گا خدا اُسے انہار جنت سے سیراب کرے گا۔ (رسول پاک) ۳۴۶

قرآن فکر و عمل کی کتاب ہے

یہ کتاب صرف تلاوت کے لیے نہیں ہے ۴۰۰
بلکہ اس میں ذکر، تدبر اور انذار ہے ۴۰۹

کتب تاریخ و تفاسیر و سیرۃ

احقاق الحق ۴۱۹
استیعاب (ابن عبدالبر) ۴۰۹
اصول کافی ۲۹، ۱۰۹، ۲۴۰، ۲۶۵، ۳۳۸، ۴۰۸
اعلام القرآن ۱۸۰، ۱۸۲
السیرۃ النبوۃ (ابن ہشام) ۳۰۸، ۳۴۰
العزیزیہ ۸۴، ۲۱۵
بحار الانوار ۱۴۴، ۱۵۵، ۲۲۸، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۳، ۲۶۰، ۲۶۲، ۲۷۰، ۳۷۲، ۳۷۳
بخاری ۳۲۷
تاریخ تمدن اسلام ۳۷۲
تفسیر المیزان ۱۰۳، ۱۴۵، ۱۷۴، ۲۳۹، ۲۹۸، ۳۰۹، ۳۵۹، ۴۱۴، ۴۱۶
تفسیر برہان ۱۱۰، ۳۱۲
تفسیر تبیان ۱۷۴
تفسیر دار المنثور ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۶۷، ۱۸۰، ۲۳۸، ۳۳۸، ۴۳۷، ۴۱۹
تفسیر روح البیان ۱۱۷، ۲۳۹، ۳۸۰، ۴۰۵
تفسیر روح الجنان (ابوالفتوح) ۸۱، ۳۰۶، ۳۱۶، ۴۲۵

	۱۰۳، ۱۵۳، ۱۸۰، ۱۸۴
تفسیر روح المعانی	۱۸۱، ۱۸۷، ۱۸۹، ۱۹۶، ۳۰۰، ۳۴۷، ۳۴۹، ۳۶۹، ۳۹۷، ۴۱۹
تفسیر صافی	۴۰۲
تفسیر علی بن ابراہیم	۱۱۳، ۱۴۳، ۲۲۳، ۴۰۲
تفسیر فی ظلال القرآن (قطب)	۳۰۰، ۳۱۶، ۳۲۷، ۳۹۶
تفسیر قرطبی	۸۱، ۹۲، ۳۳۰، ۱۸۸، ۲۳۹، ۲۴۶، ۲۸۷، ۳۱۵، ۳۸۴، ۳۹۷
تفسیر کبیر (فخر الدین رازی)	۴۰، ۷۸، ۸۱، ۱۲۳، ۱۸۹، ۲۳۰، ۲۹۸، ۳۵۹، ۴۳۵
تفسیر کشاف	۷۰، ۷۴، ۲۸۸، ۳۴۹
تفسیر مجمع البیان (طبرسی)	۲۴، ۱۰۳، ۱۰۹، ۱۲۰، ۱۴۴، ۱۵۳، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۷، ۲۳۶، ۲۲۸، ۲۴۶، ۲۸۷، ۲۹۸، ۳۱۲، ۳۲۸، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۵۷، ۳۵۹، ۳۶۸، ۳۹۶، ۳۹۸، ۴۱۵، ۴۳۵
تفسیر مراغی	۸۱، ۱۸۹، ۲۳۹، ۲۴۲
تفسیر نور الثقلین	۴۱، ۶۰، ۳۰، ۱۴۴، ۱۸۵، ۱۹۸، ۲۲۴، ۲۳۹، ۲۶۵، ۳۴۱، ۳۴۶، ۳۶۰، ۳۸۶، ۴۰۲، ۴۰۷، ۴۰۴
ثواب الاعمال	۳۴۶
جامع الاصول	۴۰۹
خصال (صدوق)	۴۰۸
روضۃ الواعظین	۳۹۹
ریاض النضرہ	۴۱۹
سفینۃ البحار	۱۶۹، ۳۲۰، ۳۶۳
شرائع الاسلام	۳۵۶، ۳۷۱، ۳۷۲
فروع کافی	۲۶۵
فضائل (احمد)	۴۰۹
کفایت الطالب	۴۱۹
کنز العرفان	۳۵۶
لسان العرب	۵۳، ۱۰۰، ۱۹۷، ۳۵۵
مستدرک الوسائل	۳۶۲
مسلم	۳۲۷
مسند احمد حنبل	۳۲۷
مفردات	۹۴، ۱۴۱، ۱۵۰، ۱۵۵، ۱۵۷، ۱۸۷، ۲۲۰، ۲۵۵، ۳۲۹، ۳۳۶، ۳۵۰، ۳۵۲
	۴۱۸
نہج البلاغہ	۷۱، ۱۰۹، ۱۱۵، ۲۶۲، ۴۱۱، ۴۱۹، ۴۲۹
وسائل الشیعہ	۳۶۵، ۳۷۰، ۳۷۱

لغات قرآن

آسفونا	مادہ "اسف" نمبر ۹۴

آسن بدبو ۳۸۸

آنفا مادۂ "انف" ناک، صاحب عزت و حیثیت لوگ ۳۴۹

آثارہ (بروزن علاوہ) کسی چیز سے باقی رہ جانے والا حصہ ۲۷۴

" علامت، نشان

اثخنتموھم ثخن (بروزن شکن) ٹھوس اور سخت ہونا، دشمن پر غلبہ پانا ۳۵۵

اثیم مادۂ "اثم" ایسا شخص جو ہمیشہ گناہوں میں غرق رہے صیغہ مبالغہ ۱۸۹، ۲۱۵

احقاف حقف (بروزن رزق) کی جمع ایسی ریت جو ہواؤں کے چلنے سے مستطیل اور ٹیڑھی شکل میں ایک دوسرے پر جمع ہوتی رہتی ہے۔ قوم عاد کا مسکن ۲۶۸

اخلا مادۂ "خلۃ" خلیل کی جمع، دوست ۱۱۲

ارتقب مادۂ "رقبۃ" (بروزن طلبہ) گردن مراد گردن اٹھا کر انتظار کرنا ۲۰۰

ازواج جوڑے، جانوروں حتی کہ نباتات و جمادات کے بھی ۳۷

اسورہ سوار (بروزن ہزار) کی جمع طلائی کنگن ۹۳

اشراط شرط (بروزن شرف) کی جمع علامتیں ۳۹۵

اصلح بال زندگی بھر کے امور کو سنوارنا مکمل کرنا اور سدھارنا ۳۵۰

اضغان مادۂ "ضغن" (بروزن حرص) سخت اور شدید کینہ ۴۱۸

أف وہ گندگی اور میل کچیل جو ناخن کے نیچے اکٹھی ہو جاتی ہے ۳۰۴

افاک صیغہ مبالغہ بہت بڑا جھوٹا، بہت زیادہ جھوٹ بولنے والا ۲۱۵

اقفال مادۂ "قفول" قفل کی جمع، واپس لوٹ جانا ۴۰۹

امعا معی (بروزن سعی) کی جمع "آنت" پیٹ کے اندر کی سب چیزیں ۳۸۹

املی طول، طویل آرزوئیں ۴۱۳

انشزنا مادۂ "نشوز" پھیلنا، وسعت اختیار کرنا ۳۶، ۳۷

انصتو مادۂ "انصات" خاموشی اور یکسوئی سے سننا ۳۲۹

اودیۃ وادی کی جمع دریا اور پانی بہنے کی جگہ ۳۱۸

اوزار وزر کی جمع بھاری بوجھ۔ گناہ ۳۶۱

اوزعنی مادۂ "ایزاع" ہدایت کرنا، برائی سے روکنا، توفیق دینا ۲۹۶

ب

براء (بروزن ہوا) مصدر ہے، تبرّی کے معنی میں ۵۷

بطش (بروزن نقش) مضبوطی سے پکڑنا سزا کے لیے گرفت میں لینا ۱۵۲

ت

تحبرون مادۂ "حبر" (بروزن فکر) حسب دل خواہ اثر و نگھار ۱۱۵

تدمر مادہ "تد مین" ہلاک کرنا، نیست و نابود کرنا ۳۱۹

تعساء تعس (بروزن نحس) ڈگمگانا، منہ کے بل گرنا ۳۷۷

تفیضون کسی کام میں خلل ڈالنے کی غرض سے داخل ہونا ۲۸۰

تلاوت مادہ "تلو" (بروزن فکر) بات کو مسلسل بیان کرنا ۲۱۳

ج

جاثیہ جمع غفیر، ٹولے، عدالت میں گھٹنوں کے بل بیٹھنا ۲۵۲

جعل تخلیق، آفرینش ۵۹

ح

حاق مادہ "حوق" داخل ہونا۔ نازل ہونا۔ جالگنا ۲۵۹

حمیم کھولتا ہوا پانی، گہرا اور پکا دوست ۱۸۸

خ

خصام بحث و مباحثہ، تکرار، کش مکش ۴۵

خصمون خصم کی جمع، بہت ہی لڑنے جھگڑنے والا ۱۰۰

د

درجات درجہ کی جمع وہ سیڑھیاں جن سے اوپر چڑھا جاتا ہے۔ ۳۰۵

درکات۔ درک کی جمع۔ وہ سیڑھیاں جن کے ذریعہ نیچے اترا جاتا ہے۔ ۳۰۵

ر

رجز (بروزن حرص) اضطراب، لرزہ بدنظمی۔ ۲۲۰

ز

زخرف ایسی آرائش و زینت جس میں طرح طرح کے نقش و نگار ہوں ۶۹

زقوم تھوہر کا درخت، بدبودار، بد ذائقہ۔ نفرت انگیز پودا ۱۸۰

س

سبل سبیل کی جمع، خشکی و تری کے راستے ۳۶

سقوا انہیں پلایا جائے گا ۳۵۱

سلف آگے جانے والی چیز ۹۴

سواء درمیان۔ ہر جگہ سے برابر فاصلہ (مرکز) ۱۸۸

سئول مادہ "سُئل" (بروزن قفل) ایسی حاجت جس کا نفس حریص ہو ۴۱۳

ش

شجرہ صفت اور کبھی پودے کے معنی میں آیا ہے ۱۸۸

شریعت راستہ جو پانی تک پہنچنے کیلئے دریا کنارے بنایا جاتا ہے ۲۳۰

شہید مادہ "شہود" متعدد معنی، رحمت کے فرشتوں کا مشاہدہ کرنا ۳۶۰

ص

صحاف مادہ "صحف" وسعت دینا، بڑے وسیع ظروف ۱۱۶

صرفنا مادہ "صرف" کسی چیز کو ایک حالت سے دوسری میں تبدیل کرنا ۳۲۸

ع

عارض مادہ "عرض" یہاں وہ بادل جو آسمان پر پھیل جائے ۳۱۸

عذاب الھون حقارت و توہین آمیز عذاب۔ ۳۱۱

عزم پختہ ارادہ کرنا، صبر ایفائے عہد، حکم اور شریعت ۳۳۶

عقب پاؤں کی ایڑی، اولاد ۵۸

ف

فاعتلوہ مادہ "عتل" (بروزن قتل) پکڑنا گھسیٹنا، پھینکنا ۱۸۸

فاکھون پھلوں سے استفادہ کرنا، فکاہت دل لگی کی باتیں کرنا ۱۶۵

فتنا مادہ "فتنہ" سونے کی کھٹالی میں کندن بنانا، آزمائش و امتحان ۱۵۷

فوز ایسی کامیابی جس کے ساتھ صحت و سلامتی بھی ہو ۲۵۵

ق

قدر نظامِ نزول باراں پر ایک لطیف اشارہ ۳۶

ک

کظم غصے سے بھر جانا، بھری ہوئی مشک کا دھانہ باندھنا ۴۶

ل

لتافکنا مادہ "افک" جھوٹ، حق سے انحراف ۳۱۷

لحن لفظ کا اعراب بدل دینا، بد طریقہ قرأت کرنا ۴۱۸

لعب ایسا کھیل جس میں خیالی نظر و نسق پایا جائے ۴۳۱

لقا ہر قسم کی ملاقات دشمن سے مڈبھیڑ ۳۵۴

لھو بے مقصد کھیل۔ بے مقصد مشغولیت ۴۳۱

م

ماکثون مادہ "مکث" انتظار میں ٹھہرنا ۳۲۱

مبطل مادہ "ابطال" جھوٹ بولنا، ہنسی مذاق اڑانا ۲۵۲

مبلس مادہ "ابلاس" سخت پریشانی کی حالت میں غم ہونا ۱۷۵

مترف مادہ "ترفہ" (بروزن تعمہ) فراوانی نعمت، بدمست و سرکش ۵۳

مثل ایسی گفتگو جیسی اس مطلب کے مشابہ کے بارے میں کی گئی ۳۵۲

مجرم مادہ "جُرم" درخت کاٹنا، پھل توڑنا، برے اعمال انجام دینا ۱۲۰

مسرفین مادہ "اسراف" ہر قسم کا تجاوز ۱۴۰

معارج معراج کی جمع بالائی منزل پر جانے کا ذریعہ، سیڑھیاں ۶۸

معرضون مادہ "اعراض" منہ پھیرنا ۲۷۱

مقرنین مادہ "اقران" کسی چیز پر قابو پانا، حفاظت کرنا ۳۵

ملاء مادہ "ملا" دولت مند، سردار، اراکین سلطنت ۸۶

منتقمون مادہ "انتقام" سزا دینا ۱۵۲

مولی مادہ "ولا" دو چیزوں کا باہمی رابطہ (۲۷ معنی) سرپرست، دوست، مددگار ۳۷۵، ۱۸۴

مہد آرام کی جگہ گہوارہ ۳۵

مہل پگھلی ہوئی دھات ۱۸۸

مہین پست، گھٹیا، کم ظرف ۹۳

ن

نستنسخ مادہ "استنساخ" ایک چیز کو دوسری سے زائل کرنا ۲۵۳

نفر ایسا گروہ جو مل کر سفر کرے تین سے لے کر دس تک کی جماعت ۳۲۹

نقبض مادہ "قبض" (بروزن نبض) انڈے کا چھلکا، چھپائے رکھنا ۷۴

و

وثاق رسی یا زنجیر جس سے دشمن کو باندھا اور قید کیا جائے ۳۵۵

ی

یجرکم مادہ "ایجار" فریاد کو پہنچنا، عذاب سے بچانا، پناہ دینا، حفاظت کرنا ۳۳۰

یحفکم مادہ "احفا" مطالبہ اور سوال میں اصرار کرنا ۴۳۲

یخرصون مادہ "خرص" (بروزن غرس) اندازہ لگانا، جھوٹ بولنا ۴۹

یخسر مادہ "خسران" سرمائے کو ضائع کر دینا ۲۵۲

یصدون مادہ "صد" شور مچانا، استہزا کرنا ۱۰۰

یعش مادہ "عشو" (بروزن نشر) روگردانی ۷۴

یلعبون مادہ "لعاب" تھوک سے تشبیہ، بے مقصد کام، کھیل ۱۵۰

ینشؤ مادہ "نشا" ایجاد کرنا، بنانا ۴۴

یوم لقاء اللہ خدا کی ملاقات کا دن ۲۸۱

متفرق موضوعات

اسلام غلط اقدار کی نفی کرتا ہے

یتیم اور مادی لحاظ سے غریب انسان کو پیغمبری کے لیے منتخب کرتا ہے ۶۹ تا ۷۲

اسلام میں جنگ کے مقاصد

جنگ کو خلاف اقدار سمجھا گیا۔ لیکن قومی وجود کو خطرہ ہو تو جنگ جہاد فی سبیل اللہ ہے ۳۶۲، ۳۶۴

ان پر آسمان نے گریہ کیا نہ زمین نے

اس آیت سے مراد حقارت، ہمدردوں اور دوستوں کا فقدان ہے ۱۶۶

اندھے اور بہرے مقلدین کا انجام

پیغمبر بھیجے۔ دولت مندوں، سرکشوں نے آبا کی تقلید کا عذر کیا۔ پیغمبر نے بہتر دین پیش کیا۔ انکار۔ عبرت ناک انجام ۵۲ تا ۵۵

انہیں باطل میں غوطے کھانے دو

خدا کا بیٹا ہوتا تو پہلا اطاعت گزار ہوتا۔ وہ ان جھگڑوں سے پاک ہے۔ زمین و آسمان کا مالک و خالق ہے قیامت کی اُسی کو خبر ہے ۱۲۴ تا ۱۲۹

اولاد کی پرورش میں ماں کی تکلیف

باپ کے مقابلتاً بچوں کی پرورش میں ماں کی تکالیف زیادہ ہیں ۲۹۹

ایام اللہ سے مراد

تین دن = ظہور امام کا دن = موت = قیامت کا دن ۲۲۴

اے انسان اپنے والدین سے نیکی کر

ہم نے وصیت کی کہ والدین سے نیکی کر۔ اولاد کی پرورش میں والدین کا کردار۔ جو احسان تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کیے اُن کا شکر بجالانے کی توفیق دے۔ میری اولاد کو صالح بنا ۲۹۱ تا ۳۰۱

بنی اسرائیل کی آزمائش

ہم نے بنی اسرائیل کو منتخب کیا۔ نعمتیں دیں۔ کفران کیا مورد عذاب ہوئے ۱۶۹ تا ۱۷۲

بہشتی انسان کی صفات

توفیق شکر اور توبہ والدین اور اولاد کے لیے دعائیں ۲۹۹

بے جا اور رسوا کن صلح

کبھی ہمت نہ ہارو۔ رسوا کن صلح کی دشمن کو دعوت نہ دو خدا تمہارے ساتھ ہے ۴۳۶

پرہیزگار لوگ اور نعمات جنت

امن وامان۔ باغ اور چشمے۔ ریشمی لباس
حورالعین سے تزویج۔ انواع واقسام کے
پھل، موت کی تلخی ختم۔ یہ خدا کا فضل ہے ۱۹۲ تا ۱۹۶

پہلی موت کیا ہے

وہی موت جو دنیاوی زندگی کے بعد آئی۔
جنت میں بطور خوشخبری اس کا ذکر ہوا۔ ۱۹۶ تا ۱۹۸

پیغمبرانِ اولوالعزم کی طرح صبر کرو

ان کے لیے عذاب میں جلدی نہ کرو۔
عذاب تو ان کے لیے طے ہو چکا ہے
جب یہ دوزخ کے سامنے پیش کیے جائیں
گے تو دیکھ لیں گے ۳۳۴ تا ۳۳۶

پیغمبران اولوالعزم کون ہیں

بزرگ انبیاء کا ایک گروہ خاص جو صاحبانِ
شریعت تھے نوحؑ۔ ابراہیمؑ، موسیٰؑ۔ عیسیٰؑ اور
محمدؐ (پانچ) ۳۳۶

پیغمبر کی قوم کون لوگ ہیں

تمام امت مسلمہ، عرب یا قریش۔ لیکن تمام
امت مسلمہ ہی مراد ہے ۸۳، ۸۴

تقلید آباء کی دلیل

اگر خدا چاہتا تو ہم بتوں کو نہ پوجتے۔ جھوٹے ہیں
ہم نے آباء کو جس مذہب پر دیکھا اُسی پر
چلے ۴۷ تا ۵۱

تم خدا کی مدد کرو گے وہ تمہاری مدد کریگا

خدا کی مدد کرنا اس کے دین کی مدد کرنا ہے۔
طالوت کے ساتھیوں کا ثبات قدمی سے
جالوت کے لشکر کو شکست دینا ۳۷۶ تا ۳۸۰

تم نے روگردانی کی تو تمہاری جگہ تم سے اچھے لوگ آجائیں گے

زندگی ایک کھیل ہے۔ ایمان وتقویٰ اختیار
کرو اجر پورا ملے گا۔ راہِ خدا میں خرچ کرنے
سے بخل کرتے ہو، خدا بے نیاز ہے وہ تم
سے بہتر لوگ لے آئیگا ۴۳۰ تا ۴۳۶

ثواب ضائع ہونے کے اسباب

حسد، احسان جتانا اور تکلیف پہنچانا جیسے
عمل سے مومنوں کے اعمال بھی ضائع ہو
جاتے ہیں ۴۲۴

جس دن انسان کے بُرے اعمال ظاہر ہو جائیں گے

اُن کے کرتوت کی بُرائیاں اُن پر ظاہر ہو
جائیں گی جس کی ہنسی وہ اُڑاتے تھے ۲۵۸ تا ۲۶۲

جسمانی اور روحانی سزائیں

روحانی سزاؤں کو حقارت، ڈانٹ ڈپٹ
اور سرزنش سے ظاہر کیا گیا ہے ۱۹۱

جنات ایمان لاتے ہیں

طائف سے واپسی پر جنوں کے ایک گروہ نے حضورؐ پاک سے تلاوت سُنی، ایمان لائے اپنی قوم میں تبلیغ کے ذریعہ دوسروں کو مسلمان کیا ۳۲۵، ۳۳۲

جنّت کی صفات

صاف پانی، دودھ، شہد اور شراب طہور کی نہریں پرہیزگاروں کے لیے جب کہ جہنم میں وہ پانی جو آنتوں کو کاٹ ڈالے ۳۸۷ تا ۳۹۱

جن لوگوں نے عیسٰی کے بارے میں غلو کیا

تبلیغ کے باوجود بعض لوگوں نے خدا جانا اور بعض نے خدا کا بیٹا ۱۰۵ تا ۱۰۹

جو جی چاہے اور جس سے آنکھیں ٹھنڈی ہوں

اپنی بیویوں سمیت جنت میں داخل ہو جاؤ۔ راحت کی ہر شے موجود ہے۔ لذت، پھل کھانے بہ افراط ہیں ۱۱۴ تا ۱۱۸

حالت کفر میں مرنے والے بخشے نہیں جائیں گے

کافر ہو گئے۔ لوگوں کو راہ خدا سے روکا، رسول کی مخالفت کی اعمال اکارت ہو گئے حالت کفر میں مرے بخشش نہ ہو گی۔ پس خدا و رسول کی اطاعت کرو ۴۲۲ تا ۴۲۴

خواہش نفسانی سب سے خطرناک بُت

ایمان کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ خواہشات نفسانی کی پیروی ہے ۲۳۹

دامن وحی کو مضبوطی سے پکڑے رہیں

تمہارے بعد بھی ان کی سزا ضروری جس سے بچ نہ سکیں گے ۷۹ تا ۸۳

دخان کیا ہے

رسول پاک کی بددعا سے مکہ میں قحط فاقہ زدوں کی آنکھوں میں آسمان سیاہ، قیامت کی نشانی آسمان پر دھواں چھا جاتا۔ ۱۵۲، ۱۵۳

دوسروں کو ایمان لانے سے نہ روکو

موسیٰؑ نے دلائل کے بعد آخری بات کہی خود ایمان نہیں لاتے تو دوسروں کو تو منع نہ کرو ۱۵۶، ۱۶۰

دولت دنیا۔ جھوٹی قدریں

خدا کا انکار کرنے والوں کی چھتیں، سیڑھیاں چاندی کی بنا دیتے اور دوسرے وسائل بھی مگر سب ایک ہی طرح کی گمراہی افتیار نہ کریں۔ آخرت کا ثواب تقویٰ میں ہے ۶۷ تا ۷۲

دھریوں کے عقائد
ہماری زندگی اور موت اسی دنیا کیلئے ہے۔ ۲۴۳ تا ۲۴۸

زھد اور آخرت کا ذخیرہ
کافر جہنم کے سامنے لائے جائیں گے دنیا میں عیش کر چکے ہو اب جہنم کا مزہ چکھو ۳۰۸

سب اُس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیں گے
اُس دن ہر امت خوف و دہشت کی شدت سے گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوگی جو کچھ کرتے تھے آج اُس کا بدلہ دیا جائے گا ۲۵۰ تا ۲۵۶

سب تیرے زیر فرمان طلبگار ہیں
دریاؤں اور زمین و آسمان کے درمیان ہر چیز کو تمہارے لیے مسخر کر دیا ہر شخص کا اچھا یا بُرا کام اُس کے اپنے لیے ہے ۲۱۹ تا ۲۲۵

شفاعت کون کر سکتا ہے
تمہارے معبود بت شفاعت نہیں کر سکتے البتہ فرشتے تو وہ بھی اذنِ خدا کے بغیر شفاعت نہیں کریں گے ۱۳۰ تا ۱۳۴

شہدا کا بلند مقام
بے حد ایثار و قربانی۔ فداکاری و جانفشانی کے مواقع پر قوم کیلئے جان دینا جدِ مرتبہ و مقام رکھتا ہے ۳۵۹ تا ۳۶۲

شیاطین کا ساتھی
جو خدا رحمان کا انکار کرتے ہیں ہم اُن پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں جو اُسے گمراہ کرتا رہتا ہے۔ ۷۴ تا ۷۸

صالح اور بدکار لوگوں کا مرنا جینا ایک جیسا نہیں ہے
جو برائی کے مرتکب ہوئے کیا وہ ایمان لانے والوں کے برابر ہیں ہم نے اُن کے کان اور دل پر مہر لگا دی آنکھ پر پردہ ڈال دیا ایسی حالت میں خدا کے سوا کوئی ہدایت نہیں کر سکتا ۲۳۴ تا ۲۳۹

طبقاتی تفاوت
میں اس شخص (موسیٰؑ) سے برتر ہوں جو ایک پست طبقے اور خاندان سے تعلق رکھتا ہے گفتگو بھی صاف نہیں کر سکتا ۵۰

فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کیوں سمجھتے ہو
اللہ کے بندوں (فرشتوں) کو خدا کی بیٹیاں بناتے ہو۔ اگر تمہارے بیٹی پیدا ہو تو تم رنج و غصہ کرتے ہو ۴۳، ۱۶

قرآن مبارک رات میں نازل ہوا
ہم نے اس قرآن کو بابرکت رات میں نازل کیا ہے ۱۴۰ تا ۱۴۱

قرآن مجید کا شب قدر سے رابطہ

سورہ قدر سے واضح ہے کہ قرآن شب قدر میں نازل ہوا — ۱۴۶، ۱۴۸

قرآنی آیات میں خاندانی رشتے

والدین کا احترام اور اولاد کی تربیت کو خصوصی طور پر بیان کیا گیا — ۳۰۰ تا ۳۰۱

قرآن یکبارگی نازل ہوا یا تدریجی طور پر

پیغمبر کی ۲۳ سالہ زندگی میں نازل ہوتا رہا۔ مبارک رات میں نازل کرنے سے مراد نزول کی ابتداء ہے۔ ایک دفعہ رمضان کی شب قدر میں دوسرا تدریجی نزول — ۱۴۱ تا ۱۴۷

قوم عاد اور تباہ کن آندھی

قوم عاد کی تباہ کن آندھی کے ذریعہ تباہی جو ریت کے ٹیلے جمع کر دیتی تھی — ۲۱۳ تا ۲۱۹

قوم عاد، تم (مشرکین مکہ) سے زیادہ طاقتور تھی

جب ایسی طاقت ور قوم عذاب خدا کے مقابل نہ ٹھہر سکی تو تم کس شمار میں ہو۔ — ۳۲۰ تا ۳۲۴

قیامت کی نشانیاں ظاہر ہو چکی ہیں

کیا یہ لوگ ایمان لانے کے لیے قیامت کے منتظر ہیں اس کی نشانیاں تو ظاہر ہو چکی ہیں — ۳۹۵

کائنات کی تخلیق حق کی بنیاد پر ہے

ہم نے سارے آسمان، زمین اور اُن کے درمیان کی ہر شے حق کے ساتھ پیدا کی — ۲۶۹ تا ۲۷۱

کامیابی کی دو شرطیں

جنہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے اور اس پر ہمیشہ قائم رہے انہیں خوف و غم نہ ہوگا وہی متقین ہیں جو توحید پر اعتقاد اور صبر و استقامت پر عمل کرتے ہیں — ۲۹۰

کس انتظار میں ہو

اچانک قیامت آجائے۔ دوست دشمن ہو جائیں گے۔ مگر پرہیزگار دوست ہی رہیں گے انہیں کوئی خوف و غم نہیں — ۱۱۰، ۱۱۳

کون سے معبود جہنمی ہیں

تم اور خدا کے علاوہ جن کی تم عبادت کرتے ہو سب جہنمی ہیں۔ — ۹۹ تا ۱۰۴

گمراہ ترین لوگ

بڑا گمراہ وہ ہے جو خدا کے سوا ایسے کو پکارے جو قیامت تک جواب نہ دے قیامت میں اُن کے یہ معبود دشمن ہو جائیں گے اور ان کی عبادت کا انکار کریں گے — ۲۷۲ تا ۲۷۶

گناہ رحمت کو روک نہیں سکتے

ہم قرآن کو اس لیے واپس لے لیں کہ تم اسراف اور تجاوز کرنے والے لوگ ہو — ۳۰ تا ۳۲

گنہگار جھوٹے پر افسوس

اس پر آیات خدا پڑھی جاتی ہیں وہ غرور میں اکڑا ہوا ہے اس کے لیے عذاب ہے جہنم ان کے پیچھے لگا ہوا ہے جس سے نجات نہ ہوگی — ۲۱۴ تا ۲۱۸

ماضی میں غلاموں کا انجام

غلام کسی ایک کا نہیں پورے معاشرے کا ہوتا تھا اور پورا معاشرہ اس پر جی بھر کر ظلم کرتا تھا — ۳۶۷

مجرم ہمیشہ جہنم کے عذاب میں رہیں گے مرنے کی آرزو کریں گے

عذاب میں کمی نہ ہوگی مایوس ہوں گے موت کی آرزو کریں گے، تمہیں اسی حال میں رہنا ہے۔ ہمارے رسول اور فرشتے اُن کے پاس ہیں اور لکھتے جاتے ہیں — ۱۱۹ تا ۱۲۳

مغرور اور عہد شکن فرعونی

موسیٰ کو جادوگر کہنا، مبتلاء عذاب ہو کر بڑی منت عذاب کی دعا کرنا اور پھر ہٹ دھرمی کرنا وغیرہ — ۸۵ تا ۸۹

منافقین

تیری باتیں کان لگا کر سنتے ہیں، پھر پوچھتے ہیں ابھی اس شخص نے کیا کہا تھا۔ ان کے دلوں پر مہر لگا دی سمجھتے نہیں — ۳۹۴

منافقین انداز گفتگو سے پہچانے جاتے ہیں

خدا ان کے دلوں کا مرض اور کینہ ظاہر کرے گا۔ ہم ضرور آزمائیں گے کہ مجاہد اور صابر کون ہے — ۴۱۸ تا ۴۲۱

منافقین جہاد کے نام سے بھی ڈرتے ہیں

جہاد کا حکم آئے تو ایسے دیکھتے ہیں جیسے موت آنے لگے حالانکہ اُن کی اس حالت سے بہتر ہے — ۴۰۳ تا ۴۰۹

منافقین قرآن میں غور کیوں نہیں کرتے

حق واضح ہونے کے بعد روگردانی شیطان نے اعمال سجا دیئے وہی کو ناپسند کرتے ہیں جس میں خدا خوشی ہو اُس سے بیزار ہیں موت کے فرشتے منہ اور پشت پر ماریں گے اور جان نکالیں گے — ۴۱۳ تا ۴۱۶

موسیٰؑ کے پاس سونے کے کنگن کیوں نہیں ہیں

فرعون نے اپنے عوام کو گمراہ کرنے کے لیے موسیٰؑ کی تحقیر کی — ۹۱ تا ۹۶

مومن حق کا اور کافر باطل کا اتباع کرتے ہیں

کفر کرنے اور خدا کی راہ سے روکنے والوں کے اعمال اکارت اور ایمان والے بخش دیئے جائیں گے ۴۹ تا ۳۵

مومنین اور کفار کا انجام

نیک عمل والوں کو جنت کافروں کو جہنم ملے گا، جو اپنے رب کی طرف سے روشن دلیل پر ہو کیا اُس کے برابر ہے جو اعمال بد کو اچھا سمجھتا ہے ۳۸۱ تا ۳۸۶

میں کوئی نیا رسول نہیں ہوں

یہ توحید کی پہلی دعوت نہیں مجھ سے پہلے بہت نبی گئے وہ سب بشر تھے، ہم وہی کچھ جانتے ہیں جو ہمارے رب نے بتایا ۲۶۷ تا ۲۸۴

نعمتوں کے موقعہ پر خدا کی یاد

قرآن میں عطاء نعمت پر حمد و شکر کا ذکر ہے ۳۹، ۴۰

والدین کے حقوق پامال کرنے والے

اولاد کا والدین کو اُف کہنا، قیامت میں اُٹھنے کا انکار، والدین کی نافرمانی، جنوں اور انسانوں کی گزشتہ کافر امتیں دردناک عذاب میں گرفتار ہوں گے ۳۰۲

وہ بہترین قوم ہیں یا قوم تبع

تبع یمن کے بادشاہوں کا لقب اور قوم کا نام، واقعات تبع ۱۷۷ تا ۱۸۲

ہر جگہ اُس کی نشانیاں موجود ہیں

مومنین کے لیے آسمانوں، زمین اور مخلوقات میں بہت سی نشانیاں ہیں، شب و روز کی آمد و رفت، آسمانی رزق (پانی) کا نزول صاحبان عقل کے لیے نشانیاں ہیں ۲۰۸ تا ۲۱۳

ہولناک دھواں آسمان پر چھا جائیگا

عذاب خدا کے اظہار میں آسمان پر دھواں، جس سے عذاب دور کرنے کا موقوف ہونا، پھر سخت دن کا عذاب ۱۴۹ تا ۱۵۲

یوم الفصل

قیامت کا دن جب کوئی کسی کی مدد نہ کر سکے گا، مگر جس پر رحمت ہو ۱۸۳، ۱۸۵

یہ آیت بنی اُمیہ کی طرف کیسے تحریف کی گئی

عائشہ زوجہ رسول کا حاکم مدینہ مروان کو لعنتی قرار دینا ۳۰۶، ۳۰۷

یہی موت ہے بس

مشرکین مکہ کے اعتراضات رسول پاک سے آپکے بدقصی بن کلاب کی زندگی کا تقاضا ۱۷۳ تا ۱۷۶

مقامات

احساء
احقاف کے حدود اربعہ کا ایک علاقہ ۳۱۵

احقاف
قوم عاد کا مسکن ۲۶۷
نجد، احسار، حضرموت اور عمان سے گھرا ہوا علاقہ ۳۱۵
سرزمین عراق میں کلاہ و بابل کا علاقہ ہے۔ بقول طبری شام میں ایک پہاڑ کا نام ہے ۳۱۶

امریکہ
امریکہ ۱۸۶۵ء تک غلامی کا رواج رہا ۳۶۶

انگلستان
۱۸۳۳ء تک غلامی کا رواج رہا ۳۶۶

بابل
جسے احقاف بھی بتایا گیا ۳۱۶

برسلز
۱۸۹۰ء میں برسلز میں ایک کانفرنس کے ذریعہ غلامی کو ختم کیا گیا ۳۶۶

تہامہ
ایک عرب علاقہ جہاں زقوم (تھوہر) کا پودا پیدا ہوتا ہے ۱۸۷

تیہ
ایک قطعہ زمین جس میں بنی اسرائیل بھٹکتے رہے ۱۷۲

حضرموت
احقاف کے حدود اربعہ کا ایک علاقہ ۳۱۵

سینا
مصر سے ملحق ایک وسیع صحرا ۱۷۲

شام
ایک مشہور ملک جہاں بقول طبری احقاف نام کا ایک پہاڑ ہے ۳۱۶

عراق
ایک مشہور ملک ہے ۳۱۶

عمان
احقاف کے حدود اربعہ کا ایک علاقہ ۳۱۵

فرانس
۱۸۴۸ء تک فرانس میں غلامی کا رواج رہا ۳۶۶

کلاہ
جسے احقاف بھی بتایا گیا ہے ۳۱۶

مشربہ ام ابراھیم
مدینہ کا ایک مقام ۲۱۱

مصر
مصر قدیم فرعون کی سلطنت ۹۲

نجد

احقاف کے صدود اربعہ کا ایک علاقہ ۳۱۵

نصیبین

نصیبین کے جنّات نے رسول پاکؐ سے قرآن سنا ۳۲۸

ہالینڈ

۱۹۶۳ء ہالینڈ میں غلامی کا رواج تھا ۳۶۶

یمن

یمن میں ایک درخشندہ تمدن قوم تھی جس کے طاقتور بادشاہ تبع کہلاتے تھے ۱۷۸

یمن کے جنّوں کا ایک گروہ رسولؐ پاک سے قرآن سن کر ایمان لایا ۳۲۸

الحمدُللہ اِشاریہ جلد ۲۱ اختتام پذیر ہوا